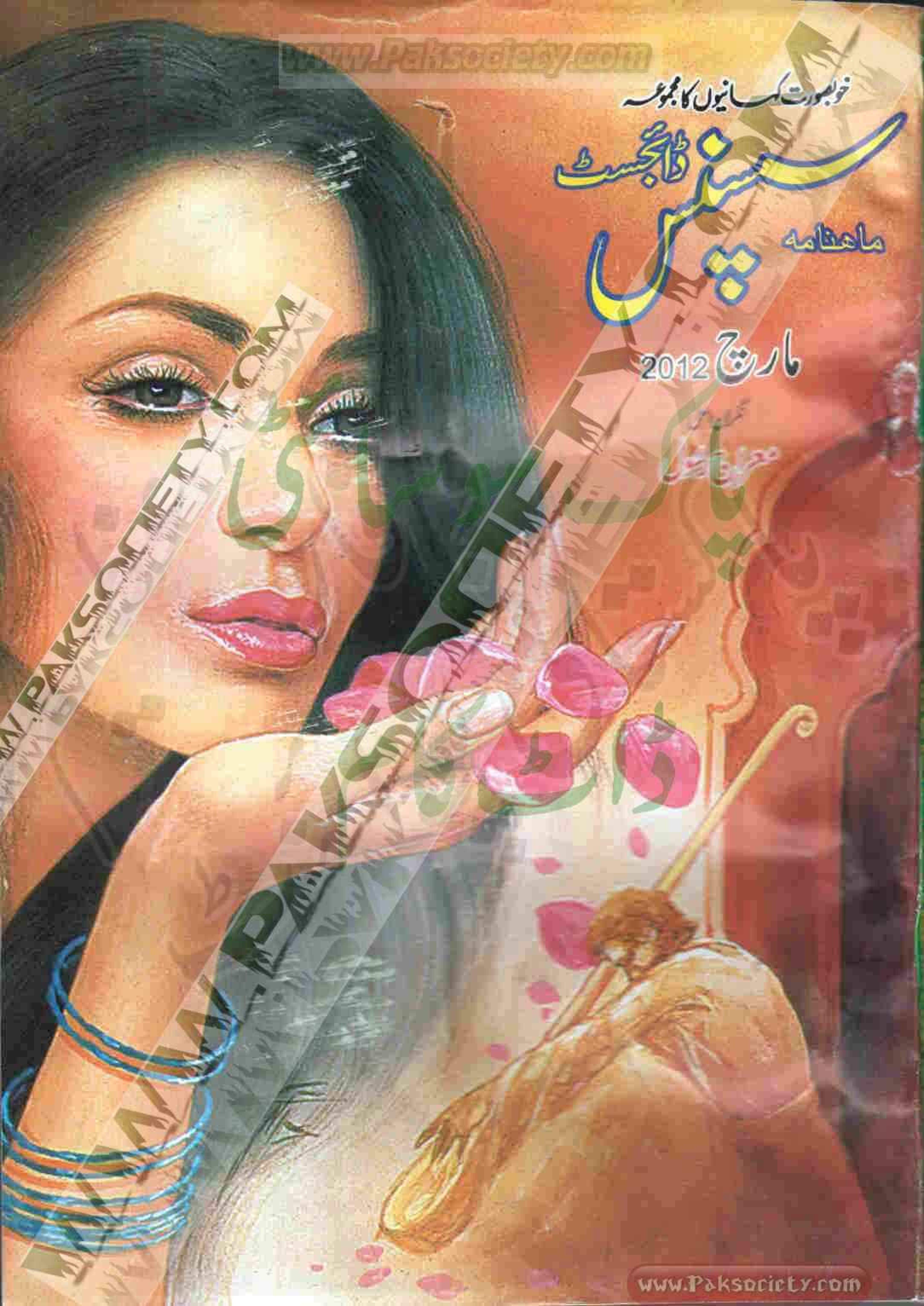
www.Paksociety.com
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
مارچ 2012
www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

انشائیہ

نسخۂ نجات

جون ایلیا

جانے کس ستم ظریف نے کب اور کہاں نوکر شاہی کا لفظ ایجاد و اختراع کیا تھا۔ اس ستم ظریف موجد اور مخترع کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ یہ لفظ یا دو لفظی مرکب شہنشاہوں، شاہوں اور حکمرانوں کے شانوں پر پیر تسمہ پا بن کر سوار ہو جائے گا اور سکہ چاہے کسی بھی بادشاہ کا چلے اور شاہی چاہے کسی بھی خاندان کی ہو مگر "حکومت" نوکر شاہی کے قبضے ہی میں رہے گی۔

جسے اس بات پر شک ہو اور جو اس بیان پر یقین کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس کرتا ہو، وہ تاریخ اٹھائے اور وزیروں اور "امیروں" کا جاہ و جلال اور اوج کمال دیکھے۔ یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی ہیں کہ ان کے تزک و احتشام کے سامنے ہارون الرشید کا اہتمام اور انصرام ماند پڑ جاتا ہے اور وہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ آخرکار جعفر برمکی کا سر قلم کرا کے اور اس کے باپ یحییٰ برمکی کو تباہی کا نشانہ بنا کر ہی ہارون ان دونوں باپ بیٹوں سے نجات پاتا ہے اور حقیقی معنوں میں "خلیفہ ہارون رشید" کی حیثیت حاصل کرتا ہے۔ ابوالفضل اور فیضی ہیں کہ ان کے اثر و رسوخ کے آگے مہابلی اکبر کے نورِ عین شہزادہ سلیم کی ایک نہیں چلتی، یہاں تک کہ اسے ابوالفضل سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے قاتل کے خنجر آبدار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم یحییٰ برمکی، جعفر برمکی، ابوالفضل اور فیضی کے علمی مرتبے کے منکر نہیں ہیں اور ان کی عظمت مسلم ہے۔ ہم تو صرف نوکر شاہی کے تعلق سے ان کا ذکر کر رہے ہیں۔

سیدانِ بادشاہ گر ہیں جسے چاہیں تخت پر بٹھائیں اور جسے چاہیں تخت سے اتار دیں۔ انہی کے اشارے سے زندگی کے چراغ گل ہوتے ہیں اور انہی کے اشارے سے شہزادے آزاد زندگی کا سانس لیتے ہیں۔

ہم چند صدیوں ہی کی تاریخ کو کیوں دیکھیں۔ دو ہزار، تین ہزار اور چار پانچ ہزار برس پہلے کے دور پر نظر ڈالیں۔ فراعنہ ہوں یا قیصر و کسریٰ کے پرجلال دربار، ہر جگہ اور ہر بارگاہ عالی میں وزیرانِ باتدبیر اور امیرانِ باتوقیر اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والی نوکر شاہی کی حکومت نظر آئے گی۔ ٹکسالوں میں سکہ شاہوں کے نام کا ڈھلتا ہے اور سلطنت میں حکم ان کی نوکر شاہی کا چلتا ہے۔

شہنشاہی اور نوکر شاہی کی ناک میں اگر نکیل ڈالی تو وہ جمہوریت نے ڈالی لیکن یہ وہیں ممکن ہو سکا جہاں واقعی عوام کی مرضی اور منشا سے حکومتیں بنتی اور بدلتی ہیں اور جن کی ناخوشی اور برہمی سے ایوان ہائے حکومت اور رنگ ہائے سلطنت لرزہ براندام ہوتے ہیں۔

ہم نے یہ ملک جمہوریت کے نام پر بنایا تھا لیکن نوکر شاہی سے تعلق رکھنے والے ایک "غلام" نے اس جمہوریت کا گلا ایسا گھونٹا کہ پھر وہ ڈھنگ سے پنپ نہ پائی۔ اب ہمارے یہاں جمہوریت کے نام پر جو انتشار پھیلا ہوا ہے اس نے نوکر شاہی کو بے لگام کر دیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا اہلکار جسے چاہے نہال کر دے اور جسے چاہے اسے عبرت ناک زوال کا نمونہ بنا دے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کی حرمت کو چاہے تار تار کر ڈالے۔ کوئی بھی نہیں ہے جو ان کی دست برد سے محفوظ ہو۔ ان کے نزدیک کسی کی بھی شخصیت اور آبرومندی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ایسی صورت حال، ایسی وحشت ناک اور دہشت ناک صورت حال کسی بھی جمہوری حکومت کو راس نہیں آتی۔ راس آ ہی نہیں سکتی اور کوئی بھی منتخب حکمران دوبارہ عوام کے دربار میں بار نہیں پاتا۔ اس لیے اپنے حکمرانوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ نوکر شاہی کو اپنے قابو میں لائیں، اس کے تابع مہمل بن کے نہ رہیں۔ اسی میں حکمرانوں کی بھلائی ہے اور اسی میں عوام کی بہبود ہے۔

یہاں ایک خاص بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ نوکر شاہی کوئی قومی پس منظر نہیں رکھتی۔ یہ تو انگریز سامراج کا "کرم پرورانہ" تحفہ ہے جس سے ہمیں نوازا گیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو عوام کا طبق الٹنے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ اس گروہ کو اس کی حد میں رکھا جائے اور اسے آزاد اور جمہوری معاشرے کے آداب سکھائے جائیں۔ یہی ملک اور قوم کے لیے نسخۂ نجات ہے۔

www.Paksociety.com

عزیز قارئین!

تسلیمات

مارچ 2012ء...... دیدہ زیب و دلکش شمارہ آپ کے ہاتھوں کی زینت...... یوں تو اس دور کا ہر دن ایک نئی تاریخ مرتب کر رہا ہے مگر ماضی میں 23 مارچ 1940ء کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی اپنی ہی داستان ہے...... لیکن آج کون ہے جسے ان لمحات کے کرب اور جدوجہد کا احساس ہو سکے۔ عہدِ حاضر میں جہاں سلطان معاشرے کا سرطان بن جائیں، وہ قوم کو بیماریوں اور ناقص دواؤں کے سوا اور کیا سوغات دے سکتے ہیں۔ جعلی ادویات کا استعمال نااہلی ہو یا سازش، اس مباحثے سے قطع نظر کئی قیمتی جانوں کا زیاں ایسی دردناک حقیقت ہے جس نے کتنے ہی گھروں میں ماتم بپا کر دیا ہے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا بلکہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی نااہلی اور غفلت کا یہ تیسرا بڑا واقعہ ہے۔ 18 کروڑ کی آبادی میں اربوں روپوں کے فلائی اوور تو بنائے جا سکتے ہیں مگر غریبوں کی تعلیم اور صحت کی تباہی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ عوام سے مذاق نہیں تو کیا ہے...... ''سیاست'' بڑا بے رحم کھیل ہے...... جہاں ملکی اہم شخصیات توہینِ عدالت کا ارتکاب کر کے بھی مطمئن ہیں اور کہیں نوجوان بے روزگاری اور بے بسی کا شکار ہو کر خودکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ لگتا ہے اس کائنات کا دائرہ جلد ہی مکمل ہونے والا ہے اور انسان پھر سے زمانۂ قدیم میں قدم رکھنے والا ہے۔ جہاں جاہلیت کا دور دورہ تھا، جہاں معاشرہ تمام تر اخلاقی برائیوں اور قانون شکنی کا شکار تھا اور جہاں طاقتور کامیاب اور کمزور کو حقیر تصور کیا جاتا تھا۔ جہاں بڑے لوگوں کے لیے چھوٹے قانون اور چھوٹے لوگوں کے لیے بڑے بڑے قاعدے اور قانون ہوا کرتے تھے...... جہاں معیشت کا نظام عہدِ حاضر کی طرح تباہ تھا۔ بہرحال دائرہ کتنا ہی تنگ ہو جائے، گھٹن کتنی ہی بڑھ جائے...... کہیں نہ کہیں روزنِ زنداں بھی ہوتا ہے اور ایسی ہی خوشی کا ایک احساس پاکستانی کرکٹ ٹیم نے ٹیسٹ سیریز جیت کر عوام کو دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے ملک کے عوام پر رحم فرمائے اور ہمدرد و باشعور حکمران عطا فرمائے (آمین) تو جناب اب چل کر دیکھتے ہیں کہ ہماری محفل میں کون کون اپنی برتری جتانے کی کوشش کر رہا ہے۔

✠ **آغا فرید احمد خان**، سکھر سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''جنوری 15 کو جیسے ہی فروری کا سسپنس بک اسٹال پر دیکھا تو فوراً سے پیشتر میرے قبضہ میں آ گیا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے فہرست کو دیکھا اور اناڑی کی آخری قسط کا پتا چلا۔ ذاکر انکل کا ہنر گھر آ کر دیکھا۔ محفل میں پہنچے جہاں آپ نے ہمیں تسلیمات کہا۔ محفل کے آغاز پر ہم سب کے پیارے دوست محمد جاوید بلوچ صاحب بہت ہی خوبصورت تبصرے کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ بلوچ بھائی بہت مبارک ہو۔ ثاقب بھائی! غصہ تھوک دیں۔ ہمایوں بھائی، ایسی کیا بات ہو گئی کہ اس ٹھٹھرتی سردیوں میں وہ بھی رات کے دو بجے آپ سوچنے لگے، دن کو دماغ کرائے پر دیتے ہیں کیا؟ جواد جی! خوش آمدید۔ نعمان بھائی، کبھی خوشبو لگاتے ہو تو کبھی دل لگاتے ہو اور پھر گلے بھی لگا لیتے ہو، بھائی یہ کیا پولیٹکس ہے؟ ڈاکٹر وسیم بھائی، سعید راج کا بھانڈا تو نہ پھوڑیں۔ رمضان پاشا بھائی، آپ کے تبصروں میں مجھے آپ کی گاڑھی اردو اور الفاظ کا چناؤ بہت ہی اچھا لگتا تھا لیکن کچھ عرصے سے آپ کا ایسا کوئی تبصرہ نہیں پڑھنے کو ملا؟ جعفر حسین بھائی حسینہ کی اتنی فکر نہ کیا کرو، بھابی نے اگر آپ کا تبصرہ پڑھ لیا تو حزن و ملال کی کیفیت آپ کے چہرے پر نمایاں ہو جائے گی۔ خواجہ مدنی آپ کا تبصرہ آپ کے نام کی طرح پیارا ہے۔ طاہرہ یاسمین، بابا کون سے ملنگ سے جادو کرایا ہے کہ آپ کے تبصرے جو ایویں ہی ہوتے ہیں دھڑا دھڑ چھپ رہے ہیں۔ سردار ظفر بھائی آدمی کو اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہیے۔ سعدیہ بخاری بابا نیازی بھائی نے آپ کے راز پر سے پردہ اٹھایا تو آپ کی چیخ ایسے نکلی جیسے بلی کے پونچھ پر کسی کی لات آ گئی ہو۔ ابرار وارث تفصیلی تبصرہ کے ساتھ آئیں پلیز۔ انجم رشید بابا ہم کو آپ کے چچا کے انتقال پر افسوس ہوا۔ اللہ سائیں ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین) شارقہ سلجوق بابا سعدیہ کی عمر کو آپ ڈیفینڈ نہ کریں، اگر ہم نے آپ کی عمر سے بھی پردہ اٹھا دیا تو آپ کے لیے گڑبڑ ہو جائے گی، البتہ آپ کا تبصرہ بہترین تھا۔ ماہا ایمان اینڈ کمپنی روپوش ہو چکی ہیں۔ لگتا ہے کہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کروانا پڑے گی۔ کہانیوں کا آغاز اناڑی کی آخری قسط سے کیا۔ رابعہ کی بڑی فکر تھی کہ آخر میں اس کا کیا ہوگا لیکن اس کی قربانی نے دل میں جگہ بنا لی۔ اب فیکے اور راجا نے شادی کر لی تو اپنے آپ ہی سدھر جائیں گے۔ نہایت ہی اطمینان بخش اختتام ہوا۔ دوسرا سلسلہ کشکول بھی بڑی تیز ہو گئی ہے۔ ڈی ایس پی لودھی ایک نیا مچھ شیخ حامد کول گیا، سراج کو صبا بیگم کی آخری فون کال کی خبر بھی اس چمچہ کو ہے اب پتا نہیں شیخ صاحب اور سراج میں کیا دنگل ہوگا۔ اس کے علاوہ لیاقت کا ایک اور کارنامہ پڑھنے کو ملا۔ ویل ڈن انوار صدیقی۔ آخری صفحات پر عائشہ فاطمہ کی زبردست کہانی شکست پندار نے دل موہ لیا۔ ماسٹر فیض محمد جیسے پڑھے لکھے سے یہ امید نہیں تھی کہ اپنی بیٹی کو روزانہ حویلی بھیجے، خیر کہانی اچھی تھی، بہت پسند آئی۔ ملک صفدر حیات کی زخم جفا میں ملک صاحب کے ساتھ تفتیش کے مزے لیے اور مجرم تک پہنچ گئے۔ دورانِ مطالعہ ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ قتل کی سازش نور جہاں نے بنائی تھی۔ البتہ ملک صاحب کے اصولوں سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ یقینی طور پر اس نے نور جہاں کے خلاف قانونی کارروائی کی ہوگی۔ ڈاکٹر عبدالرب کی صد چاک سبق آموز کہانی تھی، جو اندرونِ سندھ میں روزانہ وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔ بھٹی صاحب نے کہانی کے آخر تک تمام کرداروں کو قتل کروا دیا۔ حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ کیا۔ ش صغیر ادیب کی بند دروازے میں شاکرہ کو شکو اور پھر شائستہ بیگم بنتے دیکھا۔ اچھی کہانی تھی۔ رضوانہ منظر کی قیمت میں جوزف کے ایمانداری کی قیمت کا پتا لگایا۔ محفل شعر و سخن میں اچھے اشعار پڑھنے کو ملے۔'' (شکریہ جناب)

✠ **محمد نعمان پیارے**، ایس اے کنگ، تلمبہ سے تشریف لائے ہیں ''اپنے سوہنے یار کا دیدار 16 جنوری کو ہوا۔ آہو جی! حسب عادت، حسبِ روایت سب سے پہلے حسینہ پر تاک جھانک فرمائی جو کہ پردے کے پیچھے سے دوسری جانب تکنے میں محو تھی۔ لو جی! اچھے اچھے ینگ بوائز

www.Paksociety.com

اور پیاری پیاری چڑیلوں سے درخواست ہے کہ ہولے ہولے سے آگے کی جانب سرک جائیں تا کہ محفل میں تھوڑی سی جگہ ہماری بھی بن جائے۔ جاوید بلوچ صاحب! شانِ بے نیازی سے کرسی صدارت کے مہااستھان پر بیٹھے پھولے نہ سما رہے تھے۔ سسٹر طاہرہ یاسمین! آپ کی والدہ کی صحت یابی کے لیے تہِ دل سے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت یابی فرمائے۔ سعدیہ بخاری اگر 25، 30 برس نہیں تو کتنے برسوں بعد خط لکھا ہے؟ ابرار وارث! آپ نے چپ توڑنے کا مصمم ارادہ کر کے بہت اچھا کیا ہے، اس لیے موسٹ ویلکم! گلے لگا کے۔ انجم رشید صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کے مرحوم چچا کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ شارجہ سلجوق! اس ملک میں سب کچھ دھڑلے سے چل رہا ہے۔ کہیں ایوانِ صدر کے کچن پر 26 کروڑ روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں تو کبھی وزیرِاعظم اپنے ساتھ 100 گاڑیوں کا قافلہ لے کر چلتے ہیں۔ کون روکے، کون ٹوکے؟ تنویر ریاض کی تجدید تعلق بہ ظاہر سادہ مگر اندرونی طور پر الجھی ہوئی تحریر تھی، مائیک نے اپنے کیے کی سزا بھگتی اور جیل اس کا مقدر ٹھہری۔ کاشف زبیر صاحب کی سادہ لوح ایک خوبصورت پلاٹ پر لکھی گئی عمدہ کہانی تھی۔ کیتو واقعی سادہ لوح تھا۔ منظر امام کی عاقبت نااندیش مکمل طور پر سبق آموز داستان تھی، انسان نہ جانے کیا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ اس زندگی کی فکر میں لگا ہوا ہے جو ایک دن ختم ہونے والی ہے۔ منظر امام صاحب ہمیشہ سے ہی ایسی کہانیاں لکھتے ہیں جن میں سبق کا عنصر نمایاں ہوتا ہے جو کہ بہت اچھی اور مثبت بات ہے۔ سیدہ عابدہ نرجس کی سیر کو سوا سیر بالکل اپنے نام کی طرح تھی یعنی چور جس شخص پر طبع آزمائی کر رہا تھا حقیقت میں وہی گھر کا مالک تھا۔ جی واہ۔ ملک صفدر حیات کی زخم جفا اپنوں کے ستم اور حاسدانہ کارروائیوں پر مشتمل ایک عبرت انگیز سچائی تھی، ملک صاحب اپنی دماغی صلاحیتوں کی وجہ سے بہرحال کیسو سے سب کچھ اگلوانے میں کامیاب رہے۔ بابر نعیم کی مات حسینہ کی عیاریوں پر مشتمل ایک زبردست کاوش تھی جس میں حسینہ دو پیاروں کو شکست دینے میں کامیاب رہی۔ دماغ لگا کے۔ لاکھوں دلوں پر راج کرنے والی اسٹوری اناڑی کا ہیپی اینڈ ہو گیا۔ نور اور فیکے پتر، شہناز اور راجا شادی کے پوتر بندھن میں بندھ گئے۔ اناڑی ایک لازوال داستان تھی۔ یہ داستان اپنی تیز رفتاری، ایکشن، سسپنس، مزاح کاری اور مصنف صاحب کی مکمل گرفت کے باعث مدتوں یاد رکھی جائے گی۔ بالکل جی! اگر زندگی نے وفا کی تو یکم فروری کو اپنی زندگی کا بیسواں جنم دن مناؤں گا۔'' (مبارکاں)

✠ **تصویر العین**، اوکاڑہ سے ہماری محفل میں تشریف لائی ہیں ''جب اپنے دوستوں کے تبصروں میں پڑھا کہ سسپنس کی محفل میں زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کو شرکت کرنی چاہیے تو سوچا کہ یہاں بھی ضرور طبع آزمائی کی جائے۔ لہٰذا اب ہم آپ کے دولت کدے پر حاضر ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اندر آنے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ (خوش آمدید۔ آپ کے بنائے ہوئے خیالی خاکے بھی پسند آئے۔ آپ کی ڈرائنگ ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ اگر آپ علیحدہ سے خاکے بنا کر بھیجیں تو انہیں شائع کیا جا سکتا ہے تاہم اس کے لیے پہلے شائع شدہ خاکوں کو بغور دیکھ لیں تا کہ موضوع کے انتخاب میں آسانی ہو اور خاکے قابلِ اشاعت ہو سکیں) ٹائٹل پر مجھے دوشیزہ کی آنکھیں اور بال بہت پسند آئے۔ سب سے پہلے نمبر پر خط محمد جاوید بلوچ کا تھا۔ ویسے ہمیشہ سرگزشت یا سسپنس میں گنے چنے لوگوں کا خط ہی نمبروں پر کیوں آتا ہے۔ جاوید صاحب مبارک باد۔ راجا ثاقب تو از ثاقب، دمبر نہیں بھٹنا یہ آپ کے دماغ کا خلل ہے۔ ہمایوں سعید راج، آپ کی دل کی دنیا میں کس نے انٹری ماری ہے۔ کہیں منگنی شنگنی تو نہیں کر لی؟ اور جو آپ نے نفسیاتی مسئلہ اپنے بارے میں بتایا ہے۔ لگتا ہے کہ آپ سائیکو پرابلم ہیں یہ تو ہمیں پہلے ہی پتا تھا۔ محمد جواد بن اشرف آپ جیسی ڈراؤنی شکلیں جب موجود ہوں گی تو صنف نازک تو ڈرے ہی گی نا۔ محمد نعمان پیارے آپ لوگوں کو کس نے کہا کہ ہمایوں سعید راج سدھر گئے، یہ اس سال کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ ڈاکٹر وسیم خالد میرے بھائی گجرات میں تین سال جاب کرتے رہے ہیں ان کی اب کھاریاں سے پوسٹنگ چکوال ہو گئی ہے اب وہ پچھلے تین ماہ سے چکوال میں ہیں۔ رمضان پاشا ''عورتانہ'' کہانی سے آپ کی کیا مراد تھی۔ کہیں آپ کے اندر تو ایک عورت نہیں چھپی ہوئی۔ طاہرہ یاسمین، آپ کی رفتار تو بہت سلو ہے آپ تو پیچھے رہ جائیں گی۔ انجم رشید آپ کے چچا کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ اور ان کی فیملی کو صبرِ جمیل عطا فرمائے (آمین) شارقہ سلجوق، عورتیں مردوں کو اپنی مت مارنے کیوں دیتی ہیں۔ ڈراموں، کہانیوں میں ہمیشہ عورتوں کو ہی کیوں سازش کرتے دکھایا جاتا ہے۔ میں نے آپ کی خواہش پر ہی سسپنس میں لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ سوچا میری سسٹر نے اتنے پیار سے سفارش کی ہے کیسے ٹالوں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کشور کشا اچھی کہانی تھی۔ بابر کی زندگی کی مجھے یہ بات اچھی لگتی ہے کہ اس نے اپنی اولاد کے لیے اپنی جان دے دی۔ تجدید تعلق میں تنویر ریاض نے بہت اچھے طریقے سے ایک عورت کے ہاتھوں مائیک کو بے وقوف بنایا۔ کاشف زبیر کی سادہ لوح بھی اچھی کہانی تھی۔ شاید کیتو کی سادہ لوحی کی وجہ سے ہی قدرت اسے چارلس کے حملوں سے بچاتی اور دشمن اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ کشکول میں مجھے لیاقت حسین، سراج اور میڈم روبی کا کردار پسند ہے۔ یہ کہانی اچھی جا رہی ہے۔ ش صغیر ادیب کی بند دروازے بھی اچھی کہانی تھی البتہ اگر بانکے کا انجام کچھ برا ہوتا تو مزہ آ جاتا۔ صد چاک میں اول کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ [illegible] اس کے باپ فیض محمد کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی تو اسی کو ساری [illegible] شعر و سخن کی محفل میں سعدیہ بخاری، عبداللہ اور [illegible] کے انتخاب پسند آئے۔ کترنیں میں، شیث بن سجاد، ذیشان مہناس اور حمدان [illegible] اگلے ماہ بھی آؤں گی۔'' (جم جم آئیں جی......)

✠ **محمد جاوید بلوچ**، ضلع مظفر گڑھ سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اس بار ٹائٹل یکسانیت کا شکار نہیں لگا۔ نقش و نگار سے مزین خوبصورت پردے کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی حسن اور حیا کی دیوی سامان قتل سے لدی پھدی، کندن رنگ زن جھمکے سمیت آنکھوں کے راستے دل میں سما گئی۔ کشکول اور اناڑی کا مطالعہ حالتِ سفر میں ہی کر ڈالا۔ فیورٹ سسپنس ڈائجسٹ گاڑی میں اغوا ہونے سے بال بال بچا۔ اس ماہ کشکول میں ایکشن کے اور مشن کے تمام سین پسِ پردہ صفحات کیے گئے جس کی وجہ سے اسٹوری ڈراما قسم کی محسوس ہوئی۔ یہ ایکشن ہی تو ہوتے ہیں جو ہر اسٹوری میں جان ڈالتے ہیں۔ حقائق کی

بہترین عکاسی کرتی ہوئی اناڑی کے پہلے چند صفحات نے آنکھوں کو خوب پرنم کیا بدنصیب رابعہ کی محبت بھی حیران کر گئی۔ راجا اور ٹیکے پتر کی یادگار دوستی ہمیشہ یاد رہے گی۔ برسوں سے اناڑی کا ساتھ چھوٹ جانے کے بعد دل نے کتنا درد محسوس کیا یہ تو صرف دل ہی جانتا ہے۔ الوداع اناڑی کے تمام کردار۔ والوداع اے ست بدھائی کے مکینو۔ مختلف انداز سے شروع ہونے والی سوتن کہانی زخم جفا چودھری ارشاد دولت مند ہونے کے باوجود تہی دست لگا۔ نور جہاں کے جلاپے نے ہنستے مسکراتے گھر کو تباہ و برباد کر دیا۔ جس طرح چودھری ارشاد نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کم ظرف قاتلہ بیوی کو لائق درگزر جانا اسی طرح حیوان اور اللہ دتہ بھی قابل معافی تھے۔ کاشف زبیر کی تحریر نے نئے رنگ، ایک نئے موضوع اور ایک نئے احساس سے دوچار کیا۔ ترقی یافتہ انسان مہذب ہونے کا دعویدار ہونے کے باوجود کتنا غیر مہذب ہے، سادہ لوح تحریر کو پڑھ کر خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔ منظر امام کی اکثر تحریریں ملکی مسائل کا احاطہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ عاقبت نااندیش میں انہوں نے چند بڑے ملکی مسائل کا ذکر مختصر تحریر میں بیان کر کے گویا دریا کوزے میں بند کر دیا۔ صد چاک میں مطمئن تھے، دشمن کے دل میں قدرت نے رحم اور محبت کا جذبہ پیدا کر کے نصیبوں جلی کومل کا سرپرست اور سائباں بنا دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب، اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ میں غریب انسانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو جس طرح آپ نے تحریر کی صورت میں سسپنس ڈائجسٹ کے توسط سے پورے پاکستان میں ہر پاکستانی تک صاف و شفاف انداز میں پہنچایا، وہ سراہے جانے کے قابل ہے۔ مختلف موضوع پر سیدہ عابدہ نرجس کی تحریر سیر کو سوا سیر کے انجام نے میرے ساتھ ساتھ دیگر قارئین کو بھی حیران کر دیا ہوگا۔ امید واثق رکھتا ہوں آئندہ بھی محترمہ سیر کو سوا سیر جیسی زبردست تحریر لکھیں گی۔ تو آموز خوبصورت نام کی ملکہ محترمہ عائشہ فاطمہ کی جیدہ تحریر شکست پندار غربت کی لکیر کے نیچے زندگی کی گاڑی گھسیٹنے والے ایک تہم رسیدہ خاندان کی داستان ورد آمیز رنگ تو بھا اور تجسس سے پڑھی، پوری اسٹوری کی جان اور محور کہانی کا پہلا جملہ تھا۔ بہترین کہانی لکھنے اور انعام کی حق دار کہانی منتخب ہونے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ تک ویلوٹ کی لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی ہوئی شاہکار چوری چوہے کی چوری میں تنک نے چوہا چوری کے ساتھ ساتھ کیرول کی زندگی بچا کر ڈبل کارنامہ انجام دیا۔ تنویر ریاض کی تجدید تعلق میں غیر تربیت یافتہ خاتون سے اس قسم کی ماہرانہ ودلیرانہ سرگرمی کی توقع ہرگز نہیں رکھی جا سکتی کجا یہ کہ مائیک جیسے پرانے گھاگ کھلاڑی کو معمولی سی تن تنہا عورت کا شکست دینا سمجھ سے باہر ہے۔ یہ مرد ہی ہے جو عورت کا ہاتھ پکڑ کر چاہے تو بانکے کی طرح ذلت کی پستیوں غربت کی پستیوں میں دھکیل دے اور اگر راج کی طرح چاہے تو عزت دے کر انمول ہیرا بنا دیتا ہے، ویل ڈن راج مجھے تم سے ایسی ہی توقع تھی۔ ش صغیر ادیب کی حساس کہانی بند دروازے کا انجام خوشگوار رہا۔ آئمہ نجم، ذوالقرنین احمد علی، شعیل متین، عدنان صدیقی، سائرہ اینڈ عاصمہ کے شاعری تحفے بہت پسند آئے۔ جنگجو اور اپنے فیصلوں پر ڈٹ جانے والے بادشاہ ظہیر الدین بابر کی تاریخ اس کے جانشینوں کے لیے رہنما اور مثالی تھی۔ ظہیر الدین بابر کا اپنے بیٹے کی جان لیوا بیماری کو اپنے سر لینے کا واقعہ حیران کن اور پدری محبت سے بھرپور لگا۔ حضرت عزیر علیہ السلام کی داستان مبارک پڑھنے سے کئی پرانی یادداشتیں تازہ ہو گئیں۔ رضوانہ منظر کی قیمت کی نسبت بابر نعیم کی مات اور ثمر عباس کی نایاب تحفہ زیادہ اچھی لگیں۔ پہلی نشست پر خود کو براجمان دیکھ کر خود کو شاباش دینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ مابدولت کے بعد وزیر باتدبیر اینڈ اولڈ از گولڈ راجا ثاقب سنجیدہ تبصرے کے ساتھ محفل میں حاضر تھے راجا بابو عزت افزائی کا شکریہ۔ ہمایوں سعید راج بھائی بہترین انسان بہتر عمل سے پہچانا جاتا ہے ورنہ اچھی باتیں تو برے لوگ بھی کر لیتے ہیں، میری نصیحت آپ کو تب بری لگتی جب بے جا ہوتی اس بار آپ نے کچھ چھوڑنے سے گریز کیا۔ یہی بات آپ کے تبصرے میں نمایاں تھی۔ محمد جواد بن اشرف صنف جلا پا ادھر گئی ہیں جدھر باقی حشرات الارض جاتے ہیں اور جن ہستیوں کی کمی کا رونا آپ رو رہے ہیں وہ کمی تو میں پوری نہیں کر سکتا اگر کیلشیم اور وٹامن کی کمی مسئلہ ہوتا تو اس کا حل بدرجہ اتم میرے پاس موجود تھا۔ محمد لقمان پیارے خوشبو اور دل لگانے کے بعد اگلا تبصرہ ایلفی لگا کے بھیجیے گا۔ ڈاکٹر وسیم خالد کا سردار ظفر اقبال کو جواب بہت اچھا لگا۔ رمضان پاشا آپ کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ جعفر حسین عقل تو ملکہ بلقیس کا پلک جھپکنے سے پہلے تخت کو ہزاروں میل دور سے حاضر کیے جانے کو بھی نہیں مانتی۔ لافانی روحانیت کی طرح فانی جادو کی بھی ایک حقیقت ہے۔ دنیا ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہمایوں سعید جیلس ہونے کی مثال آپ دے چکے ہیں۔ آغا فرید یہ یاد ہی تو ہے جو ایک دوسرے کے پاس نہ ہونے کے باوجود پاس ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ تبصرہ اول نمبر آنے کی اطلاع اور خوبصورت الفاظ میں یاد کرنے کے لیے شکریہ۔ طاہرہ یاسمین آپ کا تبصرہ دیگر خواتین کی نسبت مجھے بہت بھاتا ہے۔ یہ آپ کی نفیس اور شائستہ طبیعت کا جادو ہے۔ سردار ظفر اقبال ایک بلاوا آواز میرے قریبی شہر کے باسی چودھری سرفراز فرام جتوئی اور رضوان تنولی کو بھی دے دیجیے۔ سعدیہ بخاری آپ کو کیوں کھٹے ڈکار آ رہے ہیں؟ اپنی نصیحت آئینے پر لکھ کر روزانہ سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد دیکھ لیا کریں تو ایسے سن رسیدہ جڑواں آپ کی صنف عقل کند میں زیادہ نظر آئیں گے۔ ابرار وارث اچھا کیا جو آپ نے خاموشی کا بم توڑ پھوڑ دیا۔ کشکول نہ پڑھنے کی وجہ، وجہ کم اور جوک زیادہ لگی۔ غلام یاسین تونار، اناڑی بہترین یادگار اسٹوری تھی اس کی رخصتی تو ہونی چاہیے تھی مگر خوشی کا اظہار بالکل نہیں۔ انجم رشید مجھے خوشی ہے کہ اپنی اچھی روایتوں کا امین ہوں۔ کہانیوں میں روایتی پن آپ کو ہر ماہ آخری صفحات پر ملتا رہا ہے اور ملتا رہے گا۔ ایسی اسٹوریز کا لکھنا ناگزیر ہے۔ شارقہ سلجوق کتنے خوبصورت الفاظ میں، میں نے آپ کی صنف کی شرکت کو لازمی بنانے کی زوردار اپیل کی ہے جبکہ آپ کے خط میں بے چارگی اور جلاپے کا عنصر نمایاں تھا۔"

✠ **ابرار وارث**، ورآباد سندیلیانوالی سے تشریف لائے ہیں "اس دفعہ کا شمارہ ہمیں 17 کو ہی مل گیا تھا لیکن جلدی نہ پڑھ سکے کیونکہ 17 کو میری امی کی تائی فوت ہو گئی تھیں اس کے دوسرے ہی دن میرے ابو کا چاچا اللہ کو پیارا ہو گیا جبکہ صرف ایک دن کے وقفے کے بعد میری نانی جو مجھے سب سے زیادہ پیاری تھی۔ 20 تاریخ کو ان کا انتقال حرکت قلب بند ہونے سے ہو گیا۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ ہمارے ان پیاروں کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے گا۔ (اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر عطا کرے۔ آمین) آج یعنی 21 کی شام کو گھر واپس آیا ہوں اور اپنا پیارا ساتھی سسپنس اٹھایا جہاں پر پہلی دفعہ سرورق کی دوشیزہ مجھے بے حد پسند آئی۔ آپ کا بھی شکریہ کہ مجھے محفل میں شریک کیا۔ (خوش رہیے) آغاز انشائیہ سے کیا لیکن اپنی

www.Paksociety.com

کم علمی کی وجہ سے جون ایلیا کا انداز سمجھ میں بالکل نہ آیا۔ خطوط میں پہنچا جہاں محمد جاوید بلوچ کرسی صدارت پر بڑی شان سے پرحکمت تھے میری طرف سے مبارکباد قبول ہو۔ ان کی معلومات پر میں خود حیران رہ گیا کہ کہاں 200 آؤٹ لسٹ اور 64 ان لسٹ اور کہاں یہ 16، 17 ان لسٹ اور 5، 6 آؤٹ لسٹ۔ راجا ثاقب نواز بھٹکے نظر آئے پتا نہیں کیوں۔ ہمایوں سعید سے گزارش ہے کہ وہ جو سوچتے کی بھی کبھی کوشش کرتے ہیں وہ بھی نہ کریں تو بہتر ہے۔ محمد جواد بن اشرف میری طرح پہلی بار تشریف لائے اور انہیں ویلکم کہا گیا جبکہ ہمیں تو کسی نے ویلکم بھی نہیں کیا (ویلکم نہ کیا ہوتا تو خط کیسے شائع ہوتا) جواد صاحب قسمت والے ہو! نعمان پیارے میں بھی آپ کا سایہ ہوں اور آپ نے ہمایوں سعید کی عمر کا یہ صحیح تجزیہ کیا ہے کیا؟ جعفر حسین کا تبصرہ پسند آیا۔ آغا فرید احمد خان لو جی آپ کو اناڑی پر اعتراض تھا تو وہ تو اپنا ہیپی اینڈ کر گئی مبارک ہو۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ آئندہ خط نہ لکھنے والی بات کا بھلا کیا تک، کوشش تو کرتے رہنا چاہیے۔ سعدیہ بخاری صاحبہ لگتا ہے آپ پی ٹی وی کے ڈرامے شوق سے دیکھتی ہیں۔ انجم رشید آپ کے چچا کو اللہ جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کو صبر عطا کرے۔ یہ کیا شارقہ سلجوق صاحبہ نے تو حد ہی مکا دی مجھے تو اس کے سارے خط میں صرف ایک ہی بات نظر آئی کہ شاید موصوفہ کو مرد ذات سے حد سے بھی زیادہ نفرت ہے۔ پورے خط میں انہوں نے مردوں کو نشانہ بنایا حیرت ہے۔ شارقہ جی ہتھ ہولا رکھیں۔ سب سے پہلے اناڑی پڑھی اس کی آخری قسط تھی جہاں ٹیکے اور راجا نے تو ہمیں رلا دیا کیسے بچے لگ رہے تھے۔ ذرا سی بات پر اتنا ایبنارمل ہو گئے۔ یہی بات۔ یہ تھوڑے سے ٹائم میں ٹیکے کو بہت کچھ کھونا پڑ رہا تھا، پر بچ گیا۔ اناڑی کا ہیپی اینڈ ہوا شکر ہے کہ نور صاحبہ بازیاب ہو گئیں اور شادی کے بندھن میں بندھ بھی گئیں۔ پہلی بار بہت کم مار دھاڑ اور ایکشن کے یہ قسط شاندار رہی مدتوں یاد رہے گی۔ اس کے بعد آخری صفحات والی شکست پندار پڑھی جس نے اناڑی کا مزہ بھی کرکرا کر دیا۔ کسی بھی حوالے سے یہ انعام یافتہ کیسے بن گئی (یہ کہانی نئے مصنفین کے مقابلے میں انعام یافتہ قرار پائی تھی) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی صد چاک بے حد پسند آئی۔ ایسی ہی کہانیاں سسپنس کی جان ہیں۔ شکر ہے کہیں تو مومل کو پناہ ملی۔ نجمہ مودی نے تو اس دفعہ شاید چوریوں کے ٹھیکے لیے ہوئے ہیں، جاسوسی میں برف کی چوری اور یہاں چوہے کی چوری، مات میں کوئی نے دو کو ٹھکانے لگایا اور کسی تیسرے کے لیے نکل پڑی۔ اشعار میں آئمہ نجم کا، عمران ارشاد کا، شیث سجاد، شوکت علی اور عمران کھتری کے اشعار پسند آئے۔ نایاب تحفہ اچھی کہانی تھی اور میری نے بالکل ٹھیک کیا۔ کاشف زبیر ہمیشہ کی طرح اپنی کہانی کو کامیاب تاثر دینے میں کامیاب رہے۔ سادہ لوح میں کینتو حد سے زیادہ سادہ تھا مرتے دم تک اسے یقین نہ آیا کہ چارلس اس کا دوست نہیں دشمن ہے۔ سیر کو سوا سیر میں تو چور نے الٹا مالک مکان کو ٹھگی کا ناچ نچا دیا۔ ویلڈن عابدہ نرجس جی۔ ملک صفدر حیات انوکھا کیس لائے لیکن صرف سسپنس ہی چھایا رہا پوری کہانی میں، حالانکہ نور جہاں کا سوکھا پن مجھے تو شروع سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ ہی اصل قاتل نکلیں گی اور یہی ہوا۔"

✠ **عمران علی**، ضلع جھنگ سے ہماری پیاری محفل کی زینت بنے ہیں "زندگی میں پہلی بار کسی رسالے میں خط لکھ رہا ہوں۔ پتا نہیں ہماری قسمت، خط شائع ہوتا ہے کہ نہیں یا بلیک لسٹ پادری کی ٹوکری میں۔ (خوش آمدید) ہم 40 سال کی خاموشی کو توڑ رہے ہیں۔ بھئی ہم تو ابھی 25 کے ہوئے ہیں لیکن ہم سے پہلے ہمارے دادا مرحوم سسپنس اور جاسوسی کے قاری تھے۔ اس ماہ کا رسالہ 17 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل گرل پر نظر پڑتے ہی ایسا لگا جیسے کسی کے انتظار میں پردے کے پیچھے کھڑی ہوں۔ واہ انکل ذاکر۔ جون ایلیا کے انشائیہ میں تاریخ کے ورق نمایاں تھے واہ رے مسلمان۔ خیالات کی محفل میں محمد جاوید بلوچ کو کرسی صدارت پر پایا، مبارک ہو جناب۔ راجا ثاقب صاحب وزیر اعظم کی کرسی پر براجمان تھے۔ محمد جواد اشرف قسمت والے ہیں جو پہلی دفعہ ہی میں شامل ہو گئے ورنہ ردی کی ٹوکری۔ ڈاکٹر وسیم خالد صاحب بڑے رشتے گانٹھ رہے ہیں۔ واہ رمضان پاشا یہ عورتانہ کہانی کیا ہوتا ہے۔ طاہرہ جی شکر ادا کرو خط شائع ہو گیا ورنہ سوکھا سسپنس ہی پڑھتی رہتیں لگتا ہے اب ہواؤں میں اڑ رہی ہوں گی۔ ماہا کی ویسے بہت کمی محسوس ہو رہی ہے۔ انجم رشید بہت افسوس ہوا آپ کے چچا کے انتقال کی خبر پڑھ کر۔ شارقہ سلجوق کا خط کرسی صدارت پر ہونا چاہیے تھا تاکہ سب کو اس کی گرمی محسوس ہوتی (سردی بہت ہے نا) سب سے پہلے کہانی کشکول پڑھی جو واپسی کی کمی کو بڑی حد تک پورا کر رہی ہے۔ واپسی اور کشکول دونوں حالات حاضرہ کو اجاگر کرنے والی کہانیاں ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی کشور کشا ماضی کے رنگ بکھیرے ہوئے تھی۔ تجدید تعلق تنویر ریاض کی اچھی کہانی تھی۔ ایسے لوگ جو تبدیلی نہیں لاتے وہ ہمیشہ کسی المیے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ منظر امام کی عاقبت نااندیش میں انسان کی کوتاہیوں اور نافرمانی، لالچ کی واضح کہانی ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی زخم جفا بڑی دلچسپ اور سبق آموز کہانی تھی۔ نجمہ مودی کی کہانی چوہے کی چوری میں بڑا داؤ کھیلنے کی کوشش کی پر چور ہیرو نکلا۔ سوانح انبیا بڑی زبردست اسلامی معلومات ہے۔ سوانح اولیا کرام بھی شروع کی جائے۔ عائشہ فاطمہ کی کہانی شکست پندار واقعی ہی انعام یافتہ کہانی ثابت ہوئی ہے۔ کہانی پڑھ کر ایسا معلوم ہوا کہ یہ ایک حقیقت ہے جس سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ محفل شعر و سخن میں آئمہ نجم، مسز ضیا القمر، طاہرہ یاسمین، محمد اشفاق اور سدرہ منیر کے شعر پسند آئے۔ طاہر جاوید مغل صاحب سے گزارش ہے کہ ایک بار شہر محبت کی طرح پھر جلوہ افروز ہوں۔"

✠ **طاہرہ یاسمین**، ضلع سرگودھا سے تبصرہ فرما رہی ہیں "یہ ماہ تو میرے لیے پریشانیوں سے بھرپور تھا۔ امی جان بہت بیمار تھیں، صبح و شام روتے اور دعائیں مانگتے گزر جاتے تھے۔ اب خدا کے کرم سے ان کو کچھ آرام ہے (اللہ انہیں جلد مکمل صحت عطا کرے۔ آمین) اس ماہ کا شمارہ تین دن لیٹ ملا۔ 19 ... کی صبح 9 بجے سب سے پہلے ٹائٹل گرل کو دیکھا، کچھ ویرانی سی دکھائی دے رہی تھی، اس کی آنکھوں میں۔ پھر محفل یاراں میں پہنچے صدر کی کرسی پر محمد جاوید بلوچ ... بھائی جان مبارک ہو کرسی کی، آپ نے جس طرح عورت کے شاہکار کی حاضری لازمی قرار دی اچھا لگا، آپ کا یہ انداز۔ محمد جواد اشرف، خوش آمدید محفل میں۔ ہائی اللہ اعتبار کرنا یہ کہتے ہوئے کہ صنف نازک ڈر کی وجہ سے چھپ گئی۔ ڈر صرف اس ذات سے لگتا ہے پروردگار سے بس اگر کسی وجہ سے عورتوں کے خط شائع نہ ہوں تو محفل کے اکثر مرد حضرات جھٹ سے لکھ دیتے ہیں کہ فلاں چڑیل ڈر کے بھاگ گئی، اچھی اچھی باتیں لکھا

کریں جس سے دوسروں کو بھی خوشی ملے مذاق میں بھی کسی کی دل آزاری نہ ہو کوشش کیا کریں (ہم بھی آپ کی اس بات سے مکمل اتفاق کرتے ہیں) رمضان پاشا جی تبصرہ پسند کرنے پر شکریہ۔ جعفر حسین بھٹی ..... آپ نے میرے بارے میں لکھا کہ ہائے یہ سادگی اس پر ہمارا کیا کہنا۔ اس کا کیا مطلب تھا (اف توبہ......) آغا فرید صاحب بھی آخر لائن پر آگئے میرا تبصرہ پسند کرنے کے لیے شکریہ۔ سردار ظفر اقبال وڑائچ آپ کا نام پڑھ کر مجھے اپنے ماموں کی یاد آبدیدہ کر دیتی ہے۔ میرے ماموں کا نام بھی ظفر اقبال تھا۔ 25 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی شکل کرکٹر شاہد خان آفریدی کی کاپی تھی۔ ابرار وارث بھی ایسا کیا جادو ہے آپ کے پاس کہ آپ نے ایک ہی نشست میں سارا پڑھ ڈالا رسالہ۔ میں بھی ایک ہی نشست میں سارا رسالہ پڑھنا چاہتی ہوں۔ اس دفعہ سعدیہ بخاری اور نوید نعمان پیارے کا تبصرہ شاندار تھا۔ انجم رشید سسٹر خدا آپ کے چچا کو جنت میں جگہ دے آپ کا خط بھی دل کو بھا گیا۔ ماہا جی آپ اس دفعہ بھی غائب ہو، آئی مس یو۔ مسافر کا انتظار بڑی شدت سے کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں ناصر ملک اس دفعہ کیا شاندار تحریر لکھتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی (زخم جفا)، ملک صفدر حیات تو ہر تحریر ہی دل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ بہت اچھی تحریر تھی۔ کشکول حسبِ معمول شاندار جا رہی ہے پہلی قسط سے لے کر اب تک کشکول پڑھتے ہیں تو وقت کا پتا ہی نہیں چلتا اور جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ مات، قیمت اچھی تھیں۔ صد چاک بھی بہت سبق آموز تحریر تھی اور آخری صفحات پر شکست پندار، عائشہ فاطمہ جی کو بہت مبارک ہو۔ پورے سسپنس کی نمبر ون تحریر لکھنے پر مدتوں یاد رہے گی یہ تحریر، اور جناب ٹیگ، اناڑی ختم ہو ہی گیا آخر 6 سال بعد، پہلی قسط تھی مئی 2006ء میں۔ ہمیں تو لگتا تھا اناڑی لمبی ہی جائے گی جس حساب سے فیکے کے پروجیکٹ تھے مگر آخر کار سیٹ ہی گئی۔ اب مسافر آئے گی تو ہی چین آئے گا۔“

✠ **احمد خان توحیدی**، پاکستان اسٹیل، کراچی سے محفل میں شامل ہوئے ہیں ”ماہ فروری کا شمارہ 19 جنوری کو ملا۔ 40 سال سے اوپر پرانا قاری ہونے کے ساتھ جاسوسی، سرگزشت اور پاکیزہ سے بھی دوستی ہے۔ (پاکیزہ سے آپ کی دوستی پر کچھ ساتھی ضرور حیران ہوں گے تاہم ہمارے بہت سارے دوست پاکیزہ میں خصوصاً سلسلوں کو شوق سے پڑھتے ہیں، خاص طور پر عمیرہ احمد کا نیا ناول عکس جو تجسس سے بھرپور ہے۔ ساتھ ہی دوسری معروف رائٹرز جیسے ناہید سلطانہ اختر جو سسپنس کے لیے بھی لکھتی رہی ہیں، ثمرہ احمد، انجم انصار اور دیگر مصنفات کو بہت پسند کیا جا رہا ہے) سروس ڈیوٹی میں چار شماروں کے مطالعہ کا ٹائم نہیں ملتا، کبھی محفل خطوط میں لکھا تو بھی منظور نظر نہ ہونے کے باعث لفٹ نہ ملی (آپ محفل کے دیگر دوستوں کی طرح ہمیں عزیز ہیں) انشائیہ جون ایلیا کے چند الفاظ گہرا انکشاف ہوتے ہیں۔ خطوط کی محفل، جاوید بلوچ، راجا ثاقب، نعمان پیارے، ڈاکٹر وسیم، خواجہ مدنی، طاہرہ یاسمین، ظفر وڑائچ اچھے تبصرے تھے مگر طویل ہونے پر مجھ جیسے پرانے خاموش قاری کو جگہ نہیں ملتی (خاموش قاری کو جگہ اس وقت ملے گی تا جب وہ بولے گا۔ ساتھیوں کو تو ہم سے پھر بھی شکایت ہے کہ ہم کاٹ چھانٹ بہت کرتے ہیں اور آپ کو وہ تبصرے بھی طویل محسوس ہو رہے ہیں) ساجد امجد کی کشور کشا، تاریخی معلوماتی تحریر ہے۔ تجدید تعلق، تنویر ریاض صاحب پاکستان میں مانیک سے بڑے مگر مجھ بڑی کہانیوں والے موجود ہیں۔ کاشف زبیر، سادہ لوح اچھی معلوماتی کہانی تھی پاکستان کی اردو کہانیاں لکھا کریں۔ کشکول کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ اناڑی کا خاتمہ دو جوڑوں کی شادیاں خوشگوار رہا۔ اب ناصر ملک کی مسافر کے منتظر ہیں۔ عاقبت نااندیش، واہ منظر امام آپ کی ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک، ذہنی تھکن دور کر کے ذہنی تفریح ہوتی ہے۔ سیدہ عابدہ نرجس، سیر کو سوا سیر بہت خوب قریشی کی تھانیداری کھڑکی سے ہوا ہو گئی۔ زخم جفا چودھری ارشاد جیسے عظیم انسان کو نور جہاں جیسی ناگن نے ڈس لیا۔ قلبی دکھ ہوا۔ ملک صفدر حیات نے قانون کے احترام میں یقیناً پابند سلاسل کیا ہو گا۔ مات، چوہے کی چوری پسند نہ آئی۔ نایاب تحفہ، ثمر عباس۔ مورگن کا اقدام درست تھا رقم بھی ضرورت مند کو دی۔ رضوانہ منظر کی قیمت نے متاثر نہ کیا۔ منظر امام صاحب کی طرح لکھا کریں اردو میں۔ بند دروازے، بانکے جیسا بے ضمیر نکھٹو، شکو غالباً راج کے ساتھ گئی۔ نیک نیتی و پاکیزہ خیالات سے شائستہ بیگم جیسی عظیم خاتون بن گئیں۔ صد چاک، جاگیردار وڈیرے عیاش طبقہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کاروکاری جیسی غلیظ رسم کا نام دیتا ہے۔ شکست پندار، عائشہ فاطمہ، واقعی انعام یافتہ کہانی ہے۔ چودھری ارشاد جیسے فرعون صفت کو جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ انجام تو عبرت سے بھرپور ہے۔ جاوید کی پُرخلوص پاکیزہ خیال سادگی سے اس کی محبت نوراں مل گئی۔“

✠ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں چلی آ رہی ہیں ”انکل میں سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کی کلاس 5th سے قاری ہوں مگر اس لیے نہیں بتاتی کہ پھر میرا سوہنا بھائی بابر عباس خفا ہو جائے گا کیونکہ پھر وہ خود کو بوڑھا نہ سمجھنے لگے۔ اب یہ لوگ ان کو چاچا کہہ کر تنگ کرتے ہیں۔ ایک میرا نازک مزاج بھائی آغا فرید احمد خان آف سکھر، بھائی میرے زیادہ غصہ نہ کیا کریں۔ ورنہ جلد بوڑھے ہو جاؤ گے۔ اب میرا شاعر اور شرارتی بھائی تفسیر عباس بھائی، جس نے میری شکایت جاسوسی کے ذریعے ادارے کو پہنچائی۔ شکریہ بھائی، ایک میرا چھوٹا بھائی عمیر وہ آج کل محفل سے غائب ہے۔ واپس آجاؤ۔ انکل کچھ نہیں کہیں گے اور دوست Wel Come کریں گے۔ نجم اور عرفان آف کوئٹہ تم لوگ بھی کبھی خط لکھا کرو۔ محمد جاوید بلوچ آف علی پور آپ بھی بہت اچھا لکھتے ہو۔ پھر آج کل کیوں لکھنا چھوڑا ہوا ہے۔ قدرت اللہ نیازی بھی بہت اچھا لکھتا ہے۔ انور سعد آپ بھی کدھر غائب ہو اور ایک ہمارے دوست ہمایوں راج صاحب بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ ان کو کوئی مغلانی ملے لیکن اشتہار اس طرح کرتے ہیں کہ بس خدا پوچھے ان سے۔ ماہا ایمان صاحبہ کیوں آپ تفسیر کے ڈر سے غائب ہو گئیں۔ دلنشین اللہ آپ کو صحت عطا کرے آپ جلدی واپس آئیں کیونکہ میں آپ سب کے خطوط پڑھ کے بہت مزہ لیتی ہوں اور آپ ہر بندے کی فطرت کو بھی سمجھنے لگی ہیں۔ سب دوست بہت اچھے ہیں لیکن ان اچھوں کے درمیان ایک بہت ہی بدذوق اور فضول زبان استعمال کرنے والے بھی ہیں۔ سسپنس اور سرگزشت میں شاعری بھی بہت معیاری ہوتی ہے۔ دوستوں کے خطوط اور کہانیوں سے

www.Paksociety.com

میری اردو پڑھنی اور بولنی بہت اچھی ہو رہی ہے۔ کہانیاں ہمارے معاشرے اور کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں۔ جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے۔ لیکن ہم انسانوں کی فطرت کہ ہم ان سے اچھائیاں کم اور برائیاں زیادہ قبول کرتے ہیں۔ یہ ملک ہمارا ہے یہ زمین ہماری ہے۔ دوسروں کو ہم موقعے کیوں دے رہے ہیں کہ وہ ہمارے لڑائی جھگڑے سے فائدہ اٹھائیں اور ہمارے گھر میں داخل ہوں۔ لیکن ہمارے دشمنوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم تکلیف کے وقت سب ایک ہوتے ہیں۔ انکل اگر آپ سب نے Wel Come کیا تو ضرور لکھوں گی۔“ (خوش آمدید)

✠ **حاجی عبدالحکیم**، شاہدرہ ٹاؤن، لاہور سے تبصرہ کر رہے ہیں ”ماہ فروری کے سسپنس کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے ناچیز خیالات کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، سب سے پہلے آپ سے ایک چھوٹا سا شکوہ۔ ماہ نومبر میں، میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مسلسل 25 سال تک جاسوسی اور سسپنس کا خاموش قاری رہا ہوں۔ پھر آپ کو خطوط لکھنے شروع کیے سب سے پہلے خط کو بلیک لسٹ میں جگہ ملی پھر لگاتار تقریباً میرے پانچ خطوط سسپنس میں شائع ہوتے رہے۔ نومبر میں، میں نے آپ کو لکھا کہ میں اب آئندہ خط نہیں لکھوں گا جس کے جواب میں آپ نے دسمبر کے سسپنس میں مجھے لکھا کہ ہم سے ناتا نہ توڑیے اور ہمیں اپنی بزرگانہ شفقت سے نوازتے رہیے۔ سسپنس کے قارئین میں سے خانیوال کے قدرت اللہ نیازی صاحب بنوں سے ہمایوں سعید راج صاحب خانیوال سے ماسٹر ضیاء الرحمن نیازی صاحب نے بھی فرمایا کہ انکل ہمارا دل نہ توڑیے۔ محفل میں اپنی نوازشات سے نوازتے رہیے۔ ان سب کے اصرار پر میں نے دوبارہ ماہ دسمبر میں آپ کو خط بھی لکھا اور اس کے ساتھ ہی اقوال زریں بھی بھیجے تھے۔ لیکن آپ نے میرے اس خط کا جواب نہیں دیا بلکہ بلیک لسٹ میں بھی اپنا نام نہ دیکھ کر دل کو بہت دکھ بھی ہوا اور میں نے پھر دسمبر اور جنوری میں آپ کو خط نہیں لکھا (دسمبر میں آپ کا خط بہت تاخیر سے وصول ہوا تھا جب پرچہ اشاعت کے بعد مارکیٹ میں بھیجا جا رہا تھا) لیکن دسمبر کے سسپنس میں قارئین نے اپنے اپنے خطوط میں میری غیر حاضری کو بہت محسوس کیا (اسے ہی تو اپنا پن کہتے ہیں) سسپنس کے آپ کے خطوط میں شامل تمام قارئین کے خطوط کے مطالعے کے بعد اناڑی اور کشکول کا مطالعہ کیا۔ اناڑی کے بہت ہی خوبصورت انجام پر مصنف کو بہت بہت مبارکباد ہو۔ میری طرف سے آپ کو آپ کے تمام اسٹاف اور قارئین کو نئے سال کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔“ (آپ کے شکوہ نامے کا بھی شکریہ)

✠ **شہزادہ ٹیڈو**، ضلع سرگودھا سے تبصرہ کرتے ہیں ”صورتِ حال یہ ہے کہ میں محفل میں ایک سال کے بعد آج دوسری بار شرکت کر رہا ہوں (خوش آمدید) پہلی دفعہ اپریل 2011ء میں پہلا خط لکھا تھا مجھے محفل میں آپ سمیت سب نے خوش آمدید کہا تھا مگر پھر میں اس کے بعد نہ لکھ سکا۔ مصروفیت کی وجہ سے۔ آپ سب کے پیار سے آج دوسری بار لکھنے پر مجبور ہو گیا (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے) واقعی سب تھکن دور ہو جاتی ہے رسالہ پڑھ کر۔ میں طاہرہ یاسمین کا چھوٹا بھائی ہوں نام تو میرا عرفان شہزاد چودھری ہے پر باجی طاہرہ نے میرا نام ٹیڈو رکھا ہوا ہے۔ ٹیڈو کا مطلب پنجابی میں نکا (چھوٹا) ہے۔ مجھے بھی مسافر کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس ماہ کی بیسٹ نمبر ون کہانی تھی شکست پندار اور اناڑی بھی آخر انجام کو پہنچی۔ ملک صفدر بھی اس بار میدان مار گئے۔ محفل کے تمام قارئین کے خط اچھے تھے۔“

✠ **قمر ستی**، کہوٹہ راولپنڈی سے محفل میں شامل ہوئے ہیں ”فروری کا شمارہ 19 جنوری کو موصول ہوا۔ انکل مہنگائی اور لوڈشیڈنگ کی وجہ سے ملک کے بارے میں فکرمند نظر آئے۔ انکل جی! آپ مایوس نہ ہوں۔ میں نے خود سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے، بس آپ اور دوستوں کی دعائیں درکار ہیں (آوے ہی آوے) محفل میں اس بار محمد بلوچ صاحب کپتانی کے حقدار ٹھہرے۔ ان کا تبصرہ جاندار تھا۔ راجا ثاقب نواز ثاقب! آپ کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ ہمایوں سعید راج، ماہا ایمان تو محفل سے غائب ہو کر ہم پر احسان کر چکی ہیں، بس اب آپ بھی سدھر جائیں تو بہتر ہو گا۔ اگر آپ کو مشکل ٹارگٹ پسند ہیں تو افسوس کہ آپ کی پسند بدلنے والی ہے کیونکہ اب میں واپس آ چکا ہوں۔ اس بار محفل میں راوی نے چین ہی چین لکھا کیونکہ صنف نازک کو اس بار زیادہ چیں چیں کرنے کا انکل نے موقع ہی نہیں دیا (ارے بھئی اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے) شارجہ سلجوق صاحب! آپ نے ٹھیک کہا کہ مرد حضرات عورتوں کی مت مار دیتے ہیں، اس لیے آپ بھی اپنا اگلا تبصرہ اپنے ننھے سے دماغ سے سوچ سمجھ کر لکھیے گا ورنہ میں آپ کی مت مار دوں گا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ کہانی آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی ہے اور لگتا ہے کہ بہت جلد یہ کہانی بھی ایک سپرہٹ ثابت ہو گی۔ مسافر کی پہلی قسط کا انتظار ہے۔ ناصر ملک صاحب ایک اچھے رائٹر ہیں اور امید ہے کہ ان کی یہ کہانی بھی بہتر ہو گی۔ شکست پندار ایک اچھی کہانی تھی جس میں ظالم اور مظلوم نے موت کے لیے ایک ہی راستہ اختیار کیا۔ صغرا کو بھی چودھری کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا اور کم سے کم فیض محمد کو تو ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔ تاریخی کہانی پڑھ کر بہت غصہ آیا۔ ہم نے کتابوں میں تو بابر کی بہادری و فیاضی کے قصے سن رکھے تھے اور بابر کی نیک نامی بہت مشہور تھی مگر یہ کیا کہ جس کو دیکھا اسی کا عاشق بن بیٹھا، خود بیالیس سال کا ہو کر ایک پندرہ سالہ لڑکی سے جبراً شادی کرنا اور مے نوشی۔ ایسی بہادری کا کوئی فائدہ نہیں۔ تجدید تعلق، سادہ لوح اور صد چاک بہترین کہانیاں تھیں۔ چوہے کی چوری میں نک ویلوٹ کا یہ روپ تو میں نے پہلی بار دیکھا۔ ش صغیر ادیب کی کہانی بھی زندگی کے ایک تلخ پہلو کو اجاگر کرتی نظر آئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد سے گزارش ہے کہ اسلامی صفحات پر مشہور ولی منصور حلاج کے بارے میں تحریر کریں۔“

✠ **شیر علی خان**، خانیوال سے تبصرہ کرتے ہیں ”پچھلے مہینے خط شامل نہ ہونے پر مایوسی کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں ”گرتے ہیں شہسوار میدان جنگ میں“ کی عملی تصویر بنے ہوئے (خط اگر مل گیا ہوتا تو ضرور شائع ہوتا۔ ویسے جسارت اچھی لگی) میں میٹرک کلاس سے سسپنس کا قاری ہوں مگر غیر مستقل مزاج رہا۔ اب دوبارہ ملازمت کی نوعیت اور محفل یاراں کے ایک دوست مستقل ممبر کی وجہ سے دوبارہ شامل ہونے کا موقع ملا ہے۔ اس دفعہ انشائیہ اور ٹائٹل پر پردے پر بنی کسی مغل شہزادے کی تصویر میں کچھ مماثلت نظر آئی جس کے پیچھے ایک لڑکی کی آنکھوں کا

موسم، موسم خزاں کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ انشائیہ کو پڑھنے کے بعد مدیرہ کو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے پایا۔ اے اللہ تعالیٰ ہمیں کوئی اچھا لیڈر عطا فرما۔ آمین۔ راجا ثاقب مجھے لگتا ہے کہ رسالہ پڑھنے کے بعد آپ کو سوال کا جواب مل چکا ہوگا، نہیں ملا تو بتایئے گا۔ ہمایوں بھائی نے پھر بہنوں کی مہندی سے خوب ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ محفل کے راج دلارے جو ٹھہرے۔ ڈاکٹر صاحب دی گریٹ! آپ ڈاکٹری کے بعد سسپنس کے لیے وقت نکال لیتے ہیں؟ پیاری بہن یاسمین میں نے ابھی تک خط نہ لکھنے کا پکا ارادہ نہیں کیا، دیکھتے ہیں مدیرہ آنٹی شکریہ کا موقع دیتی ہیں (شکریہ کا موقع ہم نے دے دیا) ویسے آپ کے لیے تو میں یہی کہوں گا کہ ”میں اڈی اڈی جاواں ہوا دے نال“ نیازی صاحب بہت خوش ہوں گے، ہے ناں؟ کچھ لوگ منظر سے ہٹ گئے ہیں، جیسے ایم ڈبل اے، بابر عباس، ماہا ایمان، ہشکیاری والے بھائی۔ حکیم صاحب، نیازی صاحب کہاں مصروف ہوگئے ہیں آپ؟ محفل شعر و سخن میں طاہرہ یاسمین، شوکت علی، جعفر حسین، عمران کھتری کے اشعار بہت پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ظہیر الدین بابر کا تذکرہ بار بار پڑھنے کو دل چاہا۔ ڈاکٹر صاحب! 1857ء کے بعد کے حالات اور اگر سید احمد خان کی زندگی کے موضوعات سے پردہ اٹھایا جائے تو بہت خوشی ہوگی۔ کشکول بہت اچھی جا رہی ہے۔ اس دفعہ بھی لیاقت علی کی پراسرار شخصیت دوسرے کرداروں پر حاوی رہی۔ سیر کو سوا سیر حد سے زیادہ مضحکہ خیز کہانی ثابت ہوئی۔ ملک صاحب نے پھر پیشہ وارانہ طریقہ کار سے سوکن کی سفاکی سے پردہ اٹھایا۔ چودھری ارشاد کو ذرا بھی شک نہ ہوا کہ اس کی بیوی اپنی سوکن کو زہر بھی دے سکتی ہے۔ نک نے جس طرح نقے سے کھلونا چوہا چوری کیا مصنف کو داد دینی پڑے گی۔ نایاب تحفہ ثمر عباس کی بہت اچھی کہانی تھی میری کے لیے مور گن کا تحفہ۔ محبت کے نازک جذبات کو ایک آرٹسٹ ہی کینوس پر منتقل کر سکتا ہے۔ زبردست۔ اناڑی کے انجام تک دل کو تھامے رکھا کہ پتا نہیں کیا ہوگا۔ شکر ہے نواب صاحب کو نور ملی اور ایک اچھے انجام پر خاتمہ ہوا مگر رابعہ کا بہت افسوس ہوا کہ نواب صاحب اس کی محبت کو جان نہ سکے۔ بند دروازے میں شگو معاشرے کی ایک ٹھکرائی ہوئی عورت تھی مگر ادیب صاحب نے جس طرح کہانی کا انجام کیا یہ ہم سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ عائشہ فاطمہ نے زن، زر، زمین کے جھگڑوں کی سچ حقیقت بیان کی۔ انگریزوں نے ہمارے معاشرے میں جاگیریں عطا کیں جن کے جھگڑوں کی وجہ سے ہمارا معاشرہ جاگیرداری نظام سے ابھی تک نہیں نکل سکا اور اس نظام کے نسل در نسل چلنے کی وجہ ہمارے اونچے ایوانوں میں بیٹھنے والے جاگیردار حکمران ہیں اور ان کے مزارعین ان کی خودساختہ روایات کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمام اسیران کو رہائی اور ہم سب کو آسانیاں تقسیم کرے۔“

✠ **بشریٰ تلوکر اینڈ تانی تلوکر**، ہیاتوالی سے محفل میں تشریف لائی ہیں ”سسپنس خوبصورت اور لاجواب کہانیوں کا مجموعہ ہے، میں نئی قاری ہوں۔ کشکول بہت اچھی لگی۔ اسلامی سلسلہ بہت اچھا ہے، سسپنس سارے کا سارا اچھا ہے۔ مگر ایک بات اچھی نہیں یہ ہمارے ہاں آتا بہت لیٹ ہے۔“ (کتنا لیٹ..... یہ بھی بتائیں)

✠ **طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے محفل میں شامل ہوئے ہیں ”میرپور خاص میں سخت بارشوں کے بعد سخت سردی بھی اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ جمہوریت زندہ باد اور بھاری مینڈیٹ کا راگ الاپنے والے حکمران پائندہ باد۔ محمد جاوید بلوچ صاحب کا تبصرہ خوب رہا۔ بلوچ صاحب خطوط کا ذکر کرتے کرتے گنگ ہو کر رہ گئے پھر بلوچ صاحب واپسی کس طرح ہوئی جواب کا انتظار رہے گا۔ ہمایوں سعید راج صاحب ظفر سے ذرا پرہیز کریں۔ راج صاحب آپ کا نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ آپ کو مشکل ٹارگٹ پسند ہیں مگر دوسروں کو نہ ہوں..... طاہرہ یاسمین اور سعدیہ بخاری صاحبہ کے ساتھ ساتھ شارقہ سلجوق صاحبہ نے بڑا ہی بھرپور اور لاجواب تبصرہ لکھا ہے۔ ایوان صدر میں کچن کے خرچہ کا ذکر۔ شارقہ صاحبہ جمہوریت کی یہ بھی ایک نشانی ہے پھر شاید آپ کو معلوم نہیں عوام نے انہیں بھاری مینڈیٹ دیا ہے اور انہوں نے عوام کو کیا دیا۔ بجلی ختم، ٹرین ختم، پی آئی اے کا بیڑا غرق اور اب گیس بھی لب دم ہے اب میں بولوں کہ نا بولوں۔ جالب صاحب نے کیا خوب کہا۔

جاگنے والو جاگو مگر خاموش رہو
کل کیا ہو کس کو خبر خاموش رہو

اب ذکر ہو جائے کچھ کشور کشا کا پچھلی قسط پڑھ کر ایسا لگا تھا کہ اختتام پذیر ہوئی مگر اس دفعہ بابر کی ہمایوں سے محبت کی داستان اور شراب نوشی ترک کرنے کا ارادہ یہ سب تاریخ میں نقش ہیں۔ بابر بڑا باہمت مغل فرماں روا تھا اور غضب کا مقرر بھی۔ اپنی تقاریر کے ذریعہ اپنی دل گرفتہ فوج میں نیا جذبہ اور حوصلہ پیدا کر دیتا تھا۔ پانی پت کی لڑائی بابر کی زبردست حکمت عملی اور حوصلہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ تجدید تعلق تنویر ریاض صاحب نے خوب لکھی ہے اچھا سسپنس رہا اور انجام بخیر ہوا۔ منظر امام صاحب بھی آئے ہیں خوب ہی آئے ہیں اور اس مرتبہ بھی عاقبت نااندیش میں ان کے قلم کا جادو زبردست رہا۔ انوار صدیقی صاحب کی کشکول زبردست کہانی ہے۔ خاص طور پر لیاقت حسین کا کردار جس طرح انوار صدیقی صاحب خوبصورتی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ پہلے سراج کا کردار اور اب اورنگ زیب کی انٹری۔ کہانی آگے جا کر بڑی دھما چوکڑی مچائے گی۔ شکست پندار عائشہ فاطمہ صاحبہ کی انعام یافتہ کہانی بہت ہی خوب ہے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

محمد فیضان غنی، ہری پور ہزارہ۔ شمس الدین سیال، نوشہرو فیروز۔ مسٹر ڈب کلاں، ڈب کلاں۔ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی۔ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی۔ اے ایم چودھری، احمد پور شرقیہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ سعدیہ بخاری، ضلع اٹک۔ جعفر حسین، بھوآنہ ضلع چنیوٹ۔ یاسر شہباز، جابہ۔ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ سردار ظفر اقبال، جودھ پور، ضلع خانیوال۔ رانا حبیب الرحمن، سینٹرل جیل کوٹ لکھپت، لاہور۔ مظہر شہباز بٹ، فیصل آباد۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال۔ راشد حبیب تابش، ضلع اٹک۔

www.Paksociety.com

شہیدِ ہند

ڈاکٹر ساجد امجد

بعض شخصیات کا تعاقب تاریخ بچپن سے ہی کر رہی ہوتی ہے... اس سنہرے دور میں جب بچے کچی مٹی کے گھروندے بناتے اور بگاڑتے ہیں ایسے میں ایک فقیر نے اس بچے "ٹیپو" کے لیے پیش گوئی کی... "تیری خوش نصیبی ایک دن تجھے بادشاہ بنادے گی" اور باپ نے جو ریاست میسور کا سپہ سالار تھا جواباً کہا "بادشاہت، فقیر نہیں بانٹا کرتے" لیکن اسے کیا خبر تھی فقیر کی یہ پیش گوئی مسلسل سفر میں رہے گی۔ رفتہ رفتہ جب مرہٹوں اور نظام دکن کی سازشوں اور بدگمانیوں کی ہوا چلی تو انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام پر ہندوستان میں قدم جماتے چلے گئے۔ گویا "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" کیونکہ جب اس فقیر کی پیش گوئی پوری ہوئی تو "ٹیپو سلطان" کے دربار میں میر صادق جیسا غدار وزیر اعظم موجود تھا... مگر ٹیپو سلطان نے شکست و فتح کی منازل طے کرتے ہوئے فرانس کی بھی حمایت حاصل کرلی افسوس کہ اس وقت فرانس کے دروازے پر انقلاب دستک دے رہا تھا ورنہ آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ اپنوں کی غداری کا شکار سلطان ہرگز دارالسلطنت چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ تھا بلکہ اس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میسور کی تاریخ مجھے مفرور کے نام سے یاد کرے۔" اور جب لڑتے لڑتے صبح سے شام ہوگئی تو پھر سے مشورہ ملا کہ خود کو انگریزوں کے حوالے کردو مگر سلطان نے ایک اور تاریخی جملہ کہا۔ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے" اور پھر اس بلا کا رن پڑا کہ دشمن کے دانت کھٹے ہوگئے... جب فدائیوں کے درمیان اس کی لاش شناخت ہوئی تو دیکھا کہ چہرے پر غیر معمولی وقار سایہ فگن تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جنوبی بھارت کے شہر سرنگا پٹم کی ایک گلی میں کوئی فقیر اچانک کسی طرف سے نمودار ہوا اور گلی میں کھڑے ایک آٹھ سالہ بچے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اس وقت گلی میں کوئی دوسرا بچہ موجود نہیں تھا جیسے فقیر کو اسی ایک بچے سے مخاطب ہونا تھا اور گویا اس نے دوسرے سب بچوں کو منع کردیا تھا کہ کوئی اس طرف نہ آئے۔ فقیر کے چہرے پر وحشت کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی سرخ آنکھیں باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں۔ کوئی عام بچہ ہوتا تو یقیناً بھاگ کھڑا ہوتا لیکن اس نے فقیر کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بس اتنا ہوا کہ ہاتھ میں دبی ٹین کی تلوار پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی اور اپنی تربیت کے مطابق نہایت ادب سے اس فقیر کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

"صاحبزادے، آپ کا نام کیا ہے؟" فقیر نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"فتح علی ٹیپو سلطان۔" بچے نے قدرے فخر کے ساتھ اپنا نام بتایا۔

"یہ نام کچھ زیادہ بڑا نہیں، تمہیں یاد کیسے رہتا ہے؟" فقیر نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"میرے دادا جان کا نام فتح محمد تھا۔ فتح علی انہی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ میرے اماں ابا تو مجھے ٹیپو سلطان کہتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ، تمہارا نام ٹیپو کیوں رکھا گیا ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

"وقت آنے پر یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔ ابھی تو صرف وہ سن لو جو ہم تم سے کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں تو آپ کی ساری باتیں سن رہا ہوں۔"

"تیری خوش نصیبی ایک دن تجھے بادشاہ بنائے گی۔ تو یہاں کا بادشاہ ہوگا۔

میں انشاءاللہ ضرور بادشاہ بنوں گا۔" اس نے اتنے یقین سے کہا کہ فقیر حیرت زدہ رہ گیا۔

"جب تم بادشاہ بن جاؤ تو دو کام ضرور کرنا۔"

"فرمائیے۔"

"اس جگہ جہاں تم اس وقت کھڑے ہو ایک عالی شان مسجد تعمیر کرانا۔"

"بنوا دوں گا۔"

"بادشاہ بننے کے بعد تمام عمر خدمتِ اسلام اور خدمتِ خلق کو شیوہ بنائے رکھنا۔"

"میں بادشاہ بننے کے بعد ایسا ضرور کروں گا۔"

فقیر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "کیا بلند رتبہ ہے اس شہید کا۔" یہ خود کلامی اتنی آہستہ تھی کہ ٹیپو سن بھی نہ سکا ہوگا۔ وہ تو بس یہ دیکھ رہا تھا کہ فقیر اسے بادشاہ بننے کی نوید سنانے کے بعد جس طرح اچانک آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

اب ٹیپو کے لیے مشکل تھا کہ اس کا دل کسی کھیل میں لگتا۔ ویسے بھی اس کا کوئی ہم عمر اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے گلی چھوڑی اور گھر کی راہ لی۔ اسے یہ بھی جلدی تھی کہ وہ اس فقیر کے بارے میں اپنی ماں کو جا کر بتائے۔

وہ گھر پہنچا تو ذہین ٹیپو یہ اندازہ لگائے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے والدین اس وقت بہت پریشان ہیں۔ اس نے سوچا یہی اچھا موقع ہے کہ اسے بادشاہ بننے کی خوش خبری سنا کر ماں کو خوش کرنا چاہیے۔

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ بابا کی نوکری چھوٹ گئی ہے تو کیا ہوا۔ میں تو بادشاہ بننے والا ہوں۔" اس نے ایسی غیر متوقع بات کہہ دی تھی کہ ماں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"تم انشاءاللہ ضرور بادشاہ بنو گے۔"

"یہی تو وہ فقیر کہہ رہا تھا۔"

"کون فقیر بیٹا؟"

"وہی جو مجھے گلی میں ملا تھا۔"

ٹیپو نے پورا ماجرا بیان کر دیا۔ اس کا باپ تو یہ سن کر ہنسنے لگا لیکن ماں سنجیدہ تھی۔

"وہ فقیر ضرور کوئی اللہ والا ہوگا۔ اللہ والوں کی باتوں پر ہنستے نہیں۔" ٹیپو کی ماں نے اپنے شوہر کو سرزنش کی۔

"بادشاہت فقیر نہیں بانٹا کرتے۔" ٹیپو کے باپ حیدر علی نے کہا۔ "اس کے لیے عملی جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔"

"میرا بیٹا یہ بھی کر لے گا۔ دیکھ لینا فقیر کی دعا پوری ہو کر رہے گی۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں اسی وقت مرہٹوں کا لشکر شہر کا محاصرہ کرنے اور حیدر علی کو گرفتار کرنے کے لیے سرنگاپٹم کا رخ کر رہا تھا۔

حیدر علی ریاست میسور کا سپہ سالار تھا لیکن اس کے خلاف صرف اس لیے سازشیں ہوتی رہی تھیں کہ وہ مسلمان ہے۔ راجا تو اس سے بہت خوش تھا لیکن اس کی بعض رانیاں اس کے خلاف تھیں۔ انہوں نے ریاست کے وزیر کھانڈے راؤ کے ساتھ مل کر سازش تیار کی اور عین اس وقت جبکہ حیدر علی مرہٹوں کے خلاف لڑنے کے لیے ریاست سے باہر تھا، اس کی معزولی کے احکام صادر کرا دیے اور فوج کو واپس بلا لیا۔ حیدر علی چاہتا تو اپنی وفادار فوج کو ساتھ لے کر علم بغاوت بلند کر دیتا لیکن وہ ریاست کا وفادار تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ بدامنی ہو۔ راجا کا پیغام بھی یہی ملا تھا کہ "خاموش ہو جائیے۔ اگر اس نے کوئی قدم اٹھایا تو ناحق بدامنی پھیلے گی جس سے دشمن فائدہ اٹھائے گا۔ انگریز، مرہٹے، نظام دکن تینوں اس ریاست کو ہڑپ کرنے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔"

وہ سرنگاپٹم میں محصور ہو کر بیٹھ گیا۔

حیدر علی کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ بہ مشکل 33 دیہات پر مشتمل یہ ریاست دریائے کرشنا کے جنوب میں پورے جنوبی ہند تک پھیل گئی تھی اور اب اسے اس کی فتوحات کا صلہ یہ مل رہا تھا کہ اسے معزول کر دیا گیا تھا۔

اس کی معزولی کے بعد بھی کھانڈے راؤ کو یہ خوف مارے ڈالتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت زبردست خطرہ بن سکتا ہے۔ اس نے مرہٹوں کو ایک چٹھی لکھی کہ حیدر علی، میسور کی تاک میں ہے۔ اگر وہ غالب آگیا تو ریاست میں ہندو حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ مسلمانوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔ اگر اسے گرفتار کرنے میں آپ ہماری مدد کریں تو ہم ہمیشہ آپ کے باج گزار رہیں گے اور ایک معقول رقم کے علاوہ ہمیشہ چوتھ بھی دیتے رہیں گے۔

کھانڈے راؤ نے اپنے مفاد کے لیے ریاست کو مرہٹوں کا باج گزار بنا دیا۔

حیدر علی کو اس سازش کا علم اس وقت ہوا جب دشمن نے سرنگاپٹم کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور نہ صرف لڑنے کی سکت تھی بلکہ بھاگنے کے لیے راستہ بھی نہ تھا۔ بس کچھ ہی دیر میں دشمن شہر میں داخل ہو جاتا پھر محل کتنی دور تھا۔ کھانڈے راؤ جیسا دشمن جان کے درپے تھا۔ بیوی اور بچے کو لے کر کہاں جائے۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ بیوی بچے کو وہیں چھوڑے اور اندھیرے میں اندھیرا بن کر سرنگاپٹم سے نکل جائے۔ کہاں؟ یہ اسے بھی نہیں معلوم تھا۔

[illegible] ہوتے ہوئے ٹیپو اور روتی ہوئی بیوی کو اللہ

کے بھروسے چھوڑا اور کسی نہ کسی طرح دریائے کاویری پر پہنچا۔ برسات کے دن تھے۔ دریا کی طغیانی دل دہلا رہی تھی لیکن بے عزتی کی زندگی سے عزت کی موت اچھی تھی۔ اللہ کا نام لے کر دریا میں کود گیا پھر موجوں کو چیرتا ہوا پار چلا گیا۔ اب وہ آسانی سے فیصلہ کر سکتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اس کی طرف دار فوج کا ایک دستہ بنگلور میں موجود تھا۔ اسے بنگلور جانا تھا۔

کھانڈے راؤ مرہٹوں کو لے کر سرنگاپٹم میں داخل ہوا تو حیدر علی کے فرار نے اس کا استقبال کیا۔ یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری۔ اب خطرہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ شیر اگر نشانے سے بچ کر بھاگ جائے تو اس کے غصے کی انتہا نہیں رہتی۔ اس نے مرہٹوں کو اشارہ کیا۔ صبح تک یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حیدر علی بنگلور کی طرف گیا ہے۔ مرہٹے بھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے بنگلور چلے گئے۔

مرہٹے بنگلور پہنچے تو حیدر علی نے قلعے سے نکل کر اس تیزی سے حملہ کیا کہ مرہٹے تتر بتر ہو کر فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اب حیدر علی جو بھی قدم اٹھاتا اسے بغاوت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ کھانڈے راؤ سے بدلہ لینے میں حق بہ جانب تھا۔

وہ اعلیٰ جنگی قابلیت کا مالک تھا۔ اس کے لیے قلت و کثرت کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی سی فوج ادھر ادھر سے جمع کی اور سرنگاپٹم پر چڑھائی کر دی۔

مرہٹے تاوان وصول کر کے جا چکے تھے۔ کھانڈے راؤ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ مقابلہ کرتا۔ حیدر علی نے محل پر گولہ باری شروع کی تو راجا کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے فوراً ایک معتمد کو حیدر علی کے پاس بھیجا اور صلح کا طالب ہوا۔ حیدر علی نے اس شرط پر صلح کی درخواست منظور کی کہ کھانڈے راؤ کو اس کے حوالے کیا جائے۔

راجا کو یہ شرط کسی صورت قبول نہیں تھی۔ جب کوئی جواب نہیں آیا تو حیدر علی نے اور زیادہ شدت سے گولہ باری شروع کر دی۔ راجا کے محل میں کھلبلی مچ گئی۔ وہی رانیاں جو سازش میں شریک اور حیدر علی کی جانی دشمن تھیں راجا کو مجبور کرنے لگیں کہ وہ کھانڈے راؤ کو حوالے کر کے ان کی جان بخشی کرائے۔ راجا نے پھر اپنا آدمی بھیجا اور اس شرط پر کھانڈے راؤ کو حوالے کرنے پر راضی ہوا کہ اس کی جان بخشی کی جائے۔ حیدر علی نے وعدہ کیا کہ وہ اسے ہلاک نہیں کرے گا۔ کھانڈے راؤ مجرم کی طرح اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

حیدر علی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے ہلاک نہیں کرے گا، یہ نہیں کہا تھا کہ قید بھی نہیں کرے گا۔ اس نے کھانڈے راؤ کو ایک بڑے پنجرے میں قید کر دیا۔ اسی میں اس بدنصیب کو دانہ پانی ڈال دیا جاتا تھا۔ جب تک زندگی رہی وہ اسی پنجرے میں قید رہا۔

حیدر علی ہندو امرا میں نہایت مقبول تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں مرہٹوں نے جو لوٹ مار مچائی تھی یہ امرا اس طوفانِ بدتمیزی کو بھی دیکھ چکے تھے لہٰذا اس کی دوبارہ آمد پر انہوں نے اس کا استقبال کیا۔

ان امرا کو ساتھ لے کر حیدر علی، راجا سے ملنے گیا۔ راجا اپنے فعل پر نادم تھا لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ اب صرف حیدر علی نہیں ریاست کے سربرآوردہ لوگ بھی یہ چاہتے تھے کہ سازشوں کا خاتمہ ہو اور ریاست کا انتظام کسی مضبوط ہاتھ میں آجائے۔ حیدر علی کے سوا کوئی دوسری شخصیت اس وقت ایسی نہیں تھی۔

حیدر علی سے پہلے ان ہندو امرا نے یہ مطالبہ راجا کے سامنے رکھ دیا۔ "راجا جی اب آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ ریاست کے تمام حالات نیناجی کے سپرد کر دو۔"

راجا نے یہ مطالبہ سنا تو بھڑک گیا۔ "حیدر علی! تم تو خود کو دیش بھگت کہتے تھے۔ اب تم ہی میرے راج پاٹ کے پیچھے پڑ گئے۔"

"یہ مطالبہ میری طرف سے نہیں ہے۔ اگر آپ سازشوں میں شریک نہ ہوئے ہوتے تو یہ نوبت کبھی نہ آتی۔"

"میں کسی سازش میں شریک نہیں ہوا تھا۔"

"پھر یہ کیا ہے۔" حیدر علی نے وہ سب خطوط راجا کے سامنے رکھ دیے جو اس نے مرہٹوں کو لکھے تھے اور حیدر علی کے ہاتھ لگ گئے تھے۔

ان خطوط کو دیکھ کر پہلے تو راجا ان کی صحت سے انکار کرتا رہا مگر پھر اسے ماننا پڑا کہ یہ خطوط اسی کے ہیں۔ اس کے امرا نے پھر مطالبہ کیا کہ وہ راج پاٹ چھوڑ دے۔

"میں راج پاٹ کے بغیر گزارہ کیسے کروں گا؟"

حیدر علی نے اسے تسلی دی۔ "اس کی آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو وظیفہ اور ایک جاگیر گزارے کے لیے مل جائے گی۔ راجا بھی آپ ہی رہیں گے بس ریاست کے کاموں میں دخل نہیں دیں گے۔ حکم میرا چلے گا۔"

راجا مجبور ہو گیا۔ "آپ لوگ کہتے ہیں تو میں ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔"

حیدر علی نے ایک تحریر راجا سے لکھوا لی اور اس کا اعلان ریاست میں نشر کرا دیا۔

حیدر علی میسور ریاست کا حکمران بن گیا۔

فقیر کی پیش گوئی برابر سفر میں تھی۔ حالات اس خاندان کو [illegible] طرف لے جا رہے تھے۔ اب حیدر علی میسور کا

www.Paksociety.com

حیدر علی خود ناخواندہ تھا اسی لیے وہ ٹیپو کی تعلیم پر خاص توجہ دے رہا تھا۔ سپہ گری کی تعلیم بھی جاری تھی۔

ٹیپو سلطان پندرہ سال کی عمر میں باقاعدہ حیدری فوج میں شامل ہوگیا۔ یہ ریاست چاروں طرف سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے دشمن انگریز بھی تھے، فرانسیسی اور مرہٹے بھی۔ حیدر علی ان سب سے مقابلہ کر رہا تھا اور ٹیپو اس کے ہمراہ داد شجاعت دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوگیا کہ ایسٹ انڈیا کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ حیدر علی کو سمجھا جانے لگا۔ اس نے بے شمار جنگیں لڑیں اور انگریزوں کے دانت کھٹے کرتا رہا۔

حیدر علی کے ساتھ ساتھ ٹیپو سلطان نے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ حیدر علی کو اس پر اتنا اعتماد ہوگیا کہ اس نے ٹیپو کو ایک جنرل کی طرح فوجوں کی علیحدہ کمان سپرد کردی۔

☆☆☆

ٹیپو ان دنوں مالابار کی طرف گیا ہوا تھا اور اس وقت بالا گھاٹ میں انگریزوں کے مقابلے پر خم ٹھونکے کھڑا تھا۔ انگریز لشکر کے سالار ہمبرا سٹون اور کرنل روز لینگ تھے۔ بالا گھاٹ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ ٹیپو اپنا دباؤ بڑھاتا رہا یہاں تک کہ انگریز پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئے اور پسپا ہوتے ہوتے دریائے پونانی کے کنارے پہنچ گئے۔

وہ جنگ میں مصروف تھا کہ اسے حیدر علی کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ اس نے یہ خط پڑھنے سے پہلے اسے آنکھوں سے لگایا۔ اس نے خط پڑھا۔

”اگر تم اس علاقے کی تادیب سے مطمئن ہوچکے تو چشم پدر کو اپنے دیدار راحت آثار سے روشن اور منور کرو۔ اس سے پہلے پورے معاملات کا جائزہ لے کر دیکھ لو کہ مزید فوج کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اپنی مدد کے لیے اور فوج بلوالو۔

”ہم تمہیں امور سلطنت کا مختار بناتے ہیں اس لیے ایک پل کے لیے بھی سرکاری کاموں میں تجاہل اور تغافل نہ برتو۔“

وہ اس خط کو پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اسے میدان جنگ سے واپس بلایا گیا ہو۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ یہ خط سرنگا پٹم سے نہیں ارکاٹ کے قریب سے لکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ خود بھی کسی مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔ یہ حقیقت اس کے لیے پریشانی کا باعث تھی کہ اس کا باپ سرنگا پٹم میں نہیں۔ اسے فوجی مدد کی بھی ضرورت نہیں پھر وہ اسے کیوں بلا رہا ہے۔ خط کے یہ الفاظ بھی اس کے دل میں کھٹک پیدا کر رہے تھے کہ ”ہم تمہیں امورِ سلطنت

ٹیپو نے یہ مہم ادھوری چھوڑی اور اپنا لشکر لے کر میسور کی طرف روانہ ہوا۔

حیدر علی ایک عرصے سے سرطان کے مرض میں مبتلا تھا۔ ہر سال اس کی پیٹھ پر سرطان کا زہریلا پھوڑا نکلتا تھا جس کا زہر نشتر زنی کے ذریعے نکال دیا جاتا تھا۔ وہ پھر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوجاتا۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوسکا تھا کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے۔ اس مرض نے اسے بہت کمزور کردیا تھا۔ موت کے قدم دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھتے جارہے تھے۔ اس مرتبہ اس کی حالت زیادہ غیر ہوگئی۔ اس نے امرا کے مشورے سے ٹیپو کو بلانے کے لیے خط بھی لکھ دیا۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بیٹے کو دیکھنا اب مقدر میں نہیں۔ اس نے ان امرا کو جو اس وقت قریب تھے طلب کیا۔ وہ بہادر سپاہی اس وقت گھوڑے پر نہیں بستر پر تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

”میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ جب میرا انتقال ہوجائے تو تم لوگ اسی وفاداری کے ساتھ ٹیپو کی خدمات انجام دینا جس طرح میری انجام دی ہیں۔“

یہ حکم بھی دیا کہ بیس ہزار فوج ارکاٹ کی طرف روانہ کر دی جائے۔ دربار کے حفاظ موجود تھے انہیں حکم ہوا کہ وہ تلاوت کرتے رہیں۔

اب اس کے پاس حفاظِ کرام کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ اسی عالم میں نہ جانے کب اس کی روح اپنے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچ گئی۔

حیدر علی کے مرتے ہی سازشوں نے سر اٹھایا۔ ہر چند کہ اس کی موت کو پوشیدہ رکھا گیا تھا لیکن یہ خبر کسی نہ کسی طرح سرنگا پٹم پہنچ گئی۔ وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو حیدر علی کے خوف سے چپ تھے لیکن دل سے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ ان میں میر صادق اور میر معین الدین سب سے آگے تھے۔ باقی لوگوں کو ان دونوں نے دم دلاسے دے کر اپنے ساتھ ملالیا۔ میر صادق یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ ریاست میسور، ٹیپو جیسے مضبوط سپاہی کے ہاتھ لگ جائے۔ یہ دونوں انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ میر معین تو انگریزوں کے اجلاسوں تک میں موجود ہوتا تھا اور انہیں پل پل کی خبریں پہنچاتا رہتا تھا۔ ان دونوں نے محمد امین کو بھی اپنے ساتھ ملالیا جس کے تحت چار ہزار سوار تھے اور جو حیدر علی کا چچازاد بھائی تھا۔ ان سب نے مل کر ٹیپو کا انتظار کرنے کے بجائے اس کے چھوٹے بھائی کو جو کریم صاحب کہلاتا تھا تخت نشین کر دیا۔ جواز یہ بتایا گیا کہ کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے یہ قدم

اٹھایا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ کریم صاحب کمزور طبیعت کا نوجوان تھا۔ اس پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا تھا۔ خفیہ ملاقاتوں میں یہ بھی طے پا گیا تھا کہ میسور کے کاغذی راجا کو بغاوت پر اکسایا جائے گا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے بہانے انگریز ریاست میسور میں داخل ہوجائیں گے۔ اس اسکیم کو انگریزوں تک پہنچانے کے لیے ایک آدمی مدراس کی طرف روانہ بھی کیا جاچکا تھا۔

حیدر علی کی میت کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سرنگا پٹم لایا گیا اور پیوند خاک کر دیا گیا۔

ٹیپو سرنگا پٹم کی طرف روانہ ضرور ہوا تھا لیکن ارکاٹ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اسے باپ کے انتقال کی خبر مل گئی تھی لیکن یہ خبر بھی پہنچ گئی تھی کہ اس کا بھائی تخت نشین ہوچکا ہے۔ وہ یہاں رک کر سرنگا پٹم کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ انتظار بھی تھا کہ اس کے امرا اس سے ملنے آتے ہیں یا سب کے سب فروخت ہوچکے؟ اب کس قسم کا ردعمل ظاہر ہوتا ہے یہ دیکھنے کی بات تھی۔

جب سرنگا پٹم میں یہ خبر پہنچی کہ ٹیپو ارکاٹ کے قریب پہنچ کر رک گیا ہے تو سرنگا پٹم کے دربار میں اندیشوں نے سر ابھارا۔ امرا کو یہ فکر لاحق ہونے لگی کہ اگر ٹیپو سرنگا پٹم پر حملہ آور ہوگیا تو فتح کے بعد ان سب کی گردنیں اڑا دی جائیں گی۔ وہ وفادار امرا جو باتوں میں آگئے تھے، ٹیپو کے پاس جانے کے لیے مشورے کرنے لگے۔ اب میر صادق کے ہوش اڑنے لگے کہ اگر یہ امرا ٹیپو کے پاس چلے گئے تو میرا نام ضرور آئے گا کہ یہ تجویز سب سے پہلے میں نے دی تھی۔ وہ بھی ان امرا کے ساتھ مل گیا بلکہ خود کو مجرم ٹھہرانے لگا۔

”مجرم تو میں ہوں۔ یہ میری ہی تجویز تھی کہ کریم صاحب کو تخت نشین کر دیا جائے مگر صاحبو! اس وقت یہی مصلحت کا تقاضا تھا۔ اس میں میری نیت کا فتور نہیں تھا۔“

”میر صادق، یہ غلطی تو ہم سب سے ہوئی تھی۔ ہم سب ہی گناہ گار ہیں۔ اب اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم سب معافی نامے لکھیں اور ٹیپو کے حضور پہنچا دیں۔“

”تجویز تو آپ لوگوں کی اچھی ہے لیکن شہزادہ کریم صاحب جو اس وقت بادشاہ ہیں ان کی رضامندی بھی ضروری ہے۔“

میر صادق نے ایک اور چال چلی۔ اسے یقین تھا کہ کریم صاحب بھی اس رائے سے اتفاق نہیں کریں گے۔ بادشاہت کون چھوڑتا ہے بلکہ اس نے خفیہ طور پر کریم صاحب کو اکسانے کی بھی کوشش کی لیکن کریم صاحب کی کمزور طبیعت اس خطرے کے سامنے کھڑی نہ رہ سکی۔ نتیجہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

مارچ 2012ء بہار کے خوشنما رنگ لیے

عمیرہ احمد ...... عکس

عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے
پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

شیریں حیدر

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

اپنے مخصوص کرداروں کے ساتھ
مسلسل ناول کے پر تحیر نشیب و فراز

ناہید سلطانہ اختر ...... زندگی

زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے روشناس کراتا آپ
کی پسندیدہ مصنفہ کے قلم سے لکھا نیا سلسلے وار ناول

راحت وفا ...... ایک تھی نیناں

انسانی ذہن کی نفسیاتی الجھنوں، کیفیات اور
احساسات کے گرد گھومتا سلسلے وار ناول

انجم انصار اور سکینہ فرخ

کے دلکش و خوب صورت ناولٹ

سعدیہ رئیس، سیما یاسمین مجتبیٰ، زاہدہ پروین، نظارت نصر، کرن احمد، عظمیٰ سید افتخار، تابندہ جبیں، نزہت جبیں ضیا، عائشہ خان اور **بشریٰ گوندل** کی دلچسپ و پر اثر تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

جب امرا اس کے پاس پہنچے تو ٹیپو کے استقبال کے لیے فوراً تیار ہوگیا۔

تمام امرا اور وزرا کے معافی نامے ٹیپو تک پہنچا دیے گئے۔ معافی نامے پہنچانے والے نے زبانی بھی تمام حالات بتا دیے۔ اب ٹیپو کا مطمئن ہوجانا لازمی تھا۔

”میرا دل اپنے امرا کی طرف سے صاف ہوگیا ہے۔ اب مجھے سرنگا پٹم جانے میں کوئی امر مانع نہیں۔“ ٹیپو نے اسی وقت کوچ کا حکم دے دیا۔

وہ عالم دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب وہ سرنگا پٹم کی سرحد پر پہنچا اور استقبال کرنے والوں میں اس نے سب سے آگے اپنے بھائی کو دیکھا جو اپنے گھوڑے سے اتر گیا تھا۔ اس کی حیثیت اس وقت میسور کے سلطان کی تھی لیکن وہ پاپیادہ بھائی کے استقبال کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ ٹیپو بھی اسے دیکھتے ہی گھوڑے سے نیچے آگیا۔

”میں سلطانی کے اعزاز سے خود کو سبکدوش کرکے آپ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔“

ٹیپو نے آگے بڑھ کر بھائی کو سینے سے لگا لیا۔ ”میرے دل میں تمہاری طرف سے جو اندیشے تھے وہ سب جاتے رہے۔ مجھے تخت و تاج کی ہوس نہیں لیکن اس وقت ہندوستان اور خاص طور پر ہماری ریاست جن خطرات میں گھری ہوئی ہے اس میں آپس کے اختلافات اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے خزانے بھرنے کے لیے ہندوستان کو ہڑپ کرنے کی فکر میں ہے۔ میں ہمیشہ ان کا راستہ روکتا رہوں گا۔ والد صاحب کے ادھورے کارناموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اب میری ذمے داری ہے۔“

جشن تاج پوشی کے بعد جب ٹیپو خلوت میں گیا ہوگا تو اسے فقیر کی پیش گوئی ضرور یاد آئی ہوگی۔ فقیر کی یہ خواہش بھی یاد آئی ہوگی کہ وہ ایک مسجد بنوائے گا۔

ٹیپو نے اپنا وعدہ پورا کیا اور سرنگا پٹم میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کا نام اس نے ”مسجدِ اعلیٰ“ رکھا۔ یہ مسجد اب بھی موجود ہے۔

☆☆☆

حیدر علی کی موت کی خبر مدراس میں انگریزوں نے خوشی کے ساتھ سنی۔ گورنر نے کہا ”ہمیں اس سے جتنا فائدہ اٹھانا ہے، اٹھالیا جائے۔ حیدر کی موت کے اہم واقعے سے ہندوستان میں ہمارے مفاد کے لیے بہت سے سودمند نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس سے مشرقی خطے پر ہمارے وطن کے لیے مستقل اور بغیر کسی تشویش کے قبضہ حاصل کرنے کے بہتر سے بہتر امکانات پیدا ہوسکتے ہیں۔“

ان خیالات کے باوجود انگریز، حیدر کی موت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس لیے کہ سلطنت میسور کی تخت نشینی نہایت پُرامن طریقے سے ہوئی۔ نہ تو ٹیپو اور کریم ہی میں تخت کے لیے کوئی جھگڑا ہوا اور نہ فوج کے سرداروں میں بغاوت ہوئی۔

ٹیپو نے جنوبی ہند کی سب سے بڑی سلطنت میسور کی باگ ڈور ایک ایسے وقت میں سنبھالی تھی جب ہر طرف انگریزوں کا دور دورہ تھا۔ عیسائی مشنریاں جگہ جگہ کام کر رہی تھیں۔ ہندو راج کے منصوبے بنانے والے پونا میں اکٹھے ہو رہے تھے اور دربار دہلی کی سطوت قلعہ دہلی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی۔ انگریزوں کے ان پر اتنے احسانات تھے کہ سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ دوسری طرف نظام اور مرہٹے ٹیپو کو انگریزوں سے زیادہ خطرناک سمجھ رہے تھے۔ ٹیپو کو ان تمام طاقتوں سے نمٹنا تھا۔ غدارانِ وطن کی سازشیں بھی اس کے راستے میں حائل تھیں۔

ٹیپو کو صرف عظیم الشان سلطنت ہی ورثے میں نہیں ملی تھی بلکہ قدم قدم پر کھڑے ہوئے خطرات بھی اس کے سامنے تھے۔ اسے گدی سنبھالتے ہی سرنگا پٹم سے نکلنا پڑا۔ انگریزی فوج وندی واش کے نواح میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ ٹیپو بھی روانہ ہوا اور وندی واش کے نواح میں خیمہ زن ہوگیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان پالار ندی کی ایک شاخ حائل تھی۔ تمام دن دونوں طرف سے ایک دوسرے پر گولیاں برستی رہیں لیکن اگلے دن انگریزوں نے پیچھے ہٹنا شروع کردیا۔ میسوریوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کے تقریباً دو سو آدمیوں کو قتل کردیا۔ جنرل اسٹورٹ، ٹیپو سے اس قدر مرعوب ہوا کہ وندی واش اور کرنگولی سے اپنی فوج ہٹالی اور تمام فوجی تنصیبات کو مسمار کردیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ میسوریوں کے ہاتھ آجائیں۔ ٹیپو کو فتح مل گئی تھی لیکن اس نے اسٹورٹ کی خوف زدگی سے مزید فائدہ نہیں اٹھایا کیونکہ اسے کرناٹک چھوڑ کر مالابار کے ان مقبوضات کی مدافعت کے لیے جانا تھا جن پر انگریزی فوجوں نے جنرل میتھیوز کی زیر کمان حملہ کردیا تھا۔

جنرل میتھیوز کو بمبئی گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت مل چکی تھی کہ وہ حیدر نگر کے زرخیز علاقے پر جلد از جلد قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔

اس علاقے کا پہلا نام بیدنور تھا۔ حیدر علی نے جب اس علاقے کو فتح کیا تھا تو یہ علاقہ اسے اتنا پسند آیا تھا کہ اس نے اسے حیدر نگر کا نام دیا اور اپنا دوسرا دارالخلافہ قرار دے کر اسے اتنی ترقی دی کہ معمولی سے قصبے کو خوش حال شہر بنا

www.Paksociety.com

دیا۔ اب انگریز اس پر دانت جمائے ہوئے تھے۔ حیدر علی نے اپنے ایک لے پالک ایاز خاں کو یہاں کا گورنر بنا دیا تھا۔ اب تک وہی چلاتا آیا تھا لیکن حیدر علی کے مرتے ہی اس نے پر پرزے نکالنے شروع کردیے تھے۔ اس کی شکایتیں مسلسل مل رہی تھیں لیکن ٹیپو نے اپنی نیک نفسی سے ان شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

جنرل میتھیوز مارا ماری کرتا ہوا حیدر گڑھ پہنچ گیا۔ یہ مقام بیدنور سے صرف چودہ میل دور تھا۔ اس کے پاس گولہ بارود کی مقدار بہت کم رہ گئی تھی۔ اگر سنگین مقابلہ ہوتا تو وہ بھی فتح یاب نہ ہو پاتا لیکن ایاز خاں کی غداری اس کے کام آگئی۔

ایاز خاں نہ جانے کب سے انگریزوں سے مل جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جو سنا کہ انگریز جنرل صرف چودہ میل دور ٹھہرا ہوا ہے تو اس نے ایک انگریز قیدی ڈونلڈ کیمبل کو بلوایا۔

”میں چاہتا ہوں قلعہ انگریزوں کے حوالے کردوں۔ اس سلسلے میں تم میری مدد کرو۔“

”اگر آپ مقابلے کی سکت نہیں رکھتے تو آپ اپنے آقا ٹیپو کو مدد کے لیے خط لکھیے۔ کیا یہ غداری نہیں جو آپ کر رہے ہیں۔“

ڈونلڈ کیمبل نے انگریز ہوتے ہوئے اسے اس فعل سے روکنا چاہا لیکن ایاز خاں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کی اپنی ایک منطق تھی۔

”انگریزوں کا ستارہ عروج پر ہے۔ ٹیپو کب تک مقابلہ کرے گا۔ پھر میں تمہاری ترقی یافتہ قوم کی طرف دوستی کا ہاتھ کیوں نہ بڑھاؤں۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔ مجھے بتایئے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔“

”تم میری طرف سے جنرل کو خط لکھو۔ اس میں قلعہ حوالے کرنے کے لیے دو شرطیں درج کردو۔ پہلی شرط یہ کہ قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز مجھے حسبِ سابق یہاں کا گورنر رکھیں گے۔ دوسری شرط یہ کہ میرے پاس جو دولت ہے اسے چھیننے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔“

ڈونلڈ کیمبل نے دونوں شرطیں تحریر کردیں اور ایاز خاں کے کہنے پر وہ خط لے کر جنرل میتھیوز کے پاس چلا گیا۔

[illegible] ان پر عمل نہ کیا [illegible] اور ایک قطرۂ خون بہائے بغیر انگریزی فوج حیدر نگر جیسے خوبصورت شہر پر قابض ہوگئی۔

[illegible] جو محب وطن ٹیپو تک پہنچتے میں

کانٹے بچھائے جا رہے تھے اور وہ ان کانٹوں کو ہٹا کر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اگر حیدر علی اور ٹیپو راستہ روک کر نہ کھڑے ہوئے ہوتے تو انگریز بہت عرصہ پہلے جنوبی ہند کو روندنے کے بعد شمالی ہند تک پہنچ چکے ہوتے۔ انہیں سو سال انتظار نہ کرنا پڑتا۔ سو سال بعد بھی 1857ء کا ہنگامہ گرم نہ ہوتا، اگر وطن کے غدار ٹیپو کی جان کو نہ لپٹے ہوتے۔

حیدر نگر کے گورنر ایاز خاں نے ہمت بڑھائی تو حیدر نگر کے بہت سے اردگرد کے قلعے انگریزوں کے حوالے ہوگئے۔ صرف قلعہ اننت پور کا قلعہ دار تھا جو ایاز خاں اور انگریزوں کے خلاف جم کر کھڑا ہوگیا۔ قلعے کے اندر صرف چار سو فوجی تھے مگر انہوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کردیے۔

یہ چار سو آدمی کب تک مقابلہ کرتے۔ شام کا گجر بجتے ہی انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس موقع پر انگریزوں نے شریف دشمن ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ فتح ملتے ہی انگریزوں نے بوڑھوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کیا۔ کوئی عورت ایسی نہیں تھی جس کی عصمت دری نہ کی ہو۔ کتنی ہی عورتوں کے پستان کاٹ دیے۔ سیکڑوں عورتیں ایسی غائب ہوئیں کہ ان کا پھر پتا نہ چلا۔

ان مظالم کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دی۔ بعض لوگوں نے انگریزوں کو مہذب قوم سمجھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاہ کاریوں کی داستان انگلستان تک پہنچائی۔ اس کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن بیٹھا۔ اس کمیشن کی جو رپورٹ آئی اس میں صرف اتنا درج تھا۔

”صرف ایک عورت قتل ہوئی۔ اس کے ساتھ بہیمانہ سلوک ہوا جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہوگئی تھی۔ دو بچے لڑائی کے دوران مارے گئے تھے۔“

یہ تھا اس قوم کا انصاف جس کی مدد مفاد پرست ہندوستانی بھی کر رہے تھے۔

ان مظالم کی داستانیں سن سن کر ٹیپو کے غضب کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ اس نے اپنے حالات سے مجبور ہوکر ایاز خاں گورنر حیدر نگر کی نمک حرامی پر خاموشی اختیار کرلی تھی۔ حیدر نگر جیسے خوبصورت قصبے کے ہاتھ سے نکل جانے کا دکھ اپنی جگہ لیکن وہ یہ برداشت نہ کرسکا کہ بے قصور شہری اتنی بے رحمی سے قتل کیے جائیں۔ وہ شیر کی طرح گرجتا ہوا حیدر نگر پہنچ گیا۔ جنرل میتھیوز نے اپنی فوجوں کو بھی اس کے مقابل صف آرا کردیا۔

ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ جنرل میتھیوز پر ٹیپو کا

رعب طاری ہوگیا۔ وہ اپنے لشکر کو لے کر قلعے میں واپس چلا گیا اور قلعہ بند کرلیا۔ سلطان ٹیپو نے اپنے توپ خانے کو حکم دیا کہ وہ قلعے پر آگ برسانی شروع کردے۔

ٹیپو نے تیرہ توپ خانے لگانے کا حکم دیا جن کی متواتر گولہ باری سے قلعے کی عمارتوں کو خاصا نقصان پہنچا۔ متواتر گولہ باری سے روزانہ متعدد انگریز سپاہی مارے جاتے تھے۔

کہتے ہیں قلعے میں ایک ہی کنواں تھا جس میں فصیل کا ایک حصہ ٹوٹ کر گرا اور کنواں بند ہوگیا۔ پانی کی سخت قلت پیدا ہوگئی۔ میسوری فوج نے گھاٹوں کے دروں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ پانی کے لیے جو بھی قلعے سے نکلتا ٹیپو کے سپاہی اسے بھون کر رکھ دیتے۔

قلعے میں پناہ لینے کی سب جگہیں ٹیپو کی توپوں نے مسمار کردی تھیں لہٰذا میتھیوز کے زخمی سپاہی دن بھر دھوپ میں پڑے رہنے پر مجبور تھے۔ رسد ملنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گولہ بارود روز بہ روز کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اٹھارہ دن تک مدافعت کرنے کے بعد جنرل میتھیوز نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ نائب قلعہ دار محمد علی بیگ صلح کا جھنڈا ہاتھ میں اٹھائے باہر نکلا اور سلطان کے کیمپ میں آگیا۔ میتھیوز نے اسے صلح کے لیے گفت و شنید کرنے بھیجا تھا۔ قلعہ دار نے قلعہ کے اندرونی حالات تفصیل سے بتائے۔ وہ اپنے ساتھ میتھیوز کی جانب سے لکھی ہوئی کچھ شرطیں بھی لایا تھا کہ اگر ان شرطوں کو تسلیم کرلیا جائے تو قلعہ اور شہر سلطان کے حوالے کردیا جائے گا۔ شرطیں یہ ہیں۔

انگریزی فوج جنگی اعزاز کے ساتھ قلعے سے باہر آئے گی۔ ہتھیار قلعے کی پشت پر جمع کرائے گی اور وہ تمام سامان جو سلطان کی ملکیت ہے، قلعے میں چھوڑ دے گی۔ بلا کسی مزاحمت کے بمبئی تک مارچ کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

سلطان ٹیپو نے ان شرائط کو تسلیم کرلیا۔ اٹھارہ روز کی جان توڑ کوشش کے بعد قلعے پر سلطان کا قبضہ ہوگیا۔ اس معاہدے کا نام معاہدۂ حیدر نگر رکھا گیا تھا۔

اس معاہدے میں یہ کہا گیا تھا کہ انگریز فوج اپنے ذاتی سامان کے سوا کچھ نہیں لے جائے گی لیکن جب انگریز فوج کی روانگی سے قبل ایک سردار کو قلعے کے اندر بھیجا گیا کہ وہ خزانے پر قبضہ کرلے تو خزانہ خالی پڑا تھا۔ دراصل میتھیوز نے اپنے افسروں کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ خزانے سے جتنا چاہیں نکال لیں۔ افسروں نے تمام ہیرے جواہرات نکال کر جہاں چھپا سکتے تھے، چھپا لیے۔

ٹیپو نے میتھیوز سے باز پرس کی تو وہ آگ بگولہ ہوگیا۔

"میں نے یا میرے کسی آدمی نے خزانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ تمہارے سردار نے خرد برد کی ہو تو الگ بات ہے۔"

"یہ سمجھ لو، اگر میں نے تلاشی لی اور تمہارے آدمیوں کے پاس سے خزانہ نکل آیا تو پھر میں معاہدے کا پابند نہیں رہوں گا۔"

"سپاہیوں کی انفرادی چوری کا میں ذمے دار نہیں۔"

"جب معاہدہ ہی نہیں رہے گا تو مجھ پر بھی کوئی ذمے داری نہیں رہے گی۔" ٹیپو نے کہا اور حکم دیا کہ انگریز سپاہیوں کی جامہ تلاشی لی جائے۔

جس سپاہی کی تلاشی لی گئی اس کے لباس کے اندر کی تہوں میں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے نکلے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیرے جواہرات کا ایک ڈھیر فرش پر لگ گیا۔

ٹیپو کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "میں اس معاہدے کو منسوخ کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی حکم دیا۔ "انگریز فوج اور جنرل میتھیوز کو سرنگاپٹم پہنچایا جائے اور انہیں قید میں رکھا جائے۔"

حیدر نگر کا باغی قلعہ دار ایاز خاں پہلے ہی منگلور بھاگ گیا تھا۔ اسے جب حیدر نگر پر سلطان کے قبضے کی اطلاع ہوئی تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب سلطان منگلور کی طرف بڑھے گا۔ وہ منگلور سے بھاگ کر سورت پہنچا اور وہاں سے انگریزوں کے پاس بمبئی چلا گیا۔

جنرل میتھیوز اس شرم ناک شکست اور گرفتاری سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ قید کے دوران بیمار ہوا اور کچھ دنوں بعد مر گیا۔

انگریزوں نے ٹیپو پر الزام لگایا کہ اس نے میتھیوز کو زہر دے کر مار ڈالا۔ ان کی جنگی کونسل نے قرارداد پاس کی کہ ٹیپو سے اس قتل کا بدلہ لیا جائے گا۔

ٹیپو اس عظیم فتح کے بعد منگلور کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

معزول راجا میسور اور اس کے بعد اس کی اولادیں مسلسل ان کوششوں میں مصروف رہیں کہ کسی طرح میسور میں ہندو راج قائم ہوجائے۔ حیدر علی کی زندگی میں بھی یہ کوششیں جاری رہیں اور کئی سازشیں پکڑی گئیں۔ اب ٹیپو ان سازشوں کا نشانہ تھا۔

ایک خطرناک سازش کا جال اس کے گرد بھی تیار ہورہا تھا۔ اس مرتبہ ایک ہندو سردار انچے شامیا اس سازش کا خالق تھا۔ سرنگاپٹم میں ہونے والی ہر سازش میں راج محل کی رانیاں اور مندروں کے پنڈت وغیرہ بالواسطہ شریک ہوتے تھے۔

اس سازش میں بھی یہ سب شریک تھے لیکن سازش کی نوعیت ایسی تھی کہ قلعہ دار کو ملانا ضروری ہوگیا تھا۔ یہی ایک مشکل تھی جسے دور کرنے کے لیے انچے شامیا غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

ٹیپو نے جب سے اقتدار سنبھالا تھا وہ دشمنوں کا پیچھا کرتا پھر رہا تھا۔ جشن تاج پوشی کے بعد اسے دارالسلطنت لوٹ کر آنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ انچے شامیا کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ وہ اس کی آمد سے پہلے اس سازش پر عمل درآمد کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس وقت راج محل گیا ہوا تھا۔ بوڑھا راجا اور چند رانیاں اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ راجا اسے بتا رہا تھا کہ ٹیپو منگلور کے محاصرے کے لیے روانہ ہوچکا ہے۔ اس محاصرے میں اسے کئی مہینے لگ سکتے ہیں۔ انچے شامیا نے یہ سن کر ٹھنڈی سانس بھری۔ اسے یہ سن کر اطمینان تو ہوگیا تھا کہ اس کے پاس وقت بہت ہے لیکن اب بھی ایسی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسی وقت ایک لونڈی اجازت لے کر اندر آئی اور جو اسے کرنا تھا وہ کام کر کے واپس چلی گئی۔ یہی وقت تھا کہ انچے شامیا کے شیطانی دماغ کو حرکت ہوئی۔

"یہ لڑکی کون تھی؟"

"ملازمہ ہے۔"

"اس سے پہلے تو نظر نہیں آئی۔"

"نئی آئی ہے تم نے نہیں دیکھی ہوگی لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھے اس کا چال چلن اچھا نہیں لگا۔"

"ہمیں ملازموں کے چال چلن سے کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے، اسے کسی نے یہاں جاسوسی کے لیے بھیجا ہو۔"

"تم ایسے کیسے کہہ سکتے ہو۔ کس نے بھیجا ہوگا جاسوسی کے لیے؟"

"ٹیپو کی ماں بھی بھیج سکتی ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"اسے میرے حوالے کردو۔ پھر میں اس کا جو بھی کروں۔"

"ابھی لے جاؤ۔"

"ایسے نہیں۔ اس پر جاسوسی کا الزام لگا کر نکالو تا کہ یہ میرا احسان مند رہے۔"

اس لونڈی کا حسن و جمال دیکھ کر انچے شامیا کو قلعہ دار کی یاد آگئی تھی۔ قلعہ دار بلا کا عیاش تھا۔ عورت اس کی کمزوری تھی۔ وہ اس لونڈی کو قلعہ دار کے سامنے پیش کر کے اسے اپنے مطلب کے حصول کے لیے خرید سکتا تھا۔

دوسرے دن راج محل میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ منصوبے کے تحت لونڈی پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا۔ راجا نے حکم دے دیا کہ اسے زہر دے کر ہلاک کردیا جائے۔ اسی وقت انچے شامیا وہاں پہنچ گیا۔

"راجا جی آپ کیوں اس کے خون سے ہاتھ رنگتے ہیں۔ اسے میرے حوالے کردو۔ میں قلعہ دار کے حوالے کردوں گا، وہ اسے موت کے حوالے کردے گا۔ جاسوسی کرنے والوں کا انجام یہی ہونا چاہیے۔"

راجا نے اس لونڈی کو انچے شامیا کے حوالے کردیا۔ اس نے بھی شکر بھیجا کہ جان تو بچی۔ نوکری ہی کرنی ہے تو کہیں اور سہی۔ اسے تو اس وقت پچھتاوا ہوا جب انچے شامیا نے گھر پہنچ کر اسے حکم دیا کہ وہ نہا دھو کر خوب اچھی طرح تیار ہوجائے۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہی تھی کہ انچے شامیا اسے کہیں لے جانا چاہتا ہے لیکن جب وہ تیار ہو کر آئی اور انچے شامیا نے اسے خلوت میں طلب کیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

وہ اس کے پاس پہنچی تو وہ نشے میں بدمست ہورہا تھا۔

"آؤ خوبصورت پری...... ہم تمہارا ہی انتظار کررہے تھے۔" انچے شامیا نے کہا اور اسے گھسیٹ کر اپنی آغوش میں گرالیا۔ وہ تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔

"سردار جی، یہ کیا کررہے ہیں آپ؟"

"کیا تو اتنی بھولی ہے کہ تجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔"

"آپ اس وقت نشے میں ہیں، میں پھر آؤں گی۔"

"ایک معمولی لونڈی ہو کر تیری یہ ہمت کہ ہم سے ہمارا ہاتھ چھڑائے۔" انچے شامیا نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ بند کردیا۔

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔"

"تو مسلمان ہے؟"

"ہاں۔ اسی لیے میں تجھے ٹیپو کی دہائی دیتی ہوں۔ مجھے بے عزت مت کر۔"

"واہ! خوبصورت بھی اور مسلمان بھی۔ خوب مزہ آئے گا۔"

وہ چیختی رہی مگر کب تک چیختی۔ انچے شامیا کے فولادی ہاتھوں نے اس کا لباس تار تار کردیا۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

انچے شامیا نے کچھ دن اسے اپنے پاس رکھا۔ جب دل بھر گیا تو اسے لے کر قلعہ دار کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لونڈی اتنی خوبصورت تھی کہ اسے دیکھ کر قلعہ دار کے منہ میں پانی بھر آیا۔

www.Paksociety.com

”یہ ایک بے سہارا مسلمان لڑکی ہے۔ اب یہ آپ کے زیرِ سایہ زندگی گزارے گی۔“ اینچے شامیا نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی کہ ایک مسلمان لڑکی کو سہارا دوں۔“ قلعہ دار نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”تو پھر میں اسے آپ کے پاس چھوڑ جاؤں؟“

”آپ نے اسے جس طرح اپنے پاس رکھا ہے میں بھی اسی طرح رکھوں گا۔“

وہ لڑکی یہ سن کر سہم گئی لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن بھی ہوگئی کہ قلعہ دار کو کیا معلوم اینچے شامیا نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ تو یہ کہنا چاہ رہا ہوگا کہ جس طرح تم نے آرام سے رکھا ہے اسی طرح میں بھی رکھوں گا۔ اس کی یہ غلط فہمی تو اس وقت دور ہوئی جب وہ دونوں پینے کے لیے بیٹھے اور حکم ہوا کہ وہ دونوں کا دل بہلائے۔

”قلعہ دار جی، آپ تو مسلمان ہیں اور ٹیپو کے وفادار بھی۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر ٹیپو کے نام کی دہائی دی۔ اس مرتبہ بھی اس کی پکار ضائع چلی گئی۔

قلعہ دار نے اسے اپنی داشتہ بنا لیا تھا۔ اینچے شامیا بھی تقریباً روز آنے لگا تھا۔ ایک روز یہ غیر معمولی واقعہ پیش آیا کہ جب اینچے شامیا آیا تو قلعہ دار نے اس لڑکی کو کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔

”آج ہم اکیلے بیٹھ کر پئیں گے۔ جب تمہاری ضرورت ہوگی تو تمہیں بلا لیا جائے گا۔“

وہ لڑکی اٹھی اور محل کے دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن وہ یہ سوچ ضرور رہی تھی کہ اسے کیوں ہٹا دیا گیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتی رہی پھر خاموشی سے چلتی ہوئی اس کمرے تک آگئی جہاں وہ دونوں بیٹھے شراب کے جام خالی کر رہے تھے۔ ان کی بوجھل آوازیں صاف بتا رہی تھیں کہ دونوں کا نشہ گہرا ہو چکا ہے۔ انہوں نے اتنی بے احتیاطی کی تھی کہ دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور باتیں سننے لگی۔

”تمام لوگوں سے بات ہو چکی ہے۔ کوٹمور سے سنکھیا آچکا ہے اس سے بھی بات ہو چکی ہے۔ رنگا آینگر بھی پوری طرح تیار ہے۔ نرسنگا راؤ بھی تیار ہو چکا ہے۔ ایک آدمی انگریزوں کی طرف بھی بھیج دیا ہے۔ گورنر جھلانے میں نہیں آرہا ہے، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ انگریز جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، وہ بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔ ٹیپو کا تختہ الٹ کر ہم اپنا راج قائم کریں گے۔“

”یہ کام کب ہوگا؟“ قلعہ دار کی آواز ابھری۔

”فوج کی تنخواہ تقسیم ہونے والے دن۔ اس روز وہ منتشر ہوں گے اور غیر مسلح بھی۔ بس چار دن باقی رہ گئے ہیں۔“

وہ لونڈی دروازے سے لگی یہ باتیں سن رہی تھی۔ اسے ان معاملات سے کوئی غرض نہ ہوتی لیکن وہ ان دونوں سے اتنی نفرت کرتی تھی کہ انہیں پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ راجا کے جس خاندان نے اس پر جاسوسی کا الزام لگایا تھا ان کا اقتدار وہ کبھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے دروازے کے پاس سے ہٹ گئی۔ اس کے کانوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس نے کیا سنا ہے۔ پھر جیسے اسے ہوش آگیا۔ یہ باتیں مجھے کسی تک پہنچانی چاہئیں۔ اسے یاد آیا، ایک صوبے دار کبھی کبھی اس کے پاس آتا تھا اور اس سے لگاوٹ کی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتی تھی اس لیے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھی۔ اس نے سوچا اس صوبے دار کو تمام حالات سے آگاہ کر دے۔ اتفاق یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن وہ آبھی گیا۔ اس لونڈی نے اسے اس سازش سے آگاہ کر دیا۔

یہ صوبے دار فوراً گورنر سرنگا پٹم سید محمد سے ملا اور سازش کا پردہ چاک کر دیا۔ گورنر نے فوراً کارروائی کی۔ سازش کے سرغنہ گرفتار کر لیے گئے۔ سنکھیا کو بہت سے باغیوں کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نرسنگا راؤ کو پھانسی دے دی گئی۔ اینچے شامیا کو گرفتار کر لیا گیا کہ اس کا فیصلہ ٹیپو خود کرے گا۔

☆☆☆

ٹیپو ابھی منگلور پہنچا نہیں تھا کہ اسے یہ خبر ملی کہ کرنل کیمبل ایک بڑے لشکر کے ساتھ حیدر نگر کی طرف جا رہا ہے۔ سلطان ابھی منگلور سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا کہ اسے یہ خبر مل گئی۔ سلطان کے پاس ایک لاکھ سے زیادہ جاں بازوں کا لشکر تھا اس لیے اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے حملے کا حکم دے دیا۔ لشکر نے پیچھا کیا اور کرنل کیمبل کو جا لیا۔ کیمبل نے بھی سامنے آکر لشکر ترتیب دیا۔

دونوں طرف سے گولہ باری شروع ہوگئی۔ دوپہر پوری ہوئی نہیں تھی کہ انگریزوں کا گولہ بارود ختم ہوگیا۔ کرنل اپنے لشکر کو لے کر قلعے کی طرف بھاگا۔

ٹیپو جب منگلور پہنچا تو اس وقت تک انگریز ایک اہم

مورچے ٹیپو پر قبضہ کر چکے تھے۔ وہاں سے شہر کو جانے والا راستہ صاف نظر آتا تھا جو ایک میل کے فاصلے پر تھا لیکن شہر کا محاصرہ ہو جانے کے بعد سپاہیوں کے پسپا ہو کر بھاگنے کا راستہ بند ہو گیا تھا چنانچہ جب حملہ ہوا تو ان میں دہشت پھیل گئی اور وہ قلعے کی طرف بدحواسی سے بھاگے اور خود کو قلعے کے اندر محصور کر لیا۔ ٹیپو نے محاصرہ کر لیا۔

ٹیپو کی طرف سے ہونے والی گولہ باری قلعے کی دیواروں میں مسلسل شگاف ڈال رہی تھی۔ قلعے تک رسائی پانے کے لیے مورچے برابر قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ محاصرے کو چار مہینے ہو چکے تھے۔ میسوری فوج قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

محصورین کی حالت روز بہ روز پتلی ہوتی جا رہی تھی۔ بنگال کے گورنر لارڈ ہیسٹنگز کو اس محاصرے پر تشویش تھی۔ ٹیپو کے محاصرے نے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے گھبرا کر دو کمشنروں کو سلطان ٹیپو کی طرف روانہ کیا کہ وہ وہاں جا کر سلطان سے صلح کی شرائط طے کریں۔

دونوں کمشنروں کا وفد منگلور کے قریب پہنچا تو سلطان نے اپنے دو افسروں کو استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ وفد سلطان کے لیے بیش قیمت تحائف لے کر آیا تھا۔ سلطان نے اس مغرور قوم کے ان دونوں کمشنروں سے ملاقات کی زحمت نہیں کی بلکہ اپنے دو مقربین پورنیا اور کرشن راؤ کو بات چیت کے لیے بھیجا۔

ان ملاقاتوں کے کئی دور ہوئے اور بالآخر ایک معاہدہ طے پا گیا جسے ”معاہدۂ منگلور“ کہا جاتا ہے جس میں طے پایا کہ فریقین ایک دوسرے سے جنگ کریں گے اور نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد کریں گے۔ فریقین کے علاقوں کو واگزار اور قیدیوں کو واپس کر دیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

معاہدۂ منگلور سلطان ٹیپو کی زبردست فتح تھی۔ اس صلح نامے کی نقل انگلستان پہنچی تو وہاں صف ماتم بچھ گئی۔ شکست کے اس داغ کو دھونے کے لیے بڑے پیمانے پر ردوبدل ہوا۔ گورنر مدراس اور گورنر جنرل کو فوری طور پر انگلستان واپس بلا لیا گیا۔ ایک ایسے شخص کو گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا جس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ جنوبی ہند میں اچھی طرح قدم جما کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے راہ ہموار کرے گا۔ وہ قوم جو تجارت کی غرض سے آئی تھی اور مدراس میں ڈیرے ڈالے تھے، اب ہندوستان پر قبضے کے لیے اپنی فوجیں اتار رہی تھی۔

اس نئے گورنر جنرل کا نام کارنوالس تھا۔ وہ چونکہ امریکی جنگ آزادی کو دبانے میں ناکام رہا تھا اس لیے اسے ہندوستان میں برطانیہ کے لیے ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ گویا وہ ہندوستان میں اپنے ہم قوموں کی نظروں میں سرخرو ہو سکتا تھا۔ اس نے انگلستان سے روانگی سے قبل حکام کو یقین دلایا تھا کہ وہ سلطان ٹیپو کو نیست و نابود کر دے گا۔

کارنوالس 1786ء میں کلکتہ پہنچا تو خزانے کو خالی اور کشت دہقان کو غیر مزروعہ پایا۔ کمپنی کے مظالم نے بنگال کے سرسبز اور زرخیز گاؤں ویران کر دیے تھے۔ بدنظمی نے کسانوں کو حسرت و یاس کی تصویر بنا دیا تھا۔ قحط نے سیکڑوں خاندانوں کے کلی افراد کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

مرہٹہ سردار سندھیا نے اس سے بھی بنگال کا سالانہ خراج طلب کیا لیکن اس نے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے نواب اودھ سے بھی بدترین سلوک کیا۔ نظام سے گنٹور کا علاقہ چھین لیا۔

عہد نامۂ منگلور کارنوالس کے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے انگریزوں نے ٹیپو کو اپنا حلیف قرار دیا تھا اور بہ وقت ضرورت دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کیا تھا لیکن کارنوالس ٹیپو سے صرف اس لیے جنگ آزما نہیں ہونا چاہتا تھا کہ امریکی نقصانات کی تلافی ہو سکے۔ عہد نامہ منگلور کی رو سے وہ ٹیپو سے جنگ آزما نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اس نے ایسا رویہ اختیار کیا جس سے ٹیپو کو یقین ہو جائے کہ کارنوالس اس کا دشمن ہے۔ اس نے نظام دکن کو اپنے حلیفوں کی ایک فہرست بھیجی تو ٹیپو کا نام عمداً اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ ٹیپو کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ کارنوالس اس سے ضرور جنگ کرے گا۔ کارنوالس نے مرہٹوں اور نظام کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تو ٹیپو نے بھی اپنے اتحادی تلاش کرنے کے لیے سفارتی کوششیں شروع کر دیں۔

کارنوالس کی نیت کو دیکھتے ہوئے اس نے شہنشاہِ دہلی کو متعدد خطوط لکھے جن میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے مدد مانگی گئی تھی۔

مغلوں کا یہ حال تھا کہ مرہٹے ان کے سروں پر ناچ رہے تھے۔ خزانہ خالی تھا اور وہ انگریزوں سے قرض لے رہے تھے۔ شاہ عالم ہندوستان کا شہنشاہ تھا لیکن اس کی حیثیت ایک بے ملک نواب کی تھی۔ وہ اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ وہ ٹیپو کو تسلیاں دیتا رہے۔

اس طرف سے مایوس ہو کر اس نے تمام عمائدین

www.Paksociety.com

سلطنت کو جمع کیا۔ اس مجمع میں اس نے اعلان کیا۔

''شہنشاہ دہلی عملی طور پر بے بس اور نام کا بادشاہ رہ گیا ہے لیکن اب تک خطبۂ جمعہ میں اس کا نام پڑھا جاتا ہے جبکہ خطبے میں اس حکمران کا نام شامل کرنا چاہیے جو بالکل آزاد اور خود مختار ہو اور جس کی زندگی کا مقصد دینِ اسلام کی خدمت کرنا ہو۔ اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ خطبۂ جمعہ میں ہمارا نام بہ طور سلطان پڑھا جائے۔''

سلطنتِ خداداد میسور کی ہزاروں مساجد میں خطبۂ جمعہ میں سلطان کا نام لیا جانے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی ریاست ایک خود مختار ریاست بن گئی۔

کارنوالس اس شہر کو گھیرنے کے لے جو جال بچھا رہا تھا اس کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ ایک تو یہ کہ سلطان ٹیپو کو ہمسایوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رکھا جائے تاکہ انگریزوں کو اپنی طاقت بڑھانے کے لیے مناسب وقت مل جائے دوسرے یہ کہ ٹیپو کے خلاف پروپیگنڈا کر کے یہ ظاہر کیا جائے کہ ٹیپو نہایت ظالم اور سفاک ہے اور انگریز اس بات کے خواہش مند ہیں کہ میسور کو سلطان سے چھین کر اس کے اصل حاکموں کے حوالے کریں۔ چنانچہ فورٹ ولیم کی دیواروں پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا گیا کہ ٹیپو سفاکی میں چنگیز اور ہلاکو سے کہیں زیادہ ہے۔

ہمسایوں سے لڑوانے کے لیے مرہٹوں اور نظام دکن سے مدد لی جارہی تھی۔ اردگرد کے مقبوضہ علاقوں میں بغاوتوں کے بیج بونا انگریزوں کی حکمت عملی کا نتیجہ تھا لہٰذا ٹیپو کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔

ابھی وہ منگلور سے فارغ ہو کر سرنگاپٹم پہنچا تھا کہ کورگ میں بغاوت پھیلنے کی خبریں اس سے پہلے پہنچ گئیں۔

کورگ ریاست میسور کا سب سے زرخیز اور جنت نظیر علاقہ تھا۔ کمر کمر تک کھیت لہلہاتے تھے۔ جنگلوں میں ساگوان اور صندل کے قیمتی درخت تھے۔ سیاہ مرچ کے مسلسل جال نہایت دلفریب معلوم ہوتے تھے۔ چھوٹی الائچی کے درختوں کے نیچے اعلیٰ درجے کی الائچیاں سنگریزوں کی طرح بکھری رہتی تھیں۔ دار چینی کے درخت آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ باغستانی درختوں میں فالسہ، اناس، کٹھل، جامن وغیرہ کو دیکھ کر اس سرزمین پر بہشت کا گمان ہوتا تھا۔ یہی حال پھولوں کا تھا۔ گلمہندی، گیندا، نسرین، سوسن اور چمپا کے پھول آنکھوں کو تراوٹ بخشتے رہتے تھے۔ ان کی عورتیں حسن کی دیویاں نظر آتی تھیں۔

اس علاقے کو حیدر علی نے فتح کر کے اپنے علاقے میں شامل کیا تھا۔ بغاوت کا سنتے ہی وہ بارہ ہزار پیادہ اور دس ہزار سوار لے کر نکلا اور کورگ کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ اس کے سواروں نے بڑے بڑے شہروں کا رخ کیا اور خود پیادہ فوج لے کر اندرون علاقہ بڑھا۔ رن منڈل مقام پر باغیوں سے مقابلہ ہوا۔

شدید جنگ کے بعد سلطان نے باغیوں کو شکست دے دی۔ باغیوں نے لڑنے کی سکت نہ دیکھی تو جنگلوں میں چھپ کر گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا۔ ٹیپو نے بھی انداز بدلا۔ فوج کو ایک جگہ جمع رہنے کے بجائے اپنے سرداروں کو اطراف و جوانب میں روانہ کیا۔

یہ علاقہ بہت طویل رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور پھر جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ٹیپو کو ان باغیوں کا قلع قمع کرنے میں پورے آٹھ ماہ لگ گئے لیکن پورے علاقے کو از سرِ نو مسخر کر لیا۔ ایک بھی باغی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ کہتے ہیں آٹھ ہزار مرد و عورت گرفتار ہوئے۔ باغیوں کی پناہ گاہیں نذرِ آتش کر دیں۔ غرض ایسا نظم و نسق کیا کہ اتنے بڑے علاقے میں اعلانیہ یا پوشیدہ ایک بھی باغی زندہ نہ چھوڑا۔

وہ آٹھ دس مہینے کی غیر حاضری کے بعد سرنگاپٹم واپس آیا تو اسے اطلاع ملی کہ نظام حیدرآباد نے مرہٹوں کے ساتھ مل کر سازش شروع کر دی ہے۔ مرہٹوں کے ساتھ مل کر میسور پر حملہ کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً انگریز بھی ہوں گے۔ معاہدۂ منگلور ان کے گلے کی ہڈی بنا ہوا تھا۔ اب وہ اپنے حلیفوں کے ذریعے ٹیپو کو کمزور کر دینا چاہتے تھے تاکہ خانہ جنگی کو بہانہ بنا کر اس جنگ میں خود بھی کود پڑیں۔ یہ دونوں حریف اس بیرونی دشمن کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ مرہٹوں کی تو خیر تھی لیکن نظام دکن تو مسلمان تھا۔ وہ بھی ٹیپو سے مصالحت کی ہر کوشش کو ٹھکراتا چلا جارہا تھا۔

ٹیپو نے آخری کوشش کے طور پر نظام کے نام ایک دردمند اپیل لکھی اور اپنے ایلچی کے ہاتھ یہ خط نظام کی خدمت میں بھیجا۔

''میں ٹیپو سلطان مسلمانوں کی سلطنت کو تقویت دینا چاہتا ہوں۔ ایسی حالت میں تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ میرا ساتھ دیں۔

''افسوس کہ میں نے نظام علی خاں کو کئی بار مخفی پیغامات کے ذریعے سمجھایا لیکن وہ مرہٹوں کی یلغار کو اپنے ملک سے دور رکھنے کے لیے ان کی دوستی کو غنیمت سمجھتے رہے حالانکہ مرہٹوں نے حیدرآباد کو نقصان پہنچایا۔ اس سب کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ میری طاقت کو اپنی طاقت سمجھتے اور جب یہ دونوں

www.Paksociety.com

طاقتیں مل جاتیں تو مرہٹوں کو اپنے علاقے سے باہر نکلنے کی ہمت بھی نہ ہوتی۔

اس کا سب سے بڑا سبب انگریزوں کی وہ چال ہے جس نے ہمیں اور نظام کو ملنے نہیں دیا۔ اب میرے اور نظام علی خاں کے متحد ہونے کی صورت یہ ہے کہ میرے خاندان کی لڑکیاں نظام کے بیٹوں اور بھتیجوں سے بیاہی جائیں تاکہ طرفین میں یگانگت کے دروازے وا ہوں اور سب کو معلوم ہو جائے کہ دو اسلامی ملکوں میں اتحاد اور اتفاق ہو گیا ہے۔“

اس خط کے ساتھ قیمتی جواہرات اور تحائف اور امرا کے لیے خلعتیں بھی بھیجیں۔ نظام اس وقت تو اس خط سے متفق نظر آتا تھا لیکن بعد میں نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے اس منصوبے کو ناقابلِ عمل قرار دے کر ایلچی کو واپس کر دیا۔

دراصل سازشوں اور بدگمانیوں کی ایسی ہوا چلی ہوئی تھی کہ کسی نے بھی اسے بہکا دیا ہوگا۔ انگریز یہ کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس طرف سے کوئی مشورہ ملا ہو۔ خود ٹیپو کے دربار میں میر صادق جیسا غدار وزیر اعظم بنا ہوا تھا اور پورنیا وزیر مالیات تھا۔ ایک وقت وہ آیا جب یہ دونوں کھل کر سامنے آ گئے اور ٹیپو کی شہادت کا سبب بنے۔

ایلچی کے بے نیل و مرام واپس آنے پر ٹیپو کو زبردست دھچکا لگا۔ وہ انگریزوں کے خلاف جس جہاد میں مصروف تھا اس میں کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ شہنشاہِ دہلی سے بھی امید نہیں رہی تھی۔ نظام نے بھی کورا جواب دے دیا، اردگرد کی ریاستیں بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ ساتھ نہیں دے رہی تھیں بلکہ انگریزوں کی حلیف بن کر ٹیپو کے مشن کی جڑیں کھوکھلی کر رہی تھیں۔

اس نے ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد خلیفہ اسلامی سلطان ترکی کو امید کا ستارہ سمجھا اور ایک سفارتی وفد خلیفہ کے دربار میں قسطنطنیہ روانہ کیا۔ اس وفد کو پہلے ترکی اور پھر فرانس ہوتے ہوئے انگلستان جانا تھا اور وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم سے حکومتِ انگلستان کو آگاہ کرنا تھا۔

اس وفد کے بھیجنے کا مقصد بہ ظاہر تجارتی تعلق قائم کرنا تھا لیکن اصل مقصد ترکی کی مدد سے انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا تھا۔ جو کچھ پس پردہ کہنا تھا وہ اس وفد کے ارکان کو سمجھا دیا گیا تھا۔

اس وفد کے ارکان میں میر غلام علی (جو ٹیپو کے آخری دنوں میں غداری کا مرتکب ہوا) لطف علی بیگ، نوراللہ خاں، جعفر خاں اور بخش محمد حنیف شامل تھے۔

یہ وفد بیش قیمت تحائف لے کر حاجیوں کے ایک قافلے کے ساتھ بحری جہاز میں روانہ ہوا۔ اس قافلے کو بحرِ قلزم اور مصر سے ہوتے ہوئے سب سے پہلے قسطنطنیہ جا کر عثمانی خلیفہ کے حضور پیش ہونا تھا۔

بصرہ پہنچتے ہی وفد کو سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا۔ عثمانی خلیفہ کی طرف سے سفارت کو قسطنطنیہ آنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ اس کشمکش میں پانچ ماہ گزر گئے۔ آخر میر غلام علی اکیلا قسطنطنیہ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے عجیب ہوا چلتی ہوئی دیکھی۔ انگریز بھی انگلستان سے سفارت پر آئے ہوئے تھے اور خلیفہ کو فرانس کے خلاف بھڑکا کر انگریزوں سے معاہدہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ انگریزوں کی جیت اسی میں تھی کہ انگریزوں اور خلیفہ کے درمیان معاہدہ ہو جانے سے پہلے ہندوستانی سفارت کو خلیفہ سے نہ ملنے دیا جائے۔ ترکی کا سفیر اور دیگر وزیر انگریزوں کے ہاتھ کا کھلونا بنے ہوئے تھے لہٰذا نو ماہ تک اسے خلیفہ کے حضور پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

میر غلام علی خلیفہ سے تو نہیں مل سکا لیکن انگریزوں کے جال میں پھنس گیا۔ انگریزوں نے وزیر اعظم ترکی کے ذریعے میر غلام علی سے روابط استوار کر لیے۔ میر غلام علی شراب کا عادی تھا۔ انگریزوں کے ذریعے اسے شراب ملنے لگی تو وہ ان کی محفلوں میں پابندی سے جانے لگا۔ ایک روز شراب کا دور چل رہا تھا۔ میر غلام علی کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آ گیا تھا۔ وہ جام لے کر کھڑا ہو گیا اور انگریزوں کے خلاف ایک تقریر سی کر ڈالی۔

یہ تک کہہ دیا۔ ”بس خلیفہ سے ملاقات ہونے کی دیر ہے۔ پھر دیکھنا تم لوگ ہندوستان میں کیسے رہتے ہو، میں یہاں بھیجا ہی اس لیے گیا ہوں کہ تمہیں ہندوستان سے نکالنے کے لیے خلیفہ سے مدد مانگوں۔“

”تمہارا ٹیپو تو بڑا بہادر بنتا ہے پھر یہ بزدلی کیوں۔ خلیفہ کی مدد کیوں مانگ رہا ہے؟“

”اگر تم بزدل نہیں ہو تو خلیفہ سے مجھے ملنے کیوں نہیں دیتے۔ یاد رکھو اگر خلیفہ نے مدد نہیں کی تو بھی ہم تمہیں ہندوستان سے نکال باہر کریں گے۔“

اس نے نشے میں وہ راز اگل دیا جسے رازداری سے پہنچانے کے لیے سلطان نے اسے اور وفد کے دوسرے ارکان کو یہاں بھیجا تھا۔

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

انگریزوں کو جونہی اس راز کا علم ہوا انہوں نے وزیر اعظم کو خبردار کر دیا کہ وہ خلیفہ کو پہلے ہی اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ ٹیپو کے خیالات کی تائید نہیں کرے گا۔

وزیر اعظم ترکی پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ اس نے ہندوستانی وفد کے خلاف خلیفہ کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ جب اس کی یہ کوششیں اثر انداز ہو گئیں تو اس نے میر غلام علی کو خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا۔

ٹیپو نے جو خط خلیفہ کے نام تحریر کیا تھا اس کا آغاز ہی اس جملے سے ہوتا تھا۔

”میں انگریزوں سے جہاد میں مصروف ہوں اس لیے آپ کی تائید چاہتا ہوں۔“

اس خط میں اور بھی معاہدے تحریر تھے۔ خلیفہ کا جھکاؤ پہلے ہی انگریزوں کی طرف ہو چکا تھا۔ اس نے سلطان کے کسی بھی منصوبے کی تائید نہیں کی۔

اب تک انگریزوں کو صرف وہ معلوم تھا جو میر غلام علی نے بتایا تھا۔ اب انہیں وزیر اعظم کی زبانی خط کے مندرجات کا بھی علم ہو گیا۔ انہوں نے عرب اور ایران میں بھی سلطان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا لہٰذا آئندہ سلطان کو عرب و ایران سے بھی کوئی تعاون نہ مل سکا۔

☆☆☆

پونا کے مرہٹہ پیشوا اور دکن کے نظام میں گفت و شنید جاری تھی۔ ڈیڑھ مہینے تک مذاکرات جاری رہنے کے بعد بالآخر طے ہوا کہ دونوں کی فوجیں مل کر میسور پر دھاوا بول دیں۔ اپنے اپنے علاقے ٹیپو کے قبضے سے نکالنے کے بعد نظام اور مرہٹے باقی مقبوضہ علاقے آپس میں تقسیم کر لیں۔ دونوں کے وکیل جیسے ہی اس نتیجے پر پہنچے نظام اور مرہٹوں کی فوجیں سلطنتِ خداداد کی طرف بڑھیں۔ یہ متحدہ لشکر ایک لاکھ بیس ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔

ٹیپو کی شمالی سرحد کے ایک میدانی علاقے میں قلعہ بند وا ہی تھا جہاں تقریباً تین ہزار حفاظتی فوج تھی۔ اس کے علاوہ قلعے کے دونوں جانب دو پہاڑی قلعے بھی اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ تین ہفتے تک اتحادی دیواروں میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب نہیں ہوئے اس لیے انہوں نے براہ راست حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بیس ہزار پیادوں کو ساتھ لے کر دھاوا بول دیا لیکن جیسے ہی وہ آگے بڑھے بارود سے بھری خندقیں بھک سے اڑ گئیں۔ یہ سرنگیں میسوریوں نے حفاظت کی غرض سے بچھا دی تھیں۔ اس سے اتحادیوں کی بہت سی جانیں ضائع ہوئیں لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ وہ آگے بڑھے اور سیڑھیوں کے ذریعے دیواروں پر چڑھ گئے۔

حفاظتی فوج نے مزاحمت کی لیکن انہیں شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر قلعے میں گھس گئے۔ اتحادیوں نے پیچھا کیا اور قلعے میں گھسنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

قلعہ فی الحال بچا لیا گیا تھا لیکن اس کے کمانڈر حیدر بخش نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ زیادہ دیر جما نہیں رہ سکے گا۔ اس کے باوجود اس کی تین ہزار فوج جس میں سے بہت سے مارے جا چکے تھے کسی طرح قلعے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔

مرہٹہ اس قوت مدافعت پر سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس کے دماغ میں انگریزوں کی آواز گونجی۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ رہ کر یہ سیکھ لیا تھا کہ جو کام تلوار سے نہ نکلے، دولت کے جوتوں سے نکالو۔ اس نے فوراً جنگ روک دی اور اپنا پیام بر حیدر بخشی کے پاس بھیجا اور یہ تجویز پیش کی کہ قلعہ حوالے کرنے کے بدلے میں وہ جو بھی شرط رکھے گا، وہ پوری کی جائے گی۔

حیدر بخشی پہلے ہی اکتا چکا تھا۔ اس پیشکش کو اس نے نعمت سمجھا اور مرہٹہ پیشوا کے کیمپ میں آ گیا۔ اپنی فوج سے بہانہ یہ کیا کہ صلح کی شرائط طے کرنے جا رہا ہے۔ عہد کر کے گیا تھا کہ قلعہ کسی قیمت پر حوالے نہیں کرے گا۔ حیدر بخشی مرہٹہ پیشوا نانا صاحب کے سامنے پہنچا تو نانا کو خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ حیدر بخشی اس کے سامنے کھڑا ہے۔ حیدر بخشی کی اسی طرح پذیرائی ہوئی جیسے کسی کی مطلب نکالتے وقت ہوتی ہے۔

”حیدر جی، ہماری کوئی شرط نہیں ہے۔“ نانا نے کہا۔ ”جیت تو آپ کی ہوئی ہے، نو ماہ گزر گئے۔ ہم اب تک قلعے میں قدم بھی نہیں رکھ سکے ہیں۔ اب آپ بتائیے۔ ہم آپ کو منہ مانگی قیمت دیں گے۔ آپ قلعے سے سلطانی جھنڈا اتارنے کا کیا لیں گے۔ یہ وہ قلعہ ہے جو ٹیپو کے باپ نے زبردستی چھین لیا تھا۔ یہ آپ کی جیت ہے کہ یہ قلعہ ہمیں خریدنا پڑ رہا ہے۔“

ابھی نانا حیدر بخشی کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ رہا تھا کہ اس کے دو سردار پرشورام بابر اور ہری پنت اندر آئے۔

”اوہو! حیدر بخشی جی پدھارے (تشریف) ہیں۔ سمے بھی کیا کیا دکھلاتا ہے۔ یاد ہے نرگنڈ کے معاملے میں آپ نے ہم سے غداری کی تھی۔“ پھر وہ نانا سے مخاطب ہوا۔ ”آئے پنچھی کو جانے نہیں دینا چاہیے۔ انہیں گرفتار کر کے ہم پونا لے جاتے ہیں۔ انہیں ان کی غداری کی سزا بھی مل جائے گی اور بدامی بھی ہمارے ہاتھ لگ جائے گا۔“

نانا نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ”آپ دونوں نے

www.Paksociety.com

آنے میں دیر کر دی ورنہ شاید ہم آپ کی تجویز مان لیتے، اب تو ہمارا ان سے معاہدہ ہو چکا۔ ابھی ان سے اور بھی کئی کام لینے ہوں گے۔“

وہ دونوں سردار برا سامنہ بنا کر واپس چلے گئے۔

یہ محض اتفاق تھا یا ان دونوں کو اس لیے بلایا گیا تھا کہ حیدر بخشی کو خوف زدہ کیا جائے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد حیدر بخشی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے نانا کی تجویز کو قبول کیا اور بھاری رشوت طلب کر کے قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔

وہ قلعہ جو نو ماہ تک مقابلہ کرتا رہا تھا نو منٹ میں دشمن کے حوالے ہو گیا۔ حیدر بخشی سے یہ بھی وعدہ لے لیا گیا تھا کہ وہ ٹیپو کے ساتھ رہے گا لیکن ہماری مدد کرتا رہے گا۔

قلعہ بدامی کا فتح ہونا تھا کہ چھوٹے قلعہ داروں نے بغیر جنگ وجدل کے یا معمولی سا مقابلہ کرنے کے بعد یا حیدر بخشی کی طرح مال وصول کر کے اپنے قلعے دشمن کے حوالے کر دیے۔ دھارواڑ، جالی دار، بجندر، نوکنڈہ، نرگندہ وغیرہ مرہٹوں کے پاس پہنچ گئے۔

ٹیپو سلطان اس وقت کورگ میں تھا کہ اس کے وکیل نے یہ خبریں اس تک پہنچائیں۔ ٹیپو ہر مرحلے پر کوشش کرتا تھا کہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ اس مرتبہ پھر اس نے اپنے وکیلوں کو نظام اور نانا کے پاس پونا بھیجا۔ نظام سے یہ درخواست کی کہ وہ اس اتحاد سے الگ ہو جائے۔

”آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ میرے خلاف اعدائے اسلام کا ساتھ دیں اور اسلامی سلطنت کو تاراج کرنے کی کوشش کریں۔ آپ انگریزوں کے بہکائے میں آ کر ایک مسلمان بھائی کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں کے دشمن کا ساتھ دینے لگے ہیں۔ آپ ان کا ساتھ چھوڑ دیں اور میری طاقت کو اپنی طاقت سمجھیں۔“

پونا جا کر ٹیپو کے وکیل نے نانا صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”کیا آپ حیدر علی کا وہ احسان بھول گئے جب اس نے آپ کی اس وقت مدد کی تھی جب انگریزوں کے ہاتھوں آپ کے بے دخل ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ آپ نے انگریزوں کے اتحادی بن کر اس صلح نامے کو توڑ دیا جو آپ کے اور حیدر علی کے درمیان ہوا تھا اور اب اس کی مملکت کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔“

نانا کا جواب آیا کہ ٹیپو نے کئی سال سے خراج ادا نہیں کیا۔ جیسے ہی وہ خراج ادا کرے گا مخالفت اور جنگ ختم ہو جائے گی۔

وکیل نے جواب دیا۔ ”پہلے آپ جنگ بند کر دیں اور انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں، خراج ادا کر دیا جائے گا۔“ نانا اس پر تیار نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی ٹیپو نے کوشش جاری رکھی لیکن نانا نے صاف جواب دے دیا اور وکیل کو واپس چلے جانے کو کہہ دیا۔

دونوں طرف سے کورا جواب ملنے کے بعد ٹیپو بنگلور کی طرف روانہ ہو گیا تا کہ اپنی سلطنت کے دفاع کے انتظامات کر سکے۔ اس وقت اس کی فوج میں بارہ سو باقاعدہ فوج تھی۔ تیس ہزار سوار دس ہزار باقاعدہ پیدل اور 22 توپیں تھیں۔

اتحادیوں کا خیال تھا کہ ٹیپو بنگلور سے بدامی آئے گا۔ وہ سب بدامی میں جمع ہو گئے لیکن وہ انہیں حیرت میں ڈال کر یکا یک قلعہ ادھونی پہنچ گیا۔

یہ وہ قلعہ تھا جس پر نظام کے داماد مہابت جنگ نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ محض قلعہ نہیں تھا بلکہ نظام کی ایک مستحکم سرحدی چوکی تھی اور اس کے بھائی اور بال بچے وہاں رہتے تھے۔ ایک یہی ترکیب تھی جس کے ذریعے وہ اتحادی فوجوں کو اپنی سرحدوں سے نظام کا سرحدوں پر بلا سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے ادھونی کا انتخاب کیا تھا۔

مہابت جنگ نے جونہی ٹیپو کی آمد کا غلغلہ سنا تو وہ لرزہ براندام ہو گیا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اکیلا ٹیپو کے لشکر جرار کا مقابلہ کر سکتا۔ حرم سرا میں الگ کہرام مچا ہوا تھا۔ مہابت جنگ کے عقد میں نظام دکن کی بیٹی تھی۔ خوبصورت بھی تھی اور زیرک بھی۔ مہابت جنگ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ حرم سرا کی طرف بھاگا۔ شہزادی کو بھی اس واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے مہابت جنگ کی گھبراہٹ دیکھی تو ہنسے بغیر نہ رہ سکی لیکن جلد ہی اس کی ہنسی پر اس کا غصہ غالب آ گیا۔

”آپ مہابت جنگ کہلاتے ہیں اور ٹیپو کی ہیبت کا عالم یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔“

”آپ لاکھ عقل مند سہی لیکن جنگ کے میدان کو کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہو گا۔ ٹیپو یہاں شکار کھیلنے نہیں آ رہا ہے۔ میں ایک محدود فوج کے ساتھ اس کے لشکر جرار کا مقابلہ کب تک کروں گا۔ مقابلہ کیا بھی تو جتنا وقت گزرے گا اس کا غصہ بڑھتا جائے گا۔ مجھے خود سے زیادہ قلعے میں موجود عورتوں کا خیال ہے۔ نہ جانے اس کے سپاہی کیا سلوک کریں۔“

”اس کی شرافت مشہور ہے۔ وہ کبھی عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔“

”اس کا اخلاق مشہور ہے لیکن اس کے سپاہیوں کو دست درازی سے کون روک سکتا ہے۔“

”آپ کن باتوں میں الجھ گئے۔ یہ تو کوئی تدبیر سوچنے کا مقام ہے۔“

”اسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”جب طاقت کام نہ آئے تو مصلحت سے کام لیا جاتا ہے۔“

”یہ مصلحت ہی تو آپ بتائیں گی۔“

”مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ابا جان (نظام) اور مرہٹوں کے پاس آدمی دوڑائیں اور ان سے کمک طلب کریں۔ یہ کام جلدی ہونا چاہیے کیونکہ اگر ٹیپو ادھونی کے نواح میں پہنچ گیا تو کسی کا نکلنا محال ہو جائے گا۔“

”کمک کیا اتنی جلدی آ جائے گی۔ ٹیپو تو اس سے پہلے ہی حملہ آور ہو جائے گا۔“

”کمک آنے تک اسے باتوں میں الجھائے رکھنا آپ کا کام ہے۔ آپ دیوان اسد علی خاں کو اس کے پاس بھیجیں تا کہ وہ اسے ادھونی پر حملہ نہ کرنے کے لیے آمادہ کرے۔ کچھ دن اس میں گزر جائیں گے۔ اگر وہ نہ مانا تو اس سے درخواست کریں کہ وہ حرم شاہی کو قلعہ ادھونی سے بہ حفاظت نکل جانے کی اجازت دے۔ اس کے بعد قلعے کے دروازے اس پر کھل جائیں گے۔“

مہابت جنگ نے یہی کیا۔ اس نے دو ایلچی روانہ کیے۔ ایک کو مرہٹہ سردار ہری پنت کے پاس جانا تھا جو اس وقت ٹیپو کی سرحدوں کے قریب گجندر گڑھ میں تھا اور دوسرے کو [illegible]

[illegible] اور اس کے لشکر نے پڑاؤ کیا دونوں [illegible]

[illegible] دیوان اسد علی خاں کو آمادہ کیا کہ وہ [illegible] لشکر میں جائے اور ٹیپو سے ملاقات کر کے اسے ادھونی پر حملہ نہ کرنے کی ترغیب دے۔

اسد علی کا مشورہ یہ تھا کہ مہابت جنگ کو جانا چاہیے۔ ایک حاکم ہی دوسرے حاکم سے گفتگو کرتا ہوا اچھا لگتا ہے لیکن مہابت جنگ کو اپنی گرفتاری کا خوف تھا۔

”سلطان ٹیپو نظام پر دباؤ بڑھانے کے لیے مجھے گرفتار کر سکتا ہے۔ اس لیے میرا جانا ٹھیک نہیں میرے نمائندے کے طور پر تم جاؤ گے۔“

دیوان اسد علی کو مجبوراً ٹیپو کے لشکر میں جانا پڑا اور اس کے سامنے یہ درخواست رکھنی پڑی کہ وہ قلعہ ادھونی پر حملہ نہ کرے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ رقم کی بھی پیشکش کی تھی لیکن سلطان نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ اسد علی جواب پہنچانے کے لیے قلعے میں واپس آ گیا۔ مہابت جنگ نے دوسرے دن پھر اسد علی خاں کو ٹیپو کے پاس بھیجا۔ اب اس کی درخواست یہ تھی کہ خود اسے اور حرم شاہی کو بہ حفاظت جانے دیا جائے۔ ٹیپو نے یہ شرط مان لی لیکن مہابت جنگ کو تو وقت گزارنا تھا لہٰذا اس نے دو تین دن کی مہلت مانگ لی۔ اسے یقین تھا کہ اس دوران میں کمک آ جائے گی۔

شریف النفس ٹیپو نے یہ شرط مان لی لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ یہ مدت ختم ہونے کے بعد وہ شہر پر حملہ کر دے گا۔ اس کے بعد بھی قلعے کے دروازے نہیں کھلے تو وہ قلعے کا محاصرہ کر لے گا۔ اسی اثنا میں ٹیپو کو معلوم ہوا کہ مہابت جنگ نے چالاکی سے کام لیا ہے۔ نظام اور مرہٹوں کی فوج کو بلا کر اسے باتوں میں پھنسایا ہے۔ اس نے کمک آنے سے قبل شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کی فوجیں ادھونی شہر میں داخل ہو گئیں اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

ہری پنت کو گجندر گڑھ میں خبر ملی تو اس نے نظام کی ان فوجوں کو جو اس کے ساتھ تھیں اور بیس ہزار مرہٹوں کو ادھونی کی مدد کے لیے جلد سے جلد روانہ ہونے کا حکم دیا۔ نظام نے بھی مہابت جنگ کا خط ملتے ہی اپنے چھوٹے بھائی مغل خاں کو 25 ہزار سواروں کے ساتھ مدد کے لیے بھیجا۔

یہ ساری فوجیں بنور میں جا کر جمع ہوئیں اور تنگا بھدرا ندی کو پار کر لیا۔

ٹیپو نے اس فوج کی آمد کا سن کر محاصرہ اٹھا لیا اور وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک بلند مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔

دشمن نے اپنی فوج کا بڑا حصہ پیچھے چھوڑا اور صرف سات ہزار آدمیوں کو لے کر ادھونی کی طرف بڑھا۔ قلعہ بدامی کا قلعہ دار حیدر بخشی بھی اس وقت ٹیپو کے ساتھ تھا۔ یہ وہی تھا جس نے رشوت لے کر قلعہ مرہٹوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے عجیب حرکت کی۔ اپنے سردار غازی خاں کی اجازت کے بغیر مرہٹوں کی ایک بڑی فوج پر حملہ کر دیا۔ ہونا یہی تھا کہ اسے سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نے قبل از وقت جنگ چھیڑ دی تھی۔ اس کی شکست کا احوال سن کر ٹیپو کو اس کی مدد کے لیے جانا پڑا اور اس طرح وہ ادھونی سے دور ہو گیا۔

مہابت جنگ نے دیکھا کہ ٹیپو کمک کے لیے آنے والی

www.Paksociety.com

حیدرآبادی فوج سے الجھا ہوا ہے تو وہ اہل وعیال کے ساتھ قلعے سے نکلا اور رائے چور کا رخ کیا۔

ٹیپو نے اس کا تعاقب ضروری نہ سمجھا اور واپس آکر قلعہ ادھونی پر قبضہ کرلیا۔ ان توپوں اور گولہ بارود پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا جو اتحادی جاتے وقت چھوڑ گئے تھے۔

قطب الدین خاں کو ادھونی کا حاکم مقرر کردیا گیا۔ شہر کے بازار اسی طرح کھلنے لگے جیسے کہ کھلتے تھے۔ ٹیپو کے کسی سپاہی کی مجال نہیں تھی کہ کسی شہری کو کوئی نقصان پہنچائے۔

برسات سر پر آگئی تھی۔ اتحادی فوجوں نے سوچا قلعے پر قبضہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اب محاصرہ ہمیں کرنا پڑے گا۔ اس میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے اور اگر تنگا بھدرا میں طغیانی آگئی تو کہیں پھنس کر نہ رہ جائیں لہٰذا مغل علی خاں نے حیدرآباد کا رخ کیا اور باقی فوج گجندر گڑھ جاکر ہری پنت سے مل گئی کہ اسی نے اس فوج کو بھیجا تھا۔

اتحادی فوجوں کی طرح ٹیپو نے بھی یہی سوچا کہ موسم برسات یہاں گزارنے کے بجائے طغیانی آنے سے پہلے ندی پار کرجائے اور اتحادی فوجوں کو ان کی یورش کی سزا دے۔ وہ علاقے ان سے دوبارہ حاصل کرلے جن پر انہوں نے قبضہ کیا تھا۔

ہری پنت یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طغیانی میں ٹیپو تنگا بھدرا کی ندی کو پار کرے گا۔ وہ میسور کے تمام علاقے پر قبضہ کرنے میں مصروف رہا۔ وہ بہادر بنیڈا نامی قلعے پر دھاوا بولنے والا تھا کہ اسے ٹیپو کے پار اتر جانے کی خبر ملی۔ یہ خبر اس کے لیے پریشان کن بھی تھی اور حیرت ناک بھی۔ اس نے ہراول دستے کو محض یہ دیکھنے کے لیے بھیجا کہ اس خبر میں کتنی صداقت ہے اور یہ کہ ٹیپو نے کہاں پڑاؤ ڈالا ہے۔

رگھوناتھ بیس ہزار کا دستہ لے کر روانہ ہوا۔ ہری پنت اس کا منتظر تھا۔ بہادر بنیڈا کا قلعہ اس کے قبضے میں آچکا تھا۔

رگھوناتھ نے آکر خبر دی کہ ٹیپو دریا کے ایک اہم مقام پر خیمے ڈالے ہوئے ہے۔ ہری پنت نے کلکری میں پڑاؤ کیا جو ٹیپو کے کیمپ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔

جھڑپوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ ہری پنت کے ہمراہ ایک لاکھ سے زیادہ فوج تھی لیکن وہ کھلے میدان میں آکر پوری فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کو ٹیپو کے سپاہی ناکام بناتے رہے۔

ٹیپو نے شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ شب خون اتنا کامیاب رہا کہ دشمن کے لشکر میں افراتفری پھیل گئی، مرہٹوں کو ایسا سخت دھچکا لگا کہ مجروحین اور مقتولین کی بڑی تعداد کے علاوہ تمام فوجی سامان چھن گیا۔ ہری پنت کو شب خون کا خطرہ تھا اس لیے وہ اپنے آدمیوں کو لے کر پیچھے ہٹ گیا لہٰذا محفوظ رہا لیکن تہور جنگ اور رگھوناتھ کو زبردست نقصان اٹھا کر بھاگنا پڑا۔

گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کو اتحادیوں کے حوالے کردیا گیا لیکن مالِ غنیمت روک لیا۔

اس فتح کے بعد ٹیپو واردا اور تنگا بھدرا کے کنارے والی ناہموار زمین پر آگے بڑھتا گیا اور ''کوپل'' اور بہار بنیڈا کے درمیان پڑاؤ ڈالا۔ بہادر بنیڈا اس کے نشانے پر تھا۔ ہری پنت اسے فتح کرچکا تھا اور اب اس کے آدمی اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ حفاظتی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن یہ دیکھ کر رسد کی کوئی امید نہیں جان کی امان اور مرہٹہ فوج میں جانے کی آزادی مانگ کر ہتھیار ڈال دیے۔ مرہٹہ فوج چار یا پانچ فرسخ کے فاصلے پر موجود تھی لیکن ٹیپو کا گھیرا توڑ کر مدد کے لیے نہ آسکی۔

بہادر بنیڈا پر قبضے کے بعد ٹیپو نے اتحادی فوجوں پر ناگہانی حملے شروع کردیے۔ ان حملوں کا تواتر اور کامیابی اس قدر تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ زمین کا کوئی حصہ ان کے پاس نہیں رہ سکے گا اور ٹیپو ان کا پیچھا کرتے ہوئے پونا تک پہنچ جائے گا۔

مرہٹہ لشکر کی یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ وہ شام ہوتے ہی گھوڑوں اور گاڑیوں پر سامان لاد لیتے تھے اور رات بھر اس انتظار میں رہتے تھے کہ کب ان پر حملہ ہو اور انہیں بھاگنا پڑ جائے۔ آئندہ دو ہفتوں تک وہ اپنا سامان لیے پیچھے پیچھے پسپا ہوتے رہے۔

ایک وقت وہ تھا جب ٹیپو نے نانا صاحب کے پاس اپنا وکیل بھیجا تھا اور جنگ بندی کی اپیل کی تھی اور نانا صاحب نے اس اپیل کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ کارنوالس نے مدد دینے سے انکار کردیا تھا اور اتحادی فوجیں سلطان کے رحم وکرم پر تھیں۔ انگریز چاہتے بھی یہی تھے کہ دونوں قوتیں آپس میں لڑتی رہیں۔ نانا کو نظر آرہا تھا کہ ٹیپو علاقے پر علاقہ فتح کرتا چلا جائے گا۔ اس نے فوراً ہری پنت کو لکھا کہ ٹیپو سے صلح کرلو۔ اس کے قدموں کو آگے بڑھنے سے روکو۔ ہری پنت تو جیسے یہی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے فوراً ایک قاصد ٹیپو کی طرف دوڑایا۔

''سلطان جی! ہمارا سردار ہری پنت نہیں چاہتا کہ جنگ جاری رہے۔ اس نے کہلا بھیجا ہے کہ آپ اپنے دو آدمی اس کے پاس بھیجیں تاکہ صلح کی شرائط طے ہوں۔''

''اس مرتبہ شرائط میری مرضی سے طے ہوں گی۔'' ٹیپو نے کہا۔

''یہ تو آپ کے آدمی بات چیت کے ذریعے ہی طے کریں گے۔ صلح کے لیے پہل ہری پنت نے کی ہے اس لیے آپ ہی کی شرائط مانی جائیں گی۔''

''اپنے سردار سے یہ بھی کہنا کہ میرے آدمیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''اگر آپ کو اندیشہ ہے تو ہم دونوں کو یا ہم میں سے ایک کو اپنے پاس روک لیجیے۔''

''میں ایسا بزدل نہیں ہوں۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی کہ اپنے سردار کو جتا دینا۔ اپنے سردار سے کہہ دینا کہ ہمیں آپ کا پیغام مل گیا ہے۔ ہمارے دو سردار گفتگو کے لیے ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔''

ان کے جانے کے بعد ٹیپو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور بدرالزماں خاں اور علی رضا خاں کو حکم دیا کہ وہ چند افسروں کو ساتھ لے کر ملاقات کے لیے جائیں۔

اس وقت مرہٹہ لشکر پسپا ہو کر دس میل دور پہنچا ہوا تھا۔

ٹیپو نے جو شرائط تجویز کیں وہ یہ تھیں کہ مرہٹے تنگا بھدرا اور کرشنا کے درمیان والے علاقے پر اس کے اقتدار اور فرماں روائی کو تسلیم کریں اور لڑائی کے دوران جو مقامات انہوں نے حاصل کرلیے ہیں ان کو بحال کریں۔ اس کے بدلے میں خراج کے بقایا اڑتالیس لاکھ روپے ادا کرے گا۔ معاہدے کے مطابق بارہ لاکھ سالانہ ادا کرتا رہے گا۔

ہری پنت نے ان تجاویز کو رد کردیا اور جواب دیا کہ صرف اس وقت صلح ہونے کا امکان ہے جب وہ ادھونی کو مہابت جنگ کے حوالے کردے اور مرہٹوں کو وہ علاقہ واپس دے جو پیشوا مادھوراؤ کے زمانے میں ان کے پاس تھا۔ ٹیپو نے یہ شرائط ماننے سے انکار کردیا کیونکہ اس کے نزدیک وہ اپنے باپ کی ان فتوحات سے دست بردار ہوجائے جنہیں پیشوا پہلے تسلیم کرچکا ہے، انتہائی غیر منصفانہ تھا۔ ایک مرتبہ پھر بحث کا آغاز ہوگیا۔ بہرحال کئی ترامیم کے بعد ایک مسودہ تیار ہوگیا جس پر دونوں فریقین نے اتفاق کیا۔

نظام علی خاں، مرہٹے اور سلطان ٹیپو اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ یہ تینوں اپنے اپنے علاقوں پر ہی حکمرانی کریں گے اور بالکل امن واتحاد سے رہیں گے۔ اگر کوئی چوتھی طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرے تو تینوں متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

ادھونی کا قلعہ مہابت جنگ کو دے دیا جائے گا۔

کتلاہ، نولگندہ اور جالی کے قلعے بہ طور انعام پیشوائے پونا کو دیے جائیں گے۔

اس کے بدلے میں ٹیپو نے مرہٹوں سے وعدہ لینا چاہا کہ وہ تمام وہ مقامات اسے واپس کریں گے جن پر انہوں نے جنگ کے دوران قبضہ کرلیا ہے اور اسے (ٹیپو) بادشاہ کے خطاب سے مخاطب کریں گے۔

ہری پنت کو تمام تجاویز سے اتفاق تھا لیکن وہ اس پر تیار نہیں تھا کہ اسے بادشاہ کے لقب سے مخاطب کیا جائے لیکن ٹوکوجی ہولکر نے جو گفتگو میں شریک تھا مداخلت کی تو وہ اس پر راضی ہوگیا کہ آئندہ ٹیپو کو نواب ٹیپو سلطان فتح علی خاں کہہ کر مخاطب کیا جائے گا۔

نظام کو اس معاہدے کا فریق نہیں بنایا گیا تھا کیونکہ مرہٹے نظام سے غیر مطمئن اور ناخوش تھے کیونکہ اس نے جنگ میں برائے نام حصہ لیا تھا تاہم جب نظام نے اس کو صلح نامے سے الگ تھلگ رکھے جانے کی حکومت سے شکایت کی تو اسے بھی معاہدے میں شریک کرلیا گیا اور ٹیپو اس کی سرحدی چوکیاں واپس کرنے پر راضی ہوگیا جن پر اس نے جنگ کے دوران قبضہ کرلیا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ فتح مند ہونے کے باوجود ٹیپو نے اتنی کمزور شرائط پر صلح کرلی۔ مرہٹے ہار کر بھی جیت گئے۔ اسے نہ کوئی علاقہ ملا اور نہ تاوان ملا۔ اس کے برخلاف رائچور اور ادھونی نظام کے حوالے کرنے پڑے اور مرہٹوں کو خراج کے بقایا کی ایک بڑی رقم دینی پڑی۔ کتور، نرگند اور بدامی سے دست بردار ہونا پڑا۔ یہ وہی مقامات تھے جن کی مدافعت کے لیے وہ نبرد آزما ہوا تھا۔ اس کی سلطنت کی وسعت کم ہوگئی تھی۔

یہ سب نقصان اس نے صرف اس لیے اٹھائے کہ وہ مرہٹوں کو انگریزوں سے دور کرنا چاہتا تھا۔ کارنوالس کے جوڑ توڑ اور فوجی تیاریوں کے پیش نظر مرہٹوں سے دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کا یہ خواب محض خواب رہا۔ کچھ ہی عرصہ بعد پیشوا نے یہ معاہدہ توڑ دیا اور اس کو زیر کرنے کے لیے انگریزوں سے اتحاد کرلیا۔

سلطان ٹیپو اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد سرنگاپٹم واپس آگیا تھا۔ وہ پچھلے چار سال تک مرہٹوں اور نظام سے الجھتا رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی خاموش تماشائی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ اندر ہی اندر سازشوں کا جال بھی بچھا رہی تھی۔ کارنوالس کو یقین تھا کہ اگر انگریز ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں جلد یا بہ دیر ٹیپو سے جنگ کرنی پڑے گی کیونکہ توازنِ قوت کا جھکاؤ

www.Paksociety.com

میسور کی طرف بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ تمام ہندوستانی ریاستوں میں میسور کی سلطنت سب سے زیادہ مستحکم تھی اور اس کا نظم ونسق بھی سب سے اچھا تھا۔ میسور کے حکمران نے مرہٹوں اور نظام کو شکست دے دی تھی۔ سفارتی وفد بھیج کر فرانس کے بادشاہ اور ترکی کے سلطان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کارنوالس کی نظر میں اس سے ہندوستان میں انگریزی مفاد کو شدید خطرات لاحق ہونے کے امکانات تھے۔ اسے پختہ یقین تھا کہ ہندوستانی فرماں رواؤں میں ٹیپو غیر معمولی قابلیت اور بے پایاں حوصلے کا مالک ہے۔ اس نے اس حد تک وسیع علاقہ، دولت اور فوجی قوت حاصل کرلی ہے کہ اس سے کمپنی کے کرناٹک کے مقبوضات کے لیے اور اس کے تمام ہمسایوں کے لیے شدید خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ اس کے پیش نظر وہ سمجھتا تھا کہ ٹیپو کی قوت کو کم کیا جائے۔

اس کے علاوہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے مقبوضات کو وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے اس کی للچائی نظریں ٹیپو کی قلمرو پر خصوصاً اس کے مالاباری مقبوضات پر پڑ رہی تھیں جہاں مسالے، صندل اور صنوبر کے درختوں کی کثرت تھی اور جہاں کالی کٹ اور کتانور جیسی بندرگاہیں تھیں۔ امریکی نو آبادیاں انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں۔ وہ اس کی تلافی ان مقبوضات سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ نعرہ عام ہوگیا تھا کہ ٹیپو کو ختم کردو اور سابق راجا کو بحال کردو۔

انگریزوں کو کسی بہانے کی تلاش تھی تاکہ سلطان سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع ہوجائے۔ اس کے لیے وہ سلطان کے حریفوں کی کمر تھپ تھپا رہے تھے تاکہ ٹیپو ان سے الجھے اور وہ اسے بہانہ بنا کر ٹیپو سے الجھ جائیں۔ ٹیپو کے علاقے میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی اور باغیوں کو پناہ دی۔

انگریزوں نے کوچین اور ٹراونکور کے راجا کو اکسایا کہ وہ ٹیپو سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں نے راجا ٹراونکور سے معاہدہ کرلیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی فوج کی دو بٹالین اس کی سرحد پر تعینات کردیں اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو یورپین اور ہندوستانی فوج کی مزید امداد بھی اسے دی جائے گی۔ اس طرف سے مطمئن ہوکر اس نے مالابار کے باغی نائروں کو بغاوت کے لیے اکسایا۔ اس نے مدارس کے گورنر سے بھی کہا کہ وہ مالابار کے سرداروں کی مدد کرے اور ٹیپو سے ان کی سلطنتیں انہیں واپس دلائے۔ اس نے ٹراونکور کی ان فوجی چوکیوں کو مسمار کرنے سے بھی انکار کردیا جن کے متعلق ٹیپو نے کہا کہ وہ کوچین کے راجا کے علاقے میں بنائی گئی ہیں جو میسور کا باج گزار ہے۔

ٹراونکور کی سلطنت جزیرہ نمائے ہند کے انتہائی جنوبی سرے پر تھی۔ اس کی مشرقی سرحدیں بلند مغربی گھاٹوں کے ڈھلانوں سے گھری تھیں۔ مغرب اور جنوب میں اس کی سرحد سمندر کو چھوتی تھی اس لیے سوائے شمال کے ہر طرف وہ خشکی کے حملے سے محفوظ تھی۔ یہ سمت بھی گو جزوی طور پر گھاٹوں کی پناہ میں تھی مگر کوچین کی طرف سے کھلی ہوئی تھی۔

ٹیپو کو اطلاع ملی تھی کہ نائروں نے پھر سر ابھارا ہے اور اس بار ان کی پشت پناہی راجا کوچین اور ٹراونکور کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی سلطان نے کوچین اور ٹراونکور پر حملے کی تیاری شروع کردی۔

وہ بھاری توپ خانہ لے کر مالابار تو پہنچ گیا لیکن اس سے آگے راستہ نہایت ناہموار تھا۔ راستے میں ایک دریا بھی پڑتا تھا۔ دوسرا راستہ اختیار کیا جاتا تو بہت دیر ہوجاتی۔ اب ٹیپو نے کمال بہادری کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنے لشکر کو متبادل راستہ اختیار کرنے کے لیے کہا اور خود محض دو ہزار سپاہی لے کر روانہ ہوا اور چند روز میں کوچین پہنچ گیا اور حملہ کر کے ریاست پر قابض ہوگیا۔

وہ حیران تھا کہ اتنی جلدی قبضہ کیسے ہوگیا۔ وہ بھی دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ وہ اس معمولی سی فوج کے ہمراہ کچھ دنوں تک راجا کو مصروف رکھے گا، اتنی دیر میں باقی ماندہ فوج بھاری سازوسامان کے ساتھ اس سے آملے گی جو دوسرے راستے سے آرہی تھی۔

مکار دشمن نے ایک اور ہی پلان تیار کرلیا تھا۔ جیسے ہی کوچین میں رات نے قدم رکھا، دشمن نے دریا کے بند توڑ دیے۔ پانی نے فراٹے بھرے اور سلطانی لشکر چاروں طرف سے پانی میں گھر گیا۔ پانی کا گھیرا تلوار چلانے سے نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔

اس کا لشکر پانی سے نکلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دشمن کے سپاہی تلواریں سونت کر سروں پر آگئے۔ اس شدت سے حملہ کیا کہ سلطان کا تمام لشکر وہیں کام آگیا۔ اب سلطان کے چاروں طرف خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس کا وزیر قمرالدین زندہ بچ گیا تھا۔ اس نے سلطان کو کسی نہ کسی طرح دریا پار کرادیا۔

راستے میں باقی ماندہ فوج بھی اسے مل گئی۔ ٹیپو کو اس سے پہلے کسی نے اتنے غضب میں نہیں دیکھا تھا۔ لشکر کو حکم دیا

www.Paksociety.com

کہ وہ دریا پار کرے اور دشمن سے اپنے ساتھیوں کا انتقام لے۔ اس کی فوج قریب کے جنگل میں گھس گئی۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹیں۔ دریا پر عارضی پل بنایا اور دریا پار اتر گئی۔ دشمن کا لشکر مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا لیکن اس کی طرف سے حملہ اس قدر شدید تھا کہ دشمن [illegible] تھوڑی ہی دیر میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

اب اسے ٹراونکور کی طرف بڑھنا تھا۔

ٹیپو نے ٹراونکور کے سرحدی مورچوں کے قریب پہنچ کر اپنے وکیل کو راما ورما کے پاس ایک خط لے کر بھیجا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ میسور گورنمنٹ کے باغیوں کو اس کے حوالے کردے۔ دوسرے یہ کہ نگانور اور اجے کوٹہ سے دست بردار ہوجائے اور تیسرے یہ کہ وہ مورچوں کے اس حصے کو مسمار کردے جو کوچین کے علاقے سے گزرتے ہیں۔

ان مطالبات کے متعلق راما ورما کا جواب نہایت غیر تسلی بخش تھا۔ اس نے ہر مطالبے سے قطعاً انکار کردیا۔ اپنے مطالبات منوانے میں ناکام ہوکر ٹیپو اس خیال سے مورچوں کی طرف بڑھا کہ ممکن ہے راما ورما اپنی معاندانہ روش اس کی موجودگی کے باعث بدلنے پر مجبور ہوجائے۔

انگریز ٹیپو کی اس روانگی کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کارنوالس نے ایک خط میں لکھا۔

”ٹیپو ہمارے ساتھ کیے گئے معاہدے کو توڑنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس سے زیادہ احمق اور کوئی نہیں ہوگا۔“

ایک مرتبہ پھر ٹیپو نے اپنے وکیل کو راجا کے پاس بھیجا۔ اس مرتبہ پھر تلخ و تیز جواب موصول ہوا۔ سلطان نے اسی وقت ٹراونکور پر حملے کا حکم دے دیا۔

کوچین اور ٹراونکور کے راجا انگریزوں کے دوست بنے ہوئے تھے دوسری طرف جنرل میڈوز میسور کے راجا کے معزول خاندان سے چپکے چپکے سازباز کر رہا تھا جبکہ میسور کی سابق رانی اسے سرنگاپٹم کی تمام اطلاعات بھیجتی رہتی تھی۔ ٹیپو جیسے ہی ٹراونکور میں داخل ہوا میڈوز کا خط اس کے پاس پہنچا۔

”ریاست ٹراونکور پر آپ کے حملے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے ہم پر حملہ کیا ہے کیونکہ راجا ٹراونکور ہمارا دوست ہے۔“

اس خط کا [illegible] میں کیا کمی رہ جاتی تھی کہ انگریز بہت جلد سرنگاپٹم پر حملہ کردیں گے۔ اس نے میڈوز کو اس خط کا جواب تحریر کیا۔

”ہم حیران ہیں کہ معاہدۂ منگلور کے باوجود انگریز قوم ہم سے لڑنے پر کیوں آمادہ ہے۔ اگر دونوں حکومتوں میں کوئی رنجش پیدا ہوگئی ہے تو باہمی مفاہمت سے معاملہ طے ہوسکتا ہے۔“

میڈوز کی طرف سے اس کا جواب یوں آیا۔

”ٹراونکور کی حکومت مدراس کی حلیف ہے اور اس کی سرحد پر جو واقعات ہو رہے ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔“

ایسے سخت جواب ٹیپو کو یہ بتانے کے لیے بہت تھے کہ اب انگریز اس سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اس کا اندازہ درست تھا، جنرل میڈوز سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ ٹیپو اس کا راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ کوئمبتور کے قریب اس کا آمنا سامنا جنرل میڈوز سے ہوگیا۔ سلطانی لشکر فتح یاب ہوا۔

ٹیپو کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب انگریزوں کے خیمے لوٹتے ہوئے بہت سی عورتیں ہاتھ آئیں۔ ان کا بہ ظاہر جنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان سب کو ٹیپو کے سامنے پیش کیا گیا۔

”یہ کون عورتیں ہیں؟“ ٹیپو نے پوچھا۔

”حضور، یہ وہ فاحشہ عورتیں ہیں جنہیں انگریز بدکاری کے لیے اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔“

”یہ تو سب ہندوستانی عورتیں لگتی ہیں۔“

”ہندوستانیوں کو ذلیل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ انگریز بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی ان کی نظروں میں کیا حیثیت ہے۔ ان میں سے بیشتر مسلمان ہیں۔“

ٹیپو نے ان کی حقیقت جان کر ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ ”یہ بدبخت عورتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ میرے سامنے کھڑی رہیں، لے جاؤ انہیں۔“

اس کے بعد ایک روایت کے مطابق ان سب کو سنگسار کرادیا گیا۔

جنرل میڈوز کو شکست ہوگئی تھی۔ ممکن ہے وہ اسی وقت فرار ہوجاتا لیکن بنگال سے ایک فوج اس کی مدد کے لیے آگئی، دونوں لشکروں نے متحد ہوکر ٹیپو کا مقابلہ کیا لیکن نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ انگریز ترچناپلی کی طرف بھاگے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر یہاں بھی ان کا راستہ روکا۔ انگریز چاروں طرف سے گھر گئے تھے۔ میسوری فوج نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ انگریزی فوج کی تلواریں زنگ آلود ہوگئیں۔

وہ پسپا ہونے لگے تھے کہ رات کے اندھیرے نے

ان کی حفاظت کا سامان مہیا کر دیا۔ جنگ موقوف ہوگئی۔ انگریزوں کو جان بچا کر بھاگنے کی فرصت مل گئی۔ میڈوز نے حکم دیا اور انگریز بچی کھچی فوج اور مال واسباب اٹھا کر بھاگے اور مدراس جا کر دم لیا۔

سلطان دریائے کلرون کو عبور کر کے آگے بڑھا۔ راستے کے ہر مقام کو فتح کرتا ہوا پانڈی چری تک پہنچ گیا۔ پانڈی چری فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا۔ اس نے فرنچ گورنر سے درخواست کی کہ اسے چند ہزار فرانسیسی دے دیے جائیں تاکہ ان کی مدد سے وہ انگریزوں کو نکال باہر کرے۔ اس کی یہ درخواست شاہ فرانس تک پہنچا دی گئی لیکن اس وقت فرانس کے دروازے پر انقلاب دستک دے رہا تھا لہٰذا شاہ لوئی اس درخواست پر توجہ نہ دے سکا۔

اس وقت جب سلطان کل جنوبی ہند کے سیاہ وسفید کا مالک تھا اور انگریز اس کے رحم وکرم پر تھے اگر فرانس سلطان کی مدد کرتا تو ہندوستان کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ فرانس کی طرف سے خطرہ کارنوالس کو بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے مدراس گورنمنٹ کو خط لکھا۔

"اس ملک میں ہمیں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ٹیپو سلطان سے نبرد آزما ہوں۔ موجودہ وقت سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آئے گا کیونکہ ہندوستان کی دوسری طاقتیں اس وقت ہمارا ساتھ دینے کو آمادہ ہیں۔ اگر ٹیپو کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ فرانس سے مدد لے کر ہمیں نکال باہر کرے گا۔"

کارنوالس، ٹیپو سے نبرد آزما ہونے کے لیے پختہ ارادہ کر چکا تھا اور اس کے لیے کسی بہانے کا منتظر تھا۔ یہ بہانہ اسے ٹراونکور پر ٹیپو کے حملے سے مہیا ہوگیا۔ میڈوز کی ٹیپو کے ہاتھوں شرمناک شکست نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے فوراً ٹیپو کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ ٹراونکور پر حملہ کوئی جارحانہ کارروائی تھی یا صرف سرحدی جھگڑا تھا۔ میڈوز نے خود پہل کی تھی یا ٹیپو اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے ٹیپو کی ان تجویزوں کو بھی مسترد کر دیا جو اس نے لڑائی روکنے اور راجا سے پرامن طریقے پر اپنے جھگڑے چکانے کے لیے پیش کی تھیں۔ اس کے طرزِ عمل کی تبدیلی کا سبب یہ تھا کہ اب وہ اپنی فوجی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

گورنر مدراس اور گورنر جنرل کو ٹیپو نے اس سلسلے میں جو خطوط لکھے ان سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ ٹراونکور کے راجا سے اپنے جھگڑے پرامن طریقوں سے طے کرنے کے لیے تیار تھا لیکن کارنوالس صلح نہیں جنگ چاہتا تھا۔ اس نے خفیہ کمیٹی کو مطلع کیا تھا۔

"ہماری فوجیں اس وقت جتنی منظم اور تربیت یافتہ ہیں اس سے زیادہ کبھی نہیں ہو سکتی ہیں۔"

اسی طرح اس نے میڈوز گورنر مدراس کو بھی لکھا۔

"اس وقت ہمیں ملکی حکمرانوں سے مدد ملنے کی پوری امید ہے جبکہ ٹیپو کو فرانس سے مدد ملنے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔"

ان فاسد ارادوں کے بعد وہ اپنے ارادوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مرہٹوں سے معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کی رو سے مرہٹوں اور نظام پر لازم تھا کہ وہ فوراً پچیس پچیس ہزار فوج کے ساتھ ٹیپو کے شمالی مقبوضات پر حملہ کریں اور اس کی سلطنت کے جتنے حصے پر قبضہ کر سکیں کر لیں۔

گورنر جنرل کو سوار فوج کی ضرورت پڑی تو ایک مہینے کے اندر دس ہزار سوار مہیا کرنے ہوں گے۔ ان سواروں کو انگریزی فوج کے ساتھ مل کر لڑنا ہوگا۔ جو علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی فتح کرے گی اس پر اتحادیوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

اہم ترین شرط یہ تھی جس نے اتحادیوں کو باندھ دیا کہ صلح تینوں یعنی مرہٹوں، انگریزوں اور نظام کی مرضی سے ہوگی۔

اس اتحادِ ثلاثہ کے ساتھ ساتھ کارنوالس نے ٹیپو کے باج گزاروں اور اس کی باغی رعایا کی مدد حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس نے حکومت بمبئی کو لکھا کہ مالابار کے سرداروں کو سلطان سے بغاوت کرنے پر آمادہ کیا جائے اور اس میں ان کی مدد کی جائے۔

ان کوششوں کے نتیجے میں کنانور کی رانی اور کورگ کے راجا سے انگریزوں کا معاہدہ ہوگیا۔ اس معاہدے میں ٹیپو اور اس کے حلیفوں کو اپنا دشمن سمجھنے کا اقرار کیا گیا تھا۔ کمپنی نے اس کے صلے میں "کورگ" کی خودمختاری کی حمایت کرنے اور راجا کے مفادات کا خیال رکھنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔

کوچین کے راجا سے بھی معاہدہ ہوا جس کے مطابق کمپنی نے وعدہ کیا کہ ٹیپو سے اس کے علاقے کو خالی کرانے میں کمپنی اس کی مدد کرے گی۔

یہ ہندوستان کی بدنصیبی تھی کہ جن قوتوں کو ٹیپو کا ساتھ دے کر انگریزوں کو باہر نکالنا تھا وہ انگریزوں کے گرد مکھیوں کی طرح بھن بھنا رہے تھے۔ اپنے اپنے مفاد کے لیے ہندوستان کی آزادی کو داؤ پر لگا رہے تھے۔ ٹیپو کے ہاتھ مضبوط کرنے کے بجائے اسے کمزور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ان سفارتی کوششوں کے باوجود کارنوالس پر ٹیپو کا رعب طاری تھا۔ اس نے اسے مزید کمزور کرنے کے لیے سازشوں کے جال بچھا دیے۔ اس نے سلطان کے امرا کو اپنی طرف بلانے کے لیے تھیلیوں کے منہ کھول دیے۔ سلطان کے کئی امرا انگریزوں کے ہاتھوں فروخت ہو گئے۔ سید امام جو دارالسلطنت میں مقیم تھا۔ سلطان کی تمام فوجی کارروائیوں سے انگریزوں کو مطلع کرتا رہتا تھا۔ اسی طرح اور بہت تھے جنہیں انگریزوں کی دولت نے خرید لیا۔ کچھ کے بارے میں ٹیپو کو معلوم ہوا اور اس نے انہیں سزا دی لیکن یہ فتنہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ یہ زہر اتنا پھیل گیا تھا کہ علاج ممکن نہیں تھا۔ کتنے ہی ایسے چہرے تھے جو وفادار نظر آ رہے تھے لیکن انتظار میں تھے کہ کب وقت آئے اور کب وہ اپنا چہرہ بدلیں۔

یہ ان امیروں کی سازش ہی کا نتیجہ تھا کہ حملے کی خبر ٹیپو کو اس وقت ہوئی جب کارنوالس کلکتہ سے مدراس پہنچ گیا اور ایک ہی مہینے کے اندر اس کی فوجیں سلطنتِ خداداد کی حدود میں داخل ہوگئیں۔

ٹیپو کو اس وقت بھی نہیں بتایا جا رہا تھا کہ انگریزوں کا اتحادی نظام علی خاں معاہدے کی پاسداری کرتے ہوئے حیدر آباد سے چل کر آنیکل میں خیمہ زن ہو گیا ہے۔

کارنوالس کو اتنا وقت مل گیا تھا کہ مختلف علاقوں میں چوکیاں قائم کر کے وہ کرشنا راجپور پہنچ گیا جو منگلور سے صرف تین میل دور تھا۔

سرنگا پٹم کی ایک ایک بات باہر جا رہی تھی لیکن ٹیپو کو یہ تک نہیں بتایا جا رہا تھا کہ انگریز فوج بنگلور پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ خبر ہوتی بھی کیسے میر صادق جیسا غدار ٹیپو کا وزیرِ اعظم تھا۔

سلطان کو خبر ہوئی اور وہ سرنگا پٹم سے نکلا اور ایک مقام تکلی پہنچ کر قیام کیا۔

انگریزوں نے جنگ کا یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جنرل میڈوز مرکزی فوج کے ساتھ پہلے کوئمبتور کے صوبے پر قبضہ کر لے۔ دوسری طرف جنرل ایروکرومبے، گورنر بمبئی کو مالابار ساحل پر ٹیپو کے مقبوضات کو زیر کرتا۔ تیسری طرف ٹیپو کے حملے سے کرناٹک کو بچانے کے لیے کرنل کلے کو کارمنڈل کے بیچ سے گھس کر بارہ محال میں داخل ہونا تھا۔

کارنوالس اس وقت بنگلور سے تین میل دور تھا۔ کارنوالس کے ہمراہ اس وقت بے تحاشا فوج تھی۔ اس معرکے میں قلعہ بنگلور ٹیپو کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسے اس شہر کے چلے جانے کا بہت دکھ ہوا۔ یہ ٹیپو کا دوسرا بڑا شہر تھا اور اس کا قلعہ ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ قلعہ اب بھی ناقابلِ تسخیر تھا، لیکن سلطان کے ایک معتمد کشن راؤ نے غداری کی، وہ قلعے کے اندر کی خبریں انگریزوں کو پہنچاتا رہا۔ اس کی یہ معلومات قلعہ فتح کرنے میں معاون ہوئیں۔

انگریزوں نے اپنی حفاظتی فوج کو قلعے تابت میں چھوڑا اور دیون ہلی پہنچ گئے۔ یہ شہر اس لحاظ سے اہم تھا کہ ٹیپو کی ولادت یہیں ہوئی تھی۔

دیون ہلی کا قلعہ دار بھی کشن راؤ کی سازش میں شریک تھا لہٰذا یہ قلعہ بھی کسی جنگ کے بغیر انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔

ایک قریبی قصبے چک بالاپور پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ کارنوالس نے ایک چال چلی اور یہ علاقہ اس کے پرانے مالک کو لوٹا دیا۔ اس اقدام سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ انگریز سلطان سے علاقے لے کر پرانے حاکموں کو واپس کر رہے ہیں۔ اس اقدام سے پرانے وارثین متاثر ہوئے اور سلطان کے خلاف اور انگریزوں کے حق میں آوازیں بلند ہونے لگیں چنانچہ جب سلطان انگریزوں کا تعاقب کرتا ہوا بالاپور پہنچا تو شہریوں نے مخالفانہ نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا۔ ان کی اس حرکت نے ٹیپو کو غصے سے بے قابو کر دیا۔ اس نے لشکر کو حملے کا حکم دے دیا۔

سلطان ٹیپو ابھی تک کشن راؤ کی غداری سے بے خبر تھا۔ اس نے اس پر اعتبار کیا اور حکم دیا کہ وہ سرنگا پٹم جائے اور وہاں کے انتظامات سنبھالے کیونکہ انگریزوں سے بعید نہیں کہ وہ کسی وقت بھی سرنگا پٹم کا رخ کر لیں۔

ٹیپو انگریزوں سے جنگ کرنے میں مصروف تھا۔ بالاپور پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھتا گیا اور انگریزوں سے مقابلے کے لیے وینکٹ گری کوٹہ کے مقام پر خیمہ زن ہوگیا۔ یہیں اس پر کشن راؤ کی غداری کا راز منکشف ہوا۔ وہ انگریزوں پر حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ سرنگا پٹم سے ایک قاصد لشکر میں داخل ہوا۔ وہ تھکا ہوا بھی تھا اور سخت گھبرایا ہوا بھی۔ اس نے سرنگا پٹم کے حالات سے ٹیپو کو آگاہ بھی کیا۔ ان حالات میں کشن راؤ کا نام بار بار آ رہا تھا۔

اس کشن راؤ نے سرنگا پٹم پہنچتے ہی اس نازک وقت میں انگریزوں اور مرہٹوں سے بیک وقت سلسلہ جنبانی شروع کر دیا تھا۔ وہ میسور میں ہندو ریاست قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا مگر اس کی بیوی ہندو ہونے کے باوجود اسے اس سازش سے روکتی رہتی تھی۔ دونوں میں جب اختلافات بہت بڑھ گئے تو اس کی بیوی کسی طرح ٹیپو کی والدہ کے پاس پہنچ گئی جو مادرِ ملکہ

www.Paksociety.com

کہلاتی تھیں اور انہیں کشن راؤ کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔
''مادرِ ملکہ۔ سازش مکمل ہو گئی ہے۔ محل کی رانیاں بھی اس میں شریک ہیں۔ بمبئی سے انگریزی فوج بس آنے ہی والی ہے۔ آپ کچھ کر سکتی ہیں تو کر لیں ورنہ سرنگا پٹم ہاتھ سے گیا۔''
''بے وقوف لڑکی۔ تو اب مجھے بتا رہی ہے۔ اتنے دن سے کیوں خاموش تھی؟''
''کشن غدار سہی لیکن میرا پتی ہے۔ میں اسے سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لانا چاہتی تھی مگر اب اس نے میرا منہ بند رکھنے کے لیے مجھے مارنا پیٹنا بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ اپنا ارادہ بدلنے والا نہیں۔ وہ کہتا ہے، اس میں برائی کیا ہے۔ ہم ہندو ہیں اور میسور میں ہندو ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ مورکھ یہ نہیں سمجھتا کہ اب انگریز بھی درمیان میں ہیں۔ وہ اسے ہندو ریاست کیوں بنانے دیں گے۔ کام نکلنے کے بعد پوچھیں گے بھی نہیں۔ سیدھا سیدھا انگریزی راج قائم کر دیں گے۔ ہمارے سلطان ٹیپو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے لڑ رہے ہیں اور کشن راؤ ان کی محنت پر پانی پھیر رہا ہے۔ بس یہی سوچ کر آپ کے پاس آ گئی ہوں۔''
''یہ تو، تو نے بری سنائی۔ سلطان تو نہ جانے کس ویرانے میں انگریزوں سے مصروفِ جنگ ہوں گے۔ ہر ایک پر بھروسا کر کے یہ بات بتائی بھی نہیں جا سکتی۔ کون ان تک یہ پیغام پہنچائے گا۔ ان کا اس وقت آنا بہت ضروری ہے۔''
''آپ کہیں تو میں خود کھوج کے لیے نکلوں۔ کشن کی زبانی مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ سلطان ٹیپو اس وقت کہاں ہوں گے۔''
''باؤلی ہو گئی ہے۔ یہ تیرا کام نہیں ہے۔ میں خود کوئی بندوبست کرتی ہوں۔ تو اب گھر جا اور خبردار کشن کو یہ معلوم نہ ہو کہ تو نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔''
''بھگوان، میرے سلطان کی رکھشا کرنا۔''
وہ لڑکی چلی گئی۔ مادرِ ملکہ کافی دیر تک بیٹھی سوچتی رہیں۔ یونہی ایک شک سا گزرا کہ کہیں کشن راؤ کی بیوی کا آنا بھی اسی سازش کا حصہ نہ ہو۔ اس بہانے سے سلطان کو بلایا جا رہا ہو۔ سلطان کو خبر کروں یا نہیں؟ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ ٹیپو کو خبر کر دینی چاہیے۔ وہ خود کسی کو بھیج کر تحقیق کر لے گا۔
اس کے بعد ہی مادرِ ملکہ نے ٹیپو کے پاس قاصد دوڑایا تھا۔
ٹیپو نے سید حمید سپہ دار کو سرنگا پٹم بھیجا۔ کشن راؤ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ ہو سکتا ہے یا اس کا راز منکشف ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس وقت سرنگا پٹم میں گورنر کی حیثیت رکھتا ہے۔ سلطانی حکم سے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ اگر راز کھل بھی گیا تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ سلطان یہاں سے ہزاروں میل دور ہے۔ وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے۔ وہ خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا کہ سید حمید کے ساتھ آئے ہوئے فوجی دستے نے کشن راؤ کے محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ محل میں صرف ایک آنکھ تھی جو جاگ رہی تھی۔ یہ تھی کشن راؤ کی بیوی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسی ایک رات ضرور آئے گی اور یہ رات آ گئی تھی۔ وہ کشن راؤ سے نفرت کرنے لگی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کے انجام کے بارے میں سوچ کر اس کے آنسو بہنے لگے۔
تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ پہرے دار کشن راؤ کی خواب گاہ پر دستک دینے پہنچ گئے۔ اس کی بیوی کا دل زور سے دھڑکا۔ اسے معلوم تھا کہ ناوقت کس کی دستک ہے لیکن پھر بھی اس نے برابر لیٹے ہوئے کشن راؤ کو جھنجوڑا۔
''اٹھیے۔ دیکھیے تو، کون دستک دے رہا ہے۔''
''اس وقت کون ہوگا۔'' کشن راؤ نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔
دروازے کو کوئی اتنی زور زور سے پیٹ رہا تھا کہ حویلی میں اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اور بڑبڑاتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا۔ پہرے دار کھڑے کھڑے کانپ رہے تھے۔
''کوئی میسوری سردار ہے۔ کہتا ہے کشن راؤ کو باہر بلاؤ۔''
''بدتمیز انسانو! کیا تمہیں کہا نہیں گیا ہے کہ جب ہم سو جائیں تو مت اٹھایا کرو۔''
''ہم نے ان سے کہا تھا کہ گورنر مہاراج آرام کر رہے ہیں لیکن وہ تو اندر گھسے چلے آ رہے تھے۔''
''ٹھہرو، میں چل کر دیکھتا ہوں۔''
وہ باہر نکلا ہی تھا کہ کوئی موقع دیے بغیر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے بولنے کا موقع نہیں دیا گیا۔
اس کی بیوی کو مادرِ ملکہ کے پاس بھجوا دیا گیا جہاں سید حمید موجود تھے۔ انہوں نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ اس کی زبانی کشن راؤ کے ساتھیوں کے نام بھی معلوم ہو گئے۔
''تمہیں ان لوگوں کے نام کیسے معلوم ہوئے؟''
''مجھے جب کشن راؤ پر شک ہوا تو اس کے پاس جو لوگ آتے تھے میں نے ان کی باتیں چھپ کر سننی شروع کر دیں۔ اس گفتگو کے دوران مجھے ان لوگوں کے نام معلوم ہوتے چلے گئے۔''
ان میں سے کچھ لوگ سرنگا پٹم سے باہر کے تھے کچھ سرنگا پٹم ہی کے تھے۔ انہیں اسی رات گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے ذرا سی سختی کے بعد سب کچھ اگل دیا۔
صبح ہوئی تو کشن راؤ کو سید حمید کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ شروع میں بہت اکڑ دکھاتا رہا۔ اس سازش کو ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن جب اس کے ساتھیوں کو بلایا گیا تو وہ نرم پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ سازش بے نقاب ہو گئی ہے اب کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔
''کشن راؤ، اب تجھ سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میں تجھے ایک موقع دیتا ہوں۔ کیا تجھے اپنے جرم سے انکار ہے؟'' سید حمید نے پوچھا۔
کشن راؤ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔
''تجھے چپ کیوں لگ گئی۔ بولتا کیوں نہیں۔ کم بخت، تجھے سلطان نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ سرنگا پٹم کا سارا انتظام تیرے سپرد کر دیا حالانکہ تو ان کا ہم قوم بھی نہیں اور تو نے ان کے احسانات کا یہ بدلہ دیا۔''
''میں نے ایسا کیا کر دیا؟''
''تو نے بمبئی سے انگریزی فوج بلانے کی سازش تیار کی تاکہ وہ سرنگا پٹم پر حملہ آور ہوں۔''
''میں ہندو ہوں۔ میں نے میسور میں ہندو ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اسے جرم نہیں سمجھتا۔''
''اچھا ہوا تم نے اقبالِ جرم کر کے میرا کام آسان کر دیا۔ مجھے سلطان نے حکم دیا تھا کہ میں سرنگا پٹم پہنچ کر کشن راؤ کی تحقیق کروں اور اگر جرم ثابت ہو جائے تو مجرم کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔ اب تحقیق کی ضرورت نہیں۔ تم اقبالِ جرم کر چکے اب موت کی سزا کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔''
''سید صاحب، تم مجھے موت کی نیند سلا دو لیکن جو فتنہ میں نے بیدار کیا ہے اسے تمہارا سلطان موت تو کیا نیند کی سزا بھی نہیں سنا سکتا۔ تمہارے سلطان کی باقی زندگی اس فتنے سے لڑتے ہوئے گزر جائے گی۔''
اس کے یہ الفاظ آئندہ حقیقت بن کر سامنے آئے۔
کشن راؤ کی گردن مار دی گئی اور اس کی لاش بازار کے چوک میں لٹکا دی گئی تاکہ آئندہ کسی کی ہمت نہ ہو کہ غداری کرے۔
کشن راؤ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی لیکن ایسے ہزاروں فتنے تھے جو اس وقت خاموش ہو گئے لیکن آئندہ انہوں نے سلطنتِ خداداد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ٹیپو کی شہادت کا باعث بنے۔
کشن راؤ آنجہانی ہو چکا تھا۔ اس کی بیوہ کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ اپنوں سے بھی غیروں سے بھی۔ یہ خبریں عام ہونے لگی تھیں کہ کشن راؤ کی مخبری اس کی بیوی نے کی تھی۔ ہندوؤں میں غم و غصہ تھا۔ اس کے رشتے دار بھی اب اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں تھے۔ اس نے مادرِ ملکہ سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ محل میں رہنے کی اجازت دے دے۔
''اب میں کہاں جاؤں۔ سب میری جان کے بیری ہو رہے ہیں۔ مجھے یہیں رہنے دیں۔ آپ کی خدمت کروں گی دو روٹیاں کھا لوں گی۔''
''تو گورنر کی بیوی رہ چکی ہے اور پھر تیرا احسان ہم پر ہی نہیں پورے میسور پر ہے۔ تو یہاں رانیوں کی طرح رہ سکتی ہے۔ میں ایک جاگیر تیرے نام لکھ دوں گی جو میرے بعد بھی تیرا سہارا ہوگی۔''
وہ مادرِ ملکہ کے پاس رہنے لگی۔
سید حمید کے سرنگا پٹم آ جانے کے بعد ٹیپو نے میر قمرالدین کو سپہ سالار مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ انگریزوں سے مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔
میر قمرالدین نے انگریزوں کو دھوکا دینے کے لیے نہایت شاطرانہ چال چلی۔ اس نے اپنے لشکر کو حیدرآبادی لباس پہنا دیا۔ سب کو معلوم تھا کہ حیدرآبادی لشکر بھی ٹیپو سے لڑنے کے لیے میسور میں داخل ہو چکا ہے بلکہ انگریز تو اس لشکر کا انتظار کر رہا تھا۔
میر قمرالدین اپنی فوج کو لے کر مالور کے راستے سے بنگلور کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی اس نے نصف راستہ طے کیا ہوگا کہ انگریزی فوج نظر آئی۔ انگریزی فوج نے قمرالدین کی فوج کو حیدرآبادی لشکر سمجھا اور اس کی مزاحمت نہیں کی لیکن جب وہ انگریزوں پر ٹوٹ پڑا تو سب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ بے شمار انگریز مارے گئے۔ سلطانی فوج کے ہاتھ غلے سے لدے ہوئے پانچ ہزار بیل اور بے پناہ سامان آیا۔ انگریز لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔
میر قمرالدین انگریزوں کے تعاقب میں لگا رہا۔
قمرالدین کی ان کامیابیوں سے مطمئن ہو کر ٹیپو سرنگا پٹم کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک کشن راؤ کے قتل کو تین چار ماہ گزر چکے تھے۔

www.Paksociety.com

وہ مہینوں بعد سرنگا پٹم آیا تھا۔ اتنی بڑی سازش کے بعد اسے کچھ معلومات بھی حاصل کرنی تھیں۔ وہ سیدھا والدہ کے قدموں میں پہنچ گیا۔ دو سال پہلے اس کی ایک بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسری بیوی اور شہزادے تھے، ان سے ملاقات بھی اس نے موخر کر دی۔

وہ ابھی والدہ کے کمرے تک پہنچا ہی تھا کہ ایک عورت کو اس نے والدہ کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اسے جانی پہچانی شکل لگی ضرور تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں نیچی کر لی تھیں۔ اس عورت نے اسے نہایت ادب سے سلام کیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نظریں اٹھائیں۔ اس عورت کو کہاں دیکھا ہے؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ عورت وہیں کھڑی رہ گئی اور وہ کمرے میں چلا گیا۔ ماں کی مشتاق آنکھیں اسے دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ وہ ماں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"تم محاذ چھوڑ کر آ گئے؟"

"میر قمر الدین وہاں موجود ہیں۔ وہ تمام امور اچھی طرح سنبھالے ہوئے ہیں۔"

"پھر بھی تمہیں وہاں ہونا چاہیے تھا۔"

"انگریز شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔"

"انگریز قوم بڑی دھوکے باز ہے۔ وہ پھر کسی وقت تمہیں مشکل میں ڈالے گی۔"

"ایک وہی تھوڑی ہیں۔ نظام اور مرہٹے الگ میرے علاقوں کو روندتے پھر رہے ہیں۔ میری فوجیں مختلف محاذوں پر لڑتی پھر رہی ہیں۔ میں سرنگا پٹم چلا آیا۔ یہاں جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کے پیش نظر میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری تھا۔"

"ہاں بیٹا۔ سازشوں کا مت پوچھو۔"

"مجھے آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا کہ آپ نے مجھے بروقت اطلاع کر دی۔"

"شکریہ تو تمہیں کشن راؤ کی بیوی کا ادا کرنا چاہیے۔ اس عظیم عورت نے وہ کام کیا ہے کہ میسور کی تاریخ ہمیشہ اسے یاد رکھے گی۔ اسی نے حب الوطنی کا حق ادا کیا اور کشن راؤ کی مخبری کر دی۔"

"اچھا یہ تو بتایئے۔ ابھی میں آپ کے پاس آ رہا تھا تو ڈیوڑھی میں ایک عورت نظر آئی تھی۔ اس نے مجھے سلام بھی کیا تھا۔ وہ کون تھی۔ ملازمہ بھی نہیں لگتی تھی۔"

"تم اسے کیوں پہچاننے لگے تھے۔ وہی تو تھی کشن راؤ کی بیوہ۔ اس کے رشتے دار اس کی جان کے دشمن بن گئے تھے اس لیے میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ وہ آئے تو ہماری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا اور اس سے کہنا سلطان ٹیپو تمہارے اس احسانِ عظیم کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔"

"اس کے آنے کی کیا بات ہے۔ میں ابھی اسے بلائے لیتی ہوں۔ تم اپنی زبان سے اس کا شکریہ ادا کرو گے تو اس کا دل بڑا ہو جائے گا۔"

انہوں نے ٹیپو کا جواب سننا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ایک کنیز کو بلایا کہ اسے بلا لائے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ آ گئی۔

ٹیپو نے نظریں جھکائے جھکائے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "تم نے جو احسان ہماری سلطنت پر کیا ہے ہم اس کے لیے تمہارے شکر گزار ہیں۔ ہم تمہیں جاگیر دینے کے احکام جاری کر دیں گے۔"

"آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ امی حضور یہ مہربانی فرما چکی ہیں۔"

ٹیپو پاکباز تھا۔ عورتوں کی طرف نظر اٹھانا بھی گناہ سمجھتا تھا لیکن اس عورت کی آواز میں ایسا درد تھا کہ وہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ یہ تو وہی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن نے زور سے اسے آواز دے کر مخاطب کیا۔ اس کی پلکیں پھر جھک گئیں۔ وہ پھر چلی گئی۔

"اچھا امی، میں چلتا ہوں۔"

"ہاں بیٹا جاؤ۔ تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔"

وہ ریشمی پردوں کو ہٹاتا ہوا ڈیوڑھی میں آیا۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھر نظر آ جائے۔ اسے بہت کچھ یاد آنے لگا تھا لیکن اس وقت سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔

وہ اپنے خاص محل میں پہنچا جہاں دونوں شہزادے اور بیوی اس کے منتظر تھے۔ دن بھر محاذوں اور جنگوں کی باتیں ہوتی رہیں۔

سلطنت کے امرا ملنے آتے رہے۔ ان مصروفیات نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور نہیں کیا لیکن جب رات کو سونے کے لیے اس نے زمین کو بستر بنایا (اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نہیں نکال دے گا زمین پر سوتا رہے گا) تو اسے کشن راؤ کی بیوہ کا خیال آیا جسے اب وہ پہچان چکا تھا۔

وہ جتنا جتنا سوچتا گیا اس پر یادوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ اسے یاد آیا کہ اس کے زمانۂ شہزادگی میں جب وہ سولہ سترہ سال کا نوجوان تھا، سیر و شکار کے لیے جب بھی نکلتا تھا ایک لڑکی اسے اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ٹیپو کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ وہ شروع ہی سے لڑکیوں کے معاملے میں اناڑی تھا۔

کچھ دنوں بعد لڑکی شوخی پر اتر آئی تھی۔ جب وہ گزرتا تو اس کی طرف پھول اچھال دیا کرتی تھی لیکن ٹیپو نے اس کی طرف کبھی التفات نہیں کیا تھا۔ پھر حیدر علی نے ٹیپو کو محاذوں پر بھیجنا شروع کر دیا تو وہ لڑکی مایوس ہونے کے بجائے کیا کر سکتی تھی۔

حیدر علی کے انتقال کے بعد جب ٹیپو کی تخت نشینی کی رسم ادا ہونے والی تھی تو وہ کسی نہ کسی طرح اس کے سامنے آ گئی تھی۔ اس نے گلہ کیا تھا۔

"میں آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائے بچھائے جوان ہو گئی مگر آپ نے کبھی مجھ سے پریم کے دو بول نہیں بولے۔ جانتی ہوں آپ کے لائق نہیں پر میرا دل تو رکھ لیتے۔"

ٹیپو نے اس وقت بھی صرف اتنا کہا تھا۔ "بس اب تم جاؤ۔ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "میں صرف یہ بتانے آئی تھی کہ میرا بیاہ ہو رہا ہے، اگلے ماہ۔ اس کے بعد آپ کے پاس نہیں آ سکتی تھی سو چلی آئی۔"

"میں تمہیں شادی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ فرصت ملی تو تمہاری شادی میں ضرور آؤں گا۔"

وہ لڑکی کشن راؤ سے بیاہی گئی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تو کیا اس کے دل میں میری محبت ابھی تک ہے۔ کیا اس نے کشن راؤ کی مخبری مجھے بچانے کے لیے کی ہے؟ وہ بڑی دیر تک ان سوالوں کے جواب ڈھونڈتا رہا۔

دوسری طرف کشن راؤ کی بیوہ کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دن بعد سلطان کی دید سے ٹھنڈی ہوئی تھیں۔ اسے خوشی تھی کہ وہ سلطان کے کسی کام آئی لیکن یہ سوچ کر مایوس بھی ہوئی تھی کہ سلطان نے اسے پہچانا تک نہیں اور اگر پہچان لیا ہے تو ظاہر نہیں کیا۔

تیسری جانب ٹیپو کی ماں تھیں جنہیں ٹیپو کو دیکھ کر کچھ اور ہی خیال آیا تھا۔ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رات بھر سوچتی رہی تھیں۔ ٹیپو کو سرنگا پٹم میں رہتے ہوئے دو ڈھائی مہینے ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں وہ ایک مرتبہ اپنی فوجوں کا جائزہ لینے کے لیے باہر بھی گیا تھا لیکن پھر آ گیا تھا۔ انہوں نے ہچکچاتے ہوئے کشن راؤ کی بیوہ سے اس کے دل کا حال جاننے کے لیے بات کی۔

"تم ابھی جوان ہو۔ کہیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"آپ مجھ سے اکتا گئی ہیں؟"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟"

"اسی لیے تو کہیں بھیجنے کی بات کر رہی ہیں۔"

"اگر تیری شادی کسی ایسی جگہ ہو جائے کہ تجھے جانا ہی نہ پڑے؟"

"یہ کبھی ہوا ہے؟ جو شادی کرے گا وہ لے کر بھی جائے گا۔"

"اگر شادی کرنے والا یہیں رہتا ہو۔" مادر ملکہ نے کہا پھر اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہی تھی کہ تیری شادی اگر سلطان سے ہو جاتی......"

"وہ اتنے بڑے سلطان ہیں۔ میں کوئی ان کے لائق ہوں۔"

"یہ تو دل سے کہہ رہی ہے؟" مادر ملکہ نے کہا۔ وہ خاموش تھی۔

"میرا مطلب تھا سلطان مجھے پسند نہیں کریں گے۔"

"اس کی مجال نہیں کہ انکار کر دے۔"

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ٹیپو سے بات کی لیکن وہ ان شہنشاہوں کی طرح نہیں تھا جو شادیوں پر شادیاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس نے اپنی مصروفیات کا عذر پیش کر کے بات کو ختم کرنا چاہا لیکن ماں کی دلیل یہ تھی کہ وہ ہماری وجہ سے بے سہارا ہوئی ہے۔ اس کے احسانوں کا بدلہ اسی طرح اتارا جا سکتا ہے کہ تم اس سے شادی کر لو۔ وہ برابر انکار کر رہا تھا۔

وہ کہہ چکا تھا۔ "شادی بیاہ کی مجھے فرصت نہیں۔" لیکن ماں نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا۔ "یہ ہمارا حکم ہے۔" پھر یہاں تک کہہ دیا۔ "وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ اپنا مذہب تک تبدیل کرنے کو تیار ہے۔"

وہ مجبور ہو گیا اور اس پر آشوب دور میں اس کو تیسری شادی کرنی پڑی۔

☆☆☆

مرہٹے اور نظام متحد ہو کر سلطان کے خلاف لشکر کشی کا سلسلہ شروع کیے ہوئے تھے، چنانچہ حیدر آباد کے عیسیٰ خاں نے قلعہ کوپی کوٹہ پر قبضہ کر لیا اور دوسری طرف مرہٹوں نے دہاڑواڑ پر قبضہ کر لیا۔

www.Paksociety.com

سلطان کی فوجوں نے ہر جگہ پامردی سے مقابلہ کیا لیکن دشمنوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں ان کی پیش نہیں گئی۔

میسوریوں کا سپہ سالار میر قمرالدین برابر انگریزوں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس نے یہ طریقۂ جنگ نکالا تھا کہ سامنے آنے کے بجائے اپنے لشکر کو انگریزی لشکر کے پیچھے رکھتا۔ انگریزی لشکر جب کسی بستی کو لوٹتا ہوا آگے بڑھتا تو قمرالدین کے چھاپا مار دستے اس پر شب خون مارتے اور لوٹا ہوا مال لوٹ لیتے۔ اسی طرح سامان رسد کو بھی لوٹ لیتے جو اس علاقے میں قافلوں کی شکل میں نظر آتے۔

کارنوالس نے دریائے کاویری پار کیا اور سرنگاپٹم سے نو میل دور آکر ٹھہر گیا لیکن حالت یہ ہوگئی تھی کہ لشکر میں سامان رسد بالکل ختم ہوچکا تھا۔ راستے میں نو دس جگہ شب خون مارا گیا تھا۔ لشکر میں اجناس کا قحط پڑ گیا تھا۔ ہر طرف سے بھوک بھوک کی صدائیں بلند ہورہی تھیں۔ یہ رات اس نے ان صداؤں کی گونج میں کاٹی۔ صبح ہوئی تو کارنوالس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے گرکند کی پہاڑیوں پر میسوری فوج کو دیکھا۔ سید حمید نے رات ہی میں ان پہاڑیوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ قمرالدین بھی دھاوا مارتا ہوا پیچھے چلا آرہا تھا۔

جب رسد پہنچنے کا کوئی امکان نہیں رہا تو کارنوالس نے واپسی کا ارادہ کرلیا۔ اس نے بڑی بڑی توپیں زمین میں دبا دیں، گاڑیوں کو آگ لگادی اور واپسی کا حکم دے دیا۔ اس کے فوجی لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے اس لیے خوشی خوشی واپس ہونے لگے۔

سلطان ٹیپو نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کے پاس صلح کا خط بھیجا لیکن اس مغرور نے خط کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

سلطان ٹیپو کے امرا نے سلطان کو مشورہ دیا تھا کہ اس وقت کارنوالس پر حملہ کردینا چاہیے۔ حربی نقطۂ نگاہ سے یہ صائب مشورہ تھا۔

نظام دکن کی فوجیں اس وقت کڑپہ اور گرم کنڈہ میں مصروف تھیں اور کارنوالس چاروں طرف سے گھر چکا تھا لیکن ٹیپو نے حملے کا مشورہ قبول نہیں کیا۔

یہ فیصلہ اخلاقی اعتبار سے کتنا ہی قابل تعریف ہو لیکن جنگوں میں اخلاق نہیں چلتا۔ اس کا خمیازہ سلطان کو آئندہ بھگتنا پڑا۔

کارنوالس کی فوجیں پسپا ہوکر بہ آسانی علاقے سے نکل گئیں۔ سلطانی لشکر کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی کہ حکم سلطانی یہی تھا۔

کارنوالس بنگلور پہنچ گیا اور فوجوں کی تنظیم نو میں مشغول ہوگیا۔ اس مرتبہ اس نے فراہمی رسد پر خاص توجہ دی۔

بنگلور میں رہ کر کارنوالس نے یہ کام بھی کیا کہ نظام اور مرہٹوں کی فوج کو بھی اپنے پاس بلایا۔ اب وہ تینوں افواج کے ساتھ مل کر سرنگاپٹم پر دوبارہ حملہ کرنا چاہتا تھا۔ تمام فوجوں کو ملا کر ان کی تعداد اکیاسی ہزار بنتی تھی۔ اسی حساب سے جانور تھے اور باربرداری کے لیے جو لوگ تھے وہ الگ۔ تین لاکھ بیس ہزار افراد باربرداری کے لیے اور چار لاکھ جانوروں کے لیے موجود تھے۔

سلطان ٹیپو کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ اگر افواہ بھی اڑ جاتی کہ ٹیپو کا لشکر آتا ہوا دیکھا گیا ہے تو دوسرے لمحے پوری فوج حالت جنگ میں آجاتی۔ پھر یہ خبر جھوٹی نکلتی تو خفت اٹھانی پڑتی۔

خوف و دہشت کے اسی عالم میں یہ متحدہ لشکر سفر کرتا رہا۔

دوسری طرف غداروں کی گرم بازاری تھی۔ سلطان کو ان سازشیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ اسے برابر یہ باور کرایا جارہا تھا کہ حضور، سرنگاپٹم کے باہر سب خیریت ہے۔ انگریزوں کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ اب وہ اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔

اتحادی فوجیں سرنگاپٹم کی فصیل کے باہر پہنچ گئیں۔ انہوں نے صرف چار میل کے فاصلے پر اپنا کیمپ بھی قائم کرلیا اور قلعے کی دیواروں سے ایک توپ بھی نہیں چلی جبکہ ایک سو بھاری اور تین سو ہلکی توپیں موجود تھیں۔ سلطان کی چالیس ہزار فوج موجود تھی۔

کارنوالس نے جنرل میڈوز، کرنل میکسویل اور کرنل آرتھر کو حکم دیا کہ وہ شہر پر تین اطراف سے حملہ کردیں۔ تینوں فوجیں الگ الگ روانہ ہوئیں۔ جب فوج کا ایک دستہ مشرقی دروازے کی طرف گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پہرے دار تک موجود نہیں تھے۔ یہی حال دوسری سمتوں کا بھی تھا۔

یہ ان ملک فروش غداروں کے منصوبے کا حصہ تھا جو ٹیپو کے نہیں انگریزوں کے وفادار تھے۔

سلطانی توپ خانے نے اس وقت آگ برسانی شروع کی جب انگریزی فوج تینوں راستوں سے معمولی سی مزاحمت کے بعد شہر میں داخل ہوچکی تھی۔

اس وقت سلطان کیا کرسکتا تھا۔ وہ قلعہ بند ہوگیا۔

سازشوں کا شباب تھا۔ ٹیپو کے دس ہزار جوان سرنگاپٹم سے فرار ہوگئے۔ ٹیپو کو اب اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے خلاف

www.Paksociety.com

بہت بڑی سازش ہوئی ہے۔ اس نے اردگرد بیٹھے ہوئے امرا کی طرف دیکھا۔ کس کس پر شبہ کیا جائے، کوئی ثبوت بھی اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس کے وفادار اسے طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے لیکن اب وہ کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ان سازشوں کے ہوتے ہوئے متحدہ طاقتوں سے جنگ کرنا کوئی عقل مندی نہیں۔ اس نے کارنوالس کو صلح کے لیے خط لکھا۔

اب تک ٹیپو نے جتنے خط کارنوالس کو لکھے تھے، ان کا جواب دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن اب ٹیپو ایسی مصیبت میں گھر گیا تھا کہ کارنوالس اپنی شرائط کے مطابق صلح کر سکتا تھا لہٰذا اس نے خط کا جواب دیا اور اسے لکھا کہ دونوں طرف کے وکیل جمع ہوں اور صلح کی شرائط طے کریں۔ شرائط طے کرنے والوں میں میر غلام علی بھی تھا جس کی غداری بعد میں کھلی۔ اس نے دوسرے وکیل کی مخالفت کے باوجود ان شرائط کو تسلیم کرلیا۔

یہ شرائط سلطان ٹیپو کے حضور پہنچیں تو اتنی مایوس کن تھیں کہ سلطان برہم ہوگیا۔ اس نے امرا کی طرف دیکھا۔ سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ کوئی بھی ٹیپو کا ساتھ دینے کو تیار نظر نہیں آتا تھا۔ غداری کے اس جال سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اس صلح نامے پر دستخط کر دیے جائیں۔ کارنوالس کی شرائط یہ تھیں۔

1۔ سلطان اپنے اتنے علاقے سے دستبردار ہو جائے جو تین کروڑ سالانہ محاصل ادا کرتا ہو۔

2۔ آٹھ کروڑ اشرفیوں یا پگوڈوں (سکہ) کی شکل میں ادا کیا جائے۔

3۔ اس رقم کی ادائیگی تک سلطان اپنے دو بیٹوں کو بہ طور یرغمال انگریزوں کے قبضے میں دے دے۔

23 فروری 1792ء کو معاہدے پر دستخط ہوئے اور اب دو شہزادوں کو یرغمال کے طور پر انگریزوں کے حوالے کرنا تھا۔ اس کے لیے عبدالخالق عمر آٹھ سال اور معزالدین عمر پانچ سال کا انتخاب کیا گیا کیونکہ بڑا بیٹا فتح حیدر جس کی عمر اٹھارہ سال تھی، فوج کے ساتھ موجود نہیں تھا۔

26 فروری کو دوپہر کے قریب شہزادے توپوں کی سلامی کے ساتھ قلعہ سے روانہ ہوئے۔ قلعے کی پھاٹک کی فصیل پر سلطان خود انہیں رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ ہر شہزادہ ہاتھی پر چاندی کے ہودے میں بیٹھا تھا۔ جلوس کے آگے آگے اونٹوں پر سوار ہرکارے اور سات نشان بردار تھے جن کے ہاتھوں میں سبز جھنڈے تھے۔ ان کے پیچھے نیزہ بردار تھے۔ عقب میں دو سو پیادے اور سواروں کی ایک جمعیت تھی۔ محل سرا میں آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ان شہزادوں کو مدراس بھیج دیا گیا۔

محاصرہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ صلح نامے کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ کارنوالس نے صلح نامے کی خلاف ورزی کی۔ اس نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ کورگ کا حسین علاقہ بھی انگریزوں کے سپرد کیا جائے حالانکہ صلح نامے میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔

انگریز جانتے تھے کہ سلطان اب جنگ کرنے سے قاصر ہے کیونکہ اس کے ایک نہیں دو بیٹے ہمارے قبضے میں ہیں اسی لیے کارنوالس ایسی بددیانتی کا مطالبہ کر رہا تھا۔

ٹیپو نے احتجاج ضرور کیا لیکن آخر سلطان کو کورگ بھی انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔ کارنوالس نے دھمکی دی تھی کہ اگر کورگ اس کے حوالے نہیں کیا گیا تو جنگ دوبارہ شروع کر دی جائے گی۔

کورگ کا علاقہ نکل جانے سے سلطان کے ہاتھ سے تقریباً آدھا ملک نکل گیا۔ ایک طرف دو بچوں کے چھن جانے کا دکھ، ایک طرف خزانہ خالی ہو جانے کا رنج اور اب کورگ بھی چلا گیا۔

کارنوالس اور اتحادیوں کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے کارنوالس کے لیے سرنگاپٹم میں مزید قیام کرنا بے سود تھا۔ اس نے روانگی کے لیے سامان باندھا۔ اتحادی اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔

کارنوالس نے سابق راجا کے خاندان کی وفاداریاں خریدنے کے لیے ان کی رانیوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ سلطان سے سلطنت چھین کر ان کے حوالے کر دے گا لیکن صلح کر لینے کے عمل سے مرہٹے خوش نہیں ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی نہ کسی وقت سرنگاپٹم میں انگریزی فوجیں پھر داخل ہوں گی۔

سلطان ٹیپو بھی سمجھ سکتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ اس ذلت آمیز صلح سے وہ مایوس نہیں ہوا بلکہ انگریزی فوجوں کے نکلتے ہی اس نے زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ اس لیے نہیں کہ اس کے ہاتھ سے وہ علاقے نکل گئے تھے جو اس کے باپ حیدرعلی نے بڑی جفاکشی سے حاصل کیے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی ہار میں ہندوستان کے مستقبل کو گہناتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے علاوہ کسی حکمران میں اتنی سکت نہیں کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں۔ میسور کے زوال کے ساتھ ہی کوئی علاقہ محفوظ نہیں رہے گا۔ انگریز [illegible] قوم ہے جو مطلب نکل جانے کے بعد اپنے اتحادیوں کو بھی آزاد نہیں رہنے دے گی۔

کاش! نظام اور مرہٹے انگریزوں کے بجائے ٹیپو سے اتحاد کرتے۔

ٹیپو ان اتحادیوں کی طرف سے مایوس ہونے کے بجائے اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کی فکر میں تھا۔ چند ہی ماہ میں قلعوں کی ازسرنو تنظیم کی گئی۔ جدید اسلحہ بننے لگا اور فوجی بھرتی کا کام تیز ہوگیا۔

سب سے بڑا کام انگریزوں کو تاوان کی باقی اقساط کا تھا مگر اب سلطان کے پاس آدھا ملک بھی باقی نہیں بچا تھا۔ آمدنی کے ذرائع محدود ہو گئے تھے۔ اتنی بھاری قسطوں کا ادا کرنا دشوار نظر آتا تھا۔ سوال شہزادوں کی واپسی کا تھا۔ جب تک شہزادے انگریزوں کے قبضے میں تھے، ٹیپو کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ٹیپو نے حسن تدبیر سے کام لیا۔ بے جا اخراجات سے گریز کیا۔ جو علاقے اس کے پاس رہ گئے تھے وہاں امن قائم کیا اور رعایا پر بوجھ ڈالے بغیر خزانہ بھر گیا۔ اس نے انگریزوں کی بقیہ اقساط ادا کر دیں۔

یورپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اسی دوران ٹیپو کے سب سے بڑے دشمن کارنوالس کو انگلستان واپس بلا لیا گیا۔

کارنوالس نے جنرل میڈوز کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود انگلستان روانہ ہوگیا۔ اس آپا دھاپی میں شہزادوں کی رہائی کا معاملہ رکا رہا حالانکہ قسطوں کی ادائیگی ہو چکی تھی۔

کارنوالس کی جگہ سرجان شور ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ مجبور تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔ اس نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرلی۔ جب مرہٹوں نے نظام کی ریاست پر حملہ کیا تو نظام نے معاہدے کے مطابق انگریزوں سے امداد مانگی لیکن گورنر جنرل نے مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔

کمپنی کے خزانے بھرنے کے لیے سرجان شور نے والیِ ہند سے ہٹ کر اودھ کے معاملات میں دخل دے کر کمپنی کے مالی حالات کو بہتر بنانے کی سعی کی۔

آصف الدولہ والیِ اودھ کی موت کے بعد اس کے بھائی سعادت علی کو تخت پر بٹھانے کے لیے سرجان شور نے اہم کردار ادا کیا۔ سعادت علی نے ہر شرط پر مہر ثبت کر دی۔

اب گویا شمالی ہند میں بھی انگریزوں کے قدم پہنچے۔ دہلی پہلے ہی انگریزوں کا احسان مند تھا، اب لکھنو بھی ہوگیا۔

ان حکمرانوں میں کوئی بھی ٹیپو کی طرح نہیں تھا۔

صرف ایک دفعہ کی رو سے دس لاکھ روپیہ نقد اور الٰہ آباد کا قلعہ کمپنی کے پاس چلا گیا۔

سرجان شور 1793ء میں ہندوستان آیا۔ ابتدا میں وہ عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا تھا (بعد میں اس نے اودھ کے معاملات میں دخل دیا)

1794ء میں اس نے ٹیپو کے دونوں شہزادوں کو مدراس سے جانے کی اجازت دے دی۔ شہزادے اپنے میزبان اور اتالیقوں علی رضا خاں اور غلام علی لنگڑا کے ہمراہ میسور کی طرف روانہ ہوئے۔

غلام علی لنگڑا دو سال تک شہزادے کے ساتھ مدراس میں رہنے کی وجہ سے انگریزوں سے بہت قریب ہوگیا اور غالباً اسے لالچ بھی دیا گیا تھا کیونکہ آئندہ وہ ٹیپو سے غداری پر عمل پیرا رہا۔

شہزادوں کی بہ حفاظت واپسی کے بعد ٹیپو کی زندگی کا

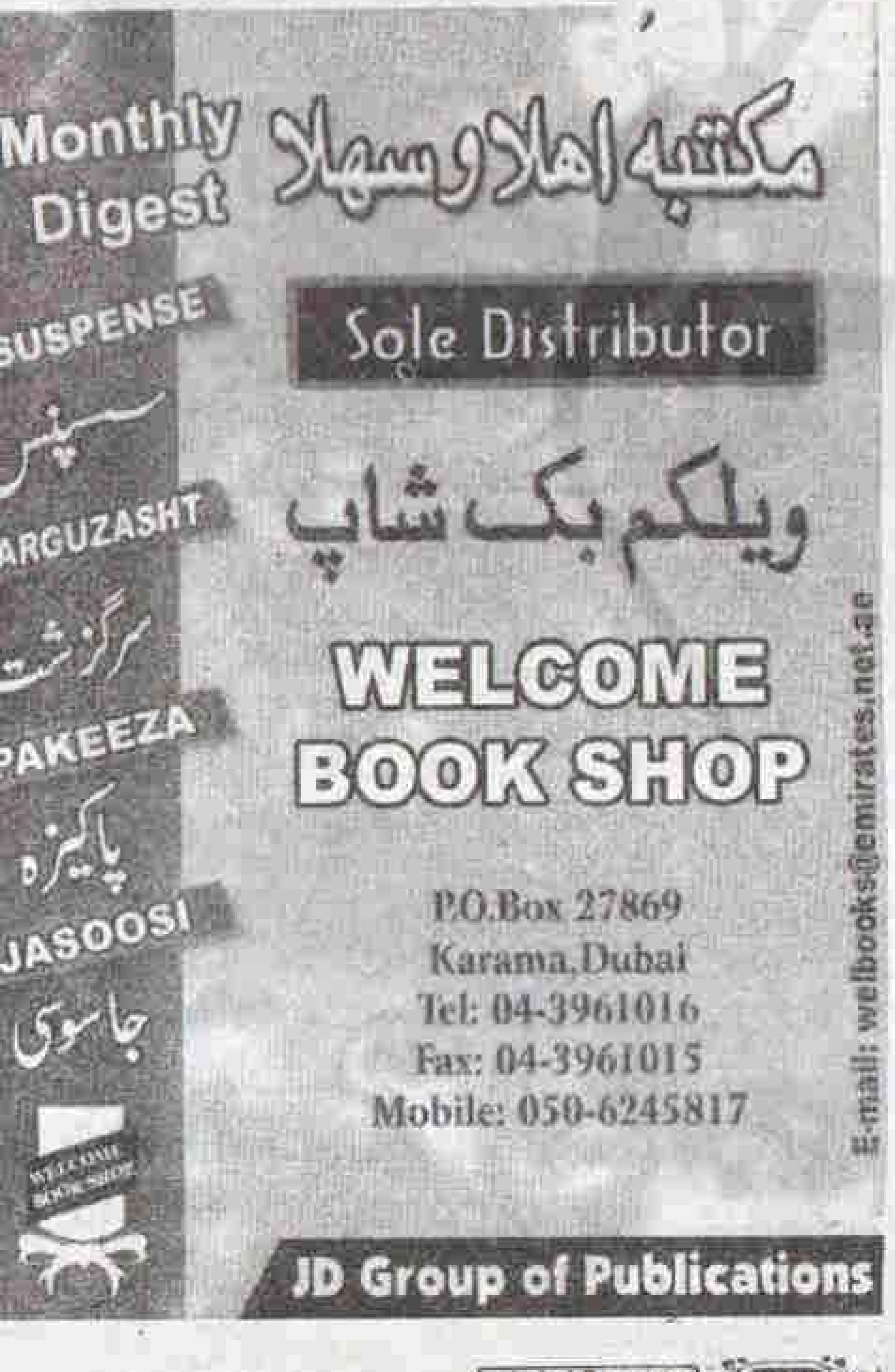

www.Paksociety.com

ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ وہ اتنی طاقت حاصل کرلے کہ انگریزوں سے اپنی ذلت کا انتقام لے سکے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اپنی مملکت سے غداروں کے وجود کو ختم کرے یا کم از کم انہیں سازشوں سے باز رہنے کی تلقین کرے۔

اس نے تمام مسلمان وزیروں اور افسروں کو مسجد میں جمع کیا اور سب سے فرداً فرداً حلف لیا کہ وہ سلطان اور سلطنت خداداد کا وفادار رہے گا۔ ان حلف اٹھانے والوں میں غدار میر صادق بھی تھا جس نے اقرار کیا۔

''میں میر صادق نمک خوار ملازم سلطنت خداداد اپنے پروردگار اور پیغمبرؐ اور کلام اللہ کو حاضر ناظر جان کر صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میں نہایت وفاداری سے اپنے آقا سلطان کی اطاعت کروں گا اور اس کے حکم کو ہر چیز پر مقدم رکھوں گا۔''

اسی قسم کے الفاظ سب نے ادا کیے۔ اب کوئی مسلمان ہوگا جو یقین نہیں کرے گا۔ ٹیپو نے بھی یقین کیا اور خاموشی سے تیاری کرنے لگا۔ سلطان کو فی الحال انگریزوں، مرہٹوں اور نظام سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے اس نے اندرونی غداروں سے نمٹنے کے لیے فوجیں روانہ کیں۔ میر قمرالدین نے ان مہمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا لیکن اس کے پیچھے یہ مقصد تھا کہ وہ سلطان کے دل میں جگہ بنا کر اس کی دامادی کا شرف حاصل کرے لیکن ٹیپو نے ایسا نہیں کیا لہٰذا وہ بھی ٹیپو کے خلاف ہوگیا۔

ٹیپو نے فرانسیسیوں سے خط کتابت شروع کردی تھی۔ اس کارروائی کو انتہائی پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ سلطنت خداداد میں ایسے نمک حرام موجود تھے جو انگریزوں کو پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے۔

میر قاسم علی، میر صادق، قمرالدین، معین الدین، پورنیا وغیرہ ایسے ہی لوگ تھے جو بہ ظاہر ٹیپو کے وفادار بنے ہوئے تھے لیکن بہ باطن انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ ٹیپو نے سیکڑوں غداروں کو پھانسی پر چڑھایا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے تھیلیوں کے منہ کھول دیے تھے۔ ایک غدار مرتا تھا تو دس پیدا ہوجاتے تھے۔

انگریزوں کو معلوم تھا کہ اگر وہ سلطان پر غالب آگئے تو دکن میں ان کا تسلط ہوجائے گا۔ نظام کو وہ پہلے ہی خرید چکے تھے۔ مرہٹے بھی ان کے ہاتھوں بکے ہوئے تھے۔ ایک سلطان میسور ہی رہ گیا تھا جو کسی طرح قابو میں نہ آتا تھا۔ اس کی تازہ فوجی بھرتیاں بھی انگریزوں کو دہلائے دے رہی تھیں۔ فرانس اور افغانستان سے ٹیپو کی مراسلت بھی انہیں پریشان کر رہی تھی۔ ان کے جاسوسوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ وہ ایران سے بھی انگریزوں کے خلاف سازباز کر رہا ہے۔

میر غلام علی لنگڑا نے یہ اطلاع بھی پہنچا دی کہ دوسو فرانسیسی فوجی عہدے دار سلطان کی مدد کے لیے سرنگا پٹم پہنچ گئے ہیں اور ٹیپو کے کہنے پر والی افغانستان، ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ وہ اگر دہلی پہنچ گیا تو مغل شہنشاہ کو سہارا مل جائے گا اور وہ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا۔

یہ تمام خبریں انگلستان پہنچ رہی تھیں۔ جو کچھ ہورہا تھا اسے سرجان شور کی کمزوری سمجھا گیا اور 1798ء میں لارڈ ویلزلی ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا گیا۔ اس کا انتخاب شاید اس لیے کیا گیا تھا کہ اسے فرانسیسیوں کا سخت دشمن خیال کیا جاتا تھا۔

اس نے مدراس کی سرزمین پر قدم رکھا ہی تھا کہ اسے معلوم ہوا اسی دن ٹیپو کے سفیر ماریشس سے منگلور پہنچے ہیں۔ میرے اندیشے درست تھے، اس نے سوچا۔ ٹیپو فرانسیسیوں سے گٹھ جوڑ میں لگا ہوا ہے۔

مدراس سے کلکتہ تک وہ ٹیپو کو شکست دینے کی تجویزیں تراشتا رہا۔ کلکتہ پہنچتے تک وہ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے ایک شاندار ترکیب وضع کرچکا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ٹیپو سے جنگ آزما ہونے کے لیے تنہا کمپنی کی فوجیں ناکافی ہیں۔ نظام اور مرہٹوں کو ساتھ ملائے بغیر یہ جنگ نہیں جیتی جاسکتی۔ اس نے نظام کو قابو کرنے کے لیے حکم نامہ جاری کیا کہ تمام ہندوستانی ریاستوں کو اپنی امداد کے لیے انگریزی فوج اپنی حدود ریاست میں رکھنی ہوگی۔ کوئی ریاست غیر برطانوی افسروں کو ملازم نہیں رکھ سکتی۔ جہاں جہاں فرانسیسی افواج ہیں انہیں نکال دیا جائے۔ ایسی ریاستوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی جہاں فرانسیسی افواج ہیں۔

اس حکم نامے کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ تھا کہ سلطان ٹیپو اس حکم کو ہرگز نہیں مانے گا اور اس کا یہی انکار اس پر حملے کے لیے بہانہ بنالیا جائے گا۔

نظام بھی ابتدا میں تیار نہیں ہورہا تھا لیکن بالآخر نظام اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ ہوگیا۔ نظام نے انگریزی امدادی فوج اپنی ریاست میں رکھ کر اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا لیے۔

مرہٹوں میں یہ افواہ پھیلا کر مضطرب کردیا گیا کہ والی افغانستان، ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ شمالی ہندوستان میں جو مرہٹوں کے مقبوضات ہیں وہ خطرے میں ہیں۔

مرہٹوں نے بھی انگریزوں سے معاہدہ کرلیا۔

انگریز نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ اودھ کی سرحد پر مرہٹوں کے مقبوضہ علاقے تھے۔ انگریزوں نے اپنی ایک فوج اس سرحد پر بھیج دی۔ جواز یہ پیش کیا کہ افغانستان حملہ کرنے والا ہے اس لیے یہ فوج اودھ کی حفاظت کے لیے تعینات کی گئی ہے۔

جب یہ تمام امور سرانجام پاچکے تو اس نے ٹیپو کے نام ایک اہانت آمیز مکتوب لکھا۔

''آپ فرانسیسیوں سے جو انگریزوں کے دشمن ہیں، جو خط کتابت کر رہے ہیں، اس سے ہم بھی واقف ہیں...... ان تمام نتائج کی ذمے داری آپ پر ہوگی جو آپ کر رہے ہیں۔ کمپنی سے آپ کی دوستی (صلح نامہ کارنوالس) بھی ختم ہوسکتی ہے۔ انتشار اور بدنظمی بھی پیدا ہوسکتی ہے اور آپ کے مذہب کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

ویلزلی نے اس خط کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور اپنی فوجوں کو حکم دے دیا کہ وہ میسور پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار رہیں اور خود بھی میدان جنگ سے قریب ہونے کے لیے مدراس پہنچ گیا۔

بے بس سلطان ٹیپو ایمان فروشوں میں گھرا ہوا تھا۔ ویلزلی کے خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کی ایک ایک کوشش سے واقف ہے۔ وہ اس کے سوا کیا لکھ سکتا تھا جو اس نے خط کے جواب میں ویلزلی کو لکھا۔

''میرا دلی مقصد یہ ہے کہ میں نے جو معاہدہ کیا ہے اس پر قائم رہوں اور اسے مستحکم کروں۔ میں اس وقت محل میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی شکار کو نکلتا ہوں۔

امید ہے کہ آپ دل میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں آنے دیں گے۔''

لارڈ ویلزلی کا دل تو کیا صاف ہوتا اس نے ایک اور خط ٹیپو کو لکھا اور ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ خط کا جواب ایک دن کے اندر اندر آنا چاہیے۔

اس طویل خط میں ایسے اہانت آمیز مطالبے تھے کہ ٹیپو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے انگریزوں سے لڑنے کا ارادہ کرلیا۔ ٹیپو نے وقت مقررہ پر خط کا جواب نہیں دیا۔ ویلزلی نے اپنی فوجوں کو مملکت خداداد میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔

جنرل ہیرس برطانوی فوج کا کمان دار اعلیٰ تھا۔

ہیرس کی کمان میں اکیس ہزار فوج تھی۔

حیدرآباد نے اٹھارہ ہزار سپاہ بھیجی۔

بمبئی سے جنرل اسٹوارٹ چھ ہزار فوج کے ساتھ آگیا۔

مرہٹوں کا پیشوا باجی راؤ بھی انگریزوں کی مدد کو آگیا۔

جنرل ہیرس، جنرل اسٹوارٹ اور آرتھر ویلزلی کی کمان میں تین مختلف سمتوں سے فوجیں روانہ ہوئیں جنہیں بالآخر سرنگا پٹم میں مل جانا تھا۔

انگریزی افواج ہر تین طرف سے سرنگا پٹم کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سلطان کے جنرل ان کی مزاحمت نہیں کر رہے تھے، یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت ہورہا تھا۔

کچھ وطن پرست دستے تھے جو انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن ان کی بساط کیا تھی۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ خود گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے جاں نثار اس کے ساتھ تھے۔ وہ یلغار کرتا ہوا نکلا اور ایک جگہ پہنچ کر انگریزوں کا راستہ روک لیا۔

اس وقت پورنیا، میر معین الدین اور میر قمرالدین اس کے ساتھ تھے۔ یہ تینوں کے تینوں غدار تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ٹیپو کا لشکر غالب آنے لگا ہے تو وہ لشکر کو اس مقام پر لے گیا جو انگریزی توپ خانے کی زد پر تھا۔ سلطانی لشکر کو شدید نقصان پہنچا۔ ٹیپو نے ایک مرتبہ پھر لشکر کو یکجا کیا اور دشمن پر ہلا بول دیا۔ اس مرتبہ میر قمرالدین کی غداری سے پانسا پلٹ گیا۔

سلطانی لشکر کے بہت سے سپاہی دشمن کی بھینٹ چڑھ گئے۔

جنرل اسٹوارٹ کے متعلق خبر پہنچی کہ وہ سرنگا پٹم کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اسے سرنگا پٹم کی فکر ہوئی۔ اس نے تھوڑی سی فوج اس محاذ پر چھوڑی اور خود سرنگا پٹم پہنچ گیا۔

وہ سرنگا پٹم پہنچا تو اس کے وفادار امرا اسے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ سرنگا پٹم سے کہیں اور چلا جائے اور کسی دوسری جگہ جا کر از سرِ نو اپنی قوت بڑھائے۔

اس نے اس مشورے کو ٹھکرا دیا۔ ''نہیں، میں دارالسلطنت چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میسور کی تاریخ مجھے مفرور کے نام سے یاد کرے۔''

اسٹوارٹ کی فوج سرنگا پٹم تک آگئی تھی۔ انگریزی فوج کا دوسرا حصہ جنرل ہیرس کی سرکردگی میں آگیا۔ دونوں نے مل کر ایک گنجان باغ میں مورچے جمالیے۔ یہ باغ قلعے کی فصیل سے بالکل نزدیک تھا۔ یہاں سے نہایت موثر گولہ باری کی جاسکتی تھی۔

www.Paksociety.com

انگریزوں کو یہاں تک لانے والا غدار میر قاسم علی تھا۔ سلطان اس گوشے کا معقول انتظام نہ کرا سکا تھا۔ میر قاسم قلعے کے اس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اس نے انگریزوں کو مخبری کردی۔

اس وقت دارالسلطنت میں صرف میر قاسم ہی نہیں تھا۔ ہر امیر اپنی جڑیں کاٹنے میں مشغول تھا۔ امرا کے مکانات جاسوسوں کے ٹھکانے بنے ہوئے تھے جن میں انگریز جاسوس پہلے ہی سے آکر چھپ گئے تھے۔

یہ جنگ ہتھیاروں سے نہیں سازشوں سے لڑی جارہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوجوں نے چاروں طرف سے سرنگاپٹم کو گھیرے میں لے لیا۔

اتنی ہزیمت اٹھانے کے بعد اسے یقین آگیا کہ ہر چہرے پر دوسرا چہرہ لگا ہوا ہے۔ جن لوگوں کو اس نے جاگیریں بخشیں، مراتب بلند کیے، جاں نثار سمجھا وہی اس کی جان کے خواہاں ہیں۔ اس کے وفادار اس پر جان نچھاور کرنے کی قسمیں کھا رہے تھے اور وہ اپنے قول میں صادق بھی تھے لیکن قلعے کے باہر سے گولہ باری ہو رہی تھی۔ اس طرف سے جو توپیں داغی جارہی تھیں ان توپوں میں روئی بھری ہوئی تھی۔ ان غداروں کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ توپوں میں پھول رکھ کر انگریزوں پر نچھاور کرتے۔

جنرل میڈوز نے اپنی کتاب میں اس کا اعتراف کیا۔

''ہمیں محفوظ راستے سے لاکر رہبری کرتے ہوئے عین قلعے کے سامنے جنوب مغرب کے گوشے تک لانے والا میر قاسم علی تھا۔''

سرنگاپٹم کا قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ اس کی کمزور ترین فصیل پر مسلسل گولہ باری کرنے کے باوجود قلعے میں داخل ہونے کے لیے بیس دن لگ گئے۔

مسلسل غیر موثر گولہ باری کو بھانپ کر اپنے فرنچ جنرل موسیو کو طلب کیا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں، جن کو میں اپنا سمجھتا تھا انہوں نے میرے ساتھ کیسا دھوکا کیا ہے۔ میں ان کی دغابازی پر بہت متعجب ہوں۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

موسیو، سلطان کی بے بسی پر آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ''ہم آپ کے لیے کٹ مرنے کو تیار ہیں لیکن آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ تمام نقد و جواہر اور بیگمات کو لے کر صوبہ سرا یا چتیل ورگ چلے جائیں۔ آپ کے بعد قلعے کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔''

یہ مشورہ نہایت معقول تھا۔ اگر وہ نکل جاتا تو انگریز محاصرہ اٹھا لیتے یا کم از کم یہ تو ہوتا کہ وہ دوبارہ سرنگاپٹم کو فتح کرلیتا۔

''میری ایک تجویز اور ہے'' موسیو نے کہا۔ ''انگریزوں کو ہم فرانسیسیوں سے پرخاش ہے۔ آپ ہمیں نکال دیں۔ انگریز آپ سے مصالحت پر آمادہ ہوجائیں گے۔''

''میری پوری سلطنت بھی تاراج ہوجائے تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔''

میر صادق کو معلوم ہوا کہ سلطان فرانسیسیوں کی باتوں میں آنے والا ہے تو اس نے سلطان کے پاس حاضری دی اور اسے بھڑکانے کی کوشش کرنے لگا۔

''حضور، ان کی باتوں میں نہ آیئے گا۔ فرانس اور انگریز دونوں یورپین قومیں ہیں۔ اگر آپ نے پیٹھ موڑی تو فرنچ سپاہ انگریزوں سے مل جائے گی اور ملک ہاتھوں سے چلا جائے گا۔''

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میری رائے تو یہ ہے کہ مساویانہ شرائط پر انگریزوں سے صلح کرلیں۔''

''مجھے یقین نہیں کہ اس وقت انگریز صلح کریں گے۔''

''انگریز آپ کے نام سے کانپتے ہیں۔ وہ ضرور صلح کرلیں گے۔ اگر شرطیں حسب منشا نہیں ہوئیں تو ہم تسلیم نہیں کریں گے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔''

سلطان نے اس کی بات مان لی۔

میر صادق نے دوسرے ہی روز انگریزی کیمپ میں خبر پہنچا دی کہ سلطان صلح نامہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ آپ سخت سے سخت شرائط رکھیے۔

ٹیپو نے صلح کی تحریک چلائی اور نتیجہ حسب توقع نکلا۔ انگریزوں نے حسب ذیل شرائط رکھ دیں۔

1۔ تمام فرانسیسی سپاہ کو برطرف کر کے انگریزوں کے حوالے کیا جائے۔

2۔ سلطان کو انگریزوں کا باج گزار بن کر رہنا پڑے گا۔

3۔ سواحل کے قریب والے تمام علاقے انگریزوں کے حوالے کیے جائیں۔

4۔ سلطان کے بعد انگریز چاہیں تو تمام سلطنت پر قابض ہوجائیں گے۔

5۔ سلطان ضرورت کے وقت اپنا خزانہ بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

انگریزوں کے حوالے کرے گا۔

6۔ سلطان اپنے چار لڑکے انگریزوں کی تحویل میں دے۔ شہزادوں کے ساتھ چار وکیل میر قمرالدین، میر صادق، پورنیا اور سید غفار بھی انگریزوں کے حوالے کیے جائیں۔

ان میں سید غفار کے علاوہ باقی تین وہ تھے جو انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ سید غفار سلطان کا سب سے وفادار سپہ سالار تھا۔ وہ اسے سلطان سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ تینوں ایجنٹوں کی طرف سے انہیں یہ خطرہ تھا کہ سلطان انہیں قتل نہ کرادے اس لیے اپنے پاس بلانا چاہتے تھے۔

کون غیور مسلمان ان شرائط کو تسلیم کر سکتا تھا۔ یہ تو میر صادق جیسے غداروں ہی کا شیوہ ہو سکتا تھا جو ایسی شرائط معاہدے میں رکھوا دیں۔ ٹیپو نے ان شرائط پر غور کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی اور تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق انگریزوں پر گولے برسانے کا حکم دیا۔ توپ خانے پر بھی غداروں کی کمی نہیں تھی۔ توپوں کے اندر روئی اور مٹی بھر کر توپیں چلائی جانے لگیں۔ سید غفار بھاگتا ہوا سلطان کی خدمت میں آیا۔

”حضور، اس غدار خانے میں کسی پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے میری التجا پر جلد سے جلد یہاں سے نکل جایئے۔ میں اور میری سپاہ اس وقت تک مزاحمت کرتی رہیں گی جب تک آپ چتیل ورگ نہ پہنچ جائیں۔“

”میرے چند رفقا کا بھی یہی کہنا ہے اور اب تم بھی یہی کہہ رہے ہو۔ اچھا مال وزر صندوقوں میں بھرواؤ۔ میں چتیل ورگ جاؤں گا۔ جنگ تو میں وہاں رہ کر بھی کرسکتا ہوں۔“

سب سے پہلے میر صادق کو سلطان کے اس فیصلے کی خبر ہوئی۔ وہ بدرالزماں کے پاس گیا۔ ”غضب ہوگیا۔ سلطان نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اگر وہ نکل گیا تو ہم انگریزوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ فوراً سلطان کے پاس جاؤ اور اسے روکنے کی کوشش کرو۔ اگر میں نے کچھ عرض کیا تو اس کے دل میں شک پیدا ہوجائے گا کہ بار بار میں ہی کیوں روکتا ہوں۔“

”اگر وہ پھر بھی نہیں رکا؟“

”پھر ہم انگریزوں کو خبر کردیں گے۔ مال وزر راستے ہی میں لٹ جائے گا۔“

بدرالزماں نے چند اور امرا کو ساتھ لیا جو سب کے سب انگریزوں کے ہاتھوں بک چکے تھے اور سلطان کے حضور پہنچ گیا۔

”حضور والا اگر آپ تشریف لے گئے تو جاں نثاروں کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی۔ اس کے علاوہ یہ حضور کے شایانِ شان بھی نہیں۔ ہم وفادار حق نمک ادا کریں گے۔ آپ پر کوئی گزند نہیں آنے دیں گے۔“

ٹیپو نے اس منافق کے کلمات کو حیرت سے سنا۔ پھر اس نے وہاں موجود دوسرے امرا کی طرف دیکھا۔ سب کے سب بدرالزماں کی تائید کررہے تھے۔

سلطان ٹیپو انہیں پہچان چکا تھا لیکن شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی انسان ہیں۔ ہوسکتا ہے راہ راست پر آگئے ہوں۔ یا پھر یہ کہ خود اس کی غیرت بھی یہ گوارا نہ کررہی ہو کہ وہ ان غداروں کے ساتھ ساتھ اپنے وفاداروں کو موت کے منہ میں دھکیل کر خود بھاگ جائے۔ ایک سرد آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اچھا اگر مشیت ایزدی یہی ہے تو نہیں جاتا۔“

دشمنوں کی سازش کامیاب ہوگئی تھی۔ اب انہوں نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ دینا شروع کردیا تھا۔ فوج کے بخشی، میر صادق کی ہدایت پر انگریزوں کو قبل از وقت خبر دے دیتے تھے کہ آج اس فصیل سے گولہ باری ہوگی۔ فلاں جگہ اتنی فوج متعین ہے۔ میر قاسم تو انگریزوں کی رسد روکنے کے بہانے سلطانی رسد ساتھ لے کر انگریزی کیمپ میں پہنچ گیا تھا اور وہاں سے انگریزوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

میر قاسم علی غائب تھا۔ اس کا مطلب یہی لیا جاسکتا تھا کہ وہ انگریزوں کے پاس پہنچ گیا۔

شدید گولہ باری سے قلعے کی ایک دیوار منہدم ہوگئی۔ انگریزوں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ تو ٹیپو کا رعب تھا کہ انگریزوں کے قدم اس طرف نہیں اٹھ رہے تھے۔

سلطان حیران تھا کہ اس تنظیم کے ساتھ گولیاں برسانے کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ کیوں برآمد نہیں ہورہا ہے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ اس کے خلاف سازش ہورہی ہے۔ اس کے سامنے بہت سے چہرے آگئے تھے جن پر لکھا تھا ”غداران وطن“

اس نے ایک پرچے پر ان غداروں کے نام لکھے اور میر معین الدین کے حوالے کردیا۔ اس پر درج تھا ”ان غداروں کو آج رات قتل کردیا جائے۔“

یہ سلطان کی بدنصیبی تھی کہ وہ تمام چہروں کو پہچاننے کے باوجود یہ نہیں جان سکا تھا کہ میر معین الدین خود بھی ان غداروں میں شامل ہے۔ میر معین الدین نے مسکراتے ہوئے

...لے کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر یہ پرچہ اس کی جیب ہی میں

سلطان کو اس کے بعد اتنی فرصت نہ ملی کہ پوچھتا، غدار اب تک زندہ کیوں ہیں؟

اس نے یہ بھی حکم دیا کہ محل سرا کے گرد خندق کھود کر اس میں بارود بھر دیا جائے تاکہ انگریز اندر آجائیں تو حفاظت ناموس کے لیے بارود میں آگ لگا کر محل سرا کو اڑا دیا جائے۔

4 مئی 1799ء کی صبح طلوع ہوئی۔ نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی ٹیپو نے دیوار کے شگاف کا معائنہ کیا اور اس کی مرمت کا حکم دیا۔

وہ یہ حکم دینے کے بعد محل میں آیا ہی تھا کہ دربار کے نجومیوں نے اسے متنبہ کیا کہ آج کا دن اس کے لیے منحوس ہے۔ اس لیے صدقہ دے اور شام تک چھاؤنی میں رہے۔

میر صادق نے رات ہی کو انگریزوں کو بتا دیا تھا کہ قلعہ پر دوپہر کو حملہ کیا جائے۔ دوپہر تک میر صادق کو جو کرنا تھا اس کی سازش کی تیاری مکمل کرلی گئی تھی۔

سلطان جیسے ہی شگاف کا معائنہ کرنے کے بعد واپس پلٹا میر معین الدین اسی شکستہ دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ مرمت کا کام جاری تھا۔ میر معین الدین کا ماتحت سپہ دار سید غفار اپنی سپاہ کے ساتھ اس شگاف پر مستعد کھڑا تھا۔ اس کی بہادری ضرب المثل تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے انگریزوں کی مجال نہیں تھی کہ اندر داخل ہوتے۔ میر معین بڑی دیر تک غور کرتا رہا کہ سید غفار کو کس طرح وہاں سے ہٹایا جائے۔ اس نے سید غفار کو کسی کام کے بہانے سلطان کے پاس بھیجا۔ سید غفار، میر معین کے حکم کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ مورچے سے ہٹ گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس غدار میر معین نے فوج سے کہا کہ تنخواہیں تقسیم ہورہی ہیں، اپنی تنخواہ لے لو ورنہ ایک مہینا انتظار کرنا پڑے گا۔ سید غفار جونہی واپس آیا توپ کا ایک گولہ کہیں سے آیا اور سید غفار کو شہید کرگیا۔ اس کے ہلاک ہوتے ہی غداروں نے سفید رومال ہلا کر انگریزی فوج کو حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔ دشمن کی فوج پہلے ہی سے خندق میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس اشارے کے ملتے ہی حرکت میں آگئی۔ صرف چھ منٹ میں شگاف کے سرے پر برطانوی جھنڈا نصب کردیا گیا۔

ٹیپو اس وقت دسترخوان پر بیٹھا ہی تھا کہ سید غفار کے مارے جانے کی خبر موصول ہوئی۔ وہ کھانا چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور شگاف کی طرف چل پڑا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی انگریز وہاں اپنا جھنڈا نصب کرچکے تھے۔

منصوبہ یہ تھا کہ فصیل پر چڑھنے کے بعد فوج کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔ ایک حصہ بنگلوری دروازے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا اور دوسرا حصہ شمالی فصیل پر قبضہ کرلے گا۔

فصیل پر چڑھنے کے لیے میر قاسم رہنمائی کررہا تھا۔ سب سے پہلے میر قاسم فصیل پر چڑھا پھر ساری فوج اوپر پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔

”اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔“

میر صادق نے ”آبی پھاٹک“ بند کرادیا کیونکہ ٹیپو اس وقت اس پھاٹک کے قریب تھا۔ میر صادق نے سوچا ہوگا کہ سلطان فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ قلعہ دار نادم خاں پھاٹک کی چھت پر کھڑا تھا لیکن اس نے اپنے آقا کو نظر انداز کیا۔ پھر وہ اس پھاٹک پر پہنچا جہاں سے قلعے کے اندرونی حصے کو راستہ جاتا تھا۔ یہ پھاٹک بھی بند ملا۔

انگریزی فوج اندرونی اور بیرونی دمدموں سے میسوریوں پر تباہ کن گولہ باری کررہی تھی جو بھاگنے کے لیے دروازوں پر ہجوم کررہے تھے۔

میر صادق نے جنرل بیرڈ کو اطلاع دی کہ سلطان قلعے کے فلاں گوشے میں ہے۔ انگریزی فوج اس طرف امڈ آئی۔ ٹیپو کی وفادار سپاہ اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ معرکہ ایسا گرم ہوا کہ بندوقیں بیکار ہوگئیں اور تیزی سے تلوار چلنے لگی۔ تین گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ ٹیپو اس طرح حملے کررہا تھا جیسے کوئی شیر گیدڑوں پر حملہ آور ہو۔ انگریزی فوج ہر طرف سے امڈ امڈ کر آرہی تھی۔ ٹیپو بہادری کے جوہر دکھا رہا تھا۔ اب شام ہونے کو آئی تھی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چھ سات گھنٹے سے مسلسل برسرپیکار تھا۔ زخمی بھی ہوچکا تھا اور پیاسا بھی تھا۔

ایک افسر نے موقعے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ٹیپو کو مشورہ دیا۔

”حضور، اب مقابلہ فضول ہے آپ خود کو انگریزوں کے حوالے کردیں۔ ممکن ہے جاں بخشی ہوجائے، زندگی رہی تو مقابلے بہت۔“

یہ سنتے ہی ٹیپو نے یہ تاریخی جملہ کہا۔

”گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔“

یہ کہتے ہوئے جیسے اس میں نئی زندگی دوڑ گئی ہو۔ شمشیر بکف دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اس بلا کا رن پڑا کہ انگریزوں کے

والا شہید ہو گئے۔ اس کے فدائی بھی ایک ایک کر کے اس پر قربان ہو رہے تھے۔ کہیں سے ایک گولی آئی اور اس کا گھوڑا اس کی رانوں تلے دم توڑ گیا۔ دوسری گولی آئی جو اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ چند انگریز سپاہی پھاٹک میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے ٹیپو کی تلوار کی بیش قیمت پیٹی جھپٹ لی۔ وہ اگرچہ نڈھال ہو رہا تھا لیکن وہ اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا۔ ایک تلوار جو قریب پڑی تھی، اٹھا کر سپاہی پر وار کیا جو اس کی دستی بندوق پر پڑا۔ ایک وار اس نے ایک دوسرے سپاہی پر کیا جو کاری ثابت ہوا۔ اسی اثنا میں ایک گولی اس کی کنپٹی میں لگی اور وہ اردگرد بکھری ہوئی لاشوں میں سے ایک لاش بن گیا۔

میسوری حواس باختہ ہو چکے تھے۔ ہر طرف سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ سپاہیوں نے مشرقی دروازے سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن اس مقام پر انگریزوں نے ان کا قتل عام شروع کر دیا۔ بہت سے سپاہی نذر آتش ہوئے اور جو بچے وہ دشمن کے نیزوں کا شکار ہوئے۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ زخمیوں اور مقتولین کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ سلطان کہاں گرا اور زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ دراصل وہ اس وقت بھی اپنے فدائیوں کی لاشوں کے درمیان ابدی نیند سو رہا تھا۔ ٹیپو چونکہ ایک عام سپاہی کی طرح دشمنوں سے لڑ رہا تھا اس لیے انگریزوں کو یہ پہچاننے میں سخت دشواری ہو رہی تھی کہ ان میں ٹیپو کی لاش کون سی ہے۔

مشعل کی تیز روشنی میں انگریز اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ محل سرا کی تلاشی لی گئی۔ یہاں چند انگریزوں کی لاشیں تھیں اور عفت مآب خواتین کی خون میں لت پت لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ غالباً کچھ انگریز محل سرا میں گھس آئے ہوں گے جن سے ان خواتین نے مقابلہ کیا۔ خود بھی ختم ہو گئیں، دشمن کو بھی ڈھیر کر دیا۔

قلعے میں ایک مقام پر ٹیپو کی پالکی ملی۔ اس کے اندر کوئی مجروح لیٹا تھا۔ تلاش کرنے والوں نے سمجھا یہی ٹیپو ہے۔ انہوں نے بندوقیں تان لیں۔

”مجھے مت مارو۔ میں سلطان نہیں ہوں۔ سلطان کا ملازم راجا خاں ہوں۔“ مجروح زور سے چیخا۔

”تیرا آقا کہاں ہے؟“

اسی راجا خاں نے اس مقام کی نشاندہی کی جہاں ٹیپو گرا تھا اور پھر اسے شناخت کر لیا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور جسم گرم تھا۔ اس نے چار زخم کھائے تھے تین جسم اور ایک کنپٹی پر۔ اس کے جسم پر نفیس کپڑے کی آستین دار صدری پھول دار ڈھیلا ڈھالا زیرجامہ، کمر کے گرد ارغوانی رنگ کا سوتی کپڑے کا پٹکا تھا۔ سر ننگا تھا۔ غالباً پگڑی جنگ کی کشمکش میں گر گئی تھی۔ اس کے بازو پر ایک تعویذ تو بندھا تھا لیکن کوئی اور زیور نہیں تھا۔ چہرے پر غیر معمولی وقار سایہ فگن تھا۔

دوسرے دن سہ پہر محل سے جنازہ اٹھا۔ اس شام کا خاتمہ ایک ہیبت ناک طوفان پر ہوا جس کے جلو میں بارش تھی۔ گرج چمک اور بجلیاں تھیں جس سے بمبئی کے کیمپ کے دو افسروں کی جانیں گئیں اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔

☆☆☆

میسوری افسروں کو انگریزوں نے بڑی فیاضی سے غداری کے انعامات دیے۔ قمرالدین خاں کو گورام کنڈ کی جاگیر عطا کی گئی۔ پورنیا کو نئے راجا کا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ میر غلام علی لنگڑا کو تین ہزار پگوڈے سالانہ تاحیات مقرر کیا۔ قتل ہو جانے والے غداروں کے اہل و عیال کو وظیفے ملے۔

نمک حرام میر صادق اپنی غداری کا پھل کھانے کے لیے زندہ نہ رہ سکا۔ سلطان کی تدفین کے بعد وہ انعام وصول کرنے انگریزوں کے کیمپ کی طرف جا رہا تھا کہ ایک میسوری اس کے پیچھے لگ گیا۔ قریب پہنچ کر اسے گھوڑے سے نیچے گرا لیا اور اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔

دفن کیے جانے کے بعد لوگوں نے اس کی لاش کھود نکالی اور کوئی دو ہفتوں تک لوگ لاش کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتے رہے۔ بچے تماشا دیکھنے آتے اور اس پر کوڑا کرکٹ پھینکتے۔

آج بھی ٹیپو کا احترام کرنے والے سرنگاپٹم جاتے ہیں تو اس مقام پر پتھر پھینکتے ہیں جہاں میر صادق مارا گیا تھا۔

ماخذات

تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن۔ دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، سی ای لارڈ۔
حیدر علی، نریندر کرشن سنہا۔ تاریخ میسور جلد نمبر 1، ولکس۔
ٹیپو شہید (ناول)، فیسی رام پوری۔ سلطان ٹیپو شہید (ناول)، الماس ایم اے

دائرہ در دائرہ

مختار آزاد

کوئی کھیل ہو یا مہم... ہمیشہ تمام ہتھیاروں سے لیس رہنے میں ہی کامیابی کا امکان ہوتا ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی کھیل میں مشغول تھے، ایک ہی میدان میں بہ ظاہر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے والے مگر... ایک دوسرے کے ارادوں سے بے خبر۔ ایک ہی ڈگر پر گامزن لیکن... الگ الگ پڑاؤ ڈالنے والے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ویسا نہ ہوتا جیسا وہ چاہتے تھے۔ محبت اور جنگ میں تو ویسے ہی سب جائز ہوتا ہے۔

چند چھپے رستموں کی عیاریوں کا احوال

ہم ہوٹل کے دوسرے فلور کی لابی میں دائرہ بنا کر کھڑے تھے۔ ہمارے سامنے ایک پر ایک، دو ڈبے رکھے تھے۔ ”تم بتاؤ۔“ پیلاڈین نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی نظریں بھی ان ڈبوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ سن کر بھی سب خاموش رہے۔ کسی میں بھی اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ان سب کی افسر جو تھی سوائے میرے۔

اُس وقت وہاں چھ لوگ کھڑے تھے۔ دو کنوینشن سینٹر کے گارڈز، دو ہوٹل سیکیورٹی پر تعینات گارڈ، میں اور پیلاڈین۔ ”تم بتاؤ؟“ یہ سوال اُس نے مجھ سے کیا تھا۔

اس وقت میں بیسویں صدی کے اوائلی عشرے کے کلاسیکل امریکی سراغرسانوں کی طرح خاموش کھڑا غور سے ان ڈبوں کو دیکھتے ہوئے کچھ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔

''ہمیں بم ڈسپوزل اسکواڈ کو بلالینا چاہیے۔'' فل نے بن مانگے مشورہ دیا۔ وہ کنوینشن سینٹر پر تعینات تھا اور حال ہی میں ہوٹل کے سیکیورٹی عملے میں بھرتی ہوا تھا۔ ویسے بھی یہ ہوٹل کئی مہینوں تک امریکی معاشی مندی کی وجہ سے بند رہنے کے بعد دوبارہ کھلا تھا۔ اس لیے زیادہ تر عملہ نیا بھرتی کیا گیا تھا۔

ہوٹل کا سب سے بڑا مسئلہ بزنس ہوتا ہے۔ یورپ و امریکا سے شروع ہونے والی عالمی مندی کے دنوں میں جہاں اور کاروبار ٹھپ ہوئے، وہیں ہوٹل بزنس بھی بری طرح متاثر ہوا تھا۔ کیپ کارن ہوٹل کو دوبارہ کھلے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اگلی صبح کنوینشن سینٹر میں ایک پروگرام طے تھا جس میں ایک معروف کمپنی کا نیا کمپیوٹر گیم لانچ کیا جارہا تھا۔ یہ ہوٹل کا دوبارہ کھلنے کے بعد پہلا بڑا بزنس تھا۔ ایسے میں ان مشکوک ڈبوں کی موجودگی کسی بڑے خطرے سے کم نہیں تھی۔ مہینوں بند رہنے کے بعد کھلنے والا ہوٹل پھر بند ہوسکتا تھا۔ یہ بات لابی میں موجود ہم سب اچھی طرح جانتے تھے کہ ہوٹل بند ہونے کا مطلب سب کا فارغ ہونا تھا۔

میں جھکا اور گھٹنے کے بل فرش پر بیٹھ کر ان ڈبوں کو دیکھنے لگا۔ یہ بہت خوبصورت تھے۔ انہیں نہایت مہارت سے تیار کیا گیا تھا۔ ڈبے کے اوپر شیشے، سنگ مرمر کے ٹکڑوں اور لکڑی کی مدد سے بہت عمدہ کندہ کاری کی گئی تھی۔ دلکش پس منظر کے ساتھ، ڈبے کے عین وسط میں ایک دراز قامت دُبلی پتلی دوشیزہ ذرا سی ترچھی کھڑی نظر آرہی تھی۔ اس کے سنہری بال خاصے لمبے اور ہوا میں اُڑتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دوشیزہ کے جسم پر موجود پتلا سا گاؤن ہوا سے لہرا رہا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آرٹ کے نمونوں کا دیوانہ ہوں مگر جتنی عمدہ دست کاری اُس ڈبے پر کی گئی تھی، اس سے پہلے میں نے کہیں اور نہیں دیکھی تھی۔

میں نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ وہ سب لوگ خاموش کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں ڈبوں کو دیکھ کر یہ پتا چلانے کی کوشش کررہا ہوں کہ اُن کے اندر کیا ہوسکتا ہے۔ کافی دیر بعد میں کھڑا ہوا۔ وہ سب میری طرف دیکھ رہے تھے اور میں خاموش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پیلا ڈین بے چینی سے منتظر ہوگی کہ اب میں کیا کہتا ہوں۔

''اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے مسٹر اسپیڈ؟'' مارون نے مجھے مخاطب کیا۔ اسپیڈ میرا اصل نام نہیں ہے، البتہ سب لوگ مجھے اسی عرفیت سے پکارتے ہیں۔ میرا اصلی نام تو صرف وہی چند لوگ جانتے ہیں جن کا میں پچھلے ایک عشرے سے بہت پرانا مددگار رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اتنے بڑے آدمی ضرور ہیں کہ کبھی کسی کمتر درجے کا شخص ان کے منہ سے میرا اصلی نام نہیں سن سکتا۔ یہ بات میرے لیے بھی اطمینان کا باعث تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں بم ڈسپوزل اسکواڈ کو طلب کرلینا ہی چاہیے؟'' مجھے خاموش دیکھ کر فل نے ایک بار پھر اپنا پرانا مشورہ دُہرایا۔

میں بہ دستور خاموش تھا۔ پیلا ڈین نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور ڈبوں کی طرف ایک قدم اٹھایا۔

''نہیں میڈم... اسے مت چھونا، یہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔'' اس سے قبل کہ وہ جھک کر ان ڈبوں کو ہاتھ لگاتی، ایک سیکیورٹی گارڈ نے اونچی آواز میں اسے آگے بڑھنے سے روکنا چاہا مگر وہ فرش پر گھٹنے کے بل جھکتی چلی گئی۔

''میرا خیال ہے، اسے ہاتھ مت لگائیں۔'' یہ دیکھتے ہوئے ایک اور گارڈ نے اسے روکنا چاہا۔

''جانتی ہوں۔'' وہ گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھی تھی۔ ''مجھے اچھی طرح معلوم ہے یہ چائنیز پزل باکس نہیں ہے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا اور ایک بار پھر اُن ڈبوں پر نظریں گاڑ دیں۔

پیلا ڈین کہنے کو تو عورت تھی لیکن کئی مردوں پر بھاری تھی۔ وہ جسمانی لحاظ سے ہم سب سے زیادہ مضبوط تھی۔ پستہ قامت پیلا ڈین خوبصورت بھی تھی لیکن میں اُسے عورت نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بازوؤں کے ڈولے اچھے خاصے مردوں سے بھی زیادہ بڑے تھے۔ اس وقت بنا بازوؤں کی ٹی شرٹ میں اس کے بھرپور ڈولے صاف نظر آرہے تھے۔ وہ ریسلر تھی اور کئی برس تک رنگ میں فری اسٹائل کشتیاں لڑتی رہی تھی۔ کم از کم وہاں موجود اُن چار محافظوں میں وہ سب زیادہ مستعد اور طاقت ور نظر آرہی تھی۔ ویسے یہ اور بات تھی کہ وہ جب بھی خواتین کے جاذبِ نظر لباس میں ملبوس ہوتی تو مجھے اچھی لگتی تھی۔

''مجھے تو یہ قرونِ وسطیٰ کے زمانے کے لاک باکس لگ رہے ہیں۔'' پیلا ڈین نے کچھ دیر تک ان کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ان ڈبوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''مت چھونا۔'' فل نے ہیجانی انداز میں چلاتے ہوئے اسے روکا۔

[illegible] نہیں لگتے۔'' پیلا ڈین نے سر اوپر [illegible] تو لگتا ہے کہ ہم خوامخواہ پریشان ہو [illegible]۔'' اس کے ہاتھ ڈبے سے صرف چند انچ کے فاصلے [illegible]۔

''ہمیں بم ڈسپوزل اسکواڈ کو فوراً فون کرنا چاہیے۔'' اس بار فل کی آواز خوف سے تھرتھراتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پیلا ڈین نے یہ سُن کر اسے گھورا۔

''پیلا ڈین...'' پہلی بار میں کچھ بولا تھا۔ ''کھڑی ہوجاؤ، میں نے بم ڈسپوزل اسکواڈ کو فون کردیا ہے، وہ پہنچنے والے ہیں۔''

''کیا...'' اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

''ہاں... کھڑی ہوجاؤ۔ بہتر ہے کہ اچھی طرح تسلی ہوجائے، پھر انہیں دیکھ لینا۔'' میں نے ڈبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ کہنے کے بعد میں نے فل کی طرف دیکھا۔ پولیس کی آمد کا سن کر اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

☆☆☆

میں ایک پرائیویٹ سراغرساں تھا اور پیلا ڈین نے بھی پولیس میں خدمات سرانجام دی تھیں۔ ہم دونوں نے کئی سال اکٹھے کام کیا تھا۔ کئی خطرناک کیس اکٹھے مل کر حل کیے تھے۔ پیلا ڈین نے کئی سال پہلے پولیس کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد میں نے بھی نوکری چھوڑ کر پرائیویٹ سراغرسانی کا لائسنس حاصل کرکے کام شروع کردیا تھا۔

سراغرسانی میری پہچان تھی لیکن پولیس کے زمانے سے ہی میری انڈرورلڈ میں بڑی اچھی جان پہچان تھی۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد بھی شناسائی برقرار رہی۔ اکثر میں اُن کے کیس لیتا رہتا تھا۔ اُن کے کاموں میں ایک فائدہ تو یہ تھا کہ مال لمبا مل جاتا تھا ورنہ سیدھی سادی سراغ رسانی کچھ زیادہ فائدے کا بزنس نہیں تھا۔

امریکی معاشی مندی نے تو ہر طرح کا دھندا ٹھپ کردیا تھا۔ بے روزگاری بہت بڑھ گئی تھی۔ اس مندی کا اثر ہر طرح کے بزنس پر ہوا تھا۔ میں بھی کئی مہینوں سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے گھوم رہا تھا۔ اُن دنوں میرا زیادہ تر وقت یہ سوچنے میں گزرتا تھا کہ ایسا کون سا کاروبار کیا جائے جو بنا پیسوں کے شروع ہوجائے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بہت جلد مجھے دو کام اکٹھے مل گئے۔ ایک کام انڈرورلڈ کا تھا۔

انڈرورلڈ کے کاموں میں میرا ایک اصول تھا۔ میں ایسا کوئی بھی کام نہیں کرتا تھا جو قانون کی نظر میں جرم ہو۔ قانون کا مطلب سرکار کے بنائے قوانین نہیں بلکہ میرے اصول تھے۔ میرا کام کرنے کا پہلا اصول یہ تھا کہ کسی کی زندگی کو خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ کام جو بھی ہو، اس کا انجام عین سرکار کے قانون کے مطابق ہو اور تیسرا یہ کہ فائدہ صرف خود نہیں اٹھاؤ، مجھے بھی اس فائدے سے حصہ دو۔ یہ کام ان تمام اصولوں پر پورا بیٹھتا تھا۔

مجھے نہ صرف لمبا مال ملنے کی امید تھی بلکہ یہ منصوبہ اگر کامیاب ہوجاتا تو میری یہ خواہش بھی پوری ہوجاتی کہ سراغرسانی کے بجائے کوئی ایسا کاروبار کرلوں جس میں ہینگ لگے نہ پھٹکری اور اس کام کی تکمیل کا مطلب تھا رنگ چوکھا آئے۔

حال ہی میں جب سان فرانسسکو کے کیپ کارن ہوٹل کو دوبارہ کھولا جارہا تھا، تب انہوں نے ملازمتوں کا اشتہار دیا۔ پیلا ڈین کو چیف سیکیورٹی افسر بھرتی کرلیا گیا تھا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار تھا اور نہ میں نے کبھی پتا چلانے کی کوشش کی کہ پیلا ڈین کیا کرتی پھر رہی ہے۔ نہ ہی مجھے کیپ کارن سے کوئی دلچسپی تھی۔ یہ تو مجھے تب پتا چلا کہ جس روز مجھے کام ملا اُسی شام میرے موبائل پر پیلا ڈین کا فون آیا۔

''کیا کررہے ہو؟''

''ہاتھ پہ ہاتھ ہے اور پاؤں گردش میں۔'' اس وقت میں ابراہام پارک میں چہل قدمی کررہا تھا۔

''مندی کا شکار ہو؟''

''ممکن ہے کہ تم بھی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''تھی مگر اب نہیں۔'' اس نے خوشدلی سے کہا۔

''چلو... اس کا مطلب کہ معیشت سنبھل رہی ہے۔'' میں نے بھی مذاقاً کہا۔

''تو اپنی معیشت بھی سنبھال لو۔''

''موقع ملنے کی دیر ہے۔'' میں نے جان بوجھ کر اسے یہ بتانے سے گریز کیا تھا کہ کئی مہینوں کی تنگی کے بعد آج ہی ایک نیا کام ملا ہے۔

''موقع تو مل گیا۔'' اس نے جواب دیا۔

''مل گیا تو دیجیے، میں منتظر ہوں۔''

''کیپ کارن ہوٹل...'' اُس نے کہا۔

''کیا...؟'' یہ نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہوگئے۔

''میں اس فائیو اسٹار ہوٹل کی چیف سیکیورٹی افسر ہوں اور مجھے ایک سراغرساں کی فوری ضرورت ہے۔''

''بندہ حاضر ہے۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

”کل صبح نو بجے ہوٹل استقبالیہ پر آ کر ملو۔“

”تو ملتے ہیں مگر...“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”مگر کیا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”بڑے دن ہوئے فائیو اسٹار ہوٹل کا پُرتکلف ناشتا نہیں کیا ہے۔“

”کل صبح ساڑھے آٹھ بجے۔“ وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ویسے ہمارے درمیان پرانے تعلقات تھے۔ وہ میرا مزاج اچھی طرح جانتی تھی۔

”آج کا دن بڑا اچھا ہے، کام کے ساتھ...“ میں نے خود کلامی کی اور ایک بار پھر پارک میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

میری ایک عادت ہے۔ لوگ سوچتے ہوئے کافی پیتے ہیں، کمرے کی لائٹ آف کر کے بیٹھ جاتے ہیں، تنہائی میں خود کو قید کر لیتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ مجھے تنہائی لوگوں کے درمیان ملتی ہے اور جب خوش رہنا چاہوں تو پھر خود کو گھر میں قید کر لیتا ہوں۔ آج میں کئی مہینوں کے بعد پارک میں آیا تھا۔ ٹہلنے کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنی صحت کی طرف سے کوئی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ دوپہر کو رابرٹ کا فون ملنے کے بعد میں نے اسے صاف صاف جواب نہیں دیا بلکہ رضامندی ظاہر کی تھی۔ میں اس کام کے ہر پہلو کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میری منصوبہ بندی ہی کام کی کامیابی کی ضمانت بنتی ہے اور میں جلد بازی میں کبھی کسی کام کی ہامی نہیں بھرتا، اس لیے اب تک کوئی ایسا کلائنٹ نہیں ملے گا جو یہ کہے کہ ان کا کام مناسب طریقے سے نہیں ہو سکا۔

رابرٹ بھی میرا پرانا گاہک تھا۔ وہ مافیا کا سرگرم کارندہ تھا۔ معمولی چور سے لے کر سان فرانسسکو میں مافیا کے منشیات کے دھندے کا ٹھیکے دار بننے تک اس نے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ وہ مجھے پولیس کے زمانے سے جانتا تھا۔ آج صبح اس نے جس کام کے لیے کہا تھا، اس پر غور کرنے کے لیے میں نے شام تک کا وقت مانگا تھا۔ میں پارک میں ٹہلتے ہوئے اسی معاملے پر غور کر رہا تھا۔ عجیب اتفاق کہ اسی دوران پیلا ڈین کا فون آیا۔ اس سے بات کر کے میں نے صرف فون بند کر کے ہی جیب میں نہیں رکھا بلکہ رابرٹ کے کیس پر بھی سوچنا بند کر دیا۔ ویسے بھی اب اُس پر مزید کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا کام کس طرح ہونا ہے۔ ایک بندہ، چند روز، دو کام...... اور مجھے دونوں کام ایک دوسرے کے متوازی کرنا تھے۔

”ہیلو...“ میں پارک سے نکلنے والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف رابرٹ تھا۔

”سوچ لیا؟“ اس نے چھوٹتے ہی مطلب کی بات کی۔

”اچھی طرح۔“

”تو کب تک؟“ اس نے سوال کیا۔ میں جانتا تھا کہ میری ہاں سن کر وہ حد سے زیادہ خوش ہو گیا ہوگا، تبھی اس کی آواز پُرجوش تھی۔

”جیب خرچ کے لیے معقول رقم جو ہزاروں میں ہونی چاہیے۔“

”سمجھو مل گئی۔“ اس نے جوش میں آ کر پوری بات سنے بغیر ہاں کر دی۔

”تم نے قطع کلامی کی ہے، کوئی بات نہیں۔ اگلا جملہ سن لو۔“

”جلدی سے کہو۔“ رابرٹ نے بے صبری سے کہا۔

”کام ہونا سو فیصد یقینی ہے، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ تمہارا نیا کاروبار اور ڈھیروں منافع۔“

”بالکل ٹھیک...“

”اتنے بڑے کاروبار میں نوے فیصد تمہارا اور صرف معمولی سا دس فیصد حصہ میرا بہ طور سلیپنگ پارٹنر۔“

”بڑے ہی کمینے ہو۔“ یہ سنتے ہی رابرٹ نے کہا۔ ”مگر سلیپنگ پارٹنر ہی کیوں، سیکیورٹی کے معاملات سنبھال لینا۔“

”قطعاً نہیں...“ میں نے زبان چٹخاتے ہوئے کہا۔ ”اب عمر کام کی نہیں موج مستی کی ہے۔ تم نے سنا نہیں، مرد پر چالیس کے بعد حقیقی جوانی آتی ہے۔“

”معاملہ جوانی کا ہے اور وہ بھی تمہاری۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”تم کہہ سکتے ہو مجھے منظور ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ رابرٹ نے ہنس کر جواب دیا۔

”کاغذات تیار کروا لو۔“ میں نے خوش گوار موڈ میں جواب دیا۔ ”کام مکمل ہونے سے پہلے ہی معاہدے پر دستخط کر لیں گے۔“

”کل شام ڈنر میرے ساتھ کرو اور دستخط بھی۔“ میں سمجھا کہ اب وہ فون بند کرنے والا ہے لیکن اچانک اس نے کہا۔ ”سنو... کچھ اندازہ ہے کہ کام کتنے دن میں ہو جائے گا؟“

”یہ میں کل شام کو ڈنر پر بتا دوں گا۔“

”بہت بہتر...“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

رابرٹ کے کئی کام میں نے نمٹائے تھے۔ وہ زبان کا سچا اور وعدے پر پورا اترنے والا مرد تھا۔ میں نے انڈر ورلڈ [illegible] کبھی نہیں سنا تھا کہ اس نے بے ایمانی کے کسی کام میں ذرہ برابر بھی بے ایمانی کی ہو۔ بے ایمانی کے تمام کام سو فیصد ایمانداری سے کرتا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح کے سوا آٹھ ہو رہے تھے جب میں کیپ کارن ہوٹل کی پارکنگ سے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ پیلا ڈین استقبالیہ پر میری منتظر تھی۔ میں نے اسے دور سے ہاتھ ہلایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھی اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”تو تم کب سے یہاں ہو؟“ بڑے دنوں کے بعد شاندار ناشتا کرنے سے آنکھیں صحیح معنوں میں کھل گئی تھیں۔

”دو ہفتے ہو گئے۔“ اس نے میرے کپ میں مزید کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔ ”چیف سیکیورٹی افسر ہوں۔“ اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

”وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔“ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح ویٹر تمہارے آگے پیچھے پھر رہے ہیں، اس سے تو پتا چلتا ہے کہ تم بڑی توپ چیز ہو یہاں پر۔“

”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دنوں کیا مصروفیات ہیں؟“

”خالص بے روزگاری۔“ میں جان بوجھ کر رابرٹ والے کام کی بات ٹال گیا تھا۔ میرا اصول ہے کہ رازداری کامیابی کی پہلی منزل ہے۔

”نوکری کرو گے؟“

”نہیں۔“ میں نے دوٹوک جواب دیا۔ ”اب نوکری کی عمر نہیں البتہ کوئی کام ہو تو...“

”چلو یونہی کر لیں گے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ناشتا ختم ہو گیا تو کمرے میں چلیں؟“

”بس دو منٹ...“ میں نے یہ سنتے ہی جھٹ سے کہا۔ ”ذرا ایک کپ کافی اور ہو جائے تو پھر چلتے ہیں۔“

”بات کافی کی ہے تو میرے کمرے میں چل کر پی لینا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی میں نے گلے سے نیپکن اتار کر ہاتھ منہ صاف کیا اور ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ سیدھی لابی کی لفٹ کی طرف بڑھی۔ کچھ دیر بعد میں پانچویں منزل پر واقع اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

”کمرا تو بہت خوبصورت ہے۔“

”شکریہ؟“ اس نے آہستہ سے سر کو جھکا کر کہا۔ ”میں نے تمہیں کسی خاص وجہ سے بلایا ہے۔“

”بنا کسی تاخیر کے کہہ ڈالیے، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔“

”یہ ہوٹل کئی مہینوں کی بندش کے بعد چند روز پہلے کھلا ہے۔“ اس نے کام کی بات شروع کی۔ اس کا لہجہ خاصا سنجیدہ تھا۔ ”چند روز بعد یہاں ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کی دو روزہ ورکشاپ شروع ہونے والی ہے جس میں دنیا بھر سے سیکڑوں افراد شرکت کر رہے ہیں۔ یہی نہیں، امریکا کی مختلف ریاستوں سے بھی بڑی تعداد میں مندوبین شریک ہوں گے۔ یہ تعداد دو ہزار سے اوپر ہے۔ ورکشاپ انتظامیہ نے پورا ہوٹل بک کر لیا ہے۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ دوبارہ کھلتے ہی اتنا بڑا بزنس۔“ میں نے قطع کلامی کی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔

”پوری بات سن لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ اسی بات پر آ گئی۔ ”ہوٹل انتظامیہ کی خواہش ہے کہ اس موقعے پر سیکیورٹی کے فول پروف انتظامات ہونے چاہئیں۔ ہم اس بات کو یقینی بنانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے کل انتظامیہ کو درخواست کی تھی کہ ہمیں ایک سراغ رساں کو کل وقتی نہ سہی تو کم از کم اس کانفرنس کے لیے تو ضرور ایک ہفتے کے لیے ملازم رکھ لینا چاہیے۔ انتظامیہ نے میری بات مان لی اور اب مجھے تمہاری خدمات چاہئیں۔“

”بہت خوب۔“ میں نے کہا۔ ”مگر اس کام کے لیے میں ہی کیوں؟“

”اس لیے کہ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں اور دوسری بات یہ کہ ہمیں ایسا آدمی چاہیے جسے لوگ ہوٹل ملازم کے طور پر نہیں جانتے ہوں... سمجھے میری بات۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”تجویز اچھی ہے۔ معاہدے کی بات کر لی جائے تو بات اور زیادہ مناسب ہو گی، تبھی میں کچھ سوچ سکوں گا۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اگلے پچیس تیس منٹ تک تمام معاملات طے پا چکے تھے۔ ورکشاپ تین دن جاری رہنا تھی اور مجھے کانفرنس سے تین دن پہلے یعنی کل سے کام پر ہونا تھا۔ میری ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کے لیے تھی۔ رہنے کے لیے کمرا بہ طور گاہک بک کر دیا گیا تھا۔ معاہدے کے مطابق مجھے کل صبح نو بجے ہوٹل میں چیک اِن کرنا تھا۔ کل چھ دنوں کا کام تھا اور ان چھ دنوں میں کھانے

www.Paksociety.com

پینے اور موج مستی کے تمام لوازمات مفت تھے۔ معاوضہ ایڈوانس میں تھا اور وہ بھی میری توقعات سے بہت زیادہ۔

''اگر کام تمہیں پسند آیا تو عارضی ملازمت پکی بھی ہو سکتی ہے اور اگر تم چاہو تو ابھی سے پکے ملازم بن سکتے ہو۔'' جب میں معاہدے کے بعد ایڈوانس میں ملنے والے نوٹ گن رہا تھا، تب پیلا ڈین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے نوٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''فی الحال تو یہی کچھ بہت ہے۔ میں تو تھوڑے میں ہی خوش ہو جاتا ہوں۔''

''اچھی طرح جانتی ہوں تمہارے تھوڑے کو۔'' میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور طنزیہ لہجے میں کہا۔

''صرف جانتی ہو، یہی بہت ہے۔ کبھی سمجھنے کی کوشش مت کرنا ورنہ بگڑ جاؤ گی۔'' میں نے بھی مذاق کے لہجے میں جواب دیا۔

''کافی لوگے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ ورکشاپ نہ صرف ہوٹل کا بہت بڑا بزنس تھا بلکہ انتظامیہ کو امید تھی کہ ورکشاپ کے کامیاب انعقاد کے بعد انہیں مزید بزنس ملے گا اور پر سے ہوٹل کی مشہوری الگ ہوگی۔ ورکشاپ میں مختلف ملکوں سے نامی گرامی مندوب شرکت کرنے والے تھے، جس کی وجہ سے ملکی و غیر ملکی میڈیا نے بڑے پیمانے پر کوریج کے انتظامات کیے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہوٹل انتظامیہ نے پیلا ڈین کے توسط سے عارضی بنیادوں پر بہ طور سراغرساں میری خدمات حاصل تو کرلی تھیں لیکن خود میرے خیال میں انہیں میری کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

پیلا ڈین سے ملنے کے بعد میں نے سپر مارکیٹ جا کر کچھ خریداری کی اور لنچ کے بعد گھر لوٹ آیا۔ شام کے سوا پانچ بجے رہے تھے جب رابرٹ کا فون آیا۔ اس نے شام سات بجے بیچ لگژری ہوٹل میں ڈنر کی دعوت دی۔ میں نے اس دعوت کے جواب میں اسے خوشخبری سنائی کہ اگلے ہفتے اس کا کام بھی ہو جائے گا۔

☆☆☆

''مجھے بڑی خوشی ہوگی جب یہ کام مکمل ہو جائے گا۔'' ڈنر کے بعد جب ہم اس کی بوٹ کی طرف بڑھ رہے تھے، تب اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''یہ میرا سپنا ہے۔ یہ سپنا میں نے انتہائی غربت کے ایام میں دیکھا تھا۔ اب اس کو سچ کر دکھاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''سمجھ لو، سب کچھ سچ ہو گیا۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''بس! صرف چند روز اور انتظار کرلو۔ کم از کم اس سلسلے میں جو کام مجھے کرنا ہے، وہ تو ضرور ہو جائے گا۔''

''تمہارا کام ہو گیا تو سمجھو ہاتھی نکل گیا۔ اس کے بعد تو پونچھ ہی باقی رہ جائے گی۔'' میری بات سن کر وہ مزید خوش ہو گیا تھا۔

ساحل سے کافی دور آنے کے بعد رابرٹ نے بوٹ رکوائی اور مجھے لے کر نیچے بنے کمرے میں آ گیا۔ ''یہ لو معاہدہ پڑھ لو اور یہ چیک خیر سگالی کے طور پر۔'' اس نے دونوں چیزیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور خود صوفے پر بیٹھ گیا۔

''بہت مناسب۔'' یہ کہہ کر میں نے قلم نکالا اور پھر باری باری ہم دونوں نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔

''اب اپنا منصوبہ بتاؤ پارٹنر۔'' ہم دونوں نے دستاویزات کی اپنی اپنی فائل سنبھال لی اور صوفے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''بات یہ ہے کہ کل تو میں کیپ کارن ہوٹل جوائن کر رہا ہوں۔'' میں نے بتانا شروع کیا۔ ''صرف چھ دن کے لیے۔ وہاں سے فارغ ہوا تو سمجھو تمہارا کام بھی مکمل۔''

''تفصیل سے منصوبہ بتاؤ۔''

''بات یہ ہے کہ...'' میں نے اسے منصوبہ سمجھانا شروع کر دیا۔

''ویل ڈن...'' میری بات مکمل ہوئی تو اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ مجھے لگا میری پلاننگ نے اسے چونکا دیا ہے۔ ''جیسے ہی تم نے اپنا کام مکمل کیا، سمجھو اس کے دو ماہ کے اندر اندر ہمارا کاروبار شروع۔''

''ہمارا...'' میں نے جان بوجھ کر چہرے پر حیرت کے آثار طاری کرتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے، تم اب دس فیصد کے پارٹنر ہو اس نئے کاروبار میں۔''

''اوہ... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' میں نے مصنوعی خفت سے کہا۔

''تم واقعی اعلیٰ نسل کے کمینے ہو۔'' یہ دیکھ کر رابرٹ ہنستے ہوئے بولا۔

''میرے خیال میں اب واپس چلتے ہیں۔ صبح مجھے کیپ کارن پہنچنا ہے۔'' میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ اب یہاں مزید ٹھہرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ ویسے بھی گھر پہنچ کر مجھے ہفتہ بھر ہوٹل میں بسر

کرنے کے لیے پیکنگ کرنا تھی۔

☆☆☆

جب تک میں ہوٹل میں خدمات انجام دیتا، تب تک میری رہائش کا انتظام فرسٹ فلور پر، ڈانس ہال اور بار کے بالکل اوپری کمرے میں کیا گیا تھا۔ یہ کمرا بہت عمدہ تھا مگر میرے لیے سب سے اچھی بات یہ تھی کہ چند سیڑھیاں اترو تو میری پسندیدہ جگہ نظروں کے سامنے تھی۔ سمجھ گئے ہوں گے، میرا مقصد بار اور ڈانس ہال سے تھا۔ موج مستی، پینا پلانا میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کم از کم ایک ہفتے کے لیے تو یہ سب کچھ بہ آسانی میرے تصرف میں تھا۔

میں تین دن سے ہوٹل میں تھا۔ معاہدے کے تحت مجھے چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہنا تھا۔ یہ کڑی شرط تھی لیکن ایک تو معاوضہ بہت ہی اچھا، دوسرا یہ کہ کام بھی بہت تھوڑے عرصے کا تھا۔ اسی لیے میں بغیر کسی پریشانی کے بڑے مزے سے وقت گزار رہا تھا۔

تین دن اور دو راتیں تو بڑے سکون سے گزریں لیکن تیسری رات میرے لیے بے آرامی بن کر سامنے آئی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اُس رات آسٹریلیا سے آنے والے نوجوان پاپ گلوکاروں کا ایک بینڈ بار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔ بینڈ کو دو روز بعد سان فرانسسکو کے سٹی پارک میں بھی پروگرام کرنا تھا۔ اسی وجہ سے وہ یہاں آئے اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہوٹل انتظامیہ نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا اور انہیں بھاری معاوضہ دے کر اس بات پر رضامند کرلیا تھا کہ وہ ہوٹل کے بار میں اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ بار بہت کشادہ تھا اور سیکنڈ فلور کی لابی پر مبینہ ہم کی موجودگی کی اطلاع ملنے سے پہلے میں وہاں موسیقی کے مزے لے رہا تھا۔ ڈانس فلور پر بڑی تعداد میں نوجوان لڑکے لڑکیاں بانہوں میں بانہیں ڈالے تھرک رہے تھے۔ انتظامیہ نے مقامی ٹی وی چینل پر ایک اشتہار کے ذریعے اس 'میوزیکل نائٹ' کا دو روز پہلے اشتہار دیا تھا، اس لیے بڑی تعداد میں لوگ ٹکٹ خرید کر یہاں پہنچ گئے تھے۔ رنگ، خوشبو اور جوانی کے اس گرما گرم ماحول میں ہر طرف گلاس اور بوتلیں کھنک رہی تھیں۔ میں بھی کئی گلاس چڑھا چکا تھا اور اب خود بخود میرے پاؤں بھی تھرک رہے تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں بھی سُرور کے عالم میں موج مستی کر رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا موبائل وائبریٹ کر رہا ہے۔ جب میں یہاں آیا تو مجھے اندازہ تھا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فون کی گھنٹی تو کسی طور سنائی نہیں دے گی، اسی لیے میں نے فون کا وائبریٹر آن کر دیا تھا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں ڈیوٹی پر تھا اور لوگوں سے کھچا کھچ بھرے اس ہال میں اگر کوئی مجھے ڈھونڈنا چاہتا تو اس کے لیے یہ کام آسان نہیں ہوتا۔

''اے اسپیڈ... کہاں ہو تم؟'' میرے فون اٹھاتے ہی پیلا ڈین نے چلاتے ہوئے کہا۔

''کون؟'' نسوانی آواز سن کر میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ جلدی میں، میں اسکرین پر یہ دیکھنا بھول گیا تھا کہ فون کس کا ہے۔

''خیریت تو ہے، میں پیلا بول رہی ہوں۔''

''اوہ... معاف کرنا، یہاں بہت شور ہے۔ میں باہر نکل رہا ہوں۔''

''اوکے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہاں اب بولو۔'' میں لابی میں پہنچ گیا جہاں ہال کے مقابلے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''میں پچھلے آدھے گھنٹے سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ دس بار فون کر چکی ہوں مگر نہ تم مل رہے ہو اور نہ موبائل اٹینڈ ہو رہا ہے۔ کمرے میں گئی، وہاں بھی تم نہیں تھے۔''

''کیا ہوا ہے؟ پوری بات بتاؤ...''

''تم اس وقت کیا کر رہے ہو؟''

''میوزک کی مستی میں تھا۔'' میں نے لہکتے ہوئے جواب دیا۔

''مستی چھوڑو... کمرے میں پہنچو، دس منٹ کے اندر میں وہیں پہنچ رہی ہوں۔'' پیلا ڈین کے لہجے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

''اوکے...'' میں نے جواب دیا۔ ''روم سروس کو فون کر کے میرے کمرے میں ایک بلیک کافی بھجوا دو اگر تم بھی پینا چاہو تو پھر دو...''

''تم کمرے میں پہنچو فوراً سے پیشتر۔'' اس نے قطع کلامی کی اور دانت کچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون منقطع کر دیا تھا۔

ڈور بیل بجی تو میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے پیلا ڈین کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میرے لیے کافی کا مگ بھی تھا۔ اس نے مجھے ایک طرف ہٹایا اور اندر داخل ہوتے ہی کرسی پر ڈھیر ہو کر بولی۔ ''بتا کر تو جایا کرو کہاں ملو گے؟''

''کیا ہوا؟'' اسے پریشان دیکھ کر میرا فکر مند ہونا یقینی تھا۔

''یہ لو...'' اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔

www.Paksociety.com

"کچھ دیر پہلے ہی یہ ای میل موصول ہوا ہے۔"

"شیطان پرواز کرچکا ہے۔ تمہارے لیے یہ چھوڑے جارہا ہوں۔ امید ہے کہ تم اسے دھمکی نہیں سچ سمجھو گی۔ تمہارے اعزاز میں، میں نے آج ہوٹل کے اندر بم نصب کردیا ہے۔ یہ شیطان کی طرف سے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔"

"یہ دھمکی نہیں اطلاع ہے۔" میں نے ای میل پڑھ کر سر اوپر اٹھایا اور پیلا ڈین سے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ وہ خاموش تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر میری پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔

"کب ملا یہ؟" میں نے ای میل والا کاغذ اس کی نگاہوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً بیس منٹ پہلے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"پولیس کو اطلاع کردی ہے؟"

"ابھی نہیں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سوچ رہی ہوں کہ پولیس سے کیا کہوں گی۔ کیا یہ کہوں کہ ہمیں ایک ای میل ملا ہے جس میں ہوٹل کے اندر بم نصب کرنے کی اطلاع ہے اور یہ اطلاع دی ہے اس نے، جس نے بم نصب کیا یا کروایا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ "جانتے ہو اس بات کا پہلا ردِعمل کیا ہوگا۔ کل ہونے والی ورکشاپ منسوخ ہوسکتی ہے اور اس صورت میں ہوٹل کی ساکھ کیا رہ جائے گی؟" یہ کہہ کر اس نے استفساریہ لہجے میں میری طرف دیکھا۔ "اگر کوئی عام دن ہوتا تو ہم آسانی سے پولیس کو بلواسکتے تھے مگر تم جانتے ہو کہ اس وقت کیا حالات ہیں۔ ہوٹل مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ کل ورکشاپ ہونی ہے۔ دنیا کے کئی ممالک سے مندوب پہنچ چکے ہیں۔ اب اگر یہ خبر ذرا بھی باہر نکلتی ہے تو یہاں کتنی بڑی افراتفری پھیلے گی۔"

"تم درست زاویے پر سوچ رہی ہو۔" اس کی باتیں سن کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"ممکن ہے کہ یہ دھمکی نہ ہو۔"

"ہوسکتا ہے کہ دھمکی ہی ہو۔" یہ سنتے ہی میں نے جواب دیا۔

"صورت کوئی بھی ہو۔ ہمیں سوچنا یہ ہے کہ کس طرح اس معاملے کو ہینڈل کریں کہ ہوٹل کی ساکھ اور ورکشاپ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے۔"

میں نے جواب دینے کے بجائے کافی کا کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ہر فلور کے عقبی کوریڈور پر پرانے طرز کا مائیکرو ویو اوون لگا ہوا ہے۔ جس کا مقصد گاہکوں کو وقت بے وقت چیزوں کو از خود گرم کرنے کی سہولت فراہم کرنا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو ان پرانی مشینوں کے اندر بہ آسانی بم نصب کرسکتا ہے۔ "ہمیں مائیکرو ویو اوون چیک کرلینے چاہئیں؟" میں نے مشورہ دیا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔" پیلا ڈین نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرا ذہن بھی سب سے پہلے اُسی طرف گیا تھا۔ جب میں تمہیں تلاش کررہی تھی، اس دوران ہی انہیں بھی چیک کروالیا تھا۔"

"سیکیورٹی کیمرے..."

"میں نے اُن پر بھی سرسری نظر ڈالی ہے مگر ان سے بھی کسی قسم کی مشکوک سرگرمی کا اندازہ نہیں ہو پارہا ہے۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جس نے بھی یہ ای میل بھیجا ہے وہ ہوٹل کی ساکھ کو تباہ کرنا چاہتا ہے یا پھر ورکشاپ کو سبوتاژ۔" اس کی بات سن کر میں نے خود کلامی کی۔

"ممکن ہے۔" پیلا ڈین نے کہا۔

"یہی ای میل تمہارے ہوٹل کی آئی ڈی پر بھیجا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بھیجنے والا تم سے بھی واقف ہے۔ حالانکہ ہوٹل اسٹاف کی آویزاں فہرست میں تمہارا نام درج نہیں۔"

"یہ بات مجھے بھی حیران کررہی ہے۔" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"صاف ظاہر ہے کہ دھمکی دینے والا تمہیں بھی نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔" یہ سنتے ہی اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ وہ اندر کی معلومات تک بھی رسائی رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم نے ہوٹل جوائن کیا ہے۔ یہاں سیکیورٹی کے حوالے سے کوئی بڑا واقعہ رونما ہونے کا مطلب ہے تمہاری ناکامی اور نتیجہ نوکری سے چھٹی بھی ہوسکتا ہے۔" میں تفصیل سے اسے سمجھانے لگا۔ "یوں دھمکی دینے یا بم نصب کرنے والے کا یہ بہ ظاہر تیسرا مقصد ہے۔ اب اگر یہ تیسرا نکتہ ہی اس کا ہدف ہے تو پھر ایک بات طے ہے کہ یہ صرف دھمکی نہیں۔ بم نصب کیا گیا ہے اور وہ پھٹے گا بھی ضرور..."

"اگر ہم نے اس کا پتا چلا کر ناکارہ نہیں بنایا تو۔" پیلا ڈین نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ میری اور تمہاری آزمائش ہے۔"

ہوٹل ہے۔"

"سب سے پہلا کام بم کو تلاش کرنا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ ہے تو پھر سوچیں گے کہ اسے کس طرح ناکارہ بنایا جاسکتا ہے۔"

"یہی درست طریقہ ہے۔" وہ کرسی سے اٹھی اور میرے قریب آکر بولی۔ "اتنا بڑا ہوٹل، کنوینشن سینٹر، پلے ایریا، بچوں کا ڈے کیئر یونٹ... یہ تلاش اتنی آسان نہیں ہوگی۔"

"سیکیورٹی کے عملے کی مدد سے یہ کام کرنا ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم سارے عملے کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کرکے انہیں تلاشی کی ذمے داری سونپیں گے مگر ایک بات یاد رہے..."

"وہ کیا؟" پیلا ڈین نے مداخلت کی۔

"کسی کو بھی بم کی موجودگی یا دھمکی کے بارے میں ہرگز نہ بتایا جائے۔" میں اسے رازداری سے تلاشی لینے کا منصوبہ سمجھانے لگا۔ "انہیں صرف یہ کہنا ہے کہ وہ نہایت احتیاط سے میٹل ڈی ٹیکٹر کی مدد سے صرف اس بات کو یقینی بنائیں کہ کہیں کوئی دھماکا خیز مواد تو موجود نہیں۔"

"اگر کوئی اس غیر معمولی تلاشی کی وجہ پوچھے تو؟"

"کہہ دینا کہ کل ہونے والی ورکشاپ کی وجہ سے غیر معمولی حفاظتی اقدامات کیے گئے ہیں۔ یہ تلاشی بھی خصوصی انتظامات کا ہی حصہ ہے۔"

"اوکے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ "میں جاکر انتظامات کرتی ہوں۔ تم بھی میرے کمرے میں پہنچو۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں اسے کئی سالوں سے جانتا تھا لیکن آج سے پہلے وہ اتنی کبھی ہوئی کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ دوسری بات یہ کہ وہ کمرے سے بہت تیزی سے نکلی۔ یہ بھی میرے لیے پریشان کن تھا۔ مجھے صورتِ حال کی سنگینی اور وقت کی نزاکت کا احساس تھا مگر پیلا ڈین کی پریشانی ظاہر کررہی تھی کہ معاملہ اُس سے بھی کہیں زیادہ سنگین ہوسکتا ہے جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ ویسے اس کا خوف زدہ ہونا فطری تھا۔ وہ ذاتی طور پر بہت بہادر اور حوصلے والی تھی مگر یہاں معاملہ اس کی ذات کا نہیں بلکہ ساکھ کا تھا۔ وہ چیف سیکیورٹی افسر تھی۔ یہ ایسا موقع تھا کہ اسے اپنی اہلیت ثابت کرنا تھی۔ بھاری ذمے داری اس کے کاندھوں پر تھی اور وہ شاید اسی لیے بہت زیادہ پریشان بھی تھی۔

پیلا ڈین کے جانے کے بعد میں صورتِ حال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ اسے گئے ہوئے ابھی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا۔ پیلا ڈین کا ہی نمبر تھا۔ "کیا ہوا؟" میں نے فون اٹینڈ کرتے ہی پوچھا۔

"سیکنڈ فلور کی لابی میں پہنچو فوراً۔" اس کی آواز میں گھبراہٹ کی جھلک تھی۔ "یہاں دو مشکوک ڈبے لاوارث حالت میں پڑے ہیں، ممکن ہے..."

"سمجھ گیا۔" میں نے قطع کلامی کی۔ "تم کوشش کرو کہ وہاں زیادہ ہجوم جمع نہ ہونے پائے۔ دو چار سے زیادہ سیکیورٹی گارڈ بھی نہ ہوں ورنہ افواہ پھیل سکتی ہے۔"

"اوکے۔"

"ہوٹل کے دوسرے حصوں میں تلاشی کا عمل جاری رکھو۔ وہ رکنے نہ پائے۔" میں نے اسے فوری ہدایت دی۔

"ایسا ہی ہوگا، تم فوراً پہنچو۔"

"سمجھو، پہنچ ہی گیا۔" یہ کہہ کر میں نے لائن منقطع کی اور سان فرانسسکو پولیس ڈیپارٹمنٹ کا نمبر ملانے لگا۔

کسی بھی ایسے ہوٹل میں جو کئی مہینوں کی بندش کے بعد صرف چند روز پہلے کھولا گیا ہو، بم کی موجودگی کی اطلاع بزنس کے لیے بہت خطرناک تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر پولیس سے یہ کہا جاتا کہ ہوٹل میں بم کی موجودگی کا شبہ ہے تو پھر اُن کے پہنچتے ہی سارے کمرے، ڈائننگ ہال اور ڈانس فلور خالی کروالیے جاتے، خطرے کا الارم بجتا اور یہ کسی طور بھی مناسب نہیں ہوتا۔ ہوٹل میں اس وقت دو ہزار سے زیادہ مہمان ٹھہرے ہوئے تھے جن میں دنیا کے مختلف ممالک کی کئی مشہور شخصیات بھی شامل تھیں۔ ایسے میں یہ اطلاع میڈیا کو ملتی تو پھر دنیا بھر کے ٹیلی وژن چینلز کو اگلے کئی گھنٹوں کے لیے چٹ پٹی خبر کا مسالا مل جاتا۔ ایسی صورت میں جب ایک طرف بم کی افواہ سے دو ہزار مہمانوں میں افراتفری پھیلی ہو، دوسری طرف ٹی وی پر خبریں چل رہی ہوں اور ہوٹل کے سامنے میڈیا کا ہجوم کھڑا ہو تو پھر ساکھ اور بزنس، دونوں کا بچنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ پولیس کو فون کرتے ہوئے یہ سب باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ سان فرانسسکو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں، میں کئی سال رہ چکا ہوں۔ وہاں آج بھی میرے کئی پرانے دوست سینئر پوزیشن پر کام کررہے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو فون کرکے مدد کی درخواست کی۔ یہ ڈپٹی پولیس چیف آرتھر تھا۔

میں نے آرتھر سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہوٹل انتظامیہ کو بم کی دھمکی دی گئی ہے یا پھر دو مشکوک ڈبوں میں بم نصب ہونے کا خطرہ ہے۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ وہ آکر چیک کرلیں کہ کہیں یہ ڈبے خطرناک تو نہیں۔ میں نے یہ بھی درخواست کی

www.Paksociety.com

تھی کہ یہاں روزمرہ کے امور نمٹانے والوں کے بجائے پولیس کا خصوصی دستہ بھیجا جائے جو یہ بات جانتے ہوں کہ اس طرح کے معاملات میں پولیس کی موجودگی کے باوجود افواہوں کو جنم لینے سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔

میں نے آرتھر کو اپنا موبائل اور ہوٹل انتظامیہ کی سیکیورٹی ڈیسک کا نمبر بھی دے دیا تھا۔ میں نے آرتھر سے کہا تھا کہ سب سے سینئر افسر کو ہی بھیجا جائے اور اسے ہدایت کردی جائے کہ وہ صرف اور صرف مجھ سے ہی رابطے میں رہے۔ میں نے اسے باور کروادیا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی کے باعث صرف ہوٹل نہیں پولیس ڈیپارٹمنٹ کی بھی دوڑ لگ سکتی ہے۔ وہ بھی یہ سن کر پریشان تھا کہ ہوٹل میں دو ہزار سے زائد مہمان موجود ہیں اور کوئی بھی افواہ کتنی بڑی خبر بن کر پولیس کے لیے مشکلات کھڑی کرسکتی ہے۔

”تم بے فکر رہو، میں معاملے کی نزاکت سمجھ گیا ہوں۔ خود اس معاملے کی نگرانی کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور میں سیکنڈ فلور کی لابی کی طرف چل دیا۔ پولیس کو اطلاع دینے کے بعد میری آدھی مشکل ختم ہوچکی تھی۔

میرے سوا کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ پولیس کو اطلاع دی جاچکی ہے۔ اس لیے جب پیلاڈین نے ان مشکوک ڈبوں کے بارے میں میری رائے جاننا چاہی تو میں اسی لیے خاموش رہا کہ پولیس تو آتی ہی ہوگی اور مشکوک ڈبوں کی موجودگی کے باعث وہ بم ڈسپوزل اسکواڈ کو لے کر ہی آئیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سیکیورٹی عملے بالخصوص فل کو ہیجان میں دیکھا تو اس وقت میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

مشکوک ڈبوں کی موجودگی کی اطلاع ابھی تک پھیلی نہیں تھی۔ پولیس کو بھی پچھلے حصے سے داخل ہو کر سیڑھیوں کے ذریعے سیکنڈ فلور تک پہنچنا تھا تاکہ انہیں ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ کر کسی کو افواہ پھیلانے کا موقع نہ ملے۔ اس وقت چار میں سے صرف ایک محافظ ایسا تھا جو ان ڈبوں کو دیکھ دیکھ کر شدید خوفزدہ ہورہا تھا۔ اُس کے ہونٹ خشک تھے اور وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یہ فل تھا، اس کی حالت دیکھ کر مجھے یقین تھا کہ اگر یہ یہاں سے باہر گیا تو پھر بم کی افواہ بہت جلد ہوٹل میں پھیل جائے گی۔ بہت کم وقت میں بڑا ہنگامہ کھڑا ہوسکتا ہے۔ اس کی نظریں ڈبوں پر ہی جمی تھیں۔

میرے برابر پیلاڈین کھڑی تھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور اپنے قریب کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا مگر کچھ نہ بولی۔ ”جب تک سارا معاملہ صاف نہ ہوجائے فل کو یہاں سے نکلنے نہ دینا ورنہ گڑبڑ ہوجائے گی۔“ میں نے رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔

”سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے نہایت آہستہ سے کہا۔ میں نے سر موڑ کر فل کی طرف دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پسینا نمودار ہوچکا تھا۔ ٹانگیں بھی آہستہ آہستہ کانپ رہی تھیں۔

”ہیلو... کچھ ملا؟“ پیلاڈین کے کانوں سے ہیڈفون لگا ہوا تھا۔ سیکیورٹی کے کسی کارکن نے اسے فون کیا تو اس نے پوچھا۔ ”تلاش جاری رکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ میری ہدایت اور اُس کے حکم پر ہر طرف بم کی تلاش جاری تھی۔ اب تک کامیابی نہ ہونے سے مجھے یقین آنے لگا تھا کہ اگر بم کہیں نصب کیا گیا ہے تو پھر اب تک نہ ملنے کا مطلب ہے کہ ان ڈبوں میں بم بھی ہوسکتا ہے۔ یہ میرا شک تھا۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ کے آنے تک ہر بات غیر یقینی اور ہر چیز مشکوک تھی۔

کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر جھک کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اچانک اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مجھے لگا کہ وہ ابھی ڈبے کو چھولے گی۔ ”رکو۔“ میں چیخا۔ ”اسے ہاتھ مت لگانا۔ تم نے سنا نہیں کہ بعض دھماکا خیز مواد انسانی جسم کی حرارت یا اسے چھونے پر بھی پھٹ سکتے ہیں۔“ میرے چیخنے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تب میں نے کہا۔ ”تم سمجھ رہی ہو۔ ابھی یہ مشکوک ہے۔ ہمیں سخت احتیاط برتنی چاہیے۔“ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ان مشکوک ڈبوں کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ یہ سن کر وہاں کھڑے لوگوں کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے خوف کے سائے لہرا گئے تھے۔

”کوئی ان ڈبوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرے۔“ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ پولیس اب تک نہیں پہنچی تھی اور سیکیورٹی عملے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اب تک کہیں بھی بم نہیں ملا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہورہا تھا کہ یہ ڈبے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اسی دوران سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں نے گردن موڑی۔ ایک جھٹکے سے پیلاڈین اٹھی اور جلدی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ میں سمجھا کہ شاید عقبی راستے سے پولیس آگئی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی بڑھا۔ اسی دوران ایک ہلکا دھماکا ہوا۔ یہ قریب ہی ہوا تھا۔ ایسا لگا کہ کسی کمرے کا دروازہ بڑی زور سے توڑا گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا پیلاڈین سیڑھیوں کی طرف دوڑ گئی۔

”بھاگو سب، میں نے ان ڈبوں کو چھوا تھا۔“ وہ چلائی۔ یہ سنتے ہی میرے کان کھڑے ہوگئے مگر میرے قدم بڑھانے سے پہلے ہی ایک اور دھماکا ہوا۔ اس بار آواز تھوڑی [illegible] دوسرے دھماکے کے ساتھ ہی ہوٹل میں خطرے کا سائرن بج اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ خراب ہوگیا ہے، اب بھاگنا ہی بہتر ہے۔ پیلاڈین سیڑھیوں کی طرف گئی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ خطرے کا سائرن بجتے ہی سیڑھیوں پر لوگوں کا ریلا دوڑ پڑے گا۔ میں نے لفٹ کا رخ کیا اور بٹن دبا دیا۔ سیکنڈ فلور پر دھواں چھایا ہوا تھا۔ بھگدڑ مچ گئی تھی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اُن ڈبوں میں بم ہی تھا۔ سیکیورٹی عملے کا کیا بنا، یہ سوچنے اور جا کر دیکھنے کا وقت میرے پاس نہیں تھا۔

میں نے چند سیکنڈ تک لفٹ کا انتظار کیا اور پھر سیڑھیوں کی طرف دوڑ پڑا۔ ہوٹل میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ میرے آگے پیلاڈین تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں دوڑتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ ”تم نے ڈبے کو چھوا تھا؟“ میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

”ہاں...“ اس نے جواب دیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”میرا خیال درست تھا۔“ یہ سنتے ہی میں نے منہ اس کے کان کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں سنسر ڈیوائس تھی۔ یہ سنسر انسانی حرارت کو محسوس کرتے ہی تیس سیکنڈ کے اندر اندر دھماکا کرسکتا ہے۔“

”اوہ میرے خدا... میں بچ گئی۔“

”کم از کم ہم دو تو بچ ہی گئے مگر...“

”سیکیورٹی عملے کا کیا ہوا؟“ یہ سنتے ہی اس نے قطع کلامی کی۔

”اوپر والا جانے؟“

ہم ہوٹل سے نکل کر پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ میرا دماغ تیزی سے دھمکی آمیز ای میل کے مندرجات پر غور کررہا تھا۔ اس میں بم کی اطلاع دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ 'ایک چھوٹا سا تحفہ' اس کا مطلب ہے کہ کوئی دوسرا 'بڑا تحفہ' بھی ممکن ہے۔ اس لیے سب سے محفوظ جگہ کار پارکنگ ہوسکتی تھی۔ باہر نکلتے ہی میں نے پارکنگ پر نظر ڈالی۔ اس کا بڑا حصہ خالی تھا۔ میں نے پیلاڈین کو بازو سے پکڑا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ باہر نکل رہے تھے۔ اس دوران میں نے کاریاں اسٹارٹ ہونے کی کئی آوازیں سنیں۔ میں سمجھ گیا کہ [illegible] باہر نکل گئی ہے۔

اسی دوران فون کی گھنٹی بجی۔ ”ہیلو، اسپیڈ بول رہا ہوں۔“

”پولیس سراغرساں ہیرالڈ بول رہا ہوں۔“ ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ ”ہم ہوٹل پہنچ چکے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ میرا لہجہ طنزیہ تھا۔ ”میں نے ایمرجنسی میں فون کیا تھا اور آپ لوگ تب پہنچے جب ایمرجنسی ہنگامے میں تبدیل ہورہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میری نگاہیں پیلاڈین کے چہرے کی طرف تھیں۔ میری بات سن کر اس نے بھی ہاں میں سر ہلایا۔

”اس وقت تم کہاں ہو...؟“ سراغرساں نے میری بات کا جواب گول کرتے ہوئے کہا۔

”بلڈنگ کے شمالی حصے کی طرف پارکنگ ہے، وہاں پہنچو۔“

”ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

جہاں ہم دونوں کھڑے تھے، وہاں سے ہوٹل کا داخلی دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں کی بڑی تعداد باہر نکل کر جمع ہورہی تھی۔ ہر طرف سوالیہ چہرے نظر آرہے تھے۔ ہم دونوں تو یہاں کھڑے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ اس وقت ہوٹل کے مالک پر جو گزر رہی ہوگی، اسے قیامت سے کم ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ بے چارے کے ساتھ وہی ہورہا تھا کہ کھایا پیا کچھ نہیں مگر سب کچھ برباد کرڈالا۔

ہوٹل کا مالک ایک آئرش تھا۔ وہ مدتوں پہلے امریکا آیا تھا۔ اس نے یہاں مختلف کاروبار میں بہت پیسا کمایا اور پھر سب کچھ بیچ باچ کر یہ ہوٹل خرید لیا۔ وہ دس سال سے یہ ہوٹل چلا رہا تھا مگر عالمی کساد بازاری کے باعث اس کا دھندا بری طرح متاثر ہوا۔ اس نے مزید نقصان سے بچنے کے لیے ہوٹل بند کردیا تھا۔ صرف ہفتہ دس دن ہوئے تھے کہ جب اس نے دوبارہ تزئین و آرائش پر بھاری رقم خرچ کرکے اسے دوبارہ کھولا لیکن جو حالات پیش آئے، اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اب تو اس کا سب کچھ چوپٹ ہوگیا۔

”بہت نقصان ہوا ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے پیلاڈین سے کہا۔

”بہت ہی زیادہ۔“ اس کے لہجے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ ”میری تو نوکری گئی۔“ اس نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”ہیلو۔“ ایک دراز قامت ادھیڑ عمر شخص ہماری طرف آکر بولا۔

”مسٹر اسپیڈ۔“ اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے سر کے اشارے سے ہاں میں جواب دیا۔

”سراغرساں ہیرالڈ...“ اس نے دایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“

”بتاتا ہوں، ذرا اُدھر چلیے۔“ میں نے پارکنگ کے

www.Paksociety.com

ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں بنچ پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''پولیس صورتِ حال کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے بتایا۔ ''سیکنڈ فلور پر بم ڈسپوزل اسکواڈ جائزہ لے رہا ہے۔ ہمیں مزید دھماکوں کا خطرہ ہے۔ اس لیے ہوٹل کو مکمل طور پر خالی کروا کر تلاشی لینے کا حکم ہے۔''

''تلاشی میں کتنی دیر لگ سکتی ہے؟'' پیلا ڈین نے چونکتے ہوئے کہا۔

''کچھ کہا نہیں جاسکتا۔''

''سب ختم۔'' سراغرساں کی بات سن کر پیلا ڈین نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے خود کلامی کی۔

اگلے دس منٹ کے اندر ہم دونوں پولیس سراغرساں کو ساری صورتِ حال تفصیل سے آگاہ کر چکے تھے۔ وہ نہایت غور سے ہماری بات سن رہا تھا۔

''وہ ای میل ہے آپ کے پاس؟''

''ہاں... یہ لیجیے۔'' میں نے دھمکی آمیز ای میل کا پرنٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کچھ دیر تک اسے غور سے پڑھتا رہا اور پھر اسے اپنی نوٹ بک میں رکھ لیا۔

''چلیے... دھماکے کی جگہ پر چلتے ہیں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اگرچہ دھماکے سے سیکنڈ فلور پر کچھ خاص نقصان تو نہیں ہوا البتہ اس کی آواز اور لابی میں بھر جانے والے دھویں کے باعث آٹومیٹک طور پر فائر الارم بج جانے سے بری طرح بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہم جیسے ہی ہوٹل کے اندر داخل ہوئے، بھگدڑ کے آثار نمایاں نظر آرہے تھے۔ ہم تینوں سیڑھیوں کے راستے سیکنڈ فلور پر پہنچے۔ فل اور کئی اور سیکیورٹی گارڈز وہاں کھڑے تھے۔ البتہ اس جگہ سے کافی دور تھے جہاں کچھ دیر پہلے دو مشکوک ڈبے اوپر تلے رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر جگہ جگہ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ اُن مشکوک ڈبوں کے ہی ٹکڑے تھے۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ جائے وقوعہ سے شواہد اکٹھے کر رہا تھا جبکہ اسکواڈ کے کئی اہلکار اس وقت ہوٹل کی بھرپور تلاشی لینے میں مصروف تھے۔ انہیں شبہ تھا کہ ہلکی طاقت کا دھماکا ممکنہ طور پر کسی بڑے دھماکے کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔

میں نے لابی کی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ نیچے بڑی تعداد میں پولیس والے موجود تھے جو میڈیا کے نمائندوں کو اندر آنے سے روک رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ٹی وی اس دھماکے کی خبر کو بریکنگ نیوز کے طور پر نشر کر رہا ہوگا۔

''میرے خیال میں یہ دھماکا کسی جانی نقصان کے بجائے صرف دھمکی کے طور پر کیا گیا ہے۔'' اسی دوران سراغرساں ہیرالڈ میرے قریب آکر بولا۔ ''لگتا ہے کہ دھماکا کرنے والا کسی کو مارنے کے بجائے صرف خوف و ہراس پھیلانا چاہتا تھا۔''

''اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔'' پیلا ڈین نے جلدی سے کہا۔

''فی الوقت یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ دھماکا کرنے والے کا مقصد کیا تھا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تنبیہ کے انداز میں کہا۔ ''جب تک مقصد کا پتا نہیں چلتا تب تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کامیاب ہوگیا ہے۔''

''بالکل درست کہا تم نے۔'' ہیرالڈ نے لقمہ دیا۔ ''بم ڈسپوزل اسکواڈ کے ماہرین کا فوری خیال یہ ہے کہ بم میں صرف دھماکا خیز مواد اور دھواں پیدا کرنے والا کیمیکل استعمال کیا گیا ہے جس کے باعث کسی جانی نقصان کا خطرہ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے، جب کوئی شخص اس کے انتہائی قریب ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ''خوش قسمتی سے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔''

''نقصان بہت بڑا ہوا ہے۔'' پیلا ڈین نے تلملا کر کہا۔

''کیا مطلب؟'' ہیرالڈ چونک گیا۔

''ہوٹل میں دھماکا ہوا ہے، یہی بات کافی ہے اس کا بزنس چوپٹ کرنے کے لیے۔'' اس نے کٹ کھنے لہجے میں جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو اس دھماکے کے نتیجے میں کیا کچھ ہوسکتا ہے؟'' اس نے ہیرالڈ سے استفسار کیا اور پھر خود ہی بتانے لگی۔ ''بزنس تو گیا، اب لوگ ہم پر مقدمہ بھی کرسکتے ہیں کہ ہوٹل کا سیکیورٹی نظام ٹھیک نہیں۔ اس جواز پر مالک کس کس کو ہرجانے ادا کرتا پھرے گا؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' ہیرالڈ نے تائید کی۔

''ہاں بے چارہ۔'' میں نے افسوس سے کہا۔ ''ایسا ہوا تو بے چارے کے پاس خودکشی کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں بچے گا۔''

یہ سن کر پیلا ڈین نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ ''موقع محل دیکھ لیا کرو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

کیپ کارن ہوٹل انتظامیہ نے چھ دن اور چھ راتوں کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پولیس، بم ڈسپوزل

[illegible] ٹیمیں پورے ہوٹل میں دندناتی پھر رہی تھیں۔ دھمکی آمیز ای میل کے باعث پولیس نے تفتیش کے لیے ہوٹل اسٹاف کے تمام لیپ ٹاپ اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔ میں انہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور ٹی وی کھول کر مختلف نیوز چینل بدل بدل کر دیکھنے لگا۔ ہر چینل پر یہی خبر تھی۔ لگتا تھا کہ امریکی میڈیا کے لیے اس وقت اس سے بڑی کوئی اور خبر تھی ہی نہیں۔ میں کافی دیر تک کمرے میں رہا۔ نہ تو پولیس اور نہ ہی پیلا ڈین نے مجھ سے رابطہ کیا۔

ٹی وی سے پتا چلا کہ پولیس نے کنونشن سینٹر کے قریب سے دو طاقتور ٹائم بم دریافت کر لیے تھے۔ جنہیں کل صبح ساڑھے نو بجے بیک وقت پھٹنا تھا۔ ٹی وی پر یہ خبر بریک ہوتے ہی ایک اور ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کل صبح کنونشن سینٹر میں کمپیوٹر پروگرام کی تقریب رونمائی اور دو روزہ ورکشاپ کا پروگرام انعقاد کرنے والی انتظامیہ نے فوراً منسوخ کر دیا۔ پروگرام میں شرکت کے لیے پہنچنے والے مندوبین کو ہدایت کی گئی تھی کہ جیسے ہی پولیس ہوٹل کو کلیر کرے، وہ اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیں۔ میں سمجھ گیا کہ اب کھیل ختم۔

رات گئے پولیس نے ہوٹل کو کلیر کر دیا۔ اس کے بعد لوگ دھڑا دھڑ انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے ٹکٹ ری شیڈول کروانے میں لگ گئے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو ہوٹل چھوڑ دے۔

صبح کے چار بجے تھے۔ میں ہوٹل کی مرکزی لابی میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگ واپس جا رہے تھے اور صبح کے سات بجے تک ہوٹل پوری طرح مہمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اسی دوران مجھے پیلا ڈین کا فون ملا۔

''میرے یا تمہارے کرنے کے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا۔''

''میرے دفتر میں پہنچ جاؤ۔'' عام طور پر یہ وقت میرے سونے کا ہوتا ہے مگر رات بھر جو یہاں ہنگامہ تھا، اس میں کس کمبخت کو نیند آسکتی تھی۔ میری آواز سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں بھی دوسروں کی طرح جاگ رہا ہوں۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ خاصی مضمحل نظر آرہی تھی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اس صورتِ حال نے اس کے اعصاب بری طرح توڑ پھوڑ دیے تھے۔

''اگر کوئی آدمی راستہ کاٹ جائے تو یہ خوش قسمتی کی نشانی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم بھی واپس لوٹ جاؤ۔'' کافی پیتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کی آواز کمزور پڑ چکی تھی۔

''تمہارا کیا بنا؟''

''میری ڈیوڈ سے بات ہوئی ہے۔'' پیلا ڈین نے بتانا شروع کیا۔ وہ اس ہوٹل کا مالک تھا۔ ''اس کی حالت بہت بری ہے۔ وہ بوڑھا آدمی ہے، اس واقعے نے اس پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔''

''ہوٹل کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''بہت ہی پریشان ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''کہہ رہا تھا کہ وہ ہوٹل بند کر رہا ہے۔ پولیس انکوائری ختم ہو تو وہ اسے بیچ دے گا۔''

''اور تمہاری نوکری؟''

''آج نہیں تو کل فارغ ہو جاؤں گی، دوسرے اسٹاف کی طرح۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پریشان نظر آرہی تھی۔

''خیر اب جو ہوا سو ہوا۔'' میں نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اس سارے معاملے میں نہ تمہاری غلطی ہے اور نہ ہی میرا کوئی دوش۔''

یہ سن کر پیلا ڈین نے سر اٹھایا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

www.Paksociety.com

صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ جب میں نے ایک شاندار ریستوران میں ناشتا کیا اور پھر گھر پہنچ کر جو سویا تو شام کے سات بجے آنکھ کھلی۔

میں نے کافی بنائی اور ٹی وی کھول کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر اب تک اس واقعے کے مختلف پہلوؤں پر خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ ایک خبر میں بتایا گیا کہ ہوٹل کے مالک نے انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ فوری طور پر ہوٹل بند کر رہا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ وہ بہت جلد ہوٹل فروخت کر کے واپس اسکاٹ لینڈ چلا جائے گا۔

میں نے ٹی وی بند کیا اور بیڈروم میں آ کر موبائل اٹھا کر اس کی رنگ ٹون آن کرنے لگا۔ سونے سے پہلے میں نے اس کی بیل آف کر دی تھی۔ ''اوہ خدایا۔'' اچانک میرے منہ سے نکلا۔ ستانوے مس کالز تھیں اور یہ سب ایک ہی نمبر سے تھیں۔ نمبر تھا رابرٹ کا۔ ''نہا دھو لوں تو پھر فون کرتا ہوں اُسے۔'' میں نے خود کلامی کی مگر اس سے پہلے کہ فون کو واپس میز پر رکھتا، اس کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ رابرٹ کال کر رہا تھا۔

''سوری باس...'' میں نے فون اٹھاتے ہی کہا۔ ''سو رہا تھا، ابھی ابھی جاگا ہوں۔''

''ہو سکے تو کل صبح مل لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

کیپ کارن ہوٹل کے واقعے کو دو ماہ گزر چکے تھے۔ پولیس ملزمان کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ بوڑھے ڈیوڈ نے ہوٹل فروخت کر دیا اور واپس چلا گیا۔ ادھر میرے شب و روز بھی شاہانہ انداز میں بسر ہو رہے تھے۔ اس دوران پیلا ڈین سے ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی۔

اُس روز شام کے سات بج رہے تھے۔ میں نہایت اہتمام سے تیار ہو رہا تھا۔ آٹھ بجے مجھے اسکائی لائن کیسینو کی افتتاحی تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ یہ تقریب میرے لیے بہت اہم تھی۔ بڑے بڑے لوگ شریک ہو رہے تھے۔ کئی معروف فلم اور ٹی وی اسٹار بھی آ رہے تھے۔ اسی لیے میں نے بھی شرکت کے لیے بڑے تپاک سے مہنگا بلیک ڈنر سوٹ سلوایا تھا۔ نئے بلیک شوز خریدے تھے۔ میں تیار ہو کر آئینے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نمبر دیکھا۔ ''اوہ!'' میرے منہ سے نکلا۔

''تم کب نکل رہے ہو؟'' اُس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''اگلے دو منٹ میں، وہیں ملتے ہیں۔'' میں نے فون بند کر کے جیب میں رکھا اور کار کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

کار پارکنگ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ہر طرف قیمتی اور جدید ماڈل کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کافی دیر بعد مجھے جگہ مل ہی گئی۔ میں پارکنگ سے نکلا تو سامنے داخلی دروازہ تھا جہاں بڑی تعداد میں ٹی وی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ وہی عمارت تھی، وہی داخلی دروازہ اور وہی پارکنگ لیکن عمارت کی آرائش میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ پہلی نظر پڑتے ہی کیسینو کا تصور ذہن میں ابھرے۔ اسکائی لائن کیسینو کی چکا چوند کے نیچے گزرے کل کا کیپ کارن ہوٹل دفن تھا۔

تقریب بہت شاندار تھی۔ کیسینو کا اصل مالک رابرٹ تھا لیکن اس نے ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی قائم کر کے اکیاون فیصد شیئر خود لے لیے تھے۔ تقریب جوبن پر تھی جب رابرٹ نے مائیک تھام کر سب کو... ایک منٹ کے لیے خاموش ہونے کا کہا۔ ''اب میں آپ کو ملاتا ہوں کمپنی کے پارٹنرز اور ڈائریکٹرز سے۔''

یکے بعد دیگرے اس نے کئی لوگوں کو متعارف کروایا۔ میں انہیں جانتا تھا، وہ سب رابرٹ کے کارندے تھے۔ اس نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے یہ چال چلی تھی۔

''اور یہ ہیں مسٹر پاسکل ایڈی عرف اسپیڈ۔'' یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ''یہ ہیں دس فیصد کے شراکت دار۔''

رابرٹ جب میرا تعارف کروا رہا تھا، اسی دوران میری نظر سامنے پڑی۔ مہمانوں میں پیلا ڈین کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی میکسی پہنی ہوئی تھی۔ وہ بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ ابھی میری حیرانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ رابرٹ نے اگلے پارٹنر کا تعارف شروع کروا دیا۔

''یہ ہیں مس پیلا ڈین، تین فیصد کی شراکت دار۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔ میں سخت حیران تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ یہاں کیسے؟

رابرٹ نے تعارف ختم کرایا تو میں غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ میرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ ''ہائے پیلا ڈین۔''

www.Paksociety.com

“آئی ایم سوری۔” وہ اس وقت کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا اور میری طرف پلٹی۔

“مبارک ہو مسٹر پارٹنر۔” اس نے میری طرف داہنا ہاتھ بڑھایا۔

“مگر تم...” میں نے آہستہ سے کہا۔

“میں بتاتا ہوں۔” میرے کانوں میں آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو رابرٹ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

“تم دونوں میری شطرنج کے کھلاڑی تھے۔” اس نے مسکرا کر کہا۔

“کیا...!”

“ہاں۔” وہ بہ دستور مسکرا رہا تھا۔

“مگر کیسے؟” میں نے حیرت سے پوچھا۔

“تم نے ڈیوڈ کو ہوٹل بیچنے پر مجبور کیا اور پیلا ڈین نے سافٹ ویئر کمپنی کو وڈیو گیم لانچ کرنے سے روکا۔”

“اوہ میرے خدا۔” میں نے قطع کلامی کی اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ “پوری بات بتاؤ۔”

“کھیل ایک تھا اور شکار دو اور تم دونوں ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے مگر ایک دوسرے کی حقیقت سے بے خبر تھے۔” اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ “وہ بم میں نے نصب کروائے تھے، دھمکی والی ای میل میرے آدمی نے بھیجی تھی اور وہ واقعی سنسر لگی ڈیوائس کے بم تھے۔ اگر پولیس پہنچ جاتی تو بم ناکارہ بنا دیے جاتے۔ اسی لیے پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی پیلا ڈین نے ان ڈبوں کو چھو کر آن کر دیا۔ ویسے میرے کہنے پر ہی پیلا ڈین نے تمہیں فون کر کے بلوایا تھا۔”

“مگر میری ضرورت کیا تھی اس کھیل میں؟”

“آپس کی بات ہے تمہاری بہت بڑی ضرورت تھی۔” وہ کہنے لگا۔ “سراغرساں، چیف سیکیورٹی افسر... ان سب کی موجودگی کے باوجود بم دھما کا صرف دہشت گردی کا واقعہ تھا۔ اس لیے کوئی شخص ہوٹل کے خلاف مقدمہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو پھر ہوٹل پر گاہک مقدمہ کر سکتے تھے اور قانون کے تحت اگر کسی جائداد پر مقدمہ چل رہا ہو تو وہ فروخت نہیں کی جا سکتی۔” یہ کہہ کر اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ “منصوبہ تو تم نے ہی بنایا تھا کیوں بھول گئے۔”

“ارے ہاں... یاد آیا۔” میں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ “مگر وہ کمپیوٹر گیم...”

“اگر وہ لانچ ہو جاتا تو میری کمپنی کا اسی طرح کا تیار کردہ پروگرام فیل ہو جاتا... سمجھے۔”

“کیا مطلب؟”

“سیدھی سی بات ہے۔ جو کمپنی کمپیوٹر گیم لانچ کر رہی تھی، اس کا پلان ہم نے چوری کر لیا تھا۔ بس ذرا بنانے میں دیر ہو رہی تھی۔” یہ کہہ کر وہ رکا۔ “اس منصوبے کی کامیابی سے مجھے دو کروڑ ڈالرز کا اب تک فائدہ ہو چکا ہے۔ بڑا مشہور ہوا ہے وہ گیم۔”

“تم واقعی شیطان ہو۔”

“اس سے کچھ زیادہ۔” وہ ہنسا۔ “کیسینو کی سیکیورٹی اب پیلا ڈین اور تمہاری ذمے داری ہے، تاکہ میں بے فکر ہو جاؤں۔”

میں نے مسکرا کر پیلا ڈین کی طرف دیکھا۔ “میں دس فیصد کا پارٹنر ہوں اور تم...”

“صرف تین فیصد۔” اس نے قطع کلامی کی۔

“ارے سنو رابرٹ...” میں نے یکدم سنجیدگی سے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ “پیلا ڈین کا حصہ کم کیوں ہے؟”

“اوہ...” اس نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ “بھئی یہ صرف کھلاڑی تھی، ویسے وہ تین فیصد پر ہی مان گئی تھی مگر تم ٹھہرے بڑے اُستاد۔”

“ارے سنو پیلا ڈین عرف مس تین فیصد۔”

“میں سمجھ گئی، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔” یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ “کہیے باس آئندہ کے لیے کیا حکم ہے؟”

“اکٹھے واپس چلیں گے۔”

میری بات سن کر رابرٹ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

“تمہارا کھیل بہت کامیاب رہا، مبارک ہو۔” میں نے رابرٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

“یہ کارپوریٹ گیم ہے...”

“اور تم اُس کے بڑے کھلاڑی۔” میں نے قطع کلامی کی۔

“صرف رابرٹ ہی نہیں۔” پیلا ڈین نے لقمہ دیا۔ “اب ہم دونوں بھی اس کارپوریٹ گیم کے دو کھلاڑی بن گئے ہیں۔”

“بالکل ٹھیک کہا تم نے۔” رابرٹ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ “آؤ...” اس نے ہم دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ “آگے بڑھو، تمہیں کارپوریٹ گیم کے کچھ بڑے کھلاڑیوں سے ملواتا ہوں۔”

“ضرور۔” میں اور پیلا ڈین یک زبان ہو کر بولے۔

آتش نادید

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کچھ لوگوں کے لیے یہ عشق تو واقعی آگ کا دریا ثابت ہوتا ہے جس میں نہ چاہتے ہوئے بھی ڈوبنا پڑتا ہے... چاہے منزل ملے نہ ملے۔ مگر اس کا عشق تو بہت عجیب تھا... جسے نہ تو جان کی پروا تھی نہ بدنامی کا احساس... بس وہ اسے اپنی ذات کے حصار میں قید رکھنا چاہتی تھی۔

ایک وفا شعار دوشیزہ کی عقلمندی کا احوال

رادھا اتنی تیزی سے باورچی خانے میں داخل ہوئی کہ اس کے ماں باپ بری طرح چونک اٹھے، وہ سخت گھبراہٹ میں مبتلا تھی۔ اس کے ہاتھوں میں موجود دودھ کی بالٹی گرتے گرتے بچی۔ وہ میز کے ایک کونے سے ٹیک لگائے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

رادھا کے ماں باپ حیران تھے کہ وہ خوف زدہ انداز میں بولی۔ “وہ...... وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔”

باورچی خانے کی ایک بھدی سی میز پر مٹی کے تیل سے جلنے والا مدھم لیمپ رکھا ہوا تھا اور روشنی پھیلانے کی مقدور بھر کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ناکافی روشنی میں رادھا کی پتلی پتلی بدہیئت ٹانگیں لرزتی نظر آ رہی تھیں۔ اگر روشنی تیز ہوتی تو رادھا کے چہرے کے وحشت زدہ تاثرات بھی صاف دکھائی دیتے۔ اس کی ماں نے وہ پتلون میز پر پٹخ دی جس کی وہ مرمت کر رہی تھی۔ اس نے رادھا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ “کون ہے وہ؟ کس نے تمہارا پیچھا کیا ہے؟”

“موہن نے۔” رادھا نے آبدیدہ ہو کر اپنے خشک

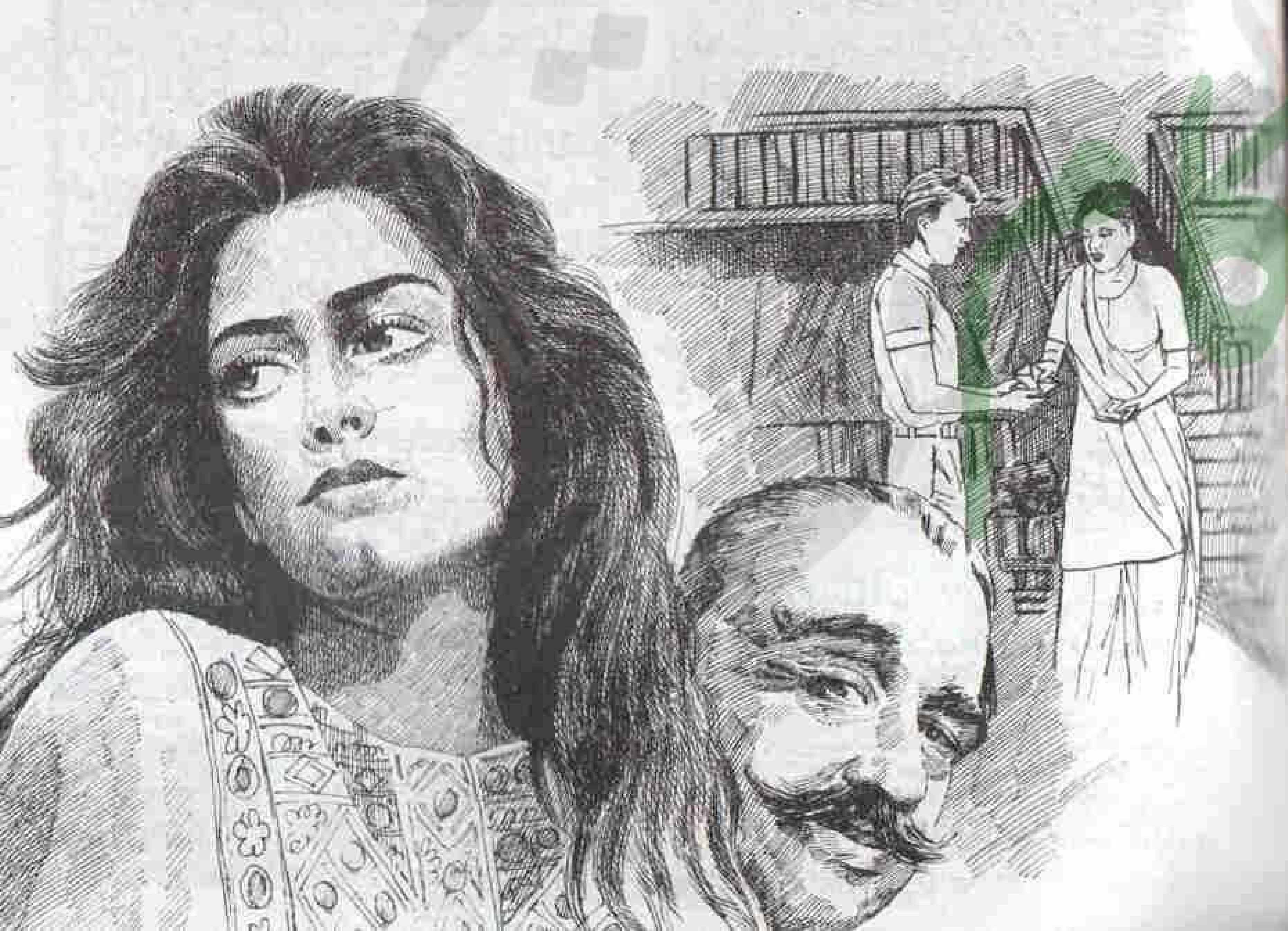

بال ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”آج تو میں بڑی مشکل سے بچی ہوں ماں! اس نے...... اس نے مجھے پکڑ لیا تھا اور...... اور......“ رادھا کے رخساروں پر سرخی سی چھا گئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مدھم روشنی میں چمک رہی تھیں۔

”کیا اس نے......؟“ ماں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ شدید بے چینی کے عالم میں کرسی سے اٹھ گئی تھی۔

”نہیں ماں!“ رادھا نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اگر میں زور لگا کر خود کو چھڑا نہ لیتی تو......“

رادھا کا باپ دیر سے ایک ہتھوڑے کا معائنہ کر رہا تھا، اس نے اسے نیچے رکھ دیا اور رادھا کو گھورنے لگا۔ اس کی ڈاڑھی ایک ہفتے سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ مضمحل اور بیمار نظر آرہا تھا۔ اس نے نحیف آواز میں خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”اس گڑبڑ میں تم نے سارا دودھ بھی گرا دیا ہوگا؟ کیوں......؟“

”نہیں باپو!“ رادھا نے جلدی سے بالٹی اٹھا کر اس کے نزدیک لے جاتے ہوئے کہا۔ ”سارا دودھ نہیں گرا البتہ تھوڑا سا ضرور گر گیا تھا۔“

”یہ تھوڑا سا گرا ہے؟“ اس کے باپ نے بالٹی میں جھانکتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔ ”یوں کہو کہ تھوڑا سا باقی بچا ہے۔ دودھ دوہنے میں بھی تم نے گھنٹوں لگا دیے۔“

”میں کیا کرتی باپو؟“ رادھا نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”زنجیر گم ہو جانے کی وجہ سے بھینس قابو میں آتی ہی نہیں، بار بار اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے۔“

”اچھا...... اچھا......“ رادھا کی ماں نے بیزاری کے ساتھ اپنے شوہر سے کہا۔ ”تم دودھ کے متعلق بعد میں چِنتا کرتے رہنا، اس سے یہ سوچو کہ اس ذلیل نے کتنی گھناؤنی حرکت کی ہے؟ جاؤ بندوق اٹھا کر ابھی اس کمینے کو تلاش کرو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ رادھا کا بھی وہی حشر کر ڈالے جو اس نے کماری کا کیا تھا؟“

”یہ سب فضولیات ہیں، ہر بات بے سوچے سمجھے آنکھ بند کر کے مت مان لیا کرو۔“ رادھا کے باپ نے بے پروائی سے کہا۔ ”یہ لڑکیاں جب بالغ ہونے لگتی ہیں تو دیوانی ہو جاتی ہیں۔ عجیب عجیب خیالات ان کے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ ہمیشہ یہی سمجھتی ہیں کہ مرد ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے دوبارہ اپنا ہتھوڑا اٹھا لیا اور رادھا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ذرا اس کم بخت کی شکل تو دیکھو۔ بالکل چوہیا جیسی لگتی ہے۔ نہ رنگ نہ روپ، دق زدہ سی مریل لڑکی۔ بھلا کون پاگل اس کا پیچھا کرے گا؟ میں کہتا ہوں موہن جذباتی ہو کر بھی کم از کم اتنا ذہین ضرور ہے کہ اس جیسی بدصورت لڑکی کی طرف توجہ نہیں دے گا۔ میں یقین ہی نہیں کر سکتا کہ اس نے اس کا پیچھا کیا ہوگا۔“

رادھا نے بھی بڑی بے باکی سے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اس کی زرد زرد آنکھیں بلّی کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگیں۔ اس نے کہا۔ ”یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اچھی صورت ہی تلاش کرے، دنیا میں بدصورت لڑکیاں بھی تو ہوتی ہیں آخر۔“

”بکواس بند کرو۔“ اس کا باپ دہاڑا۔ ”تمہاری زبان قینچی کی طرح چلنے لگی ہے۔ شرم نہیں آتی اس طرح کہتے ہوئے؟“ اس نے ہتھوڑے کو ایک جھٹکا دیا۔ صرف دستہ اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ ”تمہاری ماں نے تمہیں یہی سکھایا ہے؟“

رادھا کی ماں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ”یہ باتیں چھوڑو، باہر جاؤ اور اس حرام زادے کو تلاش کرو، ایسا نہ ہو کہ کماری کی طرح رادھا بھی کسی روز باڑے کے پیچھے مردہ حالت میں پائی جائے اور اس کے کپڑے بھی کماری کے کپڑوں کی طرح پھٹے ہوئے ہوں۔“

رادھا کے باپ نے ہتھوڑا ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ”چھوڑو بھی، ضروری نہیں ہے کہ کماری کو موہن نے ہی ہلاک کیا ہو، یہ کام کسی اور کا بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”ہرگز نہیں، یقیناً یہ موہن ہی کا کام ہے، تم خوامخواہ اس کی وکالت کر رہے ہو۔ حالانکہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کی ٹوپی کماری کی لاش کے قریب پائی گئی تھی۔ اس کا چاقو بھی وہیں پڑا تھا اور پھر اس پورواَئی (گاؤں) میں اس کے سوا کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے جس پر قتل کا شبہ کیا جا سکے۔ تم اٹھ کر اسے تلاش کرتے ہو یا نہیں؟“ رادھا کی ماں نے پیر پٹخ کر کہا۔

رادھا کے باپ نے بڑی مشکل کے ساتھ زمین سے پیر بلند کر کے لیمپ کی روشنی میں اسٹول پر رکھا۔ پاؤں پر میلے اور پرانے کپڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے لیے زیادہ چلنا مشکل ہے۔ میں اس زخمی پاؤں کے ساتھ کہاں تک گھستا پھروں گا۔“

”ہائے تمہارا پاؤں!“ رادھا کی ماں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”کیوں باتیں بنا رہے ہو، ہلکی سی سوجن ہی تو ہے، ٹوٹ تو نہیں گیا پاؤں تمہارا......“

”مگر میرے لیے تو اسے ہلانا بھی ایک عذاب ہے۔ معلوم نہیں کیوں اتنی زیادہ تکلیف ہونے لگی ہے۔“

”شاید وہ ابھی زیادہ دور نہ گیا ہو۔“ رادھا نے کہا۔ وہ اتنی دیر سے بڑے تحمل کے ساتھ بھولی بھالی لڑکیوں کی طرح اپنے ماں باپ کی نوک جھوک سن رہی تھی۔ ”ہو سکتا ہے وہ اب بھی موقعے کی تاک میں کہیں آس پاس ہی موجود ہو۔“

”جائے گا کہاں؟ ایک دو دن میں پکڑ لیا جائے گا۔“ رادھا کے باپ نے اس بار ٹالتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت باہر جانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ ”سنا ہے کماری کے معاملے میں پولیس ابھی تک سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی ہے۔ پرسوں اسے تھانیدار نے کھلیانوں میں پکڑ لیا تھا مگر وہ کمینہ اسے دھکا دے کر بھاگ نکلا۔“

”میں کچھ نہیں جانتی...... اس وقت پولیس والوں کی بیٹیاں نہیں بلکہ ہماری بیٹی خطرے میں ہے۔ رادھا! تم لالٹین جلا کر لاؤ......“ اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ”اوجی...... تم...... تم بندوق اٹھاؤ اور باہر جا کر ایک نظر ڈالو، ممکن ہے وہ مورکھ...... کہیں دکھائی دے جائے۔“

رادھا نے جلدی سے لالٹین جلائی۔ پرانی لالٹین کی بتی سے دھواں نکل کر شیشے کا ایک حصہ سیاہ کرنے لگا۔ رادھا کے باپ نے بیوی کی حکم عدولی مناسب نہ سمجھی۔ اس نے بادل ناخواستہ اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے اپنی بندوق تلاش کی اور اس میں ایک کارتوس ڈالا۔ یہ بوسیدہ سی بندوق عموماً جنگلی سور اور گیدڑ بھگانے کے کام آتی تھی۔

رادھا کی ماں نے اس کی پتلون کی مرمت ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”لو اسے پہن کر باہر جانا۔“

رادھا کے باپ نے اپنی میلی چیکٹ سی دھوتی دیکھی پھر اس نے اپنے پاؤں کی پٹیاں دیکھیں اور منہ بناتے ہوئے بیوی سے بولا۔ ”پتا نہیں کیوں تم مجھے پتلون پہننے کو دیتی ہو جسے پہننے کے لیے مجھے یہ پٹیاں اتارنی پڑتی ہیں۔ میں اب اپنی دھوتی ہی پہنے رکھوں گا، اس مورکھ موہن کو میری پتلون کی نہیں، بندوق کی فکر ہوگی۔“

رادھا لالٹین اٹھائے اپنے باپ کے ساتھ ساتھ تھی۔ باپ نے مشکل سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، اب بتاؤ اس نے کس جگہ تمہیں پکڑنے کی کوشش کی تھی؟“

”باڑے کے بالکل پاس...... میں جیسے ہی باہر نکلی، اس نے مجھے پکڑ لیا۔ پھر وہ مجھے اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔“ رادھا نے لکنت سے کہا۔

”بہت ہی بدذات ہے وہ۔“ باپ نے ناک چڑھا کر کہا۔ وہ بار بار اپنی بندوق اس طرح سنبھال لیتا تھا جیسے اسے اس کی ضرورت پڑنے ہی والی ہو۔

باڑا مکان کے سامنے ہی تھا۔ رادھا کی ماں مکان کے

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

www.Paksociety.com

دروازے پر کھڑی تھی اور ان دونوں کو باڑے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسے صرف لالٹین کی حرکت سے پتا چلا رہا ہوگا کہ وہ دونوں آگے بڑھ رہے ہیں، پھر جب وہ باڑے کے اندر چلے گئے تو اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

باڑے کے اندر ان کی بھینس بڑی بے نیازی سے بیٹھی تھی، بھینس نے لاتعلقی سے لالٹین سمیت دو متحرک سائے اندر آتے دیکھے اور بدستور جگالی کرتی رہی۔ قریب ہی وہ سانڈ بھی بندھا ہوا تھا جس نے زور سے پاؤں مار کر رادھا کے باپ کو زخمی کر دیا تھا۔ اس نے بھی ان پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔ شاید وہ اپنے مالک کے پاؤں پر پٹیاں بندھی دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رادھا نے لالٹین ذرا اونچی کر کے چاروں طرف دیکھا۔ ''باپو! یہاں تو کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی چھپ سکے۔ کیا خبر وہ کہاں چھپا ہوگا؟''

''ہوں، واقعی یہاں تو کوئی چڑیا کا بچہ بھی نہیں چھپ سکتا۔'' رادھا کے باپ نے تائید کی۔ پھر اس کی نظر لکڑی کی سیڑھی سے ہوتی ہوئی اوپر اس نیم چھتی پر پڑی جہاں چارہ سنبھال کر رکھا جاتا تھا۔ ''ہوسکتا ہے وہ مورکھ! وہاں چھپا ہو، اف میرا پاؤں بہت دکھ رہا ہے۔''

''باپو! تو اوپر چڑھ کر کم از کم دیکھ تو لے۔'' رادھا نے اس کے پاؤں کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے تجویز پیش کی۔

''نہیں، میرے لیے یہ بڑا مشکل ہے۔ تم ایسا کرو کہ خود لالٹین لے کر سیڑھی پر چڑھو اور اچھی طرح اسے تلاش کرو، اگر وہ اوپر موجود ہے تو یقیناً آج میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔'' رادھا کے باپ نے دانت پیس کر کہا۔

''اگر...... اگر باپو! وہ وہیں ہوا تو مجھے پھر نہ پکڑ لے۔'' رادھا نے خوف زدہ سی آواز میں کہا۔

''اس وقت وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں یہاں موجود ہوں۔''

رادھا سیڑھی پر چڑھ رہی تھی، اس کا باپ بندوق تھامے بالکل تیار کھڑا تھا۔ رادھا نے لالٹین کی روشنی میں اچھی طرح ادھر ادھر دیکھا۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے باپو!''

پھر وہ سیڑھیاں اترنے لگی جب وہ نیچے اتر آئی تو اس کا باپ اپنا پٹیوں والا پاؤں زمین پر رگڑ کر صاف کر رہا تھا۔

''یہ بھینس باڑے میں چاروں طرف مٹرگشت کرتی رہی ہے، اس کی زنجیر چوری نہ ہوئی ہوتی تو ہر طرف گوبر تو نہ پھیلا ہوتا۔'' پھر وہ دونوں باپ بیٹی واپس گھر کی طرف جانے لگے۔ تھوڑی دور جا کر رادھا کے باپ نے کہا۔

''بیٹی! کل تم چارہ کاٹ کر نیم چھتی میں سنبھال کر رکھ دینا، بارشوں کا موسم سر پر ہے، برف باری بھی ہوسکتی ہے۔ میں زخمی پاؤں کی وجہ سے فی الحال کسی کام کے قابل نہیں ہوں۔''

☆☆☆

باڑے میں چارہ کاٹتے وقت رادھا کو کچھ گرمی محسوس ہوئی۔ دھوپ بھی بہت تیز تھی اور وہ سخت محنت کرنے کی وجہ سے سارے بدن پر ایک خوشگوار سی نمی محسوس کر رہی تھی، اس کے دبلے پتلے بازوؤں میں خاصی طاقت تھی اس لیے دیر تک کام کرنے کے باوجود وہ تھکی نہیں تھی۔ سہ پہر کے وقت اس نے دیکھا کہ اس کی ماں انڈوں کی ٹوکری اٹھا کر بازار کی طرف جارہی ہے۔ بازار کا راستہ باڑے ہی کی طرف سے گزرتا تھا۔ جب ماں قریب پہنچی تو رادھا باہر نکل آئی۔ ماں نے کہا۔

''آج تمہاری جگہ میں بازار جارہی ہوں، رادھا! کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ کم بخت موہن تمہیں آج پھر نہ ڈھونڈ رہا ہو۔ تمہارا باپ بندوق لیے کھڑکی سے دیکھ رہا ہے۔ اگر آج موہن باڑے کی طرف آگیا تو اس کی خیر نہیں ہوگی، تم چنتا نہ کرنا۔''

''لیکن ماں! کہیں وہ راستے میں تمہیں پریشان نہ کرے؟''

''اس کی کیا مجال ہے؟'' رادھا کی ماں نے آنکھیں نکال کر کہا اور ٹوکری سے ایک لمبا چھرا نکال کر رادھا کو دکھایا۔ ''میں اس کا قیمہ بنا دوں گی۔''

جب رادھا نے ماں کو دور سڑک کے آخر میں غائب ہوتے دیکھا تو اس نے اپنے ہاتھ کا ٹوکرا زور سے زمین پر پھینکا۔ اسے یقین تھا کہ ماں بازار پہنچتے ہی دوسری عورتوں سے باتیں کرنے میں ایسی منہمک ہوگی کہ اندھیرا ہونے سے پہلے اسے واپس آنے کا خیال تک نہیں آئے گا۔ رادھا نے سوچا میرا باپ اب تک کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا ہوگا۔ اس عالم میں بھلا وہ مستعدی سے باڑے کی طرف کیا توجہ دے سکتا ہے؟ اور اگر وہاں بیٹھا لگاتار دیکھتا بھی رہے تو اسے باڑے کے دروازے کے سوا اور کیا نظر آسکتا ہے؟

رادھا نے چارے کا گٹھا بنایا اور اسے ایک لمبی رسی کے سرے پر باندھ دیا۔ پھر کسی خیال سے اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور بدن میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ اس کی بلی کی سی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوگئی۔ وہ چارے کا گٹھا گھسیٹ کر سیڑھی کی طرف لے گئی اور پھر نیم چھتی پر جا پہنچی۔ نیم چھتی کا فرش گھاس کے ایک ڈھیر کے سوا بالکل خالی تھا۔ یہاں بہت کم روشنی تھی، رادھا چارے کے گٹھے پر

بیٹھ گئی۔ اس نے پسینا خشک ہونے کا انتظار کیا۔ گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

اسی وقت گھاس کے ڈھیر میں حرکت پیدا ہوئی اور سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی ایک چہرہ وہاں سے ابھرا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا معصوم چہرہ، پھر اس کی گردن نمودار ہوئی پھر سینہ باہر نکلا۔ رادھا کی نظریں اس کے چوڑے شانوں اور فراخ سینے پر جم گئیں۔ نوجوان نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

''کیا ابھی تک وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں؟''

''ہاں! موہن! وہ انتہائی جوش و خروش سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں، انہوں نے تمہاری تلاش میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ چپا چپا چھان مارا، میرے باپو بہت مشتعل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔''

''ہاں میں نے خود انہیں کل رات یہ کہتے سنا تھا لیکن...... لیکن...... رادھا! میں بے قصور ہوں...... بالکل بے گناہ ہوں، میں بھگوان کی سوگند کھانے کو تیار ہوں...... کہ میں نے...... میں نے کماری کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔'' وہ پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ''تم تو جانتی ہی ہو رادھا! کہ کماری میری محبوبہ تھی، میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ بھلا کوئی شخص اپنی محبوبہ کو مار سکتا ہے؟ اتنی پیاری اور وفادار محبوبہ کو...... آہ...... کتنی خوب صورت اور نیک تھی کماری...... ٹھنڈے دل سے سوچو، میں اسے کیسے ہلاک کرسکتا ہوں؟ اسے تو کوئی ایسا آدمی ہلاک کرسکتا تھا جو اس سے شدید متنفر ہو۔''

''لیکن تمہاری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا، سب تمہی کو مجرم سمجھ رہے ہیں۔ پولیس کو بھی کامل یقین ہے کہ کماری کو تمہی نے مارا ہے۔ اس کی لاش کے پاس تمہاری ٹوپی بھی ملی تھی اور تمہارا چاقو بھی دستیاب ہوا تھا۔ یہ چیزیں تمہارے جرم کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔''

''لیکن...... لیکن میں نے اسے نہیں ہلاک کیا۔ وہ تو محض مذاق میں کماری نے میرا چاقو چھین لیا تھا اور میں نے اپنی ٹوپی اسے پہنا دی تھی، میری ٹوپی اس پر کس قدر سج رہی تھی، آہ......'' موہن نے کلیجا تھام لیا۔

''لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی موہن!'' رادھا نے تلخ لہجے میں کہا اور اٹھ کر موہن کے پاس گھاس پر جا بیٹھی۔ ''اب وہ بہت دور جاچکی ہے، تم کب تک اسے یاد کرتے رہو گے؟ اب تو صرف میں تمہارے پاس رہ گئی ہوں، اب تمہیں مجھ سے محبت کرنی چاہیے۔ میری طرف دیکھو، میری آنکھوں میں جھانکو، چراغ لے کر ڈھونڈو گے تو مجھ جیسی محبت کرنے والی لڑکی تمہیں کہیں نہیں ملے گی۔'' اس نے چہرہ ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیا اور سسکنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے حسرت سے موہن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لو موہن! جس طرح تم کماری کو......''

موہن نے جھکا ہوا چہرہ اٹھایا اور غور سے رادھا کی طرف دیکھا۔ وہ اب سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی کوئی الجھن دور ہوگئی ہو اور جیسے اس نے کوئی اہم مسئلہ حل کرلیا ہو۔

''رادھا! ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں...... کہو۔''

''کیا تمہی نے کماری کو ہلاک کیا ہے؟ میرا خیال ہے، تمہی ایسا کرسکتی تھیں۔'' موہن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''بالکل یہی بات ہے، تمہیں کماری سے سخت نفرت تھی نا...... اس کی خوب صورتی کی وجہ سے تم اس سے حسد کرتی تھیں۔ تم نے ہی اسے قتل کر کے قتل کا الزام مجھ پر لگا دیا ہے اور اب سب لوگ مجھے مجرم سمجھ رہے ہیں۔''

رادھا چند لمحوں تک تاثرات سے عاری چہرے کے ساتھ موہن کو گھورتی رہی۔ پھر بولی۔

''موہن! تم چنتا نہ کرو، تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔'' رادھا نے اس کے اور قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب تک میں اپنی زبان نہ کھولوں، کوئی یہ نہیں جان سکتا کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔''

''اس طرح تم انہیں اور زیادہ یقین دلا رہی ہو کہ میں ہی مجرم ہوں۔'' موہن نے کہا۔ ''تم نے کل مجھے دودھ پلایا اور اپنے باپ کو شاید کوئی اور کہانی سنائی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بندوق لے کر یہاں آپہنچا تھا۔ آج تمہاری ماں بھی چھرا لیے میری تلاش میں گھوم رہی ہے۔ تم کتنی عیار ہو۔''

''آج رات میں تمہارے لیے سیب کا مربا بھی لاؤں گی اور کھانے کو جو بھی اچھی چیزیں ملیں گی لے آؤں گی، تمہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔''

موہن بہت دیر تک خاموش رہا پھر ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''کاش......! میں کسی طرح یہاں سے فرار ہو کر اتنی دور چلا جاؤں کہ مجھے جان کا خطرہ نہ رہے۔ رادھا! تم کب مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دو گی؟''

رادھا نے موہن کی ٹانگ میں بندھی ہوئی زنجیر...... کی طرف غور سے دیکھا۔ ''جب حالات ٹھیک ہوجائیں گے۔'' اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا۔ ''لیکن ابھی کئی دن تک نہیں، بتاؤ تم مجھے چاہتے ہو نا......؟؟؟''

www.Paksociety.com

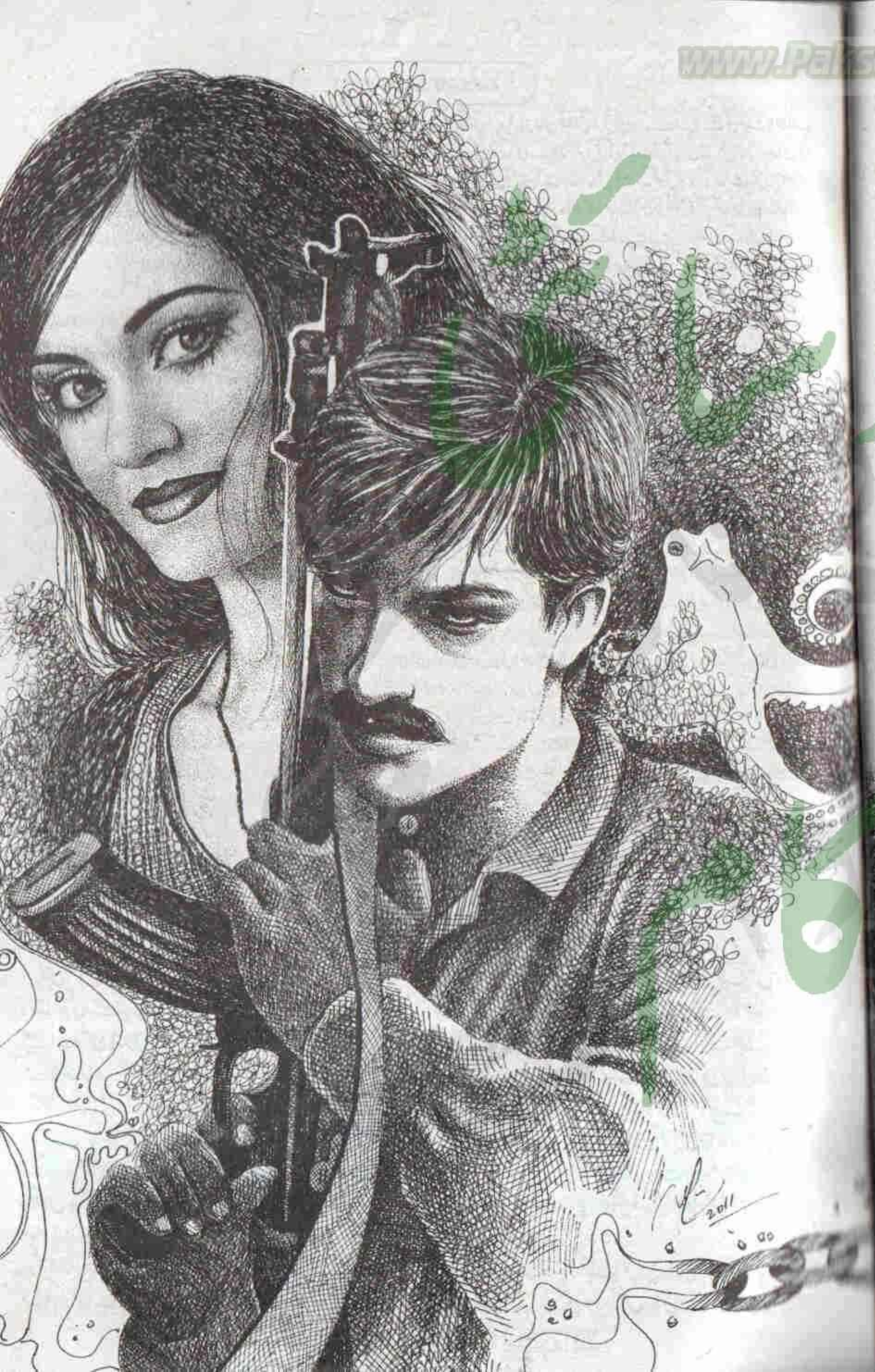

کشکول

انوار صدیقی

آٹھویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل وگلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

محبت کی یہ داستان نوشہرہ کے لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا انا پرست باپ سردار سرفراز خان طبقاتی فرق کی وجہ سے اپنے بیٹے کی محبت کا مخالف ہے۔ لیاقت اپنی چاہت، فرحین سے شادی کر کے کراچی آجاتا ہے۔ باپ مخالف مگر ماں اس کی ہمدرد تھی۔ یہ جوڑا کراچی کی ایک کچی آبادی میں گل خان اور اس کی بیوی زرینہ کے ساتھ مشترکہ طور پر کرائے کے مکان میں قیام کرتا ہے۔ مکان سے متصل قبرستان میں فرحین ایک ہندو عامل پرتاب گھوش کو برہنہ حالت میں پراسرار عمل ورقص کرتے دیکھ کر خوف زدہ ہوجاتی ہے اسی دوران لیاقت حسین کو ایک قبر سے عمل کیا ہوا نیبو ملتا ہے وہ اللہ کا نام لے کر اس عمل کو ختم کردیتا ہے۔ لیاقت ملازمت کے لیے پریشان تھا کہ راہ میں ایک جلتے مکان سے جان پر کھیل کر ایک عورت کو نکال لانے پر اس کے بیٹے کے ذریعے اسے سیٹھ عثمان کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی مسز راحیلہ بیگم بہت سلجھے ہوئے ہمدرد انسان اور کامیاب بزنس مین ہیں جبکہ شیخ حامد بہ ظاہر ان کا رفیق مگر درحقیقت حریف ہے اور اپنے دست راست افضل خان کے ذریعے اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین جسے ایک نابینا بزرگ کی جانب سے ایک ماورائی قوت یعنی ہمزاد میسر آگیا ہے جو مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے لیکن لیاقت حسین کو اس کے متعلق کوئی ادراک نہیں ہے اسی پراسرار قوت کے باعث وہ ہر بار شیخ حامد کے منصوبوں کو ناکام بنادیتا ہے۔ میڈم روبی ایک دولت مند بیوہ ہے جو اپنے شوہر کی حادثاتی موت کے بعد بزنس اور سماجی مصروفیات میں شامل ہوتی ہے اور شوہر کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے اور اسی سلسلے میں شیخ حامد کے دست راست افضل خان سے راہ رسم بڑھاتی ہے اس کے علاوہ شیخ حامد جو کہ مافیا کا سرغنہ ہے اور کوڈ ورڈ بلیک ٹائیگر کے تحت کئی خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہے، اس کے آفس کی ایک ورکر شبنم بھی بگ باس کے خلاف میڈم جیسے ہی مخالف جذبات رکھتی ہے اور اپنی ماں کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ لیاقت حسین کے علاوہ سیٹھ عثمان کا ایک پولیس آفیسر دوست ڈی ایس پی سراج بھی اس کا مددگار ہے جو کہ ایک ایماندار افسر ہے اور افسر اعلیٰ علیم احمد کا قابل اعتماد ہے۔ شیخ حامد میڈم کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے افضل خان کو استعمال کرتا ہے اور شراب کے نشے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں میڈم کی قابل اعتراض تصاویر حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن عین وقت پر ایک پراسرار کال کے سبب وہ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچاسکا۔ متعدد مواقع پر لیاقت حسین شیخ حامد کے آڑے آتا رہا۔ لہٰذا وہ لیاقت حسین کا دشمن بن گیا اور اسے مجبور کرنے کے لیے فرحین کو اغوا کرالیتا ہے لیکن یہاں بھی لیاقت حسین اپنے ہمزاد کے ذریعے کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔ ناکامی کے بعد بگ باس شیخ حامد افضل خان کو سخت عتاب کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری جانب شبنم میڈم روبی سے ملتی ہے اور مشترکہ مقصد کے لیے تعاون کی درخواست کرتی ہے۔ اسی دوران اعلیٰ افسر علیم احمد ریٹائر ہوجاتا ہے اور آغا منظور اس کی جگہ لیتا ہے جو کہ ایک کرپٹ افسر ہے لیکن میڈم روبی کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ردوبدل کے نتیجے میں نیا ڈی ایس پی لودھی تعینات ہوتا ہے جبکہ ایس پی کے عہدے پر اورنگزیب جوائن کرتا ہے جو کہ ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ سراج حکمت عملی کے تحت درپردہ شیخ حامد سے تعلقات استوار رکھتا ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا کی کال سراج کو موصول ہوتی ہے جس میں وہ اپنی خودکشی کی اطلاع دیتی ہے اور اپنی ایک خفیہ تحریر کے متعلق بتاتی ہے جو اس نے سراج کے نام لکھی ہے جس میں کچھ انکشافات کیے گئے ہیں۔ سراج پریشان ہوجاتا ہے کہ موبائل پر اس کے نمبر زدیکھ کر شیخ حامد اس سے برگشتہ ہوجائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا، حامد نے سراج کو مزہ چکھانے کے لیے اس کی بیوی الماس کو اغوا کرلیا لیکن اس بار پھر لیاقت حسین کے ہمزاد نے اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ صبا بیگم کی موت کی تحقیقات کے لیے اورنگ زیب تندہی سے تفتیش کرتا ہے شیخ حامد انسپکٹر لودھی کے ذریعے جو اس کا گماشتہ ہے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ سیٹھ عثمان لیاقت حسین کو اپنے یہاں ہی انیکسی میں رہائش دے دیتا ہے جبکہ فرحین بھی اپنے علاقے کا ایک چکر لگا کر آتی ہے اور وہاں کا احوال لیاقت حسین کو بتاتی ہے۔ دوران تفتیش انسپکٹر دانش سراج کو ایک اہم فائل کے متعلق بتاتا ہے، دوسری جانب شیخ حامد سخت مشتعل ہوکر انسپکٹر لودھی کی ملی بھگت سے بلیک ٹائیگر کے ذریعے تھانے پر حملہ کر کے انسپکٹر دانش کو قتل کرادیتا ہے اور تھانے کا تمام ریکارڈ جلادیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہوکر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ افضل خان اسپتال سے فارغ ہوکر بے یارومددگار مایوسی کے عالم میں خودکشی کے بارے میں سوچتا ہے کہ اسے شبنم اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شبنم کے فلیٹ میں قدم رکھنے کے بعد افضل خان کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے قسمت نے اسے نئی زندگی عطا کردی ہو، وہ خاموشی سے ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اسے کسی بلندی سے گرتے ہوئے شبنم نے اچانک پیچھے سے ہاتھ تھام کر زندگی کی سمت واپس گھسیٹ لیا ہو۔

اسپتال سے ڈسچارج کیے جانے کے بعد اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ وہ بگ باس کے ہاتھ کھینچ لینے کے بعد زندگی کی خوشیوں سے یکسر محروم ہوچکا ہے جبکہ وہ قسمت کے ہاتھوں بدنصیبی کا شکار ہوا تھا۔ بگ باس کے حکم کے عین مطابق وہ میڈم کو ٹریپ کرنے میں نہ صرف پوری طرح کامیاب ہوگیا تھا بلکہ انتہائی دوراندیشی سے پلاننگ کرنے کے بعد میڈم کو خواب آور شراب پلانے میں بھی سرخرو ہوگیا تھا۔

اسے صرف آدھے گھنٹے کی مہلت اور مل جاتی یا اس نے میڈم کے نشیلے جسم اور بہکتی آنکھوں کے خمار کی تعریف میں وقت ضائع کرنے کی غلطی نہ کی ہوتی تو نہ صرف وہ میڈم کے گدرائے جسم سے اپنی ہوس کی بھڑکتی آگ بجھانے میں کامیاب ہوجاتا بلکہ بلیک میلنگ کی اسکیم بھی پوری ہوجاتی، اس کے بعد شیخ حامد میڈم کو اپنے اشاروں پر نچانے میں پوری طرح کامیاب ہوجاتا۔ افضل خان کو اس شاندار کامیابی پر خاطر خواہ انعام بھی ملتا لیکن عین وقت پر سارا بنا بنایا کھیل چوپٹ ہوگیا تھا...... وہ پولیس کی آمد کی اطلاع پر فوری فرار نہ ہوتا تو رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔

اس کے بعد...... بگ باس نے اپنی پوزیشن بچانے کی خاطر جو پلاننگ کی تھی وہ افضل خان کے حق میں تباہی کا

www.Paksociety.com

باعث ہوئی۔ اسے اپنے آدمیوں کے ذریعے اغوا کرا کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے اپارٹمنٹ کو تباہ کردیا گیا۔ جس حالت میں اسے رہائی ملی اس سے تو بہتر تھا کہ مرگیا ہوتا...... لیکن وہ زندہ تھا، بے قصور ہونے کے باوجود بگ باس کے انتہائی عتاب کا شکار بن گیا۔ اسپتال سے اسے جس خوبصورت انداز میں نکالا گیا تھا اس کے بعد افضل خان کے پاس اپنے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ تھا، خودکشی!...... دردناک موت!...... لیکن عین وقت پر شبنم نے ہوا کے کسی خوشگوار جھونکے کی طرح سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

خود شبنم کا کردار بھی اس کے لیے غور طلب تھا۔ بگ باس کی دشمنی کے باوجود وہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی جرأت کرسکتی تھی؟ یہ بات اس کے سان وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ وہ انہی خیالات میں مستغرق تھا جب شبنم چینج کرنے کے بعد دوبارہ اس کے سامنے ہنستی مسکراتی آگئی۔ پھولدار ڈھیلے ڈھالے نائٹ سوٹ میں بھی وہ قیامت ہی نظر آرہی تھی۔ کبھی افضل خان نے بھی اس تیرنیم کش میں اپنا چلہ چڑھانے کی آرزو کی تھی لیکن اس وقت وہ اپنی محسنہ کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سوچ سکتا تھا۔

"کیا بات ہے؟" شبنم نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔ "تم اس قدر گم صم کیوں نظر آرہے ہو؟"

"شبنم......" افضل خان نے اسے بڑی سنجیدہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا تمہیں علم ہے کہ مجھے بگ باس کے حکم پر اسپتال سے نکالا گیا ہے؟"

"ہوسکتا ہے، ایسا ہی ہو لیکن......"

"میرا خیال ہے کہ تم نے نادانستگی میں ایک ایسا قدم اٹھالیا ہے جو تمہارے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ممکن ہے بگ باس نے تمہیں ناقابل معافی سمجھ کر نظریں پھیر لی ہوں لیکن مجھے تم سے دور رہنے کا کوئی اشارہ نہیں ملا۔"

"نہ سہی لیکن میں......" افضل خان اچانک نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے اٹھ گیا۔ "میں اپنی وجہ سے تمہیں کسی عتاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔"

"مگر اس وقت کہاں جاؤ گے؟"

"میں یقین سے صرف ایک بات کہہ رہا ہوں کہ اس وقت میری جیب میں کوئی معمولی زہر خریدنے کے لیے بھی ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے اس لیے...... صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میں......"

"تمہیں کتنے روپے درکار ہیں؟" شبنم نے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے سوال کیا۔ "تم روپوں کا کیا کروگے؟"

"اپنے منحوس وجود کو لے کر اس شہر سے کہیں اتنا دور چلا جاؤں گا کہ کوئی واقف کار نہ ہو۔"

"غلط گمان ہے تمہیں......" شبنم ایک لمحے کو سنجیدہ ہوگئی۔ "اس ملک میں رہ کر تم بگ باس کی دسترس سے دور نہیں جاسکوگے۔"

"پھر...... صرف ایک ہی بچاؤ کی صورت ہے کہ میں اپنے وجود کو ختم کردوں۔" افضل خان نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سپر ڈال دی۔

شبنم کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اس نے بڑی تیزی سے اسے نکال کر آن کرتے ہوئے کان سے لگالیا۔ ایک لمحے تک کچھ سنتی رہی۔ افضل خان کی نظریں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شبنم کے چہرے پر کچھ دیر پیشتر نظر آنے والے زندگی سے بھرپور رنگ پھیکے ہوتے جارہے تھے۔

"آئی ایم سوری باس۔ لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ...... مم...... میں معافی کی خواستگار ہوں۔ یس باس، میں سن رہی ہوں...... تھینک یو باس...... او۔کے۔ دس دن سے گیارہواں دن نہیں ہوگا...... آئی ایم تھینک فل باس۔"

موبائل بند کر کے شبنم نے اس انداز میں سکون کا سانس لیا جیسے پستول سے نکلی ہوئی کوئی گولی اس کے کان کے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی ہو۔

"کون تھا؟" افضل خان نے سہمے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"بگ باس...... اسے خبر مل گئی ہے کہ تم اس وقت میرے اپارٹمنٹ میں موجود ہو۔" شبنم نے دوبارہ اطمینان کا طویل سانس لے کر جواب دیا۔ "باس نے تمہیں دس روز کی رعایت دے دی ہے۔"

"اس کے بعد......؟"

"اس کے بعد میں تمہیں یہاں نہیں رکھ سکوں گی۔"

موت کے سرد ہاتھ ایک بار پھر افضل خان کو اپنا حلقہ تنگ کرتے محسوس ہوئے۔ وہ بگ باس کی خصلت سے واقف تھا، اس کی ڈکشنری میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اپنی خاطر وہ شبنم کو بھی کسی دشواری میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا، ایک لمحے توقف سے بولا۔

"میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن ہوسکتا ہے کہ دس روز کے اندر باس کسی وقت بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرلے۔ اس

لیے بہتر ہے کہ میں تمہیں دوست ہونے کی حیثیت سے کسی بھی مشکل میں نہ پڑنے دوں۔''

''ڈونٹ وری......'' شبنم نے پراعتماد انداز میں کہا۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔ فی الحال تم نہا دھو کر فریش ہولو۔ اتنی دیر میں، میں تمہارے لیے کچھ کھانے کا اہتمام کرلوں، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

افضل ہچکچا رہا تھا۔ اسے دس روز کی عارضی زندگی کی ضرورت نہیں تھی لیکن شبنم کے اصرار پر اس نے بات مان لی۔ گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد اس نے وہی لباس دوبارہ پہن لیا۔ ذہن نہانے کے سبب کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ شبنم نے اس کے لیے انڈے اور پراٹھے تیار کرلیے تھے۔ افضل خان خاموشی سے لقمے زہر مار کرتا رہا، اس کے ذہن میں دس دن کی مہلت رہ رہ کر وسوسے ڈال رہی تھی پھر اسے شبنم کی کہی ہوئی باتوں کا دھیان آیا تو اس نے چونک کر کہا۔

''تم نے کہا تھا کوئی شخص ہے جو بگ باس کے لیے دردِ سر بن رہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ بگ باس مجھے ایک آخری چانس سے قسمت آزمانے کا موقع فراہم کردے۔''

''ہاں...... میں نے غلط نہیں کہا تھا لیکن وہ محض ایک امکانی بات تھی۔'' شبنم نے گھما پھرا کر کہا۔ ''باس کی مرضی کے بغیر زبان کھولنا میرے لیے نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''لیکن اس وقت میرے اور تمہارے سوا اس کمرے میں......''

''میں تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ دوں گی۔'' وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''تم شاید بھول رہے کہ میڈم کے سلسلے میں تم کامیابی سے بہت قریب پہنچ چکے تھے لیکن...... اگر بگ باس کے کسی کارندے نے تمہیں فرار ہونے کا مشورہ نہ دیا ہوتا تو اس وقت تم کہاں ہوتے......؟''

''آئی۔ سی'' افضل خان کسمسا کر بولا۔ ''میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو شاید بگ باس نے تمہیں اب قابلِ اعتماد سمجھنا شروع کردیا ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''میڈم والی بات تمہارے علم میں کس طرح آئی؟'' شبنم نے غور سے افضل خان کو دیکھا پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ ''مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمہاری خود اعتمادی بحال ہورہی ہے۔''

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔''

''جب تک بگ باس کی سمت سے کوئی واضح اشارہ نہ ملے میں تمہیں کچھ بتانے کا رسک نہیں لے سکتی......

آئی۔ ایم۔ سوری۔''

افضل خان تلملا کر رہ گیا۔ اس وقت ایسی پوزیشن میں بھی نہیں تھا جب وہ سابقہ حیثیت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شبنم سے باز پرس کرسکتا...... شبنم بھی اپنی بات مکمل کرکے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

☠☠☠

''میں صابرہ خاتون بلا کسی جبر و کراہ اپنی زندگی کی یہ آخری تحریر رقم کررہی ہوں۔ اگر یہ تحریر قانون کی پاس داری کرنے والوں کے کسی کام آگئی تو میں یہ سمجھوں گی کہ میری موت رائگاں نہیں گئی۔ زندگی اس روئے زمین کی سب سے زیادہ قیمتی اور حسین نعمت ہے لیکن میں شاید اس دنیا کی سب سے بدنصیب عورت ہوں جو خود اپنے ہاتھوں اس نعمت سے محروم ہونے پر مجبور ہوگئی ہوں۔

پچیس سال قبل جب میں اٹھارہ سال کی تھی کہ مجھے گدڑی کا لعل کہا جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں ایک غریب ملازم کی بیٹی تھی جس نے بڑی منت اور مرادوں کے بعد شہر کی ایک نواحی بستی میں آنکھ کھولی تھی لیکن میری ماں مجھے پیدا کرنے کے بعد ہی اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ میرے غریب باپ نے مجھے کسی نہ کسی طرح پال پوس کر بڑا کیا تو مجھے خداوند کریم نے حسن کی دولت سے مالا مال کردیا۔ مجھے یاد ہے کہ میری ہم عمر سہیلیوں نے اس وقت مجھے صرف صبا کا نام دیا تھا، جب میں نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ میں مشرق سے چلنے والی صبح کی تازہ ہوا کے جھونکوں اور گل و سبزہ پر گرنے والے شبنم سے بھی زیادہ تروتازہ، شاداب، پاکیزہ اور حسین ہوں...... یہی حسن، خوبصورتی اور رنگ روپ میرے لیے زندگی کا عذاب بن گیا۔ میں ابھی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی کہ ایک دن میرے باپ نے مجھے دفتر سے واپس آکر گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''صبا بیٹی...... تو میرے لیے بڑی خوش نصیب ثابت ہورہی ہے۔''

باپ کو خوش دیکھ کر میں نے سوال کیا۔ ''کیا بات ہے ابا، آج آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں، روز دفتر سے لوٹتے تھے تو تھکے تھکے نظر آتے تھے۔''

''صبا بیٹی۔ آج سے میں نے نئے دفتر میں ملازمت اختیار کرلی ہے، تنخواہ بھی پہلی ملازمت سے دوگنی ہے۔''

باپ کی خوشیوں میں، میں بھی شریک ہوگئی۔ پھر جلد ہی دفتر والوں نے ابا کو ایک درمیانی درجے کے علاقے میں دو سو گز کا مکان لے کر دیا جس کی قسطیں تنخواہ سے کٹنے

لگیں۔ میں میٹرک کا نتیجہ آنے کے بعد کالج میں داخل ہوگئی۔ ہماری غربت کے دن بڑی تیزی سے گزرنے لگے، میں اس خواب کو اللہ رب العزت کا کرم اور احسان سمجھ رہی تھی لیکن بعد میں تعبیر سامنے آئی تو حقیقت کھلی کہ والد کی ترقی، تنخواہ میں ہر دو تین ماہ خاطر خواہ اضافہ اور خوشحالی بیشک اللہ کے حکم سے تھی لیکن اس طرح وہ شاید کسی غریب کے صبر اور کسی ابلیس کے قہر کی آزمائش...کررہا تھا جس کے نتیجے میں میری شادی شیخ حامد سے ہوگئی جو عمر میں مجھ سے کم از کم بیس سال بڑا تھا۔ یہ فرق اس کی دولت اور ابا کی غربت اور مجبوری کے سبب نظر انداز ہوگیا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ ابلیس صفت شیخ حامد انسان سے زیادہ کسی خبیث آدم خور درندے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

یہ شادی نہیں، ایک سودا تھا جو حالات کی ستم ظریفی کے تحت طے پا گیا تھا۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ شادی کے بعد چار سال تک میں اپنی قسمت پر رشک کرتی رہی پھر جب میرے شوہر کی شخصیت پر چڑھا ملمع اترا اور اس کی اصلیت سامنے آئی تو وقت گزر چکا تھا۔ شادی کے دو سال بعد ہی میرے والد ایک حادثاتی موت کا شکار ہوگئے تھے۔ میں اس وقت اسے ایک حادثہ ہی سمجھی تھی لیکن آج میں بڑے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس حادثے کی پشت پر بھی میرے شوہر کی خباثت کارفرما ہوگی۔

آج تقریباً چالیس سال کی عمر کے بعد میں اس خبیث کے چہرے سے وہ نقاب گھسیٹ کر علیحدہ کررہی ہوں جس کے پیچھے اس کی مکروہ اصلیت چار سال تک ڈھکی چھپی رہی۔ میرا شوہر دولت، شہرت اور خود کو سب سے بڑا کہلوانے کی خاطر اپنی تمام حدود کو پھلانگ جانے کا عادی ہے۔ وہ ایک آوارہ، بدقماش، عیاش اور کسی چالاک لومڑی کی خصلتوں کا مالک ہے، کسی فرعون وقت کی طرح۔

شادی کے پانچ سال بعد ہی وہ عیاشی کے لیے گھر میں آوارہ عورتوں کو لانے لگا، میں نے احتجاج کیا تو مجھے بھی اپنے اس غلیظ کھیل میں زبردستی شامل کیا جاتا یہاں تک کہ میری برداشت کی دھجیاں اڑنے لگیں، ایک ہی حمام میں تین ننگے ہوتے تھے، مجھے زبردستی ایک آرائشی ستون سے باندھ کر کھڑا کردیا جاتا، میرے جسم کو زبردستی بے لباس ہونا پڑتا، میری نظروں کے سامنے میرا شوہر آوارہ لڑکیوں کے ساتھ شراب اور شباب کے گھناؤنے کھیل میں بدمست ہوجاتا۔ بازاری عورتوں کے ساتھ مل کر میرے ڈھلتے جسم پر گندے اور غلیظ جملے چست کیے جاتے، حقارت آمیز تشبیہات سے نوازا جاتا۔ میں بے بس کھڑی آنسو بہاتی رہتی...... لیکن...... صبر کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔ شادی کے بعد میں نے اچھے اور برے حالات کے باوجود تین لڑکیوں کو جنم دیا لیکن میرے درندہ صفت شوہر نے تینوں کو ڈاکٹروں کی مٹھی گرم کرکے ایک ایک کرکے ختم کرا دیا۔ دولت کی ہوس کی خاطر اور اپنے سامنے دوسرے کاروباری حریفوں کو نیچا دکھانے کی خاطر میرے شوہر نے غنڈے اور بدمعاش پال رکھے تھے جو کسی کی پگڑی اچھالنے یا موت کے گھاٹ اتارنے میں ذرا دیر نہیں کرتے تھے۔ میں ان آخری سانسوں کے درمیان ان کی مختصر تفصیل درج کررہی ہوں جس کی تفتیش کرنے کے بعد پولیس اور قانون کے نمائندے (اگر بکے ہوئے نہ ہوں تو) بہ آسانی اس آدم خور انسان کو جس کا نام شیخ حامد ہے، پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر میری آخری تحریر کسی کام آسکی تو میں سمجھوں گی کہ خدا کی مرضی کے خلاف خودکشی کرنے کا یہ عمل رائگاں نہیں ہوا۔ ایک مجبور اور بے بس عورت، جس کے باپ کا کمزور سہارا بھی اس سے چھین لیا گیا تھا۔ آخر کس حد تک وہ ناساعد حالات، تذلیل اور بے شرمی برداشت کرسکتی تھی جس کی اجازت شریعت میں بھی کہیں نہیں ملتی۔

میں زہر کا گھونٹ حلق کے نیچے اتارتے وقت اپنے خدا سے یہی دعا کروں گی کہ یہ تحریر کسی ایسے خدا ترس انسان کے ہاتھ لگے جو شیخ حامد جیسے خون آشام درندے کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا کر اپنی عاقبت سنوارنے کا نیک کام سرانجام دے سکے...... بدنصیب صبا زوجہ شیخ حامد......''

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج اس خط اور اس میں درج تفصیل کو تیسری بار نہایت غور سے پڑھنے میں مصروف تھا جب الماس کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ سراج نے کھلے ہوئے کاغذ کو غیر ارادی طور پر تہ کرلیا تو الماس نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''یہ کس کا نامۂ محبت ہے جو اتنی توجہ اور انہماک سے پڑھا جارہا ہے؟''

عام حالات میں شاید سراج اس اہم تحریر کو الماس سے بھی خفیہ رکھنے کے اصول پر عمل کرتا لیکن اپنی گھریلو زندگی کو خوشگوار رکھنے کی خاطر اس نے ہاتھ میں دبا ہوا صبا بیگم کا آخری خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو...... تم بھی پڑھ لو...... شاید تم اس کو پڑھنے کے بعد میری کوئی رہنمائی کرسکو......''

الماس نے خط مکمل پڑھ لیا تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ اپنے اغوا اور لیاقت حسین کی بروقت

www.Paksociety.com

مداخلت کا تصور کر کے وہ بھی جھرجھری لیے بغیر نہ رہ سکی۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”میرا مشورہ ہے کہ سب سے پہلے آپ اس اہم ترین دستاویز کی دو تین فوٹو کاپی کرائیں پھر اسے اپنے یا میرے لاکر میں محفوظ کر دیں۔“

”مرنے والی نے ایک بڑے اور خطرناک مگرمچھ کے بارے میں جو تفصیل درج کی ہے اس کے تین چار کردار آج بھی زندہ ہیں جو قانون کا تحفظ ملنے کے بعد اگر اپنی زبان کھول دیں تو مرنے والی کی آخری خواہش بھی پوری ہو سکتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ قدرت نے آپ کو ایک اہم فرض سونپ دیا ہے جس کی تکمیل آپ کے لیے ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔“ الماس سنجیدگی سے بولی۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کی ایک نقل علیم احمد صاحب کو ضرور پہنچا دیں۔“

”تمہاری تجویز معقول ہے لیکن وہ تو ریٹائر ہو چکے ہیں۔“

”ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔“ الماس نے برجستہ جواب دیا۔ ”علیم احمد صاحب حافظ قرآن بھی ہیں جنھوں نے کبھی اس ڈرٹی ڈاگ سے سمجھوتا نہیں کیا جو اپنے تعلقات اور دولت کے زعم میں بے قابو ہو چکا ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی علیم احمد صاحب کو مرکز اور صوبے کے اکثر بڑے عہدیدار اب بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایک آسان طریقہ اور بھی ہے اس ابلیس کے تکبر کو خاک میں ملانے کا......“ آخری جملہ الماس نے بڑے جذباتی انداز میں ادا کیا۔

”وہ کیا......؟“

”مجھے صرف آپ کے اشارے اور اجازت کی ضرورت ہوگی......“ الماس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ”میں اس درندے کو اس کے دفتر میں گھس کر موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔ پھر جو ہو......سو ہو۔“

”ٹیک اٹ ایزی......“ سراج نے الماس کے تیور دیکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں تمہیں یہ نیک کام کرنے سے منع نہیں کر سکتا لیکن اس کے بعد ہماری بنی بنائی عزت اور شہرت کو جو نقصان پہنچے گا وہ میرے لیے بھی ناقابل برداشت ہوگا۔ تمہارے بعد میں بھی اپنی جان پر کھیل جانے سے گریز نہیں کروں گا۔“

کچھ دیر اسی قسم کی جذباتی باتیں ہوتی رہیں، پھر سراج نے الماس سے عہد کیا وہ مرحومہ صبا بیگم کی آخری خواہش کو پورا کرنے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔

”مجھے آپ پر اعتماد ہے لیکن نیک کام کی تکمیل میں......“

الماس اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی، سراج کے خاص موبائل کی مخصوص آواز ابھری تو اس نے جلدی سے اسے آن کیا۔ سنجیدگی سے کہا۔ ”ہیلو......سراج دس اینڈ۔“

”میں بول رہی ہوں......“ دوسری جانب سے میڈم کی آواز ابھری تو سراج نے الماس پر نظر ڈالتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”میں اس وقت آپ سے کھل کر بات نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے کہ میرا ویک پوائنٹ میرے سامنے موجود ہے۔“

”گڈ......“ میڈم نے جواب دیا۔ ”آج میں الماس سے بھی ضرور بات کروں گی لیکن اس سے پہلے آپ کو اہم اطلاع دینی ضروری ہے۔“

”وہ کیا......؟“

”بگ باسٹرڈ کے اشارے پر افضل خان کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس وقت افضل خان ایسی معاشی کسمپرسی کا شکار ہے کہ اس کے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا لیکن اب اسے شبنم اپنے اپارٹمنٹ میں لے گئی ہے۔ یقیناً اس میں بھی بگ باسٹرڈ کی کوئی خطرناک چال ہوگی ورنہ شبنم افضل خان کو پناہ دینے کی غلطی کبھی نہ کرتی۔“

”آپ کس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں؟“ سراج یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ الماس قریب کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”شطرنج کے کھیل میں گھوڑے کی چالیں وزیر سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ اکثر شاطر کھلاڑی گھوڑا بچانے کی خاطر وزیر کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اس وقت گھوڑا چاروں طرف سے مایوس ہو چکا ہے۔ اس کے پٹنے سے پیشتر بگ باسٹرڈ اسے اپنے کسی بھی دشمن کے خلاف بہ آسانی استعمال کر سکتا ہے۔“

”آئی سی......“ سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے پرخیال انداز میں کہا۔ ”میں آپ کی اس اطلاع کو فراموش نہیں کروں گا۔“

”ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ شبنم پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“

”مجھے آپ سے کچھ شکوے اور شکایتیں بھی لاحق ہو گئی ہیں۔“ میڈم نے سنجیدگی سے کہا۔

”کسی دشمن نے کان بھرے ہوں گے۔“ سراج نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”فی الحال آپ الماس کو موبائل دے دیں، باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔“

”جو حکم آپ کا......“ سراج نے سعادت مندی سے کہا پھر ہونٹوں کی جنبش سے میڈم روبی کا نام لینے کے بعد موبائل الماس کے حوالے کیا اور خود لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔ الماس کے مشورے پر وہ صبا بیگم کی اس آخری تحریر کو اپنے کمپیوٹر کے ٹاپ سیکریٹ فولڈر میں مخصوص پاس ورڈ کے ساتھ محفوظ کر دینا چاہتا تھا۔

الماس رسمی تعارف کے بعد میڈم روبی سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگی۔

☠☠☠

لودھی کو معمولی زخم آئے تھے لیکن پھر بھی اس نے اندرونی تکلیف کا بہانہ کر کے اسپتال میں ایک دو دن مزید قیام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، شیخ حامد کی وجہ سے اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے اسے بہ خوشی اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس قیام کا تعلق لودھی کی کسی تکلیف سے نہیں تھا۔ اصل وجہ نرس ڈورتھی کی وہ حسین پیشہ وارانہ مسکراہٹ تھی جو اکثر مریضوں کو پسند تھی، لودھی سے پیشتر کچھ متوسط طبقے کے پیٹ بھرے افراد بھی غلط فہمی کا شکار ہو چکے تھے لیکن انہیں بھی مایوسی ہوئی۔ ڈورتھی نرس ہونے کے باوجود اچھے، بلند کردار اور اخلاق کی مالک تھی۔ حسب معمول وہ اس روز بھی دوا دینے کی غرض سے لودھی کے قریب آئی تو اس کے ہونٹوں پر وہی دل آویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو مریضوں کو وقتی سکون دیتی تھی۔ ویسے بھی وہ حسین نقوش اور گداز جسم کی مالک تھی۔

”نرس......“ لودھی نے اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ڈورتھی......“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کل بھی میرا نام پوچھ چکے تھے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ لودھی نے شوخی سے جواب دیا۔ ”لیکن سبق کئی بار دہرایا جائے تو اچھی طرح یاد ہو جاتا ہے۔“

”اوہ......گویا آپ کو بعد میں بھول جانے کی عادت ہے؟“ ڈورتھی کے لہجے میں بڑا لطیف طنز تھا۔ ”اگر آپ کہیں تو لکھ کر دے دوں تاکہ آپ کو یاد رہے۔“

”لکھنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔“ لودھی نے اشنائی سے ایک قدم بڑھانے کی کوشش کی۔ ”جو بات یا صورت دل پر نقش ہو جائے وہ زیادہ دیرپا ثابت ہوتی ہے۔“

”آئی۔سی......“ ڈورتھی نے مسکرا کر اسے دوبارہ خجل کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ شاید ایکسپائری ڈیٹ پر دھیان دینے کے عادی ہیں؟“

”آپ کی باتیں بھی آپ کی طرح حسین اور دلکش ہیں۔“ لودھی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یو آر ریلی بیوٹی فل اینڈ چارمنگ!“

”پلیز مسٹر لودھی۔“ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی۔ ”دوا لیجیے۔ مجھے آپ کے علاوہ جنرل وارڈ میں دوسرے مریضوں کو بھی اٹینڈ کرنا ہے۔“

”میں یہاں سے جانے کے بعد بھی آپ کو یاد رکھوں گا۔“ لودھی نے رومانٹک لہجہ اختیار کیا۔

”دوا......اور علاج ضروری ہے۔“ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس اور گولیاں پھر لودھی کی طرف بڑھائیں، پہلے کے مقابلے میں وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”آپ شاید میری بات کا برا مان گئیں؟“

”پلیز مسٹر لودھی......“ وہ تلخ انداز میں بولی۔ ”میں اپنے فرائض اور آپ کے آفیشل عہدے سے بخوبی واقف ہوں لیکن انسان اپنی لمٹ کراس نہ کرے تو سب کے لیے مناسب ہوتا ہے۔“

پولیس کے محکمے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے کے علاوہ لودھی کو شیخ حامد کا منظور نظر ہونے کا گھمنڈ بھی تھا۔ پہلے بھی وہ کئی موقعوں پر اپنی مراعات کے سبب ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکال چکا تھا۔ نرسوں کے بارے میں اس کی ذاتی رائے بھی اس کے مزاج کے عین مطابق کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

اس نے یک لخت سنجیدگی اختیار کر لی، چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم ایک بات بھول رہی ہو مس ڈورتھی...... پولیس والوں سے عداوت بھی اکثر بڑی مہنگی ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے وسیع اختیارات بڑے بڑے طرم خانوں کو بھی......“

لودھی اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کی نظر دروازے کی جانب اٹھی تو وہ ایک دم سنبھل گیا۔ خلاف توقع ایس پی اورنگ زیب کی آمد نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ لودھی کی نظروں کے تعاقب میں ڈورتھی نے بھی پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا تو اس کے اندر اٹھتا ہوا طوفان اور بپھر گیا۔ اس نے خاموش انداز میں اپنی نفرت اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے دواؤں کی گولیاں ڈسٹ بن میں پھینکیں پھر...... جھلاتی ہوئی اورنگ زیب کے قریب سے گزر کر باہر چلی گئی۔

اورنگ زیب نے سچویشن کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ سنجیدگی سے قدم اٹھاتے ہوئے لودھی کے بستر کے

www.Paksociety.com

قریب آکر بڑے پروقار انداز میں ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔

''آپ نے کیوں تکلیف کی سر......؟'' لودھی نے لیٹے لیٹے ہی بڑے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ''میں ایک دو روز میں ڈسچارج ہو جاؤں گا۔''

''اس کا مشورہ ڈاکٹروں نے دیا ہے یا یہ آپ کا ذاتی فیصلہ ہے؟'' ایس پی نے چبھتے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

''ڈاکٹروں کا......'' لودھی نے دل ہی دل میں تلملا کر جبراً اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

''اس وقت آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''پہلے سے بہت بہتر ہوں سر...... کچھ اندرونی چوٹیں باقی رہ گئی ہیں۔''

''کیا میں اس وقت آپ سے اہم موضوع پر کچھ گفتگو کر سکتا ہوں؟......'' اورنگ زیب نے پہلو بدل کر سنجیدگی اختیار کر لی۔

''خیریت تو ہے سر......؟'' لودھی اس اچانک سوال پر گھبرا گیا۔

''فی الحال ابھی کسی کو آفیشلی انکوائری آفیسر مقرر نہیں کیا گیا لیکن...... بحیثیت علاقہ ایس پی، میں ذاتی طور پر تھانے پر ہونے والے تباہ کن حملے اور انسپکٹر دانش کی موت کے بارے میں کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

جواب میں لودھی کسمسا کر رہ گیا۔

''مسٹر لودھی...... کسی انسپکٹر کی آن ڈیوٹی موت اور جرائم پیشہ عناصر کا اس طرح دھڑلے سے کسی تھانے پر حملہ کرنا یقیناً ہمارے لیے باعث شرم ہے۔ کیا اس بات سے اتفاق کریں گے؟''

''جج...... جی ہاں سر۔''

''کیا آپ کسی ایسے شخص یا گروپ کا نام نہیں جانتے ہیں جو کھلے عام اتنی جرأت کا مظاہرہ کر گیا اور ابھی تک صرف مشتبہ افراد کے علاوہ کسی قابل ذکر مجرم کی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی۔'' اورنگ زیب کے لب و لہجے میں تلخی گھلنے لگی۔ ''علاقے کا ڈی ایس پی ہونے کی حیثیت میں آپ کے پاس ایسے افراد کی کوئی لسٹ ضرور ہوگی جو......''

''فی الحال میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا سر......'' لودھی نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''ویسے بہ ظاہر یہی تاثر ملتا ہے کہ اس واردات میں بدنام فوٹو گرافر فرنانڈس کے واقف کار شامل ہوں گے۔ ایسے موقعے پر شرپسند عناصر بھی لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ میں شریک ہو جاتے ہیں اس لیے......''

''ون منٹ......'' اورنگ زیب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یہی سب سے اہم بات ہے کہ جب فرنانڈس پولیس لاک اپ میں تھا تو وہ وہاں سے نکل کر باہر کس طرح گیا......؟''

''میں سمجھا نہیں سر......؟'' لودھی نے بڑی دیدہ دلیری سے جھوٹ بولا۔ ''میری معلومات کے مطابق تو حملہ آوروں نے اسے لاک اپ میں ہی جلا کر راکھ کر دیا تھا۔''

''ونڈر فل......'' اورنگ زیب نے تیور بدل کر لودھی کو گھورا۔ ''گویا آپ کے خیال کے مطابق وہ لوگ فرنانڈس کے دوست تھے اور تھانے کی تباہی کے وقت فرنانڈس کو پولیس تحویل سے نکال کر لے جانے کا اصل مقصد بھول گئے تھے؟''

لودھی بری طرح سٹپٹا گیا۔ کوئی جواب بن نہ پڑا تو سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں حادثے کی اطلاع ملتے ہی جائے وقوعہ پر گیا تھا لیکن زخمی ہونے کے سبب مجھے اسپتال پہنچا دیا گیا تھا اس لیے......''

''شاید آپ کو اس بات کا علم بھی نہ ہوگا کہ تھانے پر حملہ ہونے سے پیشتر مرحوم انسپکٹر دانش نے کسی مخبر کی اطلاع ملنے پر فرنانڈس کو کسی اور اسپاٹ سے گرفتار کیا تھا جہاں وہ کچھ بلیک میلنگ فوٹو گراف بنانے کے لیے جیل سے نکال کر لے جایا گیا تھا۔ فرنانڈس کی رنگے ہاتھوں گرفتاری کا آؤٹ ڈور مشیر نامہ اور قانونی دستاویز بھی تیار کیے گئے تھے؟''

''جی...... مم...... میں۔'' لودھی، اورنگ زیب کی معلومات سن کر ہکلانے لگا پھر بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ''سر...... کیا ایسی کوئی دستاویز ملی ہے جو......''

''سوری......'' اورنگ زیب نے تیزی سے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ''فی الحال میں آپ کی اس طفلانہ معصومیت کے اظہار پر خاموشی کو ہی ترجیح دوں گا۔''

''سر......'' لودھی نے اپنی وقتی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے پھر جوتوں سمیت ایس پی کی آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کی۔ ''اگر آپ کے پاس کوئی ایسی اطلاع ہے تو میں یہاں سے فارغ ہوتے ہی شرپسندوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں دیر نہیں کروں گا۔''

''گڈ......'' ایس پی نے زہر خند سے جواب دیا۔ ''لیکن ایسے سنگین معاملات کی بیخ کنی کے لیے ضروری نفری کے بجائے اگر سرغنہ پر جال ڈالا جائے تو امن و امان کی صورت زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔''

''آپ بجا فرما رہے ہیں سر لیکن سرغنہ......''

''میں نے آپ کے سلسلے میں پوری معلومات حاصل

کرنے کے بعد ہی فوری طور پر آپ سے ملنا ضروری سمجھا تھا۔'' ایس پی اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ میری اطلاع کے مطابق بہت نڈر، دور اندیش اور بولڈ آفیسر ہیں۔ کسی نے اس بات کی تائید بھی کی ہے کہ آپ کی معلومات کا ذخیرہ دوسرے ہم پلہ افسران سے کہیں زیادہ ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے لودھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے دبنگ لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے آئندہ تعاون کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ آپ کی پرسنل انفارمیشن کے لیے ایک اہم بات اور بتا دوں۔ میں اپنے فرض کی ادائیگی کے وقت سوائے اللہ کے کسی اور بات سے نہیں ڈرتا...... وش یو گڈ لک۔''

اورنگ زیب اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد تیزی سے پلٹا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے لب و لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے لودھی کو بگ باس کے حمایتی ہونے کے باوجود بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرنانڈس کے سلسلے میں ایس پی کی معلومات بھی اس کے لیے کچھ کم پریشان کن نہیں تھی۔ ''وہ معلومات ایس پی کو کہاں سے ملیں؟'' یہ سوال بڑی دیر تک لودھی کے ذہن میں کسی بگولے کے مانند گردش کرتا رہا۔

☠☠☠

شیخ حامد اس وقت اپنے خاص بیڈ روم میں ایک غیر ملکی اور بے باک، کمسن حسینہ کے گداز جسم سے گتھا کسی اور ہی دنیا کی حسین وادیوں میں ہچکولے کھا رہا تھا، جب اس کے موبائل کی مدھم موسیقی گنگنائی۔ شیخ حامد کو ایسا ہی لگا جیسے خوش ذائقہ نوالے کے بیچ کوئی کنکری آگئی ہو۔

''وہاٹ نان سنس۔'' حسینہ نے تلملا کر اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ ''ہواز ڈسٹربنگ؟''

''ڈونٹ وری سویٹ ہارٹ...... اٹس از بی ارجنٹ۔'' شیخ حامد نے پہلو بدل کر حسینہ کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں گھسیٹ لیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا لیا۔

''کون ہے؟'' اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

''سوری سر...... میں بلیک ٹائیگر بول رہا ہوں، آپ کو ایک اہم اطلاع دینی تھی ورنہ......''

''بکو...... کیا بات ہے؟''

پھر دوسری طرف سے اورنگ زیب اور ڈی ایس پی لودھی کے بارے میں جو تفصیل بیان کی گئی اسے سن کر شیخ حامد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''فکر مت کرو...... میں اس کو بھی جلدی ہی ڈسپوز کر دوں گا۔'' اس نے موبائل کو پاورڈ آف کرنے کے بعد حسینہ کو بڑی وحشت کے عالم میں جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

''کیا بات ہے ڈارلنگ؟...... یہ...... تم ایک دم اتنا وحشی کیوں ہو گیا......؟'' حسینہ نے احتجاج کیا۔

''شٹ اپ......'' اس نے غصے میں جواب دیا پھر اپنی ہوس کی تپش سرد کرنے کے بعد تیزی سے اٹھا اور دبیز قالین پر پڑا اپنا گاؤن پہنتے ہوئے خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

''سیلفش...... سن آف اے بچ۔'' غیر ملکی حسینہ جسے شیخ حامد نے شاید بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا تھا، تلملا کر اٹھی پھر...... بڑی دیر تک وہ کسی بپھری ہوئی زخمی شیرنی کی طرح شیخ حامد کی شان میں اپنی نفرت کے اظہار کے طور پر فحش اور مغلظ گالیاں بکتی رہی۔ وہ اپنی تہذیب کا عملی مظاہرہ کرنے میں حق بجانب بھی تھی۔

☠☠☠

لیاقت حسین لباس تبدیل کر کے ناشتے کی میز پر آیا تو فرحین پہلے سے اس کی منتظر تھی، خلاف توقع وہ اس وقت بہت خوش نظر آ رہی تھی، چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔ لیاقت حسین نے اسے بڑی توجہ سے دیکھا پھر دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا بات ہے جان لیاقت، آج تو صبح صبح کچھ بدلی بدلی نظر آ رہی ہے؟'' اس کا اشارہ ہلکے میک اپ کی طرف تھا۔

''آج صاحب کے جانے کے بعد میں اور بیگم صاحبہ شاپنگ پر جائیں گے۔'' فرحین نے اسے چھیڑنے کی خاطر پوچھا۔ ''سچ بتانا، کیسی لگ رہی ہوں؟''

''دو نمبر کی میم نظر آ رہی ہے۔''

''جل گیا ناں......'' فرحین روٹھ سی گئی۔

''مجھے تجھ کو منانے کا ہنر بھی آتا ہے لیکن......''

''لیکن کیا......'' فرحین اس کے نامکمل جملے پر تلملا کر رہ گئی۔ ''چپ کیوں ہو گیا؟ کہہ دے کے بندریا لگ رہی ہوں۔''

''وہ بھی دو نمبر کی۔'' لیاقت حسین نے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ''دیکھ فرحین...... خوبصورتی وہی بھلی لگتی ہے جو قدرت نے عطا کی ہو، تھوپا تھاپی کر کے اس میں ردوبدل کرنا مجھے تجھے زیب بھی نہیں دیتا۔''

''اور بیگم صاحبہ جو......''

''میں نے اپنی اور تمہاری بات کی تھی۔ بیگم صاحبہ کی بات اور ہے۔ ان کے لیے اس لیے جائز ہے کہ اول تو

www.Paksociety.com

صاحب کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ صاحب نے انہیں منع بھی نہیں کیا۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں شرکت کرنے کے علاوہ خود بیگم صاحبہ بھی میک اپ نہیں کرتیں اور اس چہرے میں زیادہ بھلی نظر آتی ہیں جو اوپر والے نے بنا دیا ہے۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں جانے کے لیے میک اپ ایک فضول فیشن بن گیا ہے۔''

''کیا تجھے میرا میک اپ ٹھیک اپ کرنا بھلا نہیں لگا؟'' فرحین نے سپاٹ لہجے میں شوہر سے سوال کیا۔

''ہاں......'' لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''اور تو مجھے بغیر سرخی پوڈر کے زیادہ خوبصورت اور تروتازہ لگتی ہے۔ گلابی گلابی سی، مہکتے پھول کی طرح......''

فرحین نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے ناشتا کرنے لگی۔ لیاقت حسین کو ڈیوٹی پر جانے کی دیر ہو رہی تھی اس لیے اس نے بھی جلدی جلدی ناشتا کیا پھر حسب دستور اس نے کمرے سے باہر جانے سے پہلے فرحین کے گداز ہونٹوں سے اپنے دن بھر کی پیاس کا کچھ حصہ ضرور حاصل کر لیا تھا۔ فرحین نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم میک اپ پر تبصرے والی بات اس کے دل کو اچھی نہیں لگی تھی۔

لیاقت حسین ٹھیک وقت پر سیٹھ عثمان کے پورٹیکو میں پہنچ کر ان کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ روزمرہ کے معمول کے مطابق سیٹھ عثمان ٹھیک نو بجے راحیلہ بیگم کے ساتھ باہر آئے۔ لیاقت حسین نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سیٹھ عثمان کے بیٹھنے کے بعد وہ تیزی سے اپنی سیٹ کی طرف جانے کو لپکا تو...... راحیلہ بیگم نے اسے آواز دے کر کہا۔

''لیاقت، آج میں اور فرحین شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔''

''شکریہ بیگم صاحب...... خدا اور آپ کی عنایت سے سب کچھ ہے ہمارے پاس۔''

گاڑی بنگلے سے نکل کر کھلی شاہراہ پر آئی تو سیٹھ عثمان نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''لیاقت حسین...... اس روز رات کو سراج تمہیں اپنے بنگلے پر کیوں لے گئے تھے...... کیا کوئی خاص کام درپیش تھا؟''

''مجھے صرف اتنا یاد ہے صاحب کہ ڈپٹی صاحب مجھے رات گئے گھر سے لے گئے تھے پھر مجھے اپنے گھر سے واپس آ کر چھوڑ گئے۔''

''کام کیا تھا؟''

''میں نیند میں تھا، مجھے یاد نہیں ہے کہ......''

''مجھے تمہاری بات کا سو فیصد یقین ہے۔'' سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے کئی احسانات ہمارے اوپر بھی ہیں اور اب سراج پر بھی تم نے جو احسان کیا ہے وہ بھی قابل فخر ہے۔''

''کیسا احسان صاحب......؟'' لیاقت حسین نے معصومیت سے کہا۔ ''مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ ڈپٹی صاحب نے آپ کو کیا بتایا ہے؟''

''اس رات الماس سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟''

''ڈپٹی صاحب کے بنگلے پر......'' لیاقت حسین الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں نے ان کے ڈرائنگ روم میں بیگم صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ بھی کچھ پریشان نظر آ رہی تھیں۔''

''میں ایک شرط پر تمہیں بتا رہا ہوں لیکن تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے، سراج یا فرحین سے بھی نہیں۔'' سیٹھ عثمان نے قدرے توقف سے بات جاری رکھی۔ ''اس رات تم نے الماس کو ایک بڑی مصیبت سے عین وقت پر بچا لیا تھا۔''

لیاقت حسین کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ یہی بات سراج نے بھی کہی تھی لیکن اس وقت بھی اس کے ذہن میں دھند ہی طاری رہی تھی۔ وہ ایسے کسی سانحے کے بارے میں قطعی واقف نہیں تھا۔ ''صاحب۔'' اس نے پوری ایمانداری سے سیٹھ عثمان کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے ایسی کوئی......''

''قسم مت کھاؤ۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے کہ تم غلط بیانی نہیں کر رہے۔''

''صاحب...... ایک درخواست کروں گا۔'' لیاقت حسین نے اداس انداز میں درخواست کی۔ ''آپ مجھے دماغی علاج کرنے والے کسی ماہر کو ضرور دکھا دیں۔ ہو سکتا ہے کہ شہر آنے کے بعد میری یادداشت......''

''اس وہم کو اپنے دماغ میں بھول کر بھی جگہ نہ دینا۔'' سیٹھ عثمان نے بڑے خلوص و محبت سے کہا۔ ''تم ذہنی طور پر مکمل صحت مند ہو لیکن...... ایک دو باتیں ہیں جو تم نے مجھے بھی کھل کر نہیں بتائیں۔''

''میں سمجھا نہیں صاحب؟'' سیٹھ عثمان کے جملے سے اس کے دل کو ٹھیس لگی۔ ''میں نے آپ سے کبھی کوئی بات......''

''مجھے معلوم ہے کہ تم نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی ہو گی۔'' سیٹھ عثمان نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ ''میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم ایک ذہین اور بے حد خوددار انسان ہو۔ شاید اسی لیے تم نے مجھے اپنے والد کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

لیاقت حسین لاجواب ہو گیا پھر اس سے پیشتر کہ وہ کوئی مناسب جواب دیتا ایک سگنل بند ہونے کے سبب اس نے گاڑی روک دی، اسی لمحے دو آدمی گاڑی کے قریب آئے اور دروازے کھول کر بڑی سرعت سے عقبی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

''کوئی حماقت کرنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ ہمارے خاموش پستول تم دونوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیں گے۔'' سرد لہجے میں کہا گیا، اس کے ساتھ ہی لیاقت حسین کی گردن پر کسی پستول کا دباؤ بھی ڈالا گیا۔ لیاقت حسین کو بڑی شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا، فرحین کے میک اپ اور سیٹھ عثمان کی باتوں میں الجھ کر وہ دروازوں کو لاک کرنا بھول گیا تھا۔ اب یاد آیا تو دیر ہو چکی تھی لیکن اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ آخری سانس تک کسی نہ کسی طرح وہ سیٹھ عثمان صاحب پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔

سگنل کھلا تو وہ گاڑی دوبارہ حرکت میں لانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا، فوری طور پر اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی۔ وہ اغوا برائے تاوان کی خاطر سیٹھ عثمان کو ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے۔

''تم لوگوں کو ہم سے کیا دشمنی ہے؟'' سیٹھ عثمان نے ہمت کر کے ان افراد سے پوچھا جو عقبی نشستوں پر براجمان تھے۔

''خاموش بیٹھے رہو......'' سرد اور سفاک لہجے میں جواب ملا۔ ''ہم جو کہیں اس پر عمل کرتے رہو، اسی میں تمہاری خیریت ہے۔''

''کتنی رقم درکار ہے؟''

''تم کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔'' دوسری آواز ابھری۔ ''ہم اٹھائی گیرے نہیں ہیں اور...... فی الحال تم سے ہمیں کوئی سروکار بھی نہیں ہے...... ہم صرف تمہارے اس جیالے ڈرائیور کی کھوپڑی کا چیک اپ کرانے کے لیے ساتھ لے جائیں گے۔''

''میں گلے گلے تیار ہوں۔'' لیاقت نے دلیری سے جواب دیا۔ ''تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گا لیکن صاحب پر......''

''گاڑی اگلے راؤنڈ اباؤٹ سے بائیں ہاتھ پر موڑ لینا......'' عقب سے اس کی بات کاٹ کر تحکمانہ لہجے میں کہا گیا۔

لیاقت حسین نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ اسے علم تھا کہ وہ راستہ ایک تفریحی مقام کی طرف جاتا تھا جہاں پیک آورز (Peak Hours) میں ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ حکم کی تعمیل کرتے وقت وہ پستول اس کے پاس موجود تھا جو سراج نے دیا تھا۔ سیٹھ عثمان ساتھ نہ ہوتے تو وہ جان پر کھیل کر بھی پانسا پلٹنے کی کوشش ضرور کرتا۔ راؤنڈ اباؤٹ سے بائیں ہاتھ گھومنے کے بعد کچھ آگے ایک سفید وین کھڑی تھی۔ لیاقت حسین کو اسی وین کے پیچھے گاڑی روکنے کا حکم ملا پھر ایک شخص اسے پستول سے کور کرتا ہوا وین کے اندر تک لے گیا۔ سیٹھ عثمان نے وین کے نمبر نوٹ کرنے کی کوشش کی جس پر غیر علاقے کا نمبر نظر آ رہا تھا۔ دوسرا شخص ان کے سر پر مسلط تھا، وہ درمیانے قد کا مالک تھا لیکن اس وقت اس کا چہرہ بڑی چابکدستی کے ساتھ کسی ماہرانہ انداز میں تیار کردہ اسکن کلر ماسک میں قریب سے صاف نظر آ رہا تھا۔ وین کی نمبر پلیٹ بھی یقیناً جعلی ہی ہو گی۔

''تمہیں میرے ڈرائیور سے کیا دشمنی ہے؟'' سیٹھ عثمان نے ایک اور کوشش کی۔

''ہمیں اس کا بھی علم نہیں ہے۔'' سرد لہجے میں جواب ملا۔ ''جو رقم تمہیں دی گئی ہے یا طے کی گئی ہے میں تمہیں اس کا دوگنا......''

''بکواس بند کرو۔'' حقارت سے کہا گیا۔ ''تم غلط اندازہ لگا رہے ہو۔ ہم بکاؤ مال نہیں ہیں۔''

اسی وقت وین کی طرف سے اشارہ ملا تو وہ سیٹھ عثمان کو قہر آلود نظروں سے گھور کر بولا۔ ''تم میرے جانے اور وین کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد تک ڈرائیونگ سیٹ پر جانے کی غلطی نہیں کرو گے۔ ہمارے دو ساتھی اور بھی ہیں جو تمہیں نظر نہیں آ رہے لیکن...... اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو پھر تمہاری زندگی کی بھی ضمانت نہیں دی جا سکتی، دیسی ساخت کا ایک معمولی بم بھی تمہیں اور تمہاری گاڑی کو تباہ کر دینے کے لیے بہت کافی ہو گا۔'' اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ بھی لمبے لمبے قدم اٹھاتا وین میں چلا گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی وین تیزی سے حرکت میں آئی اور اسپیڈ بڑھانے لگی۔

سیٹھ عثمان نے وین کے نظروں سے اوجھل ہو جانے تک اپنی سیٹ نہیں بدلی پھر...... انہوں نے سب سے پہلے سراج سے موبائل پر رابطہ قائم کیا۔

''خیریت......'' دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔ ''اس وقت کیسے یاد کیا؟''

''میں اس وقت مشکل میں ہوں۔'' سیٹھ عثمان نے مختصراً کہا۔ ''دو نامعلوم پیشہ ور بدمعاش لیاقت حسین کو گن پوائنٹ پر اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''تم اس وقت کہاں ہو......؟'' سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ سیٹھ عثمان جواب میں وہ لوکیشن بتانے

www.Paksociety.com

گئے جہاں وہ موجود تھے پھر...... اس وقت تک انہوں نے اپنی سیٹ تبدیل نہیں کی جب تک سراج نہیں آگیا۔ انہیں اپنی جان کو کوئی متوقع پیش آنے والے خطرے سے بھی کہیں زیادہ لیاقت حسین کی فکر تھی۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے......؟" سراج نے پوری تفصیل دریافت کرنے کے بعد سوال کیا۔

"لیاقت حسین ہم دونوں کے لیے کتنا اہم اور انمول ہے اس کا اندازہ تمہیں بھی ہوگا۔" سیٹھ عثمان نے جذباتی انداز میں کہا۔ "اس وقت میں ایسی اعصابی کیفیت سے دوچار ہوں کہ دفتر کے بجائے سیدھا گھر واپس جاؤں گا۔"

"ڈونٹ وری مائی ڈیئر......" سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ لیاقت حسین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ تم گھر جاؤ، میں فوری طور پر راستوں کی ناکا بندی کرانے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں۔"

سیٹھ عثمان نے سراج کو پرامید نظروں سے دیکھا پھر گاڑی میں بیٹھ کر گھر لوٹ گئے۔ فرحین اور راحیلہ بیگم گھر پر تھیں، دونوں بازار جانے کو تیار نظر آرہی تھیں۔ راحیلہ بیگم نے شوہر کو خلاف توقع اتنی جلدی واپس آتے دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکیں۔ سیٹھ عثمان کے چہرے پر موجود تاثرات بھی بتا رہے تھے کہ وہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ راحیلہ بیگم بے چین ہوکر ان کے قریب چلی گئیں۔

"کیا بات ہے؟ آپ اتنی جلدی کیسے واپس آگئے۔ خدانخواستہ آپ کی طبیعت تو خراب نہیں؟"

"اندر کمرے میں چلیے۔" سیٹھ عثمان نے فرحین کی وجہ سے مدھم لہجے میں کہا پھر کمرے میں پہنچ کر اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو راحیلہ بیگم بھی تڑپ اٹھیں۔ لیاقت حسین انہیں بھی بہت عزیز تھا۔ فرحین کا خیال بھی انہیں پریشان کررہا تھا۔ اسے شوہر کے اغوا ہونے کی خبر ملتی تو وہ بھی یقیناً مضطرب ہوجاتی۔

"آپ سراج بھائی کو دوبارہ فون کریں، میں فرحین کا خیال رکھتی ہوں۔"

"نہیں...... ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کیجیے گا۔" سیٹھ عثمان نے بیوی کو سمجھایا۔ "فی الحال جب تک سراج کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملے، فرحین کو اصل صورت حال کا علم نہ ہو تو بہتر ہے، آپ اسے یہی بتادیں کہ میں نے اسے کسی ضروری کام سے بھیجا ہے۔ میری طبیعت راستے میں بگڑ گئی تھی اس لیے واپس آگیا۔"

"خدا غارت کرے ان لوگوں کو جو ہمارے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑے ہیں۔" راحیلہ بیگم نے دل سے بددعا دی۔

"میں بھی یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ لوگ خاص طور پر لیاقت حسین کو کیوں لے گئے ہیں؟"

"اللہ اس غریب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کے لیے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا پھر فرحین کی طرف چلی گئیں۔

سیٹھ عثمان ایک صوفے پر نیم دراز ہوکر سراج کو موبائل پر ٹریس کرنے لگے جس کا نمبر مستقل انگیج مل رہا تھا۔

☠☠☠

سفید وین میں ڈرائیور اور ایک گن مین پہلے ہی سے موجود تھے۔ لیاقت حسین کو پوری طرح گھیرنے اور وین کے حرکت میں آجانے کے بعد اگلی نشست پر بیٹھے رائفل بردار نے جو ان کا سرغنہ لگتا تھا لیاقت کی طرف دیکھ کر نفرت اور حقارت سے کہا۔

"آج چوہا پھنس گیا جال میں...... میں نے تو سنا تھا کہ تو کوئی اونچی شے ہے۔"

لیاقت نے کوئی جواب نہیں دیا، ابھی تک اس کی تلاشی نہیں لی گئی تھی۔ سراج کا پستول اس کے پاس تھا۔ اسے ایسے کسی سنہری موقعے کی تلاش تھی جب وہ بساط کا رخ پلٹ سکتا۔

"اب تو یہ بالکل بھیگی بلی بنا بیٹھا ہے۔" دوسرے نے بھی مذاق اڑایا۔ "ہمیں بتایا گیا تھا بڑا پھنے خاں ہے، آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے، اونٹ خود کو سب سے زیادہ قدآور ہی سمجھتا ہے۔" تیسرے نے تنقید کی۔

"کوئی جواب نہ دینا لیاقت حسین۔" لیاقت حسین کو خود اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا، وہ سمجھ گیا کہ اس کا ہمزاد اس سے مخاطب تھا۔ "میں ان لوگوں کو تمہاری تلاشی سے باز ہی رکھوں گا۔"

"ان کی پشت پر کون لوگ ہیں؟"

"بھول جاؤ...... تم صرف اتنا یاد رکھو کہ کچھ دور جاکر ان کی وین کسی وجہ سے رک جائے گی اس کے دوبارہ حرکت میں آنے تک یہ سب تمہاری جانب سے بالکل غافل ہوں گے۔ تمہیں خاموشی سے گاڑی سے اتر جانا ہے، اس کے بعد میں مادی شکل میں تمہاری جگہ لے لوں گا۔"

"لیکن......" لیاقت حسین نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی بات درمیان سے اچک لی گئی۔

"تم یہاں سے سیدھے گھر جاؤ گے، میرے تمہارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں، وہ تمہیں یاد نہیں رہیں گی۔ تم سے

سوال کیا جائے تو بس ایک ہی بات پر ڈٹے رہنا۔ سیٹھ عثمان نے تمہیں کسی کام سے بھیجا تھا جو نہیں ہوسکا۔ خود وہ طبیعت خراب ہونے کے سبب واپس لوٹ گیا تھا۔ میری بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔"

"کیا تم بھی مجھے ان دشمنوں کا نام نہیں بتا سکتے جو......"

"میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔" پھر بات دہرا کر جواب ملا۔ "لیکن جتنی اجازت ہے اس حد کو پھلانگنے کی کوشش کی تو جل کر خاکستر ہوجاؤں گا۔ ہم سب کسی ایسی لازوال قوت کے تابع ہیں جسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔"

لیاقت حسین نے پھر کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

"کیا بات ہے تیس مار خان۔" اگلی نشست والے نے پھر اسے تاؤ دلانے کی کوشش کی۔ "ہم نے تو تمہارے بڑے بڑے کارنامے سن رکھے تھے۔ اس وقت نانی کیوں مرگئی؟"

لیاقت حسین تلملا کر رہ گیا۔ تینوں دشمن اس کی بے بسی کا مذاق اڑاتے رہے، اسلحے کے زور پر...... اگر وہ نہتے ہوتے تو شاید لیاقت حسین ان سے دو دو ہاتھ کر گزرنے میں کسی بزدلی کا مظاہرہ بھی نہ کرتا۔ وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑاتا رہا۔ پھر وین جو برق رفتاری کا مظاہرہ کررہی تھی، ایک ویران جگہ پہنچ کر روک دی گئی۔

"کیا بات ہے؟" اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے سرغنہ نے ڈرائیور کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے شبہ ہے کہ پچھلے پہیے کی ہوا کم ہوگئی ہے۔ ایک منٹ میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

ڈرائیور نیچے اتر گیا۔ ہمزاد کی آواز بہت قریب سے سنائی دی۔ "تم اب نیچے اتر جاؤ لیاقت حسین، میں نے ان تینوں کو بے حس کردیا ہے۔ وقت کم ہے، جلدی کرو۔"

لیاقت حسین نے بہ مشکل جگہ بنا کر دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا، اسے بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص سے ٹکرا کر نیچے اترنا پڑا تھا لیکن وہ بے خبر بیٹھا رہا...... ایسا ہی لگا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو، لیاقت حسین کے باہر نکلنے کے دس سیکنڈ بعد وین دوبارہ حرکت میں آگئی۔ لیاقت حسین واپسی کے راستے پر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ تقریباً چالیس منٹ تک وہ پیدل چلتا رہا۔ اسے کوئی ٹیکسی یا رکشا نظر نہیں آیا۔ ایک دو پرائیویٹ گاڑیوں کو ہاتھ اٹھا کر لفٹ مانگنے کی کوشش کی لیکن وہ گاڑی سے رکے بغیر گزر گئیں۔ پندرہ منٹ بعد اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو سیٹھ عثمان کا پتا بتا کر تھکے تھکے انداز میں سیٹ سے ٹیک لگالی۔ اس کو اپنا ذہن بالکل خالی خالی لگ رہا تھا۔ چہرے کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ وہ کسی خاص بات پر غور کررہا تھا۔

☠☠☠

فون کی گھنٹی بجتے ہی شیخ حامد نے اس طرح لپک کر ریسیور اٹھالیا جیسے اسے کسی متوقع کال کا شدت سے انتظار ہو۔

"بلیک ٹائیگر بول رہا ہوں۔" دوسری جانب سے ضروری کوڈ اور پاس ورڈ بتانے کے بعد کہا گیا۔ "جن افراد کو ضروری کام سونپا گیا تھا وہ ہماری مطلوبہ شے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ اسے مطلوبہ مقام پر پہنچا کر دوبارہ اطلاع کریں گے۔"

"سیٹھ عثمان کو تو نہیں چھیڑا گیا......؟" شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔

"نو سر...... آپ نے جو ہدایتیں دی تھیں، کام اس کے عین مطابق ہوا ہے۔"

"اپنے آدمیوں کو دوبارہ تاکید کردو کہ جو مال حاصل ہوا ہے اس میں زیادہ ٹوٹ پھوٹ نہیں ہونی چاہیے لیکن اس کی اتنی مرمت ضروری ہے کہ پانچویں بار کسی کام کا نہ رہ سکے...... میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو؟"

"یس باس...... سمجھ گیا، اور کوئی حکم......؟"

"میں نے آج وہ ٹینڈر حاصل کرلیا ہے جس کی خاطر سیٹھ عثمان کے راستے سے بھیگی بلی کی طرح ہٹ جانے کے بعد اب رستم علی آغا خانی مقابلے پر آنے کی غلطی کررہا ہے۔"

"اجازت ہو تو کسی جماعت خانے میں اس کے لیے بھی دفنانے کا بندوبست شروع کردوں؟

"جلد بازی نہیں لیکن...... محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق وہ بھی کچھ ایسے جرائم پیشہ بدمعاشوں کی پشت پناہی کررہا ہے جو قانون کو سنگین جرائم میں مطلوب ہیں۔ میں پہل کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ایک بات عرض کرنا چاہوں گا۔"

"کہو......"

"دشمن کو سر اٹھانے سے پیشتر ہی کچل دیا جائے تو اندیشے باقی نہیں رہتے۔"

"نہیں......" اس کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا۔ "جتنا کہا جائے صرف اتنا کرو...... میں نے نمبر ٹو کو بھی ضروری ہدایت کردی ہیں، فی الحال زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

شیخ حامد نے ریسیور رکھ کر شبنم کی طرف دیکھا جو اس

www.Paksociety.com

وقت اس نے ساؤنڈ پروف کمرے میں موجود تھی۔ میک اپ میں اس کا حسن پہلے کے مقابلے میں زیادہ نکھرا نکھرا الگ رہا تھا۔

''گڈ......'' شیخ حامد نے اسے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔ ''اب تم نے جینے کا جو نیا انداز اختیار کیا ہے وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ سود مند، چارمنگ اور گڈ لکنگ ہے۔ دوبارہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کبھی نہ کرنا، یہ میرا ذاتی مشورہ ہے۔''

''میں آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کروں گی۔'' وہ سعادت مندی سے بولی۔

''فائن......'' اس نے شبنم کو بہ دستور للچاتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ ''جانتی ہو میں نے تمہیں افضل خان کے بارے میں کیوں رعایت دی تھی؟''

''ہے کوئی شخص جو بہت زیادہ سر ابھارنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' شبنم نے دبی زبان میں بگ باس کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔ ''ایسے موقع پر افضل خان کے پاس کوئی دوسری چوائس بھی نہیں ہوگی۔ تخت یا تختہ والی صورت حال ہے۔''

''ونڈرفل......'' خطرناک مگر مچھ نے شبنم کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔ ''تم اب سمجھ دار ہوتی جا رہی ہو۔ اسے اس طرح اکسانا کہ وہ اس بات کا اندازہ نہ کر سکے کہ پشت پر میری مرضی بھی شامل ہے۔''

''ڈونٹ وری سر...... میں ایسا ہی کروں گی۔''

''وش یو آل دی بیسٹ...... میں باقی باتیں تمہیں موبائل پر سمجھا دوں گا۔'' شبنم بگ باس کا اشارہ پا کر اٹھی اور تیزی سے باہر چلی گئی تو شیخ حامد اپنے مخصوص موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر بے حد خشک اور سنجیدہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''اپنے کچھ کارندے رستم علی کی نقل و حرکت پر تعینات کر دو لیکن...... میری طرف سے اشارہ ملے بغیر کوئی حماقت نہ کرنا۔''

''رائٹ سر......'' دوسری جانب سے مختصراً کہا گیا۔

''مجھے ہر دو گھنٹے بعد حالات اور مطلوبہ شخص کی ذاتی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہنا...... دیٹ از آل۔'' بات مکمل کر کے شیخ حامد علی نے موبائل آف کر دیا۔ اس کی نگاہوں میں اس زخم خوردہ ناگ کی چمک ابھر آئی جس کی ناگن اسے بیچ منجدھار میں دغا دے کر ساتھ چھوڑ گئی ہو۔

☠☠☠

سیٹھ عثمان کے علاوہ راحیلہ بیگم بھی لیاقت حسین کی طرف سے بے حد فکر مند تھیں، سراج کا فون دوبار آ چکا تھا لیکن اس طرف سے بھی کوئی خاص خبر نہیں مل سکی۔ سفید وین کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ متعلقہ محکمے کے ذمے داروں نے بھی اس نمبر کو جعلی قرار دے دیا جو وین پر دیکھا گیا تھا۔ راحیلہ بیگم نے فرحین کو شوہر کی طبیعت کا بہانہ کر کے ٹال دیا تھا اس کے بعد سے وہ شوہر ہی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی لیاقت حسین کی زندگی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ دونوں کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

''آپ کا شبہ کن لوگوں پر ہے؟'' راحیلہ بیگم نے خود کو بہلانے کی خاطر پوچھا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......'' سیٹھ عثمان کسمسا کر بولے۔ ''اگر انہوں نے اغوا کا کامیاب پروگرام بنا ہی لیا تھا تو پھر مجھے صحیح و سلامت کیوں چھوڑ گئے؟''

''خدا کے لیے ایسی بات منہ سے نہ نکالیے۔'' راحیلہ بیگم نے شوہر کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری عقل بھی کام نہیں کر رہی کہ ان کی لیاقت حسین سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''ہو سکتا ہے کہ یہ پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہو جس کا ذکر لیاقت حسین نے ہم سے کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔''

''ایسی کوئی بات ہوتی تو کم از کم فرحین مجھے ضرور بتا دیتی۔''

''پھر آپ کیا نتیجہ اخذ کر رہی ہیں؟''

''آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ لیاقت حسین کی گاڑی کو ٹکر کیوں ماری گئی تھی؟ دشمنوں کا مقصد ہم سب کو ایک ساتھ ختم کرنے کا تھا۔ شاید انہیں ہمارے راستے میں سپر اسٹور پر اتر جانے کی اطلاع بروقت نہ ملی ہو۔''

''میرے ذہن میں بھی سب سے پہلے شیخ حامد ہی کا نام ابھرا تھا لیکن اگر بات وہی ہے جو آپ سوچ رہی ہیں تو پھر اس بار مجھے کیوں نظر انداز کر دیا گیا؟''

''اس لیے کہ آپ نے اب اس کے مقابلے پر آنا کم کر دیا ہے۔'' راحیلہ بیگم نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن دودھ کے جلے کو چھاچھ بھی پھونک کر پینے سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہو سکتا ہے آپ کا اندازہ درست ہو۔ فی الحال یہ دعا کریں کہ لیاقت حسین خیر و عافیت سے گھر آ جائے ورنہ ہم فرحین کو کیا منہ دکھائیں گے۔''

''میرا دل کہتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ حدیث میں بھی یہی لکھا ہے کہ جو شخص دنیا میں کسی کی پریشانی میں کام آئے یا کسی مومن کی دنیا میں تکلیف رفع کرے گا تو خداوند قدوس

... کے روز اس کی تکلیفوں کو رفع فرمائے گا۔ لیاقت ... عبادت گزار ہے اور سب کے کام آتا ہے۔ اس مشکل ... میں میرا دل کہتا ہے کہ خدا بھی غیب سے اس کی مدد ... مائے گا۔''

سیٹھ عثمان کچھ جواب دینا چاہتے تھے کہ ایک ملازمہ ... آ کر اطلاع دی کہ لیاقت حسین دروازے پر موجود ہے ... صاحب سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

سیٹھ عثمان کے علاوہ راحیلہ بیگم بھی اس طرح چونکیں ... کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ لیاقت حسین کے بارے گھر میں کسی ... اس بات کا علم نہیں تھا کہ اسے دو ڈھائی گھنٹے پہلے اغوا کر لیا گیا تھا۔ سیٹھ عثمان نے بیوی کی طرف حیرت سے دیکھا جو خود بھی حیران و پریشان نظر آ رہی تھیں پھر... وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے پر آئے تو انہیں لیاقت حسین کو پرسکون حالت میں سامنے کھڑا دیکھ کر اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔

''تم......!'' وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ انہیں بہ دستور اپنی قوت بینائی پر شبہ ہو رہا تھا۔

''صاحب......'' لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''آپ نے مجھے جس کام سے بھیجا تھا وہ نہیں ہو سکا۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

سیٹھ عثمان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لیاقت حسین نے حرف بہ حرف وہی جملہ کہا تھا جو انہوں نے فرحین کو تسلی دینے کی خاطر راحیلہ بیگم سے کہا تھا۔ پھر وہ جملہ لیاقت حسین کی زبان سے کیسے ادا ہوا؟ کیا وہ محض اتفاق تھا؟

''آپ آرام کریں صاحب۔'' لیاقت حسین نے انہیں گم صم دیکھ کر کہا۔ ''میں ادھر ہوں، کوئی کام ہو تو یاد کر لیجیے گا۔''

سیٹھ عثمان نے اس وقت بھی کوئی سوال جواب مناسب نہیں سمجھا۔ صرف اتنا کہا۔ ''تم گھر جا کر کپڑے تبدیل کر لو۔ آج میں گھر پر آرام کروں گا۔''

لیاقت حسین کے جانے کے بعد انہوں نے بیوی سے ... کیا تو وہ بھی ششدر رہ گئیں، کچھ توقف سے بولیں۔ ''سراج بھائی کا اندازہ غلط نہیں ہے کہ کوئی غیبی قوت لیاقت حسین کی مدد کر رہی ہے۔''

''ہو سکتا ہے لیکن...... حیرت اس بات کی ہے کہ انہوں نے لیاقت حسین کو خاموشی سے چھوڑ دینے کا رسک کیوں لیا؟''

''مجھے بھی تعجب ہے...... بہرحال آپ سراج بھائی کو فون کر کے بتا دیں کہ لیاقت حسین، صحیح سلامت واپس آ گیا ... وہ اسی کی خاطر بھاگ دوڑ میں لگے ہوں گے۔''

سیٹھ عثمان نے بیوی کے مشورے پر سراج کو آگاہ کیا تو ایک لمحے کو اس کی طرف سے بھی خاموش رہی پھر اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ''تم نے اس سے اغوا کرنے والوں کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ تو نہیں کی؟''

''نہیں لیکن...... مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ میں نے راحیلہ کو فرحین کی دلجوئی کی خاطر اسے جو بات سمجھائی تھی وہی جملہ جواب کی صورت میں لیاقت حسین کی زبان سے کس طرح ادا ہوا؟''

''پریشان مت ہو...... میں کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں، رات کو آؤں گا تو تمہیں بھی سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

''کیا تمہیں اس بات پر تعجب نہیں ہو رہا کہ جو شرپسند اسے زبردستی لے گئے تھے انہوں نے اسے چھوڑ دینے کا رسک کیوں لیا؟''

''ابھی مت الجھو......'' سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ''رات کو تفصیل سے بات ہوگی۔''

سیٹھ عثمان نے موبائل آف کر دیا لیکن ان کے ذہن میں مختلف پریشان کن خیالات بڑی تیزی سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ راحیلہ بیگم کے دماغ میں بھی وسوسے سر اٹھانے لگے تھے۔

☠☠☠

اس وقت رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ شیخ حامد شراب و شباب سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا جب اچانک وہ کچھ خلاف معمول آواز اور شور و غل سن کر اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ کمرے کی لائٹس آن کرنے کے بعد اس نے کال بیل بجائی، نائٹ ڈیوٹی ملازم دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، وہ بھی بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

''یہ شور و غل کیسا ہے؟'' اس نے ملازم سے جھلا کر سوال کیا۔

''سر ہم پر حملہ ہو گیا ہے۔'' ملازم گھبرایا ہوا تھا۔

شیخ حامد کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے بنگلے کے دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا، تیز تیز قدم اٹھاتا عقبی کھڑکی کی طرف بڑھا، دبیز پردے کو ذرا سا ہٹا کر اس نے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی جو بال بال بچ گیا۔ کھڑکی میں روشنی کی جھری نظر آتے ہی باہر سے دو شعلے فضا میں برق رفتاری سے لپکے۔ کھڑکی کا شیشہ چور چور ہو کر فرش پر بکھر گیا۔ شیخ حامد اچھل کر دیوار سے چپک گیا پھر اس نے جیب سے اپنا موبائل نکال کر بلیک ٹائیگر کے نمبر

www.Paksociety.com

ڈائل ہوتے ہی کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی۔

"تم اس وقت کہاں مرے ہوئے ہو؟" وہ کسی شیر کی طرح دہاڑنے لگا۔ "میرے بنگلے کو دونوں طرف سے گھیر کر فائرنگ ہو رہی ہے۔"

"میں بنگلے سے زیادہ دور نہیں ہوں سر......"

"یہ سور کے بچے کون ہیں جنہوں نے اپنی موت کو دعوت دی ہے؟"

"ابھی اس کا علم نہیں ہوا۔ ہمارے گارڈز انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" بلیک ٹائیگر نے جواب دیا۔ "حملہ آور تین مختلف گاڑیوں میں وقفے وقفے سے آئے تھے اس لیے ہمارے آدمیوں کو کچھ دشواری ہو رہی ہے۔"

"بکومت......" شیخ حامد گرجا۔ "میں ان حرامیوں کو کیا مفت میں پال رہا ہوں جو ان کی غفلت سے ایک سنسناتی ہوئی گولی نے میری خواب گاہ کا شیشہ بھی چکنا چور کر دیا۔ میں اگر فائرنگ کی زد میں آجاتا تو......"

"مجھے افسوس ہے سر لیکن...... حملہ اس قدر منظم طریقے سے......"

"نان سنس۔" اس کے منہ سے پھر گالیوں کا طوفان ابلنے لگا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ دشمنوں کو حملہ کرنے سے پیشتر تمہیں اور تمہارے حرام خور محافظ دستے کے افراد سے باقاعدہ انوی ٹیشن کارڈ لے کر آنا چاہیے تھا؟"

"سوری سر، میں خود آگے جا کر دیکھتا ہوں۔"

"ربش...... ابھی تک کس بات کا انتظار کر رہے تھے......؟" شیخ حامد نے جھلا کر فون آف کر دیا پھر کچھ سوچ کر اس نے فون اٹھایا اور ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ہیلو...... اورنگ زیب بول رہا ہوں۔"

"تم اس وقت غالباً غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے ہو۔" شیخ حامد نے نفرت کا اظہار کیا۔

"کون بکواس کر رہا ہے؟" جواب بھی اسی لب ولہجے میں دیا گیا۔

"میں شیخ حامد بول رہا ہوں۔" اس نے بڑے تکبر سے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"اس وقت کیا تکلیف لاحق ہوگئی......؟" دوسری جانب سے بے پروائی سے سوال کیا گیا۔

"تم علاقے کے ایس پی ہو اور ابھی......"

"پلیز شیخ حامد...... تمیز سے بات کریں، میں آپ کا ماتحت نہیں ہوں۔" اس بار اورنگ زیب کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

"میرے گھر پر کچھ شرپسندوں نے حملہ کر دیا ہے آپ کے کارندے اس وقت کہاں ہیں؟ کیا حسب دستور مجرموں کے فرار ہونے کے بعد اپنی شکلیں دکھانے کی خاطر آئیں گے؟"

"میں نیا آیا ہوں مسٹر حامد......" اورنگ زیب نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے میں طنز بھی شامل تھا۔ "آپ کے شہر کا یہ پرانا دستور ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں بھی مرکز کے کسی وزیر سے بات کرنی چاہیے تاکہ پرانے دستور بدلے جا سکیں اور پولیس اور عوام دونوں اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی حماقت نہ کریں۔"

"میں نے آپ کو لیکچر سننے کی خاطر فون نہیں کیا۔" شیخ حامد بری طرح تلملا گیا لیکن اس بار اس نے "تم" کا صیغہ نہیں استعمال کیا تھا۔

"لیکچر نہیں...... میں اصول کی بات کر رہا ہوں شیخ صاحب، ویسے آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کے تھانے کی پولیس پارٹی موقع واردات پر موجود ہے۔ میں خود بھی نکل رہا تھا کہ آپ کا فون آگیا۔ آپ کے اکثر پڑوسیوں کے فون بھی آرہے ہیں۔"

"میں آپ کا منتظر رہوں گا۔" شیخ حامد نے مصلحتاً جواب دیا۔ وہ دریا میں رہ کر مچھلیوں سے بیر بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

"سوری، میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ سچویشن کو فوری کنٹرول کرنا میرے لیے زیادہ اہم ہوگا۔ رہا ملاقات کا سوال تو ابھی میرے تبادلے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایک ہی شہر میں ہیں تو ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں گی۔" دوسری جانب سے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

"باسٹرڈ......" شیخ حامد بری طرح تلملا کر رہ گیا۔ تبادلے کے حوالے سے ایس پی نے جو ڈھکا چھپا طنز اور ملاقاتوں کا ذکر کیا تھا وہ بگ باس کے منہ پر بھرپور طمانچے سے زیادہ کاری ثابت ہوا۔ "ڈونٹ وری ایس پی...... میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔"

باہر سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں کچھ کمی ضرور آگئی تھی لیکن فائرنگ تھوڑے تھوڑے وقفے سے جاری تھی، خطرناک مگرمچھ کسی بھوکے درندے کے مانند ٹہل رہا تھا۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر مخالفین کے کئی چہرے بار بار ابھر رہے تھے پھر یک لخت اسے رستم علی آغا خانی کا خیال آیا۔ ٹینڈر میں ناکامی کے بعد اس نے جس انداز میں شیخ حامد سے ہاتھ ملا کر مبارکباد دی تھی اس میں کھلا چیلنج بھی موجود تھا۔ وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا جب ملازم نے آ کر ملحقہ تھانے کے انسپکٹر کی آمد کی اطلاع دی۔

''بلا لاؤ......'' اس نے جھلا کر کہا۔

''سر......'' انسپکٹر کے دو منٹ بعد کمرے میں داخل ہو کر اسے باقاعدہ سیلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم حالات پر قابو پا چکے ہیں۔''

''حملہ کرنے والے کون تھے؟'' بڑی رعونت سے سوال کیا گیا۔

''جو دو لاشیں ملی ہیں وہ پولیس کو متعدد جرائم میں پہلے سے مطلوب تھے۔''

''کس پارٹی کے ہو سکتے ہیں؟''

''مفرور مجرم تھے سر...... ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان کی پشت پر کس کا ہاتھ ہوگا۔''

''ہمارے گارڈز کی کیا اطلاع ہے......؟''

''تین مارے گئے دو معمولی زخمی ہیں۔ انہیں میں نے اسپتال بھجوا دیا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا پھر عقبی کھڑکی کے شیشوں کو بکھرا دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ ''یہ کیسے ہوا سر...... کیا انہوں نے......''

''ڈونٹ بی سلی۔'' شیخ حامد نے جھلا کر کہا۔ ''حملہ آور یہاں دشمنی کی غرض سے آئے تھے۔ دوستی کا پیغام دینے نہیں۔''

''سوری سر......''

''تمہارا ایس پی کہاں ہے......؟''

''وہ قرب و جوار کے لوگوں کا بیان لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سارے کاغذات ان ہی کی نگرانی میں تیار ہوئے ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''آپ کی رہائش گاہ پر آپ کے گارڈز کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے پولیس کے سادہ لباس والوں کو تعینات کرنے کا حکم بھی......''

''اپنے ایس پی کو منع کر دینا۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔'' شیخ حامد نے ایس پی سے تلخ باتوں کی جھلاہٹ انسپکٹر پر اتارنے کی کوشش کی۔ ''دشمن کے کارندے پولیس کے کسی آدمی کو بھی منہ مانگے داموں خرید سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پولیس فورس میں بھی بے شمار کالی بھیڑیں موجود ہیں جن کو ان کے عہدے کے اعتبار سے خریدا جاتا ہے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے سر......؟'' انسپکٹر نے کسمسا کر دریافت کیا۔

''گیٹ لاسٹ...... تم جانو اور تمہارا ایس پی۔''

انسپکٹر سیلیوٹ کر کے الٹے قدموں چلا گیا تو شیخ حامد نے موبائل پر کسی مخصوص نمبر ''ٹو'' سے رابطہ قائم کیا، لائن ملنے کے بعد اس نے سخت لہجے سوال کیا۔ ''تمہیں جس شخص کی نگرانی پر لگایا گیا تھا اس کی رپورٹ کیا ہے......؟''

''میں اور میرے خاص آدمی مستقل اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ ابھی تک کہیں باہر نہیں نکلا۔ عام طور سے اس کا یہی معمول ہے، یہ بات ہم نے اس کے ایک آدمی سے معلوم کی تھی...... پارٹیوں میں سے بھی صرف کسی خاص میں جاتا ہے۔''

''ٹیلی فون ایکس چینج میں کوئی واقف کار ہے؟''

''میں سمجھ گیا سر......'' دوسری جانب سے فوری جواب ملا۔ ''میں آدھے گھنٹے کے اندر اندر آپ کو ایسے تمام نمبروں کی فہرست فراہم کر دوں گا جہاں اس کے نمبروں سے رابطہ قائم کیا گیا ہے لیکن......''

''رک کیوں گئے؟ کیا کہنا چاہتے تھے......؟''

''میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر یہ اسی کی حرکت ہے تو پھر اس نے فون پر کسی سے گفتگو کرنے کے بجائے شاید موبائل کو ترجیح دی ہو۔''

''یو آر...... رائٹ...... پھر بھی تم فون نمبرز مجھے پہلی فرصت میں فراہم کر دو۔'' شیخ حامد نے موبائل آف کر دیا پھر اپنے بستر پر لیٹ کر لائٹس بند کر کے نائٹ بلب آن کر دیا لیکن...... اس کا ذہن برابر اس دشمن کی کھوج لگانے میں مصروف تھا جس نے پہلی بار اس کے مکان پر حملہ کرنے کی حماقت کی تھی۔

☠☠☠

سفید وین کے پچھلے پہیے کی ہوا چیک کرنے کے بعد ڈرائیور نے دوبارہ تیز رفتاری کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ لیاقت حسین کو قابو کرنے والے دونوں مسلح افراد اس کے دائیں بائیں پوری طرح محتاط نظر آ رہے تھے، اگلی نشست پر بیٹھا ہوا رائفل بردار وین کے حرکت میں آتے ہی دوبارہ لیاقت حسین کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا جواب قدرے مطمئن اور بے پروا نظر آ رہا تھا۔

''جانتے ہو ہم نے اس وقت پیک آورز کے باوجود تمہیں کیوں اغوا کیا ہے؟'' اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔

''میں صبح کا ناشتا کر کے نکلا تھا۔ شاید تم لوگوں نے دوپہر کے کھانے کا کچھ اہتمام کیا ہوگا۔'' لیاقت حسین نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''اچھا...... مجھے خوشی ہے کہ تم قربانی کا بکرا بننے کے باوجود بوکھلاہٹ کا شکار نہیں ہو...... ورنہ عام حالات میں ایسے موقعوں پر اغوا ہونے والوں کے چہروں پر یتیمی برستی نظر آتی ہے۔''

''موت جب برحق ہے تو اسی وقت آئے گی جو مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ رونے دھونے یا واویلا مچانے سے ملک الموت کو متاثر نہیں کیا جا سکتا۔''

''مضبوط اعصاب کے مالک معلوم ہوتے ہو۔'' بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے سپاٹ انداز اختیار کیا۔ ''لیکن تمہاری یہ زبان جو ابھی شگوفے اگل رہی ہے کچھ دیر بعد قینچی کی طرح نہیں چل سکے گی۔'' داہنی سمت والا کسمسا کر سرد آواز میں بولا۔ ''ہم تمہیں اپنے اشاروں پر سچ اگلنے پر مجبور کر دیں گے۔''

''اگلے لمحے کیا ہوگا۔ یہ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' لیاقت حسین نے اس بار بھی مرعوب ہوئے بغیر اطمینان سے کہا۔ ''جو مقدر میں لکھ دیا گیا، وہ بھی اٹل ہے۔''

''شٹ اپ......'' رائفل بردار اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ ''تمہاری یہ ساری اکڑفوں ابھی کچھ دیر بعد دوسرے راستے سے نکل جائے گی۔''

''کسی مشکل کو آسان کرنا یا صبر کا امتحان لینا بھی ہماری نہیں کسی اور......''

''بکواس بند کرو۔'' داہنی جانب والے نے پستول کی نال لیاقت حسین کی پسلی میں چبھوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر بعد ہم تمہیں آٹے دال کے بھاؤ سے بھی آگاہ کر دیں گے تمہارا واسطہ شاید ابھی تک ہم جیسوں سے نہیں پڑا۔''

''بہت زیادہ مفتی اعظم بننے کی کوشش نہ کرو۔'' اگلی نشست والا غرایا۔ ''ہم نے بڑے بڑوں کو ٹھیک کر دیا ہے۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔''

اس بار لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ مرعوب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی کی رفتار ذرا مدھم ہوئی پھر وہ الٹے ہاتھ پر مڑنے کے بعد روک دی گئی۔ کسی شٹر کے اٹھنے کی آواز ابھری۔ اس کے بعد وین ڈھلوان اترنے کے بعد مکمل روک دی گئی۔ شٹر بند ہونے کی آواز دوبارہ سنائی دی پھر وین کا انجن بھی بند کر دیا گیا۔ اس جگہ آنے سے پانچ منٹ قبل لیاقت حسین کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی اس لیے کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس نے راستے میں بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

وین کا انجن بند ہونے کے بعد اسے گھسیٹ کر نیچے اتارا گیا۔ اس وقت سرغنہ نے بھاری آواز میں کہا تھا۔

''اسے اندر لے جانے سے پیشتر تلاشی بھی لے ڈالو۔ ممکن ہے اس کے پاس کوئی اسلحہ یا خنجر موجود ہو۔'' دو آدمیوں نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن لیاقت حسین کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی زبان بند کر رکھی تھی۔ دو افراد نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر آگے کی سمت دھکا دیا۔ کچھ دور اس نے کسی دروازے کے بند ہونے کی آواز سنی۔ اس کے بعد اسے کسی لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ دونوں ہاتھ پشت پر کر کے پہلے اس کو ریشم کی پتلی رسی سے پوری طرح جکڑا گیا پھر پاؤں کو بھی کرسی کے دونوں پیروں سے جکڑ دیا گیا۔ اسے پوری طرح بے بس کرنے کے بعد آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔

وہ بارہ بائی پندرہ کا کمرا تھا جس کی دیواروں پر اذیت پہنچانے والے خطرناک آلات لٹکے نظر آ رہے تھے۔ لیاقت حسین جس لوہے کی ٹھوس کرسی پر بیٹھا تھا وہ شاید اسی مقصد کے لیے زمین میں فکس تھی کہ گر نہ سکے، کمرے میں سوائے ایک بید کی کرسی کے مزید کوئی اور سامان نہیں تھا۔

''ایک نظر چھت پر بھی ڈال لو جانِ جگر!'' سرغنہ نے مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ ''شاید اسے دیکھ کر تمہیں جواب دینے میں کسی حماقت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہ ہو۔''

جواب میں لیاقت حسین نے اوپر نظریں اٹھائیں جہاں لوہے کی دو زنجیریں اور اس کے آخری سرے پر لوہے کے مضبوط کڑے جھول رہے تھے جس سے اذیت دینے والے کو الٹا لٹکایا جا سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم پوری طرح اپنی موجودہ پوزیشن کا درست طور پر اندازہ لگا چکے ہو گے؟''

''ہاں...... مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ مجھے آرام دہ بستر پر سلانے نہیں لائے ہو گے۔''

''تم کس کے ملازم ہو یہ ہم جانتے ہیں لیکن کچھ باتوں کی تصدیق ضروری ہے اس لیے ہم نے تمہیں اٹھا لیا ہے۔'' سرغنہ بید کی کرسی گھسیٹ کر اس سے دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گیا...... اس کے دونوں ساتھی دائیں بائیں موجود تھے، ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ لیاقت حسین کے ساتھ برا سلوک کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں۔

''پوچھو......'' لیاقت حسین نے بے پروائی سے کہا۔ ''اگر وہ باتیں میرے علم میں ہوئیں اور کوئی مصلحت آڑے نہ آئی تو میں سچ بولنے سے گریز بھی نہیں کروں گا۔''

''پہلی بار تم نے میڈم روبی کو اغوا کرنے والوں کے ہاتھوں سے بچانے کی حماقت کس کے اشارے پر کی تھی؟''

''میرے دل نے مجھے اکسایا تھا۔ کسی مجبور اور کمزور

www.Paksociety.com

عورت کی عزت اور عصمت بچانا ایک مسلمان کا فرض بھی ہے۔'' لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اس وقت تمہارے ساتھ اور کون موجود تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم......''

''جھوٹ بول رہے ہو۔'' سرغنہ نے گرج کر کہا۔ ''تمہارے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج بھی تھا۔''

''جب تمہیں یقین ہے تو پھر مجھ سے کس بات کی تصدیق کر رہے ہو؟''

''سیٹھ عثمان اور اس کی بیوی کو سپر اسٹور میں اتار کر تم اکیلے گاڑی لے کر کیوں چلے گئے تھے؟'' چبھتے ہوئے سرد لہجے میں اگلا سوال پوچھا گیا۔

''اس وقت میں بے ہوشی کی حالت سے دوچار تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ شاید دعوت میں مجھے جو کھانا ملا تھا وہ زہر آلود تھا۔''

''پھر تم بچ کس طرح گئے؟''

''خدا کی مرضی......''

لیاقت حسین کے جواب پر سوال کرنے والے کے ایک ساتھی نے لپک کر اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اتنی شدت سے گھسیٹا کہ وہ چیخ اٹھا لیکن فوراً ہی خاموش ہو گیا۔

''اس وقت تم نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا تو تمہاری موت بھی خدا کی مرضی سے بڑی المناک ہوگی۔'' سرغنہ بل کھا کر قہر آلود لہجے میں بولا۔

لیاقت حسین ہونٹ چبانے لگا۔ اس کا چہرہ اندرونی جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

''فرحین اور گل خان کی بیوی، زرینہ کو تم نے کس کی فراہم کردہ معلومات پر بازیاب کیا تھا؟''

''اس میں بھی مشیت ایزدی کا دخل تھا۔''

''کنجر......'' سرغنہ غصے سے کانپتا اٹھا تھا پھر اس کے حکم پر لیاقت حسین کو کرسی کے شکنجوں سے نکال کر چھت سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ اس کے سر کے نیچے ایک انگیٹھی رکھ دی گئی جس کا ایک سوئچ آن کرتے ہی لوہے کے کوئلے نما ٹکڑے بڑی تیزی سے سرخ ہونے لگے۔

''ہم تم سے پھر وہی سوال کریں گے۔'' سرغنہ نے بل کھاتے ہوئے سوال دہرایا۔ ''فرحین اور زرینہ کو جہاں رکھا گیا تھا اس کا علم تم کو کس ذریعے سے ہوا......؟''

''مم...... میں نہیں جانتا کہ میں وہاں کس طرح پہنچ گیا تھا۔'' لیاقت حسین کے چہرے پر پہلی بار اذیت کے تاثرات نمایاں ہوئے۔

''میڈم کو دوسری بار سراج نے کسی نہ کسی کی اطلاع پر عین وقت پر بچالیا تھا۔ تم اس کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''مجھے اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم......''

''جس نے بھی ہماری خدمات تمہاری خاطر مدارات کے لیے حاصل کی ہیں اس کے بنگلے پر حملہ کرنے والے کون آدمی تھے؟''

''یہ بات میں پہلی بار تمہاری زبان سے......''

لیاقت حسین کا جملہ مکمل نہ ہو سکا، سرغنہ کے اشارے پر اس کے سیدھے ہاتھ پر کھڑے ہوئے آدمی نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے لیکن دونوں نشانے شاید خطا ہو گئے تھے۔ اس نے جھلاہٹ میں پورا پستول خالی کر دیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ سرغنہ غصے سے دانت پیسنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ جس نے گولیاں چلائی تھیں وہ بڑا ماہر نشانے باز تھا پھر لیاقت حسین کس طرح محفوظ رہا...... ''انگیٹھی کو اتنا بھڑکا دو کہ اس...... کے تخم کا بھیجا پگھل کر قطرہ قطرہ بن کر ٹپکنے لگے۔'' سرغنہ نے غصے سے کانپتے ہوئے حکم دیا۔

فائر کرنے والا ابھی تک اپنی ناکامی پر ششدر تھا۔ وہ لیاقت کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کی محویت دیکھ کر دوسرا آدمی لپک کر دیوار کے قریب گیا، اس نے ایک سوئچ آن کیا تو انگیٹھی میں آگ بھڑک اٹھی، وہ بورڈ کے قریب دیوار پر لگی ایک چرخی کو آہستہ آہستہ بائیں جانب گھمانے لگا، بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے آہستہ آہستہ بلند ہونے لگے۔ جب وہ لیاقت حسین کے سر سے ڈیڑھ فٹ دور رہ گئے تو اس نے چرخی روک دی۔

سرغنہ کی نظریں لیاقت حسین کے وجود پر مرکوز تھیں جس کا پورا وجود شعلوں کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ دہکتے گولے کے مانند سرخ ہونے لگا تھا لیکن اس کے چہرے پر کرب یا اذیت نام کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی البتہ اس کی نظریں قہر آلود انداز میں سرغنہ کے چہرے پر مرکوز تھیں اس کی پلکوں نے جھپکنا بھی موقوف کر دیا تھا...... دوسری جانب سرغنہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل و دماغ پر برف سی جمنے لگی ہو، ایک لمحے تک وہ گم صم کھڑا رہا پھر اس نے اپنے آدمیوں کو کسی روبوٹ کی طرح حکم دیا۔

''اس کو نیچے اتار کر دوبارہ کرسی سے باندھ دو۔ میں سارا قصہ ہی پاک کردوں گا۔''

''ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔'' چرخی کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے احتجاج کیا۔ ''اگر یہ مرگیا تو ہماری آدھی رقم ڈوب جائے گی۔ ہم سے یہی کہا گیا تھا کہ اسے

www.Paksociety.com

...... پر......''

''بکواس مت......'' سرغنہ نے لیاقت حسین کی آنکھوں میں بدستور جھانکتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری رقم کی ادائیگی میرا ذمہ ہے جو تمہیں مل جائے گی۔''

سرغنہ کے دونوں ساتھیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر چرخی واپس گھما دی گئی، لیاقت حسین کو چھت سے اتار کر دوبارہ لوہے کی کرسی پر ہاتھ پاؤں جکڑ کر بٹھا دیا گیا۔ اس کی نظریں بدستور سرغنہ کی نظروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ''اب پستول کو دوبارہ لوڈ کر کے پورا چیمبر خالی کر دو۔'' سرغنہ کی حاکمانہ آواز کمرے میں گونجی، دونوں ساتھیوں نے ریوالور لوڈ کر کے لیاقت حسین کو الوداعی نظروں سے دیکھا پھر ان کے پستول گولیاں اگلنے لگے۔ دونوں نے غیر اختیاری طور پر لیاقت حسین کے بجائے ایک دوسرے کو جہنم رسید کر دیا تھا۔ سرغنہ کی نظریں پوری طرح لیاقت حسین پر جمی ہوئی تھیں۔ دو ساتھیوں کے مرنے کے بعد لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے سرغنہ سے کہا۔

''اب تم اپنے ناپاک وجود کے گھناؤنے قصے کو بھی پاک کر دو...... یہی اوپر والے کو منظور ہے۔''

سرغنہ نے کسی سعادت مند بچے کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنی رائفل کا دستہ زمین سے لگا دیا، اس کی نال اپنے حلق میں ڈالی پھر سیدھا ہاتھ بڑھا کر ٹریگر دبا دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی اس کی کھوپڑی تڑخ گئی، کسی کٹی ہوئی شاخ کے مانند ہی وہ لڑکھڑا کر زمین پر اوندھے منہ گرا پھر موت کی ابدی نیند سے دوچار ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی حیرت انگیز تھا۔ لیاقت حسین کے جسم کو جس ریشمی رسی سے جکڑا گیا تھا وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ پھر اس کا وجود بھی ہوا میں تحلیل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سراج بڑی سنجیدگی سے لیاقت حسین کے ساتھ سوال جواب کر رہا تھا۔ لیاقت حسین نے اسے بھی وہی بیان دیا جو اس سے قبل سیٹھ عثمان کو دے چکا تھا۔ یہی کہ اسے سیٹھ عثمان نے کسی کام سے راستے میں اتار دیا تھا اور خود گاڑی لے کر گھر آگئے تھے۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ کی علامت نہیں تھی جس سے سراج اس کے بیان کی تردید کر سکتا۔ الماس نے اغوا کے بارے میں بھی سراج سے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ لیاقت حسین کو الماس کے اغوا کی خبر کس طرح ملی جبکہ اسے رات بارہ بجے کے لگ بھگ اغوا کیا گیا تھا۔ سراج خود بھی اس کا گواہ تھا کہ لیاقت حسین نے اسے اغوا والی رات بارہ بج کر چالیس منٹ پر فون کیا تھا۔ اس وقت اس نے سراج کو اپنے گھر آنے کو کہا تھا پھر سراج کے بجائے اس کی کار بھی لیاقت حسین نے ڈرائیو کی تھی۔ لیاقت حسین نے سراج کے استفسار پر یہی کہا تھا کہ اسے کسی خاص جگہ پہنچنا ہے جس کے بارے میں اس کے ذہن میں سوتے وقت اچانک خدشہ کلبلایا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ یاد نہیں تھا پھر الماس کو ایک مکان سے بازیاب کرانے کے بعد وہ دوبارہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ واپسی پر اس نے بڑی معصومیت سے سراج سے دریافت کیا تھا کہ اسے وہ اپنے گھر کیوں لے گیا تھا؟

جہاں تک ان باتوں کا تعلق تھا، سراج کو یہی شبہ ہوا تھا کہ کوئی غیبی طاقت لیاقت حسین کی رہنمائی کرتی ہے۔ تین مسلح آدمیوں کا لیاقت حسین کو زبردستی اغوا کرنا اور پھر بغیر کسی تشدد کے واپس کر دینا تعجب خیز تھا...... یہ بات بھی اسے الجھا رہی تھی کہ لیاقت حسین نے خاص طور پر وہی جملہ کس طرح دہرایا تھا جو اس کی بیوی کو وقتی طور پر تسلی دینے کی خاطر سیٹھ عثمان نے راحیلہ بیگم سے کہا تھا۔

''صاحب......'' لیاقت حسین نے سراج کو گم صم اور سنجیدہ دیکھ کر دبی زبان میں پوچھا۔ ''کیا آپ کو میری بات پر اعتماد نہیں ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے لیاقت۔'' سیٹھ عثمان نے کہا۔ ''ہمیں صرف یہ بات پریشان کر رہی ہے کہ تمہیں کن لوگوں نے اغوا کرنے کی حماقت کی تھی اور پھر اتنی آسانی سے......''

''میں نہیں سمجھا صاحب۔'' لیاقت حسین نے عجیب الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔ آپ نے مجھے دفتر جاتے وقت راستے میں کسی کام سے اتار دیا تھا اور خود واپس آگئے تھے۔ شاید آپ کی طبیعت خراب تھی۔''

''فرحین اب کیسی ہے......؟'' سراج نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

''بھلی چنگی ہے صاحب۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ لیکن ایک منٹ......'' سراج نے فوری طور پر کچھ سوچ کر کہا۔ ''میں نے تمہیں اس وقت ایک اور کام سے بلایا تھا۔''

''حکم دیں صاحب......'' لیاقت حسین نے سعادت مندی سے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے مجھے ایک ہفتے یا دس روز کے لیے تمہاری ضرورت پڑے۔''

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

جواب میں لیاقت حسین نے سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''میری طرف سے تمہیں ہر بات کی اجازت ہے۔''

''فرحین سے خاص طور پر پوچھ لینا۔'' سراج نے معنی خیز مگر دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ''کہیں اسے کوئی......''

''وہ بھی میری طرح آپ کی بہت احسان مند ہے صاحب۔ وہ بھلا کیا اعتراض کرے گی۔''

کچھ دیر بعد لیاقت حسین کو رخصت کر دینے کے بعد سراج نے سیٹھ عثمان سے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ لیاقت حسین جو کہہ رہا ہے وہ غلط نہیں ہوگا۔'' اس نے بات جاری رکھی۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی کسی روحانی طاقت کا دخل ہو۔''

''پھر بھی...... یہ تو معلوم کرنا چاہیے کہ جن لوگوں نے سرعام اغوا کیا، وہ کون تھے؟ کس کی ایما پر انہوں نے پیک آورز میں اتنی دلیری کا ثبوت دیا اور...... اتنی شرافت سے چھوڑ کیوں دیا......؟''

اسی وقت باہر سے راحیلہ بیگم کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی تو سراج نے کہا۔

''عثمان...... پلیز، الماس کے بارے میں، میں نے تمہیں اس وقت جو تفصیل بتائی ہے وہ بھابی کے سامنے زبان پر نہ لانا۔''

''آئی نو......'' سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ''عورتیں رازداری کے معاملے میں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔''

راحیلہ بیگم نے شوہر کے ساتھ سراج کو لان پر بیٹھا دیکھ کر گاڑی پورٹیکو سے پہلے ہی رکوائی اور اتر کر سیدھی ان کی طرف آگئیں۔

''آپ کب آئے؟'' انہوں نے قریب جا کر سراج سے پوچھا۔

''ایک گھنٹے سے بغیر چائے کافی کے بیٹھا آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔'' سراج نے حسب معمول سیٹھ عثمان کو چھیڑا۔ ''خدا کے اس نیک بندے نے ایک گلاس ٹھنڈے پانی کو بھی نہیں پوچھا۔ یہی کہتا رہا کہ اپنی بھابی کو آجانے دو پھر سب ساتھ مل کر کولڈ کافی پئیں گے۔''

''اور آپ کیوں میرے بغیر ہی ناشتا کرنے کا سوچ رہے تھے......؟'' راحیلہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا تو سراج نے آسمان کی سمت نظر اٹھا کر کہا۔

''قرب قیامت کی دلیلیں ہیں۔ آج پہلی بار گھٹنا دیور کے بجائے شوہر کی طرف جھک رہا ہے۔''

راحیلہ بیگم مسکرا دیں پھر بات بناتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو عثمان کو خوش کرنے کی خاطر کہہ رہی تھی ورنہ بھائی تو بھائی ہوتا ہے۔''

سراج نے بچوں کی طرح سیٹھ عثمان کی طرف دیکھ کر تالی بجائی پھر وہ کچھ فقرہ بھی چست کرنا چاہتا تھا کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ ایس پی اورنگ زیب کا نام دیکھ کر اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ ''سراج بول رہا ہوں۔''

''مصروف نہ ہوں تو کچھ دیر کے لیے غریب خانے پر تشریف لے آئیں۔'' دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز ابھری۔

''سر...... خیریت تو ہے؟''

''آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں جو قطعی نجی اور ذاتی نوعیت کی ہیں۔''

''رائٹ سر...... پندرہ منٹ کے اندر حاضر ہوتا ہوں۔'' سراج نے کہا پھر اٹھتے ہوئے راحیلہ بیگم سے شوخی سے کہا۔

''عثمان کی دعا قبول ہوگئی...... یہ شخص نہیں چاہتا تھا کہ میں رات کا کھانا بھی کھا کر جاؤں اس لیے ایس پی کی کال آگئی۔''

''آپ واپسی پر آجائیں...... میں اتنی دیر میں آپ کے پسند کی ڈشیں بھی تیار کرلوں گی۔''

''میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری تندرستی کا خیال رہتا ہے لیکن یہ آپ کے شوہر نام دار......'' سراج نے سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا پھر مسکراتا ہوا چلا گیا، اس نے واپسی کے لیے معذرت کرلی تھی۔

راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان بھی سراج کے جانے کے بعد خاصی دیر تک اسی کی باتیں کرتے رہے۔

***

ایس پی اورنگ زیب نے بڑے پرتپاک انداز میں سراج کو اپنے ڈرائنگ روم میں خوش آمدید کہا۔ سراج نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ دفتر اور گھر کے رکھ رکھاؤ میں اس کے انداز میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ گھر میں وہ کسی ملنسار دوست کی طرح ملا تھا۔ دفتر میں وہ اس کے برخلاف سنجیدہ اور محتاط رہنے کا عادی تھا۔

''میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' رسمی گفتگو کے بعد ایس پی نے بے تکلفی ہی سے دریافت کیا۔

''جی نہیں...... اس وقت میں اپنے کلاس فیلو اور دوست سیٹھ عثمان کے کھلے لان میں بیٹھا آرام کر رہا تھا۔''

''گڈ...... ہم پولیس والوں کو عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ٹینشن رہتی ہے اس لیے ہمارے لیے ریلیکس ہونا بھی اشد ضروری ہے۔''

''میں آپ کے خیال سے متفق ہوں سر۔''

''بائی دا وے۔'' ایس پی نے صوفے پر پہلو بدل کر قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آپ کے یہ سیٹھ عثمان وہی تو نہیں جن کی گاڑی میں بم نصب کر دیا گیا تھا اور آپ نے انہیں دو مہینے کے لیے باہر جانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔''

سراج چونکا۔ ''آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی سر......؟''

''مجھے اس کے علاوہ بھی آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔'' ایس پی نے اس کا تجسس بڑھاتے ہوئے زیرلب مسکرا کر اضافہ کیا۔ ''مثلاً یہ کہ آپ نے کسی خاص وجہ سے انتہائی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے شیخ حامد سے اس کے دفتر جا کر ایک کثیر رقم بھی وصول کی تھی۔''

سراج ہکا بکا رہ گیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے لگا کہ ایس پی نے اس وقت اسے کس مقصد سے بلایا تھا؟ پہلے دوستانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کیا اور اب آہستہ آہستہ اسے ننگا کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟ وہ سنبھل کر محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی حیرت بلاوجہ نہیں تھی، شیخ حامد سے لین دین کا اصل مقصد کیا تھا اس کی وجہ سوائے ریٹائر ہونے والے ڈی آئی جی کرائمز علیم احمد کے کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ ایس پی اورنگ زیب اس وقت دوسرے شہر میں تعینات تھا۔

''اس جائز یا ناجائز لین دین کے موقعے پر آپ نے بڑی عقلمندی سے اپنے حساس اور خفیہ کیمرے سے اس کی عکس بندی بھی کی تھی۔''

سراج کے ذہن کو دوسرا جھٹکا لگا، اسے اس بات کا شبہ شروع سے تھا کہ بگ باس نے بھی اسے بلیک میل کرنے کی خاطر خفیہ کیمروں سے اس کی ویڈیو ضرور تیار کی ہوگی۔ ''تو کیا...... اس خطرناک مگرمچھ نے ایس پی اورنگ زیب کو وہ ویڈیو دکھا کر اس سے متنفر کرنے کی کوشش کی تھی......؟''

سراج کے ذہن میں یہ خیال بڑی سرعت سے ابھرا لیکن اس نے کسی بات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی نظریں بہ دستور ایس پی کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''میں ذاتی طور پر آپ کو ایک ایماندار، نڈر، بے خوف اور فرض شناس دار پولیس آفیسر سمجھتا ہوں لیکن......'' ایس پی نے پہلو بدل کر گہری سنجیدگی اختیار کرلی۔ ''حیرت اس بات پر ہے کہ شیخ حامد جیسے گرگ باراں دیدہ اور خطرناک دشمن تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر افضل خان جیسے تھرڈ ریٹ بدمعاش کو آپ نے کیا سوچ کر استعمال کیا؟''

''سر......'' سراج نے کسمسا کر انکار یا اقرار کرنے کے بجائے پہلو تہی اختیار کرنے کا درمیانی راستہ اختیار کیا۔ ''ضروری تو نہیں کہ جو باتیں آپ تک پہنچی ہوں ان میں صداقت بھی ہو...... یہ بھی عین ممکن ہے کہ پچھلی ملاقات میں میرے اور آپ کے درمیان ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی جو گفتگو ہوئی تھی اس کی بھنک دوسروں کو مل گئی ہو یا...... کسی نے دور رہ کر اندازہ قائم کیا ہو اور اب اس نے ہمارے درمیان خلیج پیدا کرنے کی خاطر ایک فرضی کہانی......''

''نہیں...... میں آپ کے اس مفروضے سے قطعی متفق نہیں ہوں۔'' ایس پی نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''اگر آپ نے تمام باتوں پر یقین ہی کرلیا ہے تو پھر میں کیا صفائی پیش کرسکتا ہوں؟'' سراج نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

''مائی ڈیئر مسٹر سراج۔'' ایس پی نے دوبارہ پہلو بدل کر سراج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''جو کثیر رقم آپ نے شیخ حامد جیسے خرانٹ مجرم سے وصول کی تھی۔ اگر میں اس کا کوئی دستاویزی ثبوت پیش کر دوں تو آپ کیا بہانہ بنانے کی کوشش کریں گے؟''

''میں اب اجازت چاہوں گا سر......'' سراج نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ نے اس وقت مجھے آف دی ریکارڈ باتوں کے لیے......''

''پلیز سٹ ڈاؤن......'' اورنگ زیب نے پھر بڑے مہذب انداز میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی کچھ باتیں رہ گئی ہیں جنہیں سننے کے بعد شاید آپ اسے آف دی ریکارڈ سمجھنے کے بجائے آئندہ میرے اوپر زیادہ اعتماد کرنے لگیں۔''

بات سراج کی سمجھ میں نہیں آئی پھر بھی وہ بادل ناخواستہ بیٹھ گیا۔

''آپ نے دو موقعوں پر میڈم روبی کو تحفظ دینے میں جو کردار ادا کیا، اس کا علم ان دشمنوں کو بھی ضرور ہوگا جو مجھے اور آپ جیسے آدمیوں کو خریدنے کی خاطر کسی بھی گھناؤنے طریقے کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔''

''میں میڈم کے سلسلے میں آپ کی معلومات سے انکار نہیں کروں گا۔'' سراج نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''ان کے بارے میں مجھے بہت ساری ایسی باتوں کا علم ہے جو شاید کسی اور کو نہ ہو۔''

www.Paksociety.com

"ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو لیکن...... اگر ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں تو عوام و خواص دونوں کو بہتر طور پر تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔"

"میں اس سے انکار نہیں کروں گا سر۔" سراج نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ابھی تک تو وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس وقت اسے بلانے کا اصل مقصد کیا تھا۔ "اس مقصد کے لیے ہمیں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد بھی کرنا ہوگا۔" اس نے کچھ توقف سے کہا۔

"مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔" ایس پی نے ٹھوس لہجے میں اظہار کیا۔ سراج کو اس کے جواب میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں محسوس ہوئی لیکن شیخ حامد کے ساؤنڈ پروف کمرے میں ہونے والی لین دین کے معاملے میں اس کا ذہن بہ دستور الجھ رہا تھا۔

"شبنم اس وقت جو کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا ذاتی خیال کیا ہے؟ میری معلومات کے مطابق اس نے افضل خان کو بھی اپنے اپارٹمنٹ میں پناہ دی ہے جبکہ شیخ حامد نے اس کی سرپرستی سے منہ موڑ کر اسپتال سے ڈسچارج کرا دیا تھا۔ کیا شبنم اس بگ کرمنل کی مخالفت مول لینے کی پوزیشن میں ہے......؟"

"میرا خیال ہے کہ شبنم بغیر شیخ حامد کے اشارے پر اتنا بولڈ اسٹیپ اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں......؟" ایس پی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "کیا وہ شبنم کے ذریعے ایک پٹے ہوئے مہرے کو کسی خاص محاذ پر استعمال کرنے پر غور کر رہا ہے؟"

"وہ محاذ ہم دونوں میں سے بھی کوئی ایک ہو سکتا ہے۔" سراج نے دیدہ و دانستہ ایس پی کا نام لینے کی غلطی نہیں کی ورنہ میڈم نے اسے کچھ ایسا ہی اشارہ دیا تھا۔

"میں ناواقف نہیں ہوں مسٹر سراج......" ایس پی نے اس بار بڑے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "وہ محاذ آپ نہیں...... میں یا پھر رستم علی آغا خانی بھی ہو سکتا ہے جو آپ کے دوست مسٹر عثمان کے درمیان سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد شیخ حامد کا اب سب سے بڑا کاروباری حریف بن کر سامنے آ رہا ہے۔"

سراج حیرت سے اچھل پڑا۔ رستم علی کا نام وہ پہلی بار شیخ حامد کے حریف کی حیثیت سے سن رہا تھا۔

"آپ کو شاید یہ بھی سن کر تعجب ہوگا کہ شیخ حامد در پردہ مجھے بھی اپنا سب سے بڑا مخالف سمجھ رہا ہے۔" اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا پھر مسکرا کر بولا۔ "اب میں مناسب سمجھوں گا کہ ان باتوں سے بھی پردہ اٹھا دوں جو آپ کے ذہن میں یقیناً چبھ رہی ہوں گی۔ میں نے رقم کی لین دین کے سلسلے میں جتنی باتیں آپ سے کی ہیں وہ مجھے کسی ایسے شخص سے معلوم ہوئی ہیں جو آج بھی ہمارے محکمے میں سب سے زیادہ معتبر اور بولڈ سمجھا جاتا ہے۔ میں علیم احمد صاحب کی بات کر رہا ہوں، جن کی شخصیت میرے لیے کسی سرپرست سے زیادہ قابل احترام ہے۔ وہ بھی مجھے اپنے خاندان کے فرد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آپ کو میں نے اس وقت انہی کے مشورے پر بلایا ہے تاکہ ہمارے درمیان آئندہ کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ آپ نے جو دستاویز اور تحریری بیان اپنی بے گناہی اور قانون کی مدد کرنے کی خاطر علیم احمد صاحب کے پاس محفوظ کرائے تھے اب انہوں نے اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی امانتاً رکھوا دی ہے۔ یہ سب اس اعتماد پر کیا ہے کہ خدانخواستہ وہ نہ ہوں تو میں آپ کا تحفظ اپنا فرض سمجھ کر ادا کر سکوں۔"

ایس پی اورنگ زیب کے جملے سن کر سراج نے سکون کا طویل سانس لیا۔ اس کے ذہن سے جیسے کوئی وزنی بوجھ اچانک اتر گیا تھا۔

☠☠☠

شیخ حامد اپنی مخصوص لفٹ سے اتر کر آفس میں داخل ہوا تو کنول اس کے قدموں کی مخصوص آہٹ پا کر اپنے آفس سے نکل کر اس کے استقبال کے لیے سامنے آ گئی۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ حسب دستور اس کے ہونٹوں کے بیضوی اعصاب پر ایک دل آویز تبسم مچل رہا تھا۔ شیخ حامد اس کے خوبصورت اور گلاب جیسے تر و تازہ جسم کی سوندھی سوندھی مہک کو خوابوں میں محسوس کر کے ہی تر و تازہ ہو جاتا تھا۔ جب سے کنول نے آفس جوائن کیا تھا اس کی بھی روزمرہ کی اولین ڈیوٹی یہی تھی کہ وہ بگ باس کے آتے ہی اپنی خواب آلود نگاہ نیم باز اور حسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کو خوش آمدید کہے۔ یہی اس کی سب سے اہم ڈیوٹی بھی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے تمام تر کیل کانٹوں سے لیس ہو کر اس کے سامنے باد بہاری کے جھونکوں کی طرح آ گئی تھی۔ کسی ارغوانی چھلکتے ہوئے جام کی طرح لیکن...... بگ باس کے چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ اپنی جگہ سمٹ کر رہ گئی۔

شیخ حامد کے چہرے پر جھلاہٹ مسلط تھی، مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ اس خوبصورت متحرک نشے کی جاندار بوتل کے اندر مچلتی شراب کو دیکھ کر اپنا غم غلط نہ کر سکتا۔

رات گھر پر ہونے والے حملے نے اس کے ذہن کو بری طرح الجھا رکھا تھا۔ اورنگ زیب سے ہونے والی تلخ

www.Paksociety.com

کلامی کی کڑواہٹ بھی اس میں شامل تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اسے سات گھنٹے گزر جانے کے باوجود حملہ کرنے والوں کے بارے میں کوئی خاص اطلاع نہیں ملی تھی۔ ان تمام تر پریشانیوں کو نظر انداز کر کے اس نے کنول کے اس جیتے جاگتے، مہکتے پھول کو دیکھا تو ذہن پر ہلکے ہلکے نشے کی ترنگ کا احساس ہوا۔ اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔

کنول نے اس وقت بیل باٹم ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ اس چست لباس نے اسے دو آتشہ بنا رکھا تھا۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز چست لباس سے سرکشی کرتے نظر آ رہے تھے۔ شیخ حامد نے کنول کو صرف "آخری حربے" کے طور پر استعمال کرنے کے لیے بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ کسی کاروباری معاملے میں سودا نہ پٹنے کی صورت میں ہی وہ اسے پارٹی کے سامنے لاتا تھا اور...... کنول جس انداز میں اس کی آؤ بھگت کرتی تھی وہ پارٹی کو "بگلا بھگت" بنا دیتا۔ وہ رائی کی مہنگی شراب کی طرح رگوں میں سرایت کر جاتی پھر...... سامنے والی پارٹی...... گویا "عمل تنویم" کے زیر اثر آ کر معمولی رد و بدل کے بعد ڈیل پر دستخط کرنے پر آمادہ ہو جاتی...... اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا۔ کاروباری تمام تر سوجھ بوجھ اور دور اندیشیاں بھی کنول کی بلوری آنکھوں سے چھلکتی شراب کی مستیوں میں غرق ہو جاتیں۔ شیخ حامد بذات خود بھی کچھ ایسی ہی کیفیتوں سے دوچار ہو گیا۔

کسی آدم خور شیر کی کبھار پر ایک ذرا خطرہ محسوس ہو تو وہ جب تک خطرے کے اسباب نہ معلوم کر لے، سکون سے بیٹھ نہیں لیتا، شیخ حامد کو بھی اس وقت سکون کی ضرورت تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی ذہنی سکون کی خاطر خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ دل بہلانے کا عادی تھا، یہی وجہ صبا بیگم کی حرام موت کا سبب بن گئی تھی جس نے اس کے ذہن کو اس حد تک جھٹکا پہنچایا تھا کہ وہ ایس پی اورنگ زیب جیسے اثر و رسوخ رکھنے والے سے بھی الجھ گیا تھا۔ اب کسی نامعلوم دشمن نے براہ راست اس کے بنگلے کو نشانہ بنایا تھا۔ اس وقت اسے ذہنی انتشار کو دور کرنے کی خاطر سکون کی ضرورت تھی۔ سکون کے لیے عورت کا لچکیلا بل کھاتا جسم اس کے لیے ہمیشہ بڑی موثر دوا ثابت ہوتی تھی۔ کنول بھی ایک ایسی سیل بند بوتل تھی جس کو اس نے اپنے کاروبار کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ اس ذہنی انتشار کو دور کرنے کا ذریعہ بھی بن سکتی تھی۔ اس کی نظریں کنول کے جسمانی پیچ و خم پر پھسلنے لگیں۔

"کیا بات ہے سر......؟" کنول نے کسی مسیحا کی طرح دریافت کیا۔ "آپ آج خلاف توقع کچھ ڈسٹرب نظر آ رہے ہیں؟"

"ہاں...... کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

شیخ حامد خاموشی سے جا کر اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ وہ کنول کے سلسلے میں خلاف عادت بڑے صبر اور احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"آپ کچھ پینا پسند کریں گے......؟" کنول اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا قرب شیخ حامد کے لیے کڑی آزمائش تھی، پہلے وہ ہمیشہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر گفتگو کرتی تھی۔ آج اس کی چہرے کے بالکل قریب آ گئی تھی، اس کے جسم کی مہک اور تپش کا احساس شیخ حامد کو گدگدانے لگا۔

"نہیں......" اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "میں دفتر میں پینے کے اصول کے خلاف ہوں۔"

"آپ نے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی۔" کنول نے ایک ہمدرد کی حیثیت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟"

جواب میں شیخ حامد نے کنول کی طرف دیکھا تو اس کی سحر آلود آنکھوں کا نشہ بے خود کر گیا، غیر اختیاری طور پر اس نے سیدھا ہاتھ کنول کی کمر میں ڈال کر ایک ذرا اشارہ دیا تو وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں آ گری۔ ایک لمحے کو فطری شرم کے احساس نے کنول کو بوکھلا دیا۔ اس نے ہچکچا کر ایک مرد کی آغوش سے دور جانے کی کوشش کی لیکن شیخ حامد کے ہاتھوں کے حصار سے نہ نکل سکی۔

"اس وقت صرف تم مجھے سکون پہنچا سکتی ہو۔" اس کا ہاتھ بہکنے لگا۔

"سر...... یہ دفتر ہے اور میں......" ایک مرد کی بہکی ہوئی گرم تپش خود اس کے سینے میں بھی ہلچل مچا رہی تھی۔ اس نے مچل کر کہا۔ "یہ گناہ ہے سر، جس کی دلدل سے ابھی تک میں محفوظ رہی ہوں...... پلیز......"

"پریشان مت ہو، میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔" شیخ حامد نے خلاف توقع اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ کنول کسی مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کے جال سے نکل گئی۔ اس کے سینے کا زیر و بم ابھی تک اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ "فی الحال تم اپنے کمرے میں جاؤ، ضرورت ہوئی تو تم سے انٹرکام پر رابطہ کر لوں گا۔"

"آ...... آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں سر......؟" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ملازمت سے چھٹی مل جانے کا احساس اس کے کمزور وجود میں اترنے لگا، وہ جانتی تھی کہ بدن کا معاوضہ اسے موجودہ تنخواہ سے کہیں زیادہ مل سکتا تھا لیکن وہ تنخواہ عزت کے ساتھ کہیں اور نہیں مل سکتی تھی

جو حامد ایسوسی ایٹس میں مل رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ تم دو کپ کافی بنا لاؤ۔“ شیخ حامد نے اسے محبت سے دیکھا۔ ”آج میں تمہارے ساتھ کافی پیوں گا۔ آمنے سامنے...... دور دور بیٹھ کر۔“

کنول نے اسے ممنونیت سے دیکھا پھر الٹے قدموں اپنے ملحقہ آفس میں چلی گئی۔ شیخ حامد کے ذہن میں پھر رستم علی آغا خانی کا نام کروٹیں لینے لگا لیکن ابھی اس کے شبہے کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی جس کے سبب وہ کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں موبائل گنگنایا۔ اسکرین پر لودھی کا نام دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے موبائل آن کر کے خشک لہجے میں سوال کیا۔

”سر...... میرے آدمی برابر سراغ لگانے میں مصروف ہیں لیکن......“

”اور کوئی خاص بات......؟“ اس نے الجھ کر بات کاٹی۔

”میں نے ایک اور پرانے شکار پر اپنے اعتماد کے کچھ لوگ لگا رکھے تھے۔ آج وہ ہمارے قبضے میں آ گیا تھا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”سیٹھ عثمان کا ڈرائیور لیاقت حسین جو چار مرتبہ ہمارا راستہ کاٹ چکا ہے۔“

”ربش......“ شیخ حامد تلملا اٹھا۔ ”تمہیں اس کام کے لیے کس نے اجازت یا حکم دیا تھا؟“

”آپ کا پرانا نمک خوار ہوں سر اس لیے......“

”لیاقت حسین اس وقت کہاں ہے......؟“ اس نے لودھی کی بات سنے بغیر جھلا کر پوچھا۔

”وہ میرے آدمیوں کے قبضے میں آ گیا تھا سر لیکن حیرت انگیز اور پراسرار طور پر مسلح آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر صاف نکل گیا۔“

لودھی جیسے جیسے تفصیل بیان کر رہا تھا، شیخ حامد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ ”لودھی......“ پوری بات سننے کے بعد اس نے بے حد سرد انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسپتال میں علاج کے دوران تمہارا کوئی دماغی اسکرو ضرور ڈھیلا چھوڑ دیا گیا ہے۔“

”میری بات کا یقین کریں سر...... اس شخص کے اوپر یقیناً کسی جنات کا سایہ......“

”بکواس بند کرو......“

شیخ حامد کا ذہن لودھی کی بات سن کر اور مکدر ہو گیا...... کنول... کافی کے ساتھ آ گئی تھی اس لیے اس نے موبائل آف کر کے اپنے غصے پر بڑی حد تک قابو پا لیا تھا۔ کافی پیتے وقت بھی اس نے کئی بار کنول کو نظر بھر کر دیکھا تھا پھر خود کو مصروف رکھنے کی خاطر اس نے موبائل اٹھا کر بلیک ٹائیگر کے نمبر ملائے، کنول سر جھکائے کافی پینے میں مصروف تھی۔

”کوئی سراغ ملا......؟“ اس نے رابطہ قائم ہونے کے بعد سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”جن دو آدمیوں کی لاشیں ملی ہیں وہ ایک مقامی بدمعاش گینگ کے آدمی تھے۔“ دوسری سمت سے جواب ملا۔ ”میں نے بذات خود اس بدمعاش کے اڈے پر جا کر اسے کھنگالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ دو روز پہلے ان دونوں مرنے والوں نے کسی وجہ سے ایک دن کی چھٹی مانگی تھی۔“

”میں سمجھا نہیں......“ شیخ حامد کی پیشانی پر شکنیں ابھرنے لگیں۔ ”میرے اندازے اور دوسری اطلاعات کے مطابق حملہ کرنے والے دو سے زیادہ کی تعداد میں تھے۔“

”میں یہی بتانا چاہتا تھا کہ حملہ کرنے والے افراد نے ہمیں دھوکا دینے کی خاطر دوسرے مقامی اڈوں سے بھی کچھ آدمی کرائے پر حاصل کر لیے تھے۔“

”اور کوئی خاص رپورٹ......؟“

”آپ کے ساتھ اس وقت کوئی اور ہے......؟“

”ہاں......“ شیخ حامد نے کنول پر نظر ڈالی جو بہ دستور کافی پینے میں مصروف تھی۔

”رستم علی آغا خانی کل شام سے ابھی تک اپنی کوٹھی کے اندر ہی ہے۔ میرے آدمی اس کی نگرانی پر مامور ہیں۔ جیسے ہی کوئی کام کی بات معلوم ہوئی، آپ کو فوری اطلاع دوں گا۔“

”مجھے اطلاع نہیں...... رزلٹ چاہیے......“ اس نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”مخالفوں کو زیادہ ڈھیل دینا بھی میرے اصول کے خلاف ہے۔“

”آپ صرف اشارہ کر دیں سر......“ دوسری جانب سے جواب ملا۔ ”جس طبقے سے ہمارے مشتبہ شخص کا تعلق ہے وہ زیادہ جیدار نہیں ہوتے۔ معمولی سختی ہی سے ان کی زبان فر فر چلنے لگتی ہے۔ حکم ہو تو اسے دو گھنٹے کے اندر اندر اٹھا لیا جائے۔“

”ابھی نہیں...... میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

شیخ عابد نے موبائل آف کیا تو کنول نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ سہمے سہمے انداز میں بولی۔ ”سر...... آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟“

”کیوں...... تمہیں اس کا اندازہ کیسے ہوا؟“

اس پر اسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

صلۂ احسان

کاشف زبیر

کہیں انسان اپنی فطرت کے مطابق نیکی کرتا ہے اور کبھی کبھی حالات کے تحت ایسا کام کر گزرتا ہے جو شاید پُرسکون زندگی میں سوچ بھی نہ سکے۔ بہرحال کسی کو نتائج کی پروا ہو یا نہ ہو قدرت کب کسی کی منشا کے مطابق لوٹاتی ہے۔ وہ تو بس مکافاتِ عمل پر کارفرما رہتی ہے۔ ان کے حصے میں بھی ویسی ہی فصل آئی جیسا انہوں نے بویا تھا... اور ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا۔

متضاد احساسات کے درمیان کشمکش کا دلچسپ ماجرا

ڈین مارکنز اس وقت بڑی مشکل میں تھا۔ وہ، اس کی بیوی مارشا اور دو چھوٹی بیٹیاں ریٹا اور لیزا دو طرف سے گھرے ہوئے تھے اور ان پر فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ دریائے کولوریڈو کے جنوب میں یہ سارا علاقہ تنگ بھنچی ہوئی چٹانوں پر مشتمل تھا اور ان سے گزرنے کا راستہ بھی تلاش کرنا پڑتا تھا۔ صرف تین دن پہلے ڈین اور اس کا خاندان کولوریڈو کے شمال میں ایک سرسبز وادی میں سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ 1798ء میں ڈین کا دادا آئرلینڈ سے

www.Paksociety.com

آ کر اس وادی میں آباد ہوا تھا، اس وقت تک حملہ آور سفید فاموں نے اس علاقے سے مقامی انڈین قبائل کا صفایا کر دیا تھا۔ نصف صدی سے جاری خون ریز جنگوں میں فتح جدید آتشیں اسلحے کی ہوئی تھی۔ تیر کمان سے مسلح انڈین قبائل کولوریڈو کے جنوب مغربی علاقوں کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ڈین کے باپ اور دادا نے محنت کر کے یہ فارم بنا لیا تھا اور ڈین ان کی محنت کا پھل کھا رہا تھا۔ اس علاقے کی سب سے بہترین مکئی، آلو اور تربوز اس کی زمین پر پیدا ہوتا تھا اور بیوپاری منہ مانگے داموں اس کی فصل لے جاتے تھے۔ دولت آئی تو ڈین نے پرانے مکان کو گرا کر دو منزلہ شاندار گھر تعمیر کیا اور اس علاقے کی سب سے حسین لڑکی مارشا سے شادی کی۔ خود ڈین بھی وجیہہ تھا لیکن مارشا واقعی بے مثال تھی۔ اس شادی نے کتنوں کے سینوں پر سانپ لوٹا دیے تھے جن میں ایڈگر کاڈ بھی شامل تھا۔ ایڈگر عرف ایڈی کا شمار اس علاقے کے نامی گرامی بدمعاشوں میں ہوتا تھا۔ وہ مارشا کو پسند کرتا تھا لیکن مارشا اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔ ایڈگر مارشا کے باپ جو مائیکل خوف زدہ تھا جو بہترین نشانے باز تھا اس لیے ایڈی اپنی حد میں رہا۔

پھر مارشا نے ڈین کو چن لیا تو معاملہ ہی ختم ہو گیا لیکن ایڈی کے اندر کہیں ایک آگ جلتی رہتی تھی۔ وہ موقعے کا انتظار کر رہا تھا اور پھر اسے موقع مل گیا۔ مارشا کا باپ ایک غیر متوقع لڑائی میں مخالف کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ جس کی نشانے بازی سے ایڈی سمیت اس کے تمام حریف خوف کھاتے تھے اس لیے حریف نے اسے اچانک دھوکے سے مارا تھا۔ مارشا کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا تو ڈین کے لیے بھی فکر کی بات تھی۔ ڈین لڑنے بھڑنے والا شخص نہیں تھا۔ وہ ایڈی کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایڈی صرف جو کے خوف سے خاموش تھا لیکن اب جو نہیں رہا۔ شادی کے پانچ سالوں میں ان کی دو بیٹیاں ہو گئی تھیں۔ ریٹا چار سال کی اور لیزا دو سال کی۔

جو کی تدفین کے بعد ڈین نے مارشا سے اپنے خدشات کا اظہار کیا اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”اس بات کو پانچ سال گزر چکے ہیں اور اب میں دو بچیوں کی ماں ہوں۔“

”ایڈی جیسے لوگ اپنی شکست نہیں بھولتے۔“ ڈین نے کہا۔ ”اب اسے تم سے کوئی غرض نہیں ہو گی وہ بس اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہے گا۔“

”تب ہم کیا کریں؟“ مارشا بھی فکر مند ہو گئی۔

ڈین کے پاس رقم تھی، اس نے دو اچھے نشانے باز پیکاک اور میتھ رکھ لیے۔ وہ فارم اور اس کے گھر کی حفاظت کرتے تھے۔ ڈین بھی اسلحے کا استعمال جانتا تھا لیکن اس کا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا دوسرے وہ جنگ و جدل کو پسند نہیں کرتا تھا جبکہ ایڈی کے لیے اس سے زیادہ لذت انگیز کام کوئی نہیں تھا لہٰذا فکر مند ہونا درست تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر ایڈی اپنے آدمیوں سمیت اس کے فارم کا رخ کرے گا اور اس کے بعد نہ جانے کیا ہو گا۔ اس کا اندیشہ بہت جلد درست ثابت ہوا۔ ایک رات جب وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک ہی اس کے فارم پر چاروں طرف سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ مارشا چلانے لگی اور بچیاں رونے لگیں۔ ڈین نے جلد ہی انہیں بیڈ کے نیچے ایک چھوٹے سے محفوظ تہ خانے میں منتقل کیا اور خود اپنی رائفل اور گولیوں کی پیٹی سنبھالتے ہوئے مکان کے اوپری حصے میں اپنے آدمیوں کے پاس آ گیا۔

پیکاک نے اسے بتایا۔ ”ہم نے دو حملہ آور مار گرائے ہیں لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔“

واقعی حملہ آور بہت تھے۔ کم سے کم بھی نصف درجن افراد باہر سے اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے جبکہ دو مارے جا چکے تھے۔ ڈین بھی مدافعت میں شامل ہو گیا مگر وہ تین تھے۔ حملہ آور رفتہ رفتہ اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ پیکاک نے ڈین سے کہا۔ ”تم اپنے بیوی بچوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“

”وہ کیسے؟“ ڈین نے پوچھا۔ ”یہ چاروں طرف موجود ہیں۔“

”انہوں نے قصبے کی طرف گھیرا سخت کیا ہوا ہے تاکہ کوئی نکل کر قصبے کی طرف نہ جا سکے لیکن کولوریڈو دریا والی طرف گنجائش ہے تم اپنی بیوی اور بچیوں کو بگھی میں لے کر نکل جاؤ۔“

پھر ڈین بہ مشکل مارشا اور بچیوں کو لے کر اپنی بگھی میں وہاں سے نکل گیا۔ ان پر گولیاں برس رہی تھیں اور ڈین کو لگ رہا تھا کہ ان میں شاید ہی کوئی زندہ بچے لیکن حیرت انگیز طور پر وہ سب سلامت رہے تھے۔ ڈین کو صرف جان بچانے کا خیال تھا اسے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ گھر سے رقم اور دوسری قیمتی اشیا اٹھا لائے۔ یہ کام مارشا نے کیا تھا جسے ان حالات میں بھی یہ خیال رہا تھا۔ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر وہ فارم سے دور نکل جانے میں کامیاب رہے تھے لیکن جب صبح ہوئی تو انہوں نے خود کو دریا کے نزدیک ایک ویران علاقے میں پایا۔ یہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ بھوکے تھے۔ بگھی میں چنوں کا ایک تھیلا پڑا تھا، وہی ان کے

کام آیا۔ ساری رات جاگنے کے بعد بچیاں تھک کر سو گئی تھیں۔ لیکن مارشا اور ڈین کی نیند بہ دستور غائب تھی۔

”مجھے یقین ہے وہ پیچھے آئیں گے۔“ مارشا سسکی۔ ”نہ جانے انہوں ہمارے گھر کا کیا حشر کیا ہو گا؟“

”گھر کو چھوڑو اپنی فکر کرو۔“ ڈین نے کہا۔ ”ہم ہیں تو سب ہے ورنہ سب بیکار ہے۔“

”میرا خیال ہے رات بھر میں ہم بہت دور نکل آئے ہیں اب وہ ہمارے پیچھے نہیں ہوں گے۔“ مارشا نے امید سے کہا۔

لیکن ڈین کا خیال تھا ایڈی اس وقت تک ان کا پیچھا کرے گا جب تک وہ انہیں مار نہیں دیتا۔ وہ اسی قسم کا کینہ پرور شخص تھا۔ اس لیے وہ ابھی محفوظ نہیں تھے۔ ”پھر بھی ہمیں آگے سفر کرنا چاہیے۔ اب ہم اس ریاست میں نہیں رہ سکتے ہیں۔“

”پھر کہاں جائیں گے؟“

”کیلیفورنیا۔“ ڈین نے فیصلہ کر لیا۔ ”میں نے سنا ہے وہاں زرخیز زمینیں بہت کم داموں میں مل رہی ہیں اور حکومت لوگوں کو آباد ہونے میں مدد بھی دیتی ہے۔“

کچھ دیر آرام کے بعد وہ دوبارہ روانہ ہوئے۔ ایک جگہ سے انہوں نے دریا عبور کیا اور ڈوبنے سے بال بال بچے کیونکہ بارشوں کا موسم تھا اور دریا میں پانی خاصا تیز تھا۔ دریا کے دوسری طرف آنے کے بعد ڈین نے کسی قدر اطمینان محسوس کیا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ ایڈی اور اس کے آدمی دریا کے پار تک اس کا پیچھا نہیں کریں گے لیکن یہ اطمینان اس وقت ختم ہو گیا جب دوسرے دن وہ تنگ چٹانوں میں راستہ تلاش کر رہے تھے اور اچانک ہی ان پر ایک بار پھر گولیاں برسنے لگیں۔ پہلے تو ڈین کو خیال آیا کہ وہ رہزنوں کے نرغے میں آ گئے ہیں لیکن جلد ہی چٹانوں کے اوپر سے ایڈی نے اسے پکارا۔

”ڈین تم چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔ ان چٹانوں سے زندہ واپس نہیں جا سکتے اس لیے میرے ساتھ سمجھوتا کر لو۔“

”کیسا سمجھوتا؟“

”مارشا کو میرے حوالے کر دو، ایک بار میں اسے ......“ اس سے آگے ایڈی کے منہ سے صرف گندگی نکل رہی تھی اور ڈین نے اس کا جواب فائر سے دیا۔ ایڈی نے قہقہہ لگایا۔ ”ڈین تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اس لیے بہتر ہے میری بات مان کر اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچاؤ۔“

ڈین، مارشا اور بچیاں ایک چھوٹی سی چٹان تلے تھے اور وہ یہیں محفوظ تھے اس سے ذرا سا باہر نکلنے پر وہ ایڈی اور اس کے ساتھیوں کے نشانے پر آ جاتے۔ شام ہو رہی تھی اور صبح ہونے پر وہ بالکل واضح ہو جاتے۔ پھر دن میں یہ چٹانیں دھوپ میں تپنے لگتی تھیں اور ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ رات تو جیسے تیسے گزر جاتی لیکن دن گزارنا ناممکن تھا، وہ بھی دو چھوٹی بچیوں کے ساتھ۔ وقت گزر رہا تھا اور ڈین چوکنا بیٹھا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا اور اسے اپنے سارے خاندان کی موت قبول تھی لیکن ایڈی کا مطالبہ قبول نہیں تھا۔

+++

اپوچی ایک جنگجو انڈین تھا۔ اس کا قبیلہ صدیوں سے دریائے کولوریڈو کے شمال مشرقی کنارے پر آباد تھا لیکن غاصب سفید فاموں نے ان کی زمینیں ہتھیا کر انہیں جنوب اور مغرب کی طرف دھکیل دیا۔ اس طرف بے آب و گیاہ چٹانوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس دربدری میں قبیلے کے بہت تھوڑے سے لوگ زندہ بچے تھے اور جو بچے تھے وہ بھی زندگی کے آخری سانسیں گن رہے تھے کیونکہ ان کے پاس زمین نہیں رہی تھی اور نہ ہی کھانے کو کچھ تھا۔ اپوچی اپنے لوگوں کو بھوکا مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت نکلا کہ کہیں سے خوراک کا بندوبست کرے لیکن خوراک کیا ملتی البتہ ان کا سامنا ایک فوجی دستے سے ہو گیا جو خاص طور سے انڈین قبائل کے صفائے کے لیے اس علاقے میں موجود تھا۔ فوجی دستے نے انہیں دیکھتے ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اپوچی اور اس کے ساتھیوں نے مدافعت کرنا چاہی لیکن ان کے پاس اسلحہ محدود اور پرانا تھا جبکہ فوجی جدید ترین اور زیادہ اسلحے سے لیس تھے۔ بیس منٹ کی اس مختصر جھڑپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف اپوچی بچا تھا اور وہ بھی زخمی حالت میں فرار ہونے پر مجبور تھا۔ ایک گولی اس کے بائیں شانے میں اتر گئی تھی۔ زخم کاری نہیں تھا لیکن گولی اندر رہ گئی تھی اور اسے بے پناہ تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کسی طرح تعاقب میں آنے والوں سے جان چھڑائی تھی اور گھوڑے پر دریا عبور کر کے دوسری طرف آ گیا۔ درحقیقت دریا درمیان میں آنے سے اس کی جان بچی تھی اور فوجی واپس چلے گئے تھے۔

اب تک اپوچی ہمت سے کام لے رہا تھا لیکن دریا عبور کرنے کے بعد وہ نڈھال ہو گیا اور اپنے گھوڑے کی گردن سے چمٹنے کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ گھوڑا خود اسے لے کر چلتا رہا تھا۔ وہ رات بھر اسی طرح سفر کرتا رہا پھر فائرنگ کی آواز نے اس کے حواس کو جھنجوڑا اور وہ جاگ اٹھا۔ کہیں پاس

www.Paksociety.com

ہی فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ چٹانوں کے درمیان تھا۔ اس نے گھوڑا ایک جگہ باندھا اور خود رائفل لے کر ڈولتا ہوا چٹانوں پر چڑھنے لگا۔ اوپر چڑھے بغیر وہ صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ایک چٹان پر چڑھتے ہی اسے وہ چار آدمی دکھائی دیے جو نیچے کہیں فائرنگ کر رہے تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا انہوں نے کسی کو گھیر لیا ہے۔ وہ سفید فام تھے۔ اپوچی کو خیال آیا کہ کہیں انہوں نے اس کے کسی ساتھی یا قبیلے والے کو تو نہیں گھیر لیا ہے۔

مگر فوراً ہی یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ اوپر والے کسی آدمی سے بات کر رہے تھے اور وہ بھی انگریزی بول رہا تھا گویا سفید فاموں نے کسی سفید فام ہی کو گھیر رکھا تھا۔ اسے کسی قدر انگریزی آتی تھی اور اس نے محسوس کیا کہ اوپر والے نیچے والے شخص سے کسی چیز کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بہر حال اسے ان کے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح نیچے اترنے والا تھا کہ اچانک ہی اسے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ خود اپوچی کے کئی بچے تھے اور اسے اندازہ تھا کہ بچے کی عمر دو تین سال سے زیادہ نہیں تھی۔ آواز نیچے سے آ رہی تھی جس طرف یہ اوپر موجود چار سفید فام فائرنگ کر رہے تھے۔ نیچے بچے موجود تھے اور ان لوگوں کو ان کا بھی خیال نہیں تھا۔ اپوچی کو غصہ آنے لگا۔ نیچے والا شخص چیخ چیخ کر فائرنگ روکنے کو کہہ رہا تھا اور اوپر والوں نے قہقہے لگانا شروع کر دیے تھے۔

+++

ڈین کا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا اور اس تنگ سی جگہ میں وہ زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ ایڈ گر فائرنگ کر رہا تھا اور ڈین اپنے بیوی بچوں کے سامنے ڈھال بنا ہوا تھا لیکن نہ جانے کیسے ایک گولی اچٹ کر ریٹا کے پیر کو چھوتی گزر گئی، اسے زخم آیا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ مارشا اس کے پاؤں سے خون روکنے کے لیے اسے ہاتھ سے دبا رہی تھی۔ ریٹا کا خون دیکھ کر ڈین پاگل ہو گیا تھا۔ اگر مارشا اسے نہ روکتی تو وہ شاید آڑ سے نکل جاتا اور فوراً ہی مارا جاتا۔

''خدا کے لیے نہیں اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہو گا؟''

''یہاں بیٹھے رہنے کی صورت میں بھی تو مارے جائیں گے۔''

مارشا اب تک خاموش تھی لیکن اپنی بچی کا خون دیکھ کر اس سے رہا نہیں گیا تھا، اس نے ڈین سے کہا۔ ''سنو میں ایڈی کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' ڈین تند لہجے میں بولا۔

مارشا رو دی تھی۔ ''ڈین اگر میری بچیوں کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گی اس لیے ہمیں یہ کڑوا گھونٹ پینا ہو گا۔''

ڈین اس کے لیے تیار نہیں تھا لیکن مارشا کے زور دینے پر وہ مان گیا، اپنی بچیوں کو مرتے دیکھنا اس کے بس سے بھی باہر تھا۔ اس نے مجبوراً ایڈی سے کہا۔ ''میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں لیکن تم مارشا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔''

ایڈی اور اس کے ساتھی ہنسنے لگے پھر ایڈی نے کہا۔ ''تم بھیجو تو ہم اسے بہت پیار سے رکھیں گے۔''

ڈین کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ ایسی ذلت سے موت اچھی تھی۔ یہ سوچ کر وہ اچانک اٹھا اور رائفل سامنے کرتے ہوئے چٹان تلے سے نکل آیا۔ ایڈی اور اس کے ساتھی شاید اس کے لیے تیار نہیں تھے اور وہ سامنے تھے ڈین کی چلائی پہلی گولی ایڈی کے ایک ساتھی کے سینے میں اتر گئی اور وہ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ نیچے آ گرا۔ ایڈی نے عجلت میں ڈین پر فائر کیا لیکن گولی اسے نہیں لگی۔ اسی لمحے ایڈی کا دوسرا ساتھی گولی کھا کر گرا لیکن یہ گولی ڈین نے نہیں چلائی تھی۔ فائر کہیں اور سے ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ ایڈی یا اس کا بچنے والا ساتھی کچھ سمجھتے، ایک اور فائر ہوا اور ایڈی کا آخری ساتھی بھی مارا گیا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی ایڈی نے چٹان کے دوسری طرف چھلانگ لگائی اور کچھ دیر بعد گھوڑا دوڑانے کی آواز آئی۔ ڈین تیزی سے باہر نکلا لیکن ایڈی فرار ہو گیا تھا۔ ڈین اس کی طرف سے مایوس ہو کر اپنے اس نادیدہ ہمدرد کو تلاش کرنے لگا جس نے اسے مرنے سے بچایا تھا۔ اگر وہ ایڈی کے دونوں ساتھیوں کو نہ مارتا تو وہ اسے مار دیتے۔

''تم کون ہو، سامنے آؤ۔'' ڈین نے بلند آواز میں کہا تو ایک چٹان کے اوپر سے متحرک آوازیں آئیں اور پھر ایک انڈین لڑکھڑاتا ہوا نیچے اترنے لگا، اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور بایاں شانہ خون آلود تھا۔ وہ اس طرح لڑکھڑا رہا تھا جیسے ابھی گر جائے گا۔ ڈین اپنی رائفل پھینک کر بھاگا اور اس نے انڈین کو سہارا دیا۔ وہ اسے نیچے لایا۔ مارشا اور بچے بھی باہر آ گئے تھے۔ مارشا نے انڈین کا شانہ دیکھا۔ ''یہ زخمی ہے..... لیکن یہ کون ہے؟''

''فی الحال تو ہمارا محسن ہے، اسی نے ایڈی کے دو ساتھیوں کو گولی مار کر مجھے بچایا تھا۔''

''تم بگھی تلاش کرو، اس میں مرہم پٹی کا سامان ہے۔'' مارشا نے کہا۔ ''میں اسے دیکھتی ہوں۔''

انڈین نیم بے ہوش تھا، اس کی آنکھیں نیم وا تھیں لیکن وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جب تک ڈین بگھی تلاش کر کے لایا۔ مارشا نے اپنے لباس سے ایک پٹی پھاڑ کر انڈین کا زخم صاف کیا۔ گولی اندر ہی تھی اور اس نے زخم کو خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔ گولی نکالنا لازمی تھا۔ ڈین بگھی سے مرہم پٹی کا سامان نکال کر لایا۔ پھر اس نے لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی مارشا نے بچیوں کو ڈین کے سپرد کیا اور خود انڈین کے شانے سے گولی نکالنے کی تیاری کرنے لگی۔ اس نے آگ پر چاقو تپا کر پہلے اسے صاف کیا اور پھر ڈین سے کہا۔ ''اسے مضبوطی سے پکڑو میں گولی نکالتی ہوں۔''

چند منٹ میں وہ انڈین کے شانے سے گولی نکال کر زخم کو گرم چاقو سے داغ چکے تھے۔ پھر مارشا نے ریٹا کے پاؤں کی مرہم پٹی کی۔ ڈین، انڈین اور ایڈی کے مارے جانے والے ساتھیوں کے گھوڑے بھی لے آیا تھا۔ ایڈی فرار ہو گیا تھا اور ڈین کو اس کا افسوس تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کینہ پرور شخص دوبارہ اس کے پیچھے آئے گا۔ تین دن میں اس کے پانچ ساتھی مارے جا چکے تھے لیکن اس کے پاس بدمعاشوں کی کمی نہیں تھی۔ شانے سے گولی نکل جانے کے بعد انڈین سکون سے سو گیا تھا۔ مارشا نے اسے کچھ پانی بھی دیا تھا۔ ڈین پانی کی تلاش میں نکلا تو اسے کچھ دور ہی دریا کی ایک اندر تک آتی شاخ مل گئی۔ وہ پانی لے کر آیا تو تھکن اور بھوک سے نڈھال مارشا چنے کھا کر سو گئی تھی' بچیاں اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ ڈین نے اسلحہ بھی جمع کر لیا، اس وقت اسے اسلحے کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے مارشا اور بچیوں کو اٹھا کر بگھی میں بھیج دیا، وہاں وہ آرام سے سو سکتے تھے۔ خود وہ الاؤ اور انڈین کے پاس بیٹھا رہا۔ اپوچی دو گھنٹے بعد بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے ڈین کی طرف دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

''میرے شانے سے گولی نکال دی ہے؟''

ڈین نے سر ہلایا۔ ''میری بیوی نے نکالی ہے۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔ اگر تم ان بدمعاشوں کو نہ مارتے تو وہ ہمیں مار دیتے۔''

''اگر میں تمہاری بچی کے رونے کی آواز نہ سن لیتا تو اس معاملے میں دخل نہ دیتا۔'' اپوچی نے انگاروں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس پانی ہے؟''

ڈین نے اسے پانی پلایا۔ وہ اس کے بارے میں متجسس تھا۔ ڈین کو معلوم تھا کہ اس علاقے میں اب انڈین کم ہی پائے جاتے۔ سفید فاموں نے انہیں دور جنوب اور مغرب کی طرف دھکیل دیا تھا جہاں نہ پانی تھا اور نہ زرخیز زمینیں۔ پانی پی کر اپوچی نے ڈین کو اپنی داستان سنائی۔ وہ جانتا تھا کہ اپوچی نے اس میں ایک لفظ جھوٹ کا نہیں کہا ہو گا۔

ڈین نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی نسل کے لوگ ان مقامی لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں لیکن اس وقت وہ خود اس تجربے سے گزر چکا تھا جس سے مقامی لوگ آئے دن گزرتے تھے۔ جس طرح انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا جاتا تھا اسی طرح ڈین اور اس کے خاندان کو ان کی زمین سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ صرف جان بچا سکے تھے اور ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔

''میرے قبیلے کے بچے کھچے لوگ ایک خشک وادی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں ان کے لیے خوراک لینے گیا تھا لیکن......'' اپوچی خاموش ہو گیا، اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ''میرے ساتھ جانے والوں میں سوائے میرے کوئی نہیں بچا۔''

''مجھے تم سے ہمدردی ہے دوست۔'' ڈین نے کہا۔ ''کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا۔''

اپوچی نے اٹھ کر اپنے شانے کا جائزہ لیا۔ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا، اس نے ڈین سے کہا۔ ''یہاں خطرہ ہے۔ اگر وہ شخص فوجیوں کو لے آیا تو ہم سب مارے جائیں گے۔''

ڈین چونک گیا واقعی ایڈی جیسے کمینے شخص سے کچھ بعید نہیں کہ وہ فوج کو لے آئے اور ڈین کو بھی اپوچی کا ساتھی ثابت کر دے۔ جو سفید فام انڈین قبائل کا ساتھ دیتا یا ان کی حمایت کرتا اسے بھی مجرم سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اپوچی سے پوچھا۔ ''یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم چھپ سکیں؟''

''وہ وادی ہے جہاں میرے لوگ چھپے ہیں۔ اس میں جانے کے راستے سے بس ہم انڈین واقف ہیں۔ وہاں ایک غار میں پانی کا چشمہ بھی ہے۔ لیکن ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔''

ڈین، اپوچی کے ساتھ اس وادی تک جانے کو تیار ہو گیا۔ وہ فی الحال ایڈی کی نظروں سے دور رہنا چاہتا تھا۔ مارشا کو معلوم ہوا تو اس نے دبے لہجے میں اس کی مخالفت کی۔ ''ڈین، ہم نہیں جانتے یہ کس قسم کے انڈین ہیں۔''

''اس شخص نے ہماری جان بچائی تھی۔''

''اس نے بچائی تھی لیکن اس کے قبیلے والے ہمیں اس طرح نہیں دیکھیں گے۔ وہ سفید فاموں کے ہاتھ سے زخم کھا چکے ہیں اور اس وقت غصے میں ہوں گے۔''

''مجھے یقین ہے اپوچی ہماری حمایت کرے گا اور

www.Paksociety.com

وہاں بھی اس کے قبیلے میں صرف عورتیں، بچے اور بوڑھے رہ گئے تھے۔ اپوچی کا کہنا ہے کہ لڑنے والے جوان آدمی اس کے ساتھ گئے تھے اور مارے گئے۔"

"پھر بھی ہمیں اس کے ساتھ جانے کے بجائے سفر جاری رکھنا چاہیے۔" مارشا نے اصرار کیا۔

"ایڈی سانپ کی طرح پلٹ کر وار کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ واپس آئے گا۔ وہ ہمیں تلاش کر سکتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ضروری ہے، ہم کچھ عرصے کہیں روپوش رہیں۔"

"ان کے پاس خوراک بھی نہیں ہے۔ ہم کہاں سے کھائیں گے؟"

"اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔" ڈین نے جھنجلا کر کہا۔ "سب سے پہلے ہمیں کسی پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔"

مارشا خاموش ہو گئی۔ شام کو وہ سب روانہ ہوئے۔ اپوچی کا کہنا تھا کہ رات میں سفر مناسب رہے گا کیونکہ صبح سے پہلے ان کی تلاش شروع ہو جاتی، اس سے پہلے وہ وادی تک پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔ ڈین نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ وہ صبح ہونے تک سفر کرتے رہے اور روشنی ہونے سے پہلے ہی وادی تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے اندر جانے کا راستہ ایک نہایت تنگ درے سے شروع ہوتا تھا جس میں آدمی اور گھوڑے بھی بہ مشکل جا سکتے تھے، بگھی جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے اپوچی اندر گیا اور اپنے ساتھ کچھ لوگ لے کر آیا جو سامان اور گھوڑوں کو اندر لے گئے تھے۔ ڈین اپنی بگھی کے لیے فکرمند تھا۔ وہ اندر نہیں جا سکتی تھی اور اگر کوئی ان کے پیچھے آتا تو بگھی سے وادی کا سراغ پا سکتا تھا۔ جب ڈین اور مارشا وادی میں پہنچے تو حیران رہ گئے۔ اس علاقے اور پہاڑوں کی ویرانی سے قطع نظر وادی سرسبز تھی اور یہاں جھاڑیوں کے ساتھ بڑے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔

"ہم اس علاقے میں سفر کے دوران اس وادی کو پڑاؤ کے لیے استعمال کرتے تھے۔" اپوچی نے کہا۔ "اب یہ ہماری پناہ گاہ ہے۔"

وادی میں اپوچی کے قبیلے کے کوئی تین درجن افراد تھے اور جب اپوچی نے بتایا کہ اس کے ساتھ جانے والے مارے جا چکے ہیں تو ان کے لواحقین آہ و بکا کرنے لگے تھے۔ مارشا کا خدشہ غلط نکلا تھا۔ ان میں سے کسی نے نہ تو انہیں نفرت سے دیکھا اور نہ ہی ان کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ البتہ وہ ان سے دور رہے تھے۔ قبیلے میں کوئی بڑا نہیں تھا اور ایک طرح سے اپوچی ہی ان کا سردار تھا۔ جیسے ہی ڈین اس سے دوبارہ ملا اس نے بگھی کے بارے میں اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ "میرا خیال ہے ہمیں بگھی کھول کر اندر لے آنا چاہیے۔"

"وہ کھل جائے گی؟" اپوچی نے پوچھا۔

"بالکل..... بس دو تین آدمی چاہئیں۔"

اپوچی نے چند آدمی اس کے ساتھ کر دیے اور وہ ان کے ساتھ جا کر بگھی کے ٹکڑے کر کے لے آیا۔ انڈینز کے پاس خوراک بچ بچ بہت کم تھی۔ اپوچی کی غیر موجودگی میں ان کی عورتوں نے وادی میں کچھ پودے دریافت کیے تھے جن کی جڑیں کھائی جا سکتی تھیں۔ فی الحال وہی ان کی خوراک تھی۔ ڈین نے وادی کا جائزہ لیا۔ یہ خاصی بڑی تھی اور یہاں پانی بھی تھا۔ ایک غار سے قدرتی چشمہ نکل رہا تھا اور اس کا پانی ایک تالاب کی صورت میں جمع ہوتا تھا۔ زمین ہموار تھی اور ڈین کے خیال میں بہت زرخیز بھی تھی۔ اس نے اپوچی سے کہا۔ "اگر اسے کاشت کیا جائے تو بہت اچھی فصل ہو سکتی ہے لیکن افسوس یہاں بیج نہیں ہیں۔"

"نہیں، بیج ہیں۔" اپوچی نے جوش سے کہا۔ "ہم انڈین بیج ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کی طرح ان کی حفاظت کرتے ہیں۔"

ان کے پاس مکئی، آلو اور سبزیوں کے بیج تھے۔ اگلے دن سے ڈین نے اپوچی اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے زمین جھاڑیوں سے صاف کر کے ہموار کرنا شروع کر دی۔ ان کے پاس اوزار نہیں تھے اس لیے سارا کام ہاتھوں اور لکڑی کے معمولی اوزاروں سے کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ لوگ خیموں میں رہتے تھے، اس لیے وہ اب تک کھلی جگہ پڑے تھے۔ ڈین نے اپوچی کو قائل کیا کہ انہیں چٹانوں میں بنے غاروں میں رہنا چاہیے اور وادی کی زمین کو صرف کاشت کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ خوش قسمتی سے ڈین کے پاس بگھی میں کچھ اوزار رکھے تھے جیسے کلہاڑی اور آری وغیرہ۔ ان کی مدد سے انہوں نے ایک درخت کاٹ کر اس کی لکڑی سے ہل اور دوسرے زرعی آلات تیار کیے۔ جوان مردنہ ہونے کے برابر تھے اس لیے عورتوں اور بوڑھوں کو بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

مارشا حیران تھی کہ ڈین اپنا راستہ لینے کے بجائے یہ سب کیا کر رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ دو تین دن بعد وہ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے لیکن دو ہفتے گزر جانے کے بعد بھی وہ یہیں موجود تھا۔ مارشا اس سے پوچھتی تو وہ اسے ٹال جاتا تھا لیکن جب ڈین نے دوسروں کے ساتھ مل کر وادی کی ساری زمین ہموار کر دی اور اس پر مکئی اور دوسری فصلوں کے بیج

لگانے لگا تو مارشا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک رات اس نے ڈین کو لیا اور وادی کے سب سے دور دراز حصے میں لے گئی جہاں ان کی گفتگو کوئی اور نہ سن سکے۔ مارشا نے کہا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو، اب ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

ڈین نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ان لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کر یہاں سے نہیں جا سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو مارشا، اپوچی ہمارا محسن ہے اس نے نہ صرف میری جان بلکہ تمہاری عزت اور ہماری بچیوں کی زندگیاں بھی بچائی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے، ایڈی ایک بار ہم پر قابو پا لیتا تو ہمیں چھوڑ دیتا۔ نہیں وہ اپنا مطلب نکال کر سب کو مار کر ان چٹانوں میں کہیں دفن کر دیتا تاکہ اس کے جرم کا کوئی سراغ باقی نہ رہے۔ اب اپوچی اور اس کے قبیلے والوں کو میری مدد کی ضرورت ہے تو میں ان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"ہم ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟"

"فی الحال تو جو کر رہے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ ایک بار ان کی خوراک کا مسئلہ حل ہو جائے تو یہ اپنے باقی مسائل سے خود نمٹا سکتے ہیں۔"

"کیا یہ اس علاقے میں محفوظ رہیں گے؟ اگر حکومت کو پتا چل گیا تو وہ انہیں یہاں سے بھی نکال دے گی۔"

اس کی بات سن کر ڈین سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ "مارشا یہ بات بھول جاؤ کہ ابھی ہمیں یہاں سے جانا ہے ہم یہیں رہیں گے اور دوسری بات یہ کہ تم ان کی عورتوں سے گھلو ملو اور ان کی مدد کرو۔ تمہارا اس طرح الگ رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ یہ بہت معصوم اور محبت کرنے والے لوگ ہیں، کیا تم نے ان کے انداز میں ذرا سی بھی نفرت محسوس کی ہے؟ جبکہ ہمارے ہم قوموں نے ان کے ساتھ ظلم کی انتہا کر دی تھی۔"

مارشا نادم ہو گئی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں اب خیال رکھوں گی اور میں تم سے متفق ہوں کہ ہمیں ان کی پوری مدد کرنا چاہیے۔"

ڈین نے سکون کا سانس لیا۔ "شکر ہے تم میری بات سمجھ گئیں۔"

ان کے پاس کل ایک درجن گھوڑے اور گھوڑیاں تھے۔ اپوچی نر گھوڑوں سے کام لیتا تھا اور ماداؤں کو اس نے افزائش نسل کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ گھوڑے ان کی دولت تھے۔ اسی طرح ان کے پاس کچھ مرغیاں تھیں۔ عورتیں ان کی حفاظت اور پرورش کرتی تھیں۔ یہ مستقبل کی خوراک کا ذریعہ تھے۔ جو جڑیں وہ ابھی خوراک کے لیے استعمال کر رہے تھے ان کی تعداد محدود ہوتی جا رہی تھی۔ اپوچی چاہتا تھا کہ وہ وادی سے باہر جا کر خوراک تلاش کرے لیکن ڈین نے اسے منع کر دیا۔ "اس میں خطرہ ہے۔ اگر ایڈی نے حکام کو تمہارے بارے میں بتایا ہو گا تو علاقے میں فوجی دستے موجود ہوں گے۔"

"ہم ساری عمر تو اس وادی میں بند ہو کر نہیں رہ سکتے۔"

"میرے دوست تمہیں صبر سے کام لینا ہو گا۔" ڈین نے نرمی سے کہا۔ "ابھی وادی سے باہر جانے کا موقع نہیں ہے بلکہ وادی میں آنے والے راستے کو بھی بند کر دیا جائے تو بہتر ہو گا تاکہ کوئی اتفاق سے بھی اس راستے کو دریافت نہ کر سکے۔"

اپوچی، ڈین سے متفق نہیں تھا لیکن اس نے مخالفت بھی نہیں کی تھی۔ ڈین اور اس کے ساتھیوں نے مل کر راستہ اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ دراڑ آگے جا کر کسی وادی میں کھلتی ہے۔ چاروں طرف اتنی اونچی چٹانیں تھیں کہ وادی کسی جگہ سے نظر نہیں آتی تھی حالانکہ اس کا رقبہ ایک مربع کلومیٹر سے ذرا کم ہو گا۔ خوراک رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی اس لیے بھی اپوچی اور اس کے ساتھی زیادہ فکرمند تھے۔ ابھی مکئی، آلو اور سبزیوں کی فصل تیار ہونے میں وقت تھا۔ اپوچی یہاں سے کچھ دور ایک ایسی جگہ سے واقف تھا جہاں جنگلی بھینسے ملتے تھے۔ سفید فاموں نے ایک پلاننگ کے تحت جنگلی بھینسوں کو ختم کیا تھا کیونکہ ہزاروں برس سے یہ جنگلی بھینسے انڈین قبائل کی خوراک کا اہم حصہ تھے۔ یہ ختم ہوئے تو انڈین قبائل کی خوراک کم ہو گئی تھی اور وہ بھوکوں مرنے لگے۔ ان کی زمینیں چھین کر انہیں بنجر علاقوں میں دھکیلنے کا مقصد ان کی منظم نسل کشی کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک صدی کے اندر صرف کولوریڈو میں دس لاکھ سے زیادہ انڈین مر چکے تھے اور اب ان کی تعداد ہزاروں میں رہ گئی تھی۔

ڈین اس لیے بھی اپوچی اور اس کے ساتھیوں کے باہر جانے کی مخالفت کر رہا تھا کہ اگر وہ پکڑے جاتے تو اس وادی کا پتا بتا سکتے تھے اور پھر ان میں سے کوئی نہیں بچتا۔ فوج ڈین اور اس کے بیوی بچوں کو بھی ختم کر دیتی اور اگر وہ فوج سے بچ جاتے تو ایڈی جیسا بدمعاش انہیں نہ چھوڑتا۔ اس لیے وہ اپوچی کو سمجھا رہا تھا کہ وہ عجلت سے کام نہ لے۔ ڈین نے زمین پر کام کے لیے کارکن تیار کر لیے تھے۔ یہ زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔ اپوچی سمیت جوان جن کی تعداد نصف درجن بھی نہیں تھی۔ محنت والے کاموں اور

www.Paksociety.com

پہرے پر مامور تھے۔ اپوچی نے داخلی حصے میں ایک بلند جگہ نگران چوکی بنادی تھی جہاں اس کے آدمی چوبیس گھنٹے آس پاس نظر رکھتے تھے تا کہ کوئی اس طرف آرہا ہو تو وہ بروقت خبردار ہو جائیں۔

دو مہینے بعد ان کے پاس خوراک تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ بڑے بھوک سے نحیف اور نڈھال ہو رہے تھے اور بچے روتے رہتے تھے۔ ابھی مکئی کی فصل پکنے میں ایک مہینے سے زیادہ وقت تھا، آلو اس سے بھی زیادہ وقت لیتا البتہ کچھ سبزیاں جلد پک جاتیں مگر اس میں بھی کم سے کم دو ہفتے کا وقت چاہیے تھا۔ اگر انہیں خوراک نہ ملتی تو وہ اتنے دن زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ڈین نے وادی میں ایسی جگہوں پر جہاں فصل نہیں لگائی جا سکتی تھی وہاں جنگلی گھاس کے بیج ڈال دیے تھے اور ان جگہوں پر بھی باقاعدگی سے پانی دیا جاتا تھا۔ اس سے وہاں بہت تیزی سے جنگلی گھاس اگ آئی تھی۔ گھوڑوں کو یہی گھاس کھلائی جاتی تھی، اس سے ان کی صحت برقرار تھی بلکہ کوئی خاص کام نہ کرنے کی وجہ سے وہ خاصے موٹے تازے ہو رہے تھے۔ ڈین نے اپوچی کو تجویز پیش کی۔

''ہم ایک دو گھوڑے کاٹ کر کھا لیتے ہیں۔''

اپوچی یہ سن کر پہلے تو بدک گیا تھا کیونکہ اس کے نزدیک یہ گھوڑے ان کی دولت تھے لیکن اگر وہ زندہ اور مضبوط رہتے تب ہی گھوڑوں سے کام لے سکتے تھے۔ اگر وہ نہ رہتے تو گھوڑے کس کے کام آتے۔ اس لیے مجبوراً وہ ڈین کی تجویز سے متفق ہو گیا۔ انہوں نے ایک تقریباً بوڑھا ہو جانے والا گھوڑا کاٹ لیا اور وہ سب اسے تین دن تک کھاتے رہے۔ اس میں سے اچھا خاصا گوشت نکلا تھا۔ وہ اسے تین دن سے زیادہ کھا سکتے تھے لیکن اس کے بعد گوشت خراب ہو جاتا۔ گھوڑے کا گوشت سوکھ کر اپنی توانائی کھو دیتا ہے۔ اس لیے انہوں نے جلدی ختم کر لیا، اس سے ان کی توانائی آنے والے کئی دن کے لیے بحال ہو گئی مگر ایک ہفتے بعد انہیں دوسرا گھوڑا بھی کاٹنا پڑا۔ اس سے بھی آنے والے ایک ہفتے کی خوراک کا انتظام ہو گیا۔ موسم سرد اور خشک ہو رہا تھا اس لیے وہ اس بار چار دن تک گوشت بچانے میں کامیاب رہے تھے۔

اس کے بعد سبزیوں کی فصلیں یکے بعد دیگرے پکنے لگی تھیں۔ یوں خوراک کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا اور جب مکئی اور آلو پکے تو خوراک ضرورت سے زیادہ ہو گئی تھی جسے اپوچی اور اس کے ساتھیوں نے اپنے طریقے سے محفوظ کر لیا۔ کئی مہینوں بعد ان کی زندگی میں خوشیاں آئی تھیں اور وہ خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ ایک رات انہوں نے اس کا جشن منایا تھا جس میں انہوں نے جی بھر کر مکئی سے کشید کی ہوئی شراب پی تھی۔ انڈین عورتیں اپنے روایتی انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ وہ مارشا کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ لے گئیں، وہ ہنستے ہوئے ان کے انداز میں رقص کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈین اور اپوچی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اچانک اپوچی نے کہا۔

''دوست میں تمہارا شکر گزار ہوں تم نے بہت دانش مندی سے ہمیں یقینی موت سے بچایا ہے لیکن اب ہم کیا کریں؟''

''کیا مطلب؟''

''جب سفید فاموں کو اس وادی کا پتا چلے گا تو کیا وہ ہمیں یہاں سے بھی بے دخل نہیں کر دیں گے؟''

ڈین سوچ میں پڑ گیا۔ اپوچی کا خدشہ درست تھا اگر مقامی انتظامیہ کو ان انڈینز کا پتا چل جاتا تو وہ فوج بھیج کر انہیں یہاں سے بھی مار بھگاتے۔ حکام زرخیز زمینوں پر انڈینز کو برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس نے اپوچی سے کہا۔ ''اگر میں مقامی حکام سے بات کروں اور تمہاری طرف سے ضمانت دوں کہ تم لوگ اب کبھی فوج یا سفید فاموں پر حملہ نہیں کرو گے تو امکان ہے کہ تمہیں یہاں آباد ہونے کی اجازت مل جائے۔''

''امکان ہے۔'' اپوچی نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''یعنی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ انکار ہو جائے اور پھر ہمارے خلاف فوج کو بھیجا جائے یا ہمیں یہاں سے کہیں اور جانا پڑے۔''

''ایسا ہو سکتا ہے۔'' ڈین نے بے بسی سے کہا۔ ''میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں۔''

اپوچی نے سوچا اور سرد آہ بھری۔ ''ہاں دوست، تم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ تم ویسے ہی ہمارے لیے بہت کچھ کر چکے ہو۔ بہتر ہوگا تم یہاں سے چلے جاؤ تا کہ اگر ہم پر کوئی مشکل آئے تو تم اس سے محفوظ رہو۔''

ڈین بھی اب یہی سوچ رہا تھا۔ اس کے بس میں جو تھا وہ اس نے اپوچی اور اس کے قبیلے کے لیے کر دیا تھا، اب اسے اپنی بیوی اور بچیوں کے ساتھ کیلیفورنیا کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ وہاں اسے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ زمین خرید کر اسے آباد کر سکتا تھا۔ ڈین نے اپوچی سے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں کل تیاری کروں گا اور پرسوں ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔''

www.Paksociety.com

اگلے دن اپوچی اور اس کے ساتھیوں نے وادی میں آنے والا راستہ کھول دیا۔ ڈین نے بگھی کے حصے وادی سے اوپر پہنچائے اور انہیں جوڑنے لگا۔ شام تک اس نے بگھی جوڑ لی تھی اب وہ کل صبح یہاں سے روانہ ہو سکتے تھے۔ اس رات تمام قبیلے والوں نے ان کے اعزاز میں مشترکہ ضیافت دی تھی وہ ڈین اور مارشا کے احسان مند تھے جنہوں نے اس مشکل دور میں ان کا ساتھ دیا اور انہیں پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ الاؤ روشن تھے اور ابھی کھانے پینے کا دور چل رہا تھا کہ نگرانی کرنے والے نے مخصوص آواز نکال کر خطرے کا سگنل دیا۔ ان میں افراتفری مچ گئی۔ الاؤ بجھا دیے گئے۔ عورتوں اور بچوں کو غاروں میں بھیج دیا گیا اور مرد مسلح ہو کر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد راستے سے نصف درجن کے قریب افراد نمودار ہوئے۔ جیسے ہی وہ سامنے آئے اپوچی نے بلند آواز سے کچھ کہا اور آنے والے رک گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ کچھ دیر اپوچی اور اس کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر وہ آمنے سامنے آگئے اور مشعلیں روشن کر لی گئیں۔ یہ بھی انڈین تھے اور ان کے نقوش اور حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ اپوچی کے قبیلے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ابھی تک پرسکون تھے لیکن جیسے ہی ان کی نظر ڈین پر گئی وہ بھڑک گئے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار تان لیے۔

''یہ سفید فام یہاں کیسے آیا؟'' اپوچی سے بات کرنے والا چیخ کر بولا۔

ڈین نے اپوچی کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''یہ ہمارے برادر قبیلے کا چیف کارپو ہے۔'' اپوچی نے تعارف کرایا اور کارپو سے کہا۔ ''ہتھیار نیچے کر لو، یہ ہمارا دوست ہے اور اس نے ہماری جان بچائی ہے۔''

''تم ایک سفید فام کو دوست کہہ رہے ہو۔'' کارپو کا انداز خطرناک تھا۔ ''اس کا مطلب ہے تم بھی غدار ہو گئے ہو۔ اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ مارے جاؤ گے۔''

اپوچی اور اس کے ساتھی مطمئن ہو گئے تھے اور ان کے ہتھیار ان کے شانوں پر تھے جبکہ کارپو اور اس کے ساتھیوں کے ہتھیار ان کے ہاتھوں میں تھے۔ اگر وہ مزاحمت کرتے تو بچ مچ مارے جاتے۔ ایک منٹ میں ان سب کے ہتھیار لے لیے گئے اور کارپو کے آدمی ان کے ہاتھ پشت پر باندھ رہے تھے۔ اپوچی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اس نے کارپو سے کہا۔ ''تم مجھے میرے مہمان کے سامنے بے عزت کر کے اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''تم اسی سلوک کے مستحق ہو تم ایک سفید فام کی حمایت کر رہے ہو۔'' کارپو بولا۔ اس کے آدمیوں نے انہیں میدان میں بٹھا دیا اور اب قبیلے والوں کو دیکھ رہے تھے انہیں شک تھا کہ شاید ان کے درمیان مزید سفید فام موجود ہیں۔ اپوچی اور ڈین ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اپوچی نے سرگوشی میں کہا۔

''کارپو کمینہ آدمی ہے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ میرے قبیلے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس وقت بھی باہر سے کچھ کر کے آیا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''جب فوج نے ہمارے خلاف کارروائی کی تو میرے قبیلے کے ساتھ اس کے قبیلے کو بھی علاقے سے نکال دیا گیا تھا اور کارپو اپنے قبیلے والوں کو مغرب کی طرف کہیں لے گیا تھا۔ اس کے بعد سے میں اب اسے دیکھ رہا ہوں۔ میں کارپو کے انداز میں خون کی بو محسوس کر رہا ہوں، یہ کہیں خونریزی کر کے آیا ہے۔''

اپوچی کی بات سے ڈین کے اندر ایک خدشہ ابھرا۔ ''کہیں یہ فوج یا سفید فاموں سے لڑائی کر کے تو نہیں آیا ہے اور پناہ کے لیے یہاں آ گیا ہو۔''

اپوچی نے سر ہلایا۔ ''مجھے بھی یہی خیال آیا ہے۔''

''اس صورت میں فوج اس کے پیچھے ہو گی اور اگر انہوں نے اپنے نشان چھوڑے ہوں گے تو فوج یہاں وادی تک بھی آ سکتی ہے۔''

''اگر ایسا ہوا تو ہماری باقی بربادی بھی مکمل ہو جائے گی۔''

ڈین پریشان ہو گیا تھا۔ فوج آنے کا مطلب تھا قتل و غارت گری، جس میں اس سمیت کوئی بھی نہ بچتا۔ کارپو اور اس کے ساتھی ان پر قابو پا کر کھانے اور شراب پر ٹوٹ پڑے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک مستقل ان کی نگرانی پر مامور تھا اور اس نے شراب پینے سے گریز کیا تھا۔ باقی سب جلد نشے میں دھت ہو گئے۔ ڈین بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا۔ اچانک وہ کسی کی کراہ سن کر چونکا۔ الاؤ بجھا دیا گیا تھا اور وہاں نیم تاریکی تھی، پھر کوئی ڈین کے پیچھے آیا اور اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ میں ہوں، آرام سے بیٹھو تمہارے ہاتھ کھول رہا ہوں۔''

آواز اپوچی کی تھی اس نے ڈین کے ہاتھ کھولے اور خاموشی سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے وادی سے باہر جانے والے راستے پر آئے۔ ڈین، مارشا اور

بچیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپوچی سے ان کے بارے میں سوال کرتا اس نے انہیں باہر بگھی کے پاس پایا۔ اپوچی دو گھوڑے بھی کھول کر لے آیا تھا۔ اس نے ڈین سے کہا۔ ”میں نے کارپو کے آدمی کو پتھر مار کر بے ہوش کردیا ہے، باقی سب نشے میں دھت ہیں، یہ صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گے اور اس وقت تک میرے آدمی سب سنبھال لیں گے لیکن تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ۔“

ڈین، اپوچی کے گلے لگا اور پھر بگھی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ مارشا اور بچیاں پیچھے موجود تھیں۔ مارشا کا خیال تھا کہ وہ مغرب یا جنوب کی طرف جارہے ہیں لیکن جب صبح نمودار ہوئی تو وہ دریائے کولوریڈو کے کنارے پر تھے اور شمال کی طرف جارہے تھے۔ مارشا نے پریشان ہو کر ڈین سے کہا۔

”یہ تم کہاں جارہے ہو؟“

”ڈینور کی طرف۔“

”لیکن ہمیں تو مغرب کی طرف کیلیفورنیا جانا تھا؟“

”ہاں لیکن میں نے فیصلہ بدل دیا ہے۔“ ڈین نے کہا۔ ”اب ہم ڈینور جارہے ہیں۔“

ڈینور ریاست کولوریڈو کا دارالحکومت ہے۔ ڈین نے ایک آسان جگہ سے دریا عبور کیا۔ انہیں آج کے دن ہی کسی بستی تک پہنچنا تھا کیونکہ ان کے پاس خوراک نہیں تھی اور ان کا لباس تقریباً تباہ ہوگیا تھا۔ یہ خستہ لباس انڈینز کی وادی میں تو چل جاتا لیکن کسی مہذب بستی میں نہیں چل سکتا تھا۔ شام تک وہ ایک بستی تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ یہاں انہیں کھانا اور کپڑے بھی مل گئے۔ رات گزارنے کے ایک ہوٹل میں کمرا بھی مل گیا تھا۔ ڈین نے ایک سیلون میں نہا دھو کر شیو اور بال بنوائے اور نیا لباس پہنا۔ مارشا اور بچوں نے بھی نئے جوڑے پہنے تھے۔ اگلے دن وہ ڈینور کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈین نے رائفل کے لیے مزید کارتوس لے لیے تھے اور قصبے سے ایک عدد پستول بھی حاصل کرلیا تھا۔ تیز رفتاری سے سفر کرنے کے لیے اس نے دو گھوڑے مزید خریدے تھے۔ اس کے پاس رقم اور سونا تھا جس سے وہ ہر چیز خرید سکتا تھا۔

وہ دو دن کے سفر کے بعد ڈینور پہنچے۔ مارشا کا یہ خدشہ باطل ثابت ہوا تھا کہ ایڈی اور اس کے ساتھی راستے میں کہیں ان کا راستہ روکیں گے۔ ڈین نے اس سے کہا۔ ”اس واقعے کو کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے ایڈی ہمیں بھول چکا ہوگا ورنہ صبر تو کر ہی چکا ہوگا۔“

ڈینور میں وہ ایک اچھے ہوٹل میں رکے تھے۔ مارشا اور بچیاں کئی مہینوں بعد سکون اور آرام کی زندگی گزار رہے تھے اور وہ بہت خوش تھے۔ ڈینور چھوٹا لیکن خوب صورت قصبہ نما شہر تھا جہاں ماحول اچھا اور تفریح کے بہت سارے ذرائع تھے۔ ڈین نے مارشا اور بچوں کو تفریح میں چھوڑا اور خود بیشتر وقت ہوٹل سے غائب رہتا تھا۔ مارشا نے کئی بار اس سے پوچھا لیکن وہ اسے ٹال جاتا تھا۔ چند دنوں میں مارشا کو یہ شہر اتنا اچھا لگنے لگا کہ اس نے ڈین سے کہا۔ ”کیا ہم یہاں نہیں رہ سکتے؟“

”رہ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے مجھے کاشت کاری چھوڑ کر کوئی اور پیشہ اپنانا پڑے گا۔“

”پلیز پاپا۔“ ریٹا نے بھی کہا۔ ”یہ بہت اچھی جگہ ہے۔“

بیوی اور بچی کے اصرار نے ڈین کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ دو دن بعد وہ مارشا اور بچیوں کو ہوٹل سے ایک چھوٹے سے لیکن خوب صورت دو منزلہ مکان پر لے گیا جو شہر کے وسط میں تھا۔ اس میں اوپر رہائش تھی اور نیچے ایک بڑی سی دکان تھی۔ ڈین نے مارشا سے پوچھا۔ ”مکان کیسا لگا؟“

”بہت خوب صورت۔“ مارشا نے کہا۔

”میں نے اسے رہائش اور کاروبار کے لیے خرید لیا ہے۔ نیچے دکان میں ہم کوئی اسٹور قائم کریں گے۔“

مارشا خوش ہوگئی تھی۔ اس کے محبوب شوہر نے اس کی خواہش پوری کردی تھی۔ ڈین نے بتایا کہ اس نے ایک مقامی وکیل کی خدمات حاصل کی ہیں جو ان کے قصبے میں جا کر اس کی زمین اور مکان فروخت کرے گا۔ ڈین کے پاس جو کچھ تھا اس سے اس نے یہ مکان خرید لیا تھا اور اب اس کے پاس زیادہ رقم نہیں رہی تھی۔ اس نے یہ باقی رقم بھی مارشا کے سپرد کردی۔

”جب تک میں واپس آؤں گا تم اس کی مدد سے گزارا کروگی۔“

مارشا پریشان ہوگئی۔ ”تم کہاں جارہے ہو؟“

”مجھے کام سے جانا ہے۔“ ڈین نے اسے ٹالا لیکن مارشا سمجھ گئی تھی۔

”تم وادی کی طرف جارہے ہو نا......؟“

ڈین کو مجبوراً اقرار کرنا پڑا۔ ”ہاں میں وہیں جارہا ہوں۔“

”لیکن کیوں..... تم جانتے ہو وہاں تمہاری جان کے دشمن موجود ہیں اور اگر فوج آگئی تو......“

”میں اسی لیے تو جارہا ہوں۔ مارشا! اپوچی نے مجھ پر پھر احسان کیا۔ اگر وہ اس رات اپنی جان پر کھیل کر باہر نہ لاتا تو مجھے یقین ہے کارپو ہمیں نہ چھوڑتا۔ اب یہ میرا فرض ہے کہ میں اس کے اور اس کے لوگوں کے لیے کچھ کروں۔“

”تم ان کے لیے کیا کرسکو گے؟“

”کچھ نہ کچھ تو کرسکوں گا۔ اسی لیے تو وہاں جارہا ہوں۔“

مارشا اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی لیکن اس نے پھر ڈین کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ڈین کو اس پر فخر محسوس ہوا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی اور اس پر پورا حق رکھتی تھی لیکن اس کی خاطر وہ اپنے اس حق سے بھی دست بردار ہوگئی تھی۔ ڈین نے اس کے آنسو صاف کیے۔ ”ڈیئر! میں وعدہ کرتا ہوں کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا اور اپنی حفاظت کروں گا۔ تمہارے اور بچیوں کی خاطر۔“

”اب میں مطمئن ہوں۔“ مارشا بولی۔ ”یاد رکھنا میں اور بچیاں تمہارا انتظار کررہے ہوں گے۔“

”میں واپس آؤں گا۔ امکان ہے کہ میری غیر موجودگی میں وکیل مکان اور فارم کا معاملہ نمٹا کر آجائے گا۔ اسے اس گھر کا علم نہیں ہے، تم اس کے دفتر جا کر اس سے رقم وصول کرلینا۔“

”تم فکر مت کرو، میں یہ کام کرلوں گی۔“

ڈین نے بیوی بچوں کو نئے مکان میں منتقل کیا، ان کی ضرورت کا سامان لیا اور پھر وادی کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ایک گھوڑا اور کچھ سامان تھا۔ سردیاں عروج کی طرف آرہی تھیں تاہم ابھی برف باری کا آغاز نہیں ہوا تھا لیکن آسمان پر بادل آگئے تھے اور شمال کی طرف سے تیز ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا تھا جو اس کے آبائی علاقے سے الگ تھا۔ وہ ایڈی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

+++

اپوچی اور کارپو کا شدید جھگڑا ہوا تھا۔ اگلی صبح جب کارپو کو پتا چلا کہ اپوچی نے ڈین اور اس کے خاندان وہاں سے نکال دیا ہے تو وہ غصے سے پاگل ہو کر اپوچی پر چڑھ دوڑا تھا دونوں میں شدید ہاتھا پائی ہوئی لیکن پھر دونوں طرف سے ان کے ساتھیوں نے بیچ بچاؤ کردیا تھا۔ دونوں پارٹیاں مسلح تھیں اس لیے کسی قسم کے تصادم کا مطلب آپس میں خونریزی ہوسکتی تھی اور ابھی وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ آپس میں لڑتے۔ کسی وقت بھی سفید فام فوج ان کا گھیراؤ کرسکتی تھی۔ شاید اسی بات نے دونوں کو ٹھنڈا کیا تھا۔ کارپو فی الحال چپ ہوگیا تھا لیکن اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپوچی کی بالادستی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے عورتوں کا مطالبہ کردیا تھا لیکن اپوچی نے ان کا مطالبہ رد کردیا۔

”یہ ہماری عورتیں ہیں اور ہماری زندگی میں کوئی ان پر قبضہ نہیں کرسکتا۔“

قبیلے میں ایسی عورتیں جن کی عمریں چودہ سے چالیس سال کے درمیان تھیں، صرف ایک درجن رہ گئی تھیں جبکہ مردوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی لیکن ان میں جوان مرد اپوچی سمیت صرف سات تھے۔ باقی پانچ عورتیں بوڑھوں کے حصے میں آئی تھیں۔ گویا اگر کارپو اور اس کے ساتھی کوئی عورت حاصل کرنا چاہتے تو انہیں اس کے لیے لڑنا پڑتا اور ابھی وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے، اس سے اپوچی کے شبہے کو تقویت ملی تھی کہ کارپو اور اس کے ساتھی باہر نہیں کچھ کر کے آئے ہیں۔ اس نے ایک موقعے پر کارپو سے پوچھا بھی لیکن اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ وہ لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے اس لیے جب کچھ بتانے سے گریز کرنا ہو تو خاموش رہتے تھے۔

”اگر تم فوج یا سفید فاموں پر حملہ کر کے آرہے ہو تو بتا دو تاکہ ہم آنے والے وقت کے لیے تیار رہیں۔ میں بے خبری میں مارا جانا پسند نہیں کروں گا۔“

”میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔“ کارپو نے خشک لہجے میں کہا۔

اپوچی نے وادی میں آنے کا راستہ دوبارہ بند کرادیا تھا مگر یہ انتظام تسلی بخش نہیں تھا۔ اگر فوج یہاں آجاتی تو وہ وادی بھی تلاش کرسکتی تھی۔ ڈین کے جانے کے چوتھے دن فوج ان کے علاقے میں آگئی۔ یہ خاصا بڑا دستہ تھا اور ایسا لگ رہا تھا وہ اس علاقے میں مکمل تلاشی کا ارادہ لے کر آیا ہے۔ انہیں کسی کی تلاش تھی۔ اپوچی نے کارپو کو الزام دیا۔

”یہ یقیناً تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تلاش کرنے آئے ہیں۔“

کارپو نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”اگر ایسا ہے تو کیا تم ہمیں ان کے حوالے کردو گے اور کیا اس طرح تمہاری جان بچ جائے گی؟“

اپوچی دانت پیس کر رہ گیا۔ کارپو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جو پوزیشن کارپو اور اس کے ساتھیوں کی تھی وہی اپوچی اور اس کے قبیلے والوں کی بھی تھی فوج وادی تلاش کرلیتی اور ان پر قابو پالیتی تو وہ کسی کو نہیں چھوڑتے، عورتوں اور بچوں تک کو گولی مار دیتے یا پھانسی پر لٹکا دیتے، جیسا کہ وہ زندہ ہاتھ

www.Paksociety.com

آجانے والے انڈینز کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ فوجی دستہ خاصا بڑا تھا اور وہ کسی صورت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فوج کی اطلاع ملتے ہی کارپو نے اپوچی سے کہا۔ ”یہ تمہارے دوست کا کام ہے اسی نے فوج کو اس وادی کے بارے میں بتایا ہوگا۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اپوچی نے یقین سے کہا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو فوج سیدھی وادی کی طرف آتی۔“

اب بھی فوج وادی سے زیادہ دور نہیں تھی اور وہ کسی وقت بھی وادی میں آنے والے راستے کو دریافت کر سکتی تھی۔ اگلے دن ایسا ہی ہوا، کسی فوجی نے دراڑ دریافت کر لی جو وادی میں داخلے کا راستہ تھی اور جب اس نے اس میں آگے بڑھنے کی کوشش کی تو کارپو کے ایک عجلت پسند ساتھی نے اس پر گولی چلا دی۔ فوجی وہیں ڈھیر ہو گیا لیکن اس کے دستے کو پتا چل گیا کہ دراڑ میں کوئی ہے اور آناً فاناً دراڑ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ دراڑ تنگ اور چھوٹی تھی اس وجہ سے فوجیوں کو پیش قدمی میں دشواری ہو رہی تھی۔ دوسری طرف وادی میں محصور انڈینز بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے اور فوجی دستے کو مستقل روک بھی نہیں سکتے تھے جو سست روی سے سہی لیکن دراڑ میں آگے بڑھ رہا تھا۔

اپوچی اور کارپو اپنے ساتھیوں سمیت دفاع کر رہے تھے لیکن ان کے پاس اسلحہ محدود تھا اور کہیں سے رسد ملنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ ان کے پاس روایتی ہتھیار یعنی تیر کمان اور کلہاڑیاں بھی تھیں لیکن جدید آتشیں اسلحے کے مقابلے میں یہ بیکار تھیں۔ فوجی بڑی حکمت عملی سے مرحلہ وار آگے آ رہے تھے۔ انہوں نے اب تک کارپو کے تین ساتھیوں کو مار دیا تھا جبکہ ان کا صرف ایک فوجی مرا تھا۔ اپوچی کو صاف لگ رہا تھا کہ آنے والے دو تین دن میں فوج وادی میں داخل ہو جائے گی اور اس کے بعد ان کا قتل عام ہوگا۔ جو بچ جائیں گے انہیں درختوں سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے گی۔ پیش قدمی کے تیسرے دن تک فوج وادی کے دہانے تک آ گئی تھی اور اب اس پر اوپر سے حملہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لڑنے والے وادی میں محصور ہو گئے تھے۔ انجام سامنے تھا اور اس سے فرار ممکن نہیں تھا۔

+++

ڈین کی خوش فہمی اس وقت دور ہو گئی جب اس نے کولوریڈو دریا عبور کیا اور ایڈی کو اپنے دو ساتھیوں سمیت اپنے تعاقب میں پایا۔ اسے ڈین کے بارے میں پتا چل گیا تھا اور وہ شاید دور سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ البتہ ڈین کو نظر یہاں آیا تھا۔ شاید وہ ڈین کو اکیلا دیکھ کر سمجھ رہا تھا کہ اس کی بیوی اور بچیاں کہیں آس پاس ہیں اور وہ اصل میں مارشا کے چکر میں تھا۔ اس لیے ڈین کو روکنے کے بجائے خاموشی سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ ڈین نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے انہیں دیکھا نہیں ہے اور گھوڑا بھگانے کے بجائے معمول کی رفتار سے سفر کرتا رہا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ انہیں اسی طرح دوڑاتا ہوا وادی تک لے جائے گا اور وہاں اپوچی اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے آسانی سے ان پر قابو پا لے گا۔

لیکن ایڈی نے بھی شاید بھانپ لیا تھا کہ وہ انہیں کسی جال کی طرف لے جا رہا ہے اس لیے چٹانوں کے پاس پہنچتے ہی انہوں نے اپنے گھوڑے تیز کیے اور اس کے نزدیک آنے لگے۔ ڈین نے بھی رفتار تیز کی لیکن ایڈی اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑے کہیں تیز تھے، انہوں نے اسے چٹانوں کے پاس آ لیا اور پھر ڈین کو مجبوراً ایک جگہ رکنا پڑا۔ ورنہ وہ اسے عقب سے گولی مار دیتے۔ فائرنگ انہوں نے شروع کر دی تھی لیکن ابھی ڈین ان کی پہنچ سے باہر تھا۔ ایک مورچے نما چٹان میں ڈین نے پناہ لی اور اپنا گھوڑا اس کے پیچھے چھوڑ دیا۔ ایڈی اور اس کے ساتھیوں نے بھی چٹانوں کی آڑ لے لی تھی اور ذرا دیر بعد دونوں طرف سے فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کے مقابلے میں تین تھے اور یہ کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ڈین جانتا تھا کہ وہ اس طرح زیادہ دیر مدافعت نہیں کر سکے گا۔ وہ اپنی حماقت پر افسوس کر رہا تھا۔ اسے ان پر نظر پڑتے ہی بھاگ لینا چاہیے تھا اور وہ ایک بار چٹانوں کے اندر پہنچ جاتا تو پھر ان سے پیچھا چھڑانا آسان تھا لیکن اب وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اس کا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا جبکہ ایڈی اور اس کے ساتھی یقیناً اچھے نشانے باز تھے کیونکہ ان کی چلائی ہوئی گولیاں اس کے آس پاس لگ رہی تھیں۔ اسے جوابی فائر کا موقع بھی مشکل سے ملتا تھا۔ ایڈی نے چلا کر کہا۔

”بلاؤ ان دوستوں کو جنہوں نے پچھلی بار تمہیں بچایا تھا۔“

”فکر مت کرو انہوں نے فائرنگ کی آواز سن لی ہوگی اور وہ آ رہے ہوں گے۔“ ڈین نے چلا کر کہا لیکن اسے شک تھا کہ وادی تک فائرنگ کی آواز پہنچے گی اور اگر پہنچے گی بھی تو اپوچی اور اس کے ساتھی اس کی مدد کو آئیں گے کیونکہ انہیں کیا پتا کہ ڈین ایک بار پھر مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ اسے خود ہی ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ ایڈی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مارشا اور بچیوں کو تم نے کہاں رکھا ہے؟“

”یہ تم قیامت تک نہیں معلوم کر سکتے۔“

”قیامت بہت دور ہے، تمہارے مرنے کے بعد میں تلاش کر لوں گا۔“ ایڈی خباثت بھرے انداز میں بولا۔ ”ایک بار مارشا کو حاصل کر کے میں اسے اور بچیوں کو بھی تمہارے پاس روانہ کر دوں گا۔ دوسری دنیا میں تمہاری فیملی مکمل ہو جائے گی۔“

ڈین کو احساس تھا کہ ایڈی بات کر کے اس کا دھیان بٹا رہا ہے، اس دوران میں اس کے ساتھی یقیناً کسی ایسی جگہ آنا چاہتے تھے جہاں سے اسے گولی کا نشانہ بنا سکیں۔ مگر ڈین کا اندازہ غلط تھا۔ ایڈی اور اس کے ساتھی اسے مارنا نہیں چاہتے تھے، وہ اسے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ ایڈی کا ایک ساتھی دائیں طرف سے پتھروں اور چٹانوں کی آڑ لیتا ایک ایسی جگہ آ گیا تھا جہاں سے اسے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس نے گولی چلائی جو ڈین کے بازو پر لگی اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا پستول نکالتا، ایڈی اور اس کے ساتھیوں نے اسے گھیر کر بے بس کر دیا۔ ایڈی نے اس کے زخم کی پروا کیے بغیر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔

”مارشا کہاں ہے؟“

ڈین نے منہ میں آیا ہوا خون تھوکا۔ ”معلوم کر سکتے ہو تو معلوم کر لو۔“

ایڈی نے پستول نکال لیا۔ ”ڈین، تم جانتے ہو میں اپنے دشمنوں کو کس طرح مارتا ہوں۔ میں انہیں ایک گولی سے ختم نہیں کرتا۔ پہلے میں ان کے ہاتھ اور پیروں کے جوڑوں میں گولی مارتا ہوں اور جب وہ جاں بہ لب ہوتے ہیں تب ان کے سر میں گولی مارتا ہوں۔ میں دس تک گنوں گا، اس کے بعد پہلے تمہارے ٹخنے میں گولی ماروں گا اور اس کے ہر دس سیکنڈ بعد ایک گولی مارتا رہوں گا۔“

”نہیں تم دس تک مت گنو، فوراً گولی مارنا شروع کر دو۔“ ڈین نے اسے مشورہ دیا۔ ایڈی کی آنکھوں میں خطرناک چمک نمودار ہوئی جیسے وہ ڈین کے مشورے پر عمل کرنے کا سوچ رہا ہو لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا، ایک گرج دار آواز آئی۔ ”ہالٹ...... سب اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر کر لو۔“

آواز اور انداز فوجی تھا۔ ایڈی اور اس کے ساتھیوں نے بے ساختہ اپنے ہتھیار پھینک دیے اور فوراً ہی چاروں طرف سے مسلح فوجیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ڈین پہلے ہی ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ ہی فوجی دستہ تھا جو وادی کو گھیرے ہوئے تھا۔ ذرا دیر بعد ان چاروں کو دستے کے کپتان کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ سنہری بالوں والا نوجوان آدمی تھا۔ ڈین نے حیرت سے نوجوان کپتان سے کہا۔

”تم لوگ میرے فارم کے باہر کیا کر رہے ہو؟“

”تمہارا فارم!“ کپتان نے حیرت سے کہا۔

”ہاں، یہ وادی میرا فارم ہے۔ اسے میں نے آباد کیا ہے اور اب حکومت نے یہ وادی مجھے الاٹ کر دی ہے۔ تم اجازت دو تو میں کاغذات دکھاؤں۔“

کپتان نے اجازت دی تو ڈین نے اسے کوٹ سے کاغذات نکال کر پیش کیے۔ ریاستی حکام نے وادی ڈین کے نام منتقل کر دی تھی کیونکہ اس نے اسے آباد کیا تھا۔ کپتان نے کاغذات کو تسلیم کر لیا۔ ”اس وادی سے میرے آدمیوں پر کچھ انڈینز نے حملہ کیا ہے اور ہم نے حملہ کرنے والوں کو گھیر لیا ہے۔“

”وہ جنگجو نہیں ہیں میرے ملازم ہیں۔ میرا خیال ہے حملہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔“

”تمہارے آدمی ہیں؟“ کپتان نے اسے گھورا۔ ”اس کا مطلب ہے تم بھی اس کے ذمے دار ہو۔“

”یہ انڈینز کو استعمال کرتا ہے۔“ ایڈی نے درمیان میں مداخلت کی۔

”تم چپ کرو، میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں، تم بدمعاش ایڈگر ہو۔ تمہیں مقامی پولیس کے حوالے کروں گا۔“

اسی وقت وادی کے اندر کی طرف سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ ڈین نے مضطرب ہو کر کہا۔ ”کپتان، اپنے آدمیوں کو روکو۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی ہیں اور یہ سب میرے ملازم ہیں۔“

ریاستی قانون کے مطابق کسی سفید فام کی ملازمت میں انڈینز عام شہری تصور کیے جاتے تھے اور ان سے وہ

میچ سے پہلے ایک ٹیم کا کپتان امپائر سے باتیں کر رہا تھا۔ ”دیکھیے جناب، میں چاہتا ہوں کہ امپائرنگ فیئر اور قوانین کے مطابق ہو لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس گراؤنڈ کے ایک طرف اسپتال ہے، دوسری طرف قبرستان ہے، عقب میں نہر بہہ رہی ہے اور ہم نے اس سیزن میں اب تک کوئی میچ نہیں ہارا ہے۔“

www.Paksociety.com

سلوک نہیں کیا جاتا تھا جو آزاد انڈین قبائل کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ نوجوان کپتان معقول آدمی تھا، اس نے ڈین سے کہا۔ ''اگر یہ تمہارے آدمی ہیں اور تمہارے کہنے پر ہتھیار ڈال دیں تو میں اپنے آدمیوں کو روک لوں گا۔''

''یہ میرے ہی آدمی ہیں تم خود وادی میں چل کر دیکھ سکتے ہو، وہاں باقاعدہ کاشت کی جاتی ہے۔''

''مگر ان میں یقینی طور پر کچھ بدمعاش انڈین ہیں اور انہوں نے میرے آدمیوں پر حملہ کیا تھا۔ ہم انہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔''

''اگر ایسے انڈین موجود ہیں تو تم انہیں پکڑ سکتے ہو۔'' ڈین نے کہا۔ ''لیکن پہلے مجھے جا کر ان سے بات کرنے دو۔''

کپتان کے حکم پر اس کے آدمیوں نے فائرنگ روک دی اور ڈین آخری مورچے تک گیا، وہاں سے اس نے اپوچی کو پکارا۔ ''اپوچی! میں آگیا ہوں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ تم سب میرے ملازم ہو۔ کیا یہاں باہر سے انڈین آئے ہیں؟''

''ہاں یہاں باہر سے کچھ لوگ آئے ہیں۔'' اپوچی نے کہا۔

''مجھے اندر آنے دو، فائرنگ مت کرنا۔''

''کوئی فائر نہ کرے۔'' اپوچی نے حکم دیا اور ڈین آرام سے اندر پہنچ گیا۔ وہاں کارپو زخمی حالت میں موجود تھا اور قریب المرگ تھا، گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔ اس کے تین ساتھی پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ ڈین نے اپوچی کو بتایا کہ کارپو اور اس کے ساتھی فوج کو مطلوب تھے اور وہ ان کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ اپوچی نے سر ہلایا۔ ''تبھی یہ لڑنے مرنے پر تلے ہوئے تھے میں نے انہیں سمجھایا بھی تھا کہ ہم اتنی بڑی فوج سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

''تم سب ہتھیار ڈال دو۔ میں تمہیں اپنے ملازم بتا چکا ہوں اور یہ فارم اب میری ملکیت ہے۔ میں نے ریاست سے اس کے کاغذات بنوا لیے۔ میرے ملازم ہونے کی وجہ سے تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ کارپو اور اس کے ساتھیوں کو فوج لے جائے گی۔''

اپوچی ہچکچا رہا تھا لیکن پھر ڈین کے زور دینے پر وہ مان گیا۔ اس کے ساتھیوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ کارپو اور اس کے بچ جانے والے تین ساتھیوں کو فوج نے گرفتار کر لیا البتہ اپوچی اور اس کا قبیلہ بچ گیا تھا۔ پھر بھی کپتان نے واپسی سے پہلے ڈین کو وارننگ دی تھی کہ اسے ان انڈینز کی رجسٹریشن کرانی ہوگی اور ان کی ضمانت دینی ہوگی کہ آئندہ وہ کبھی فوج یا ریاست کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ ڈین نے اسے یقین دلایا کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ملازمین کی حیثیت سے رجسٹر کرائے گا اور ان کی طرف سے ضمانت بھی دے گا۔ فوجی دستے نے روانگی سے پہلے زخمی کارپو اور اس کے تین ساتھیوں کو پھانسی دے دی اور ان کی لاشیں اپوچی کے قبیلے کے حوالے کر دیں۔ وہ ایڈی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

اپوچی اور دوسرے انڈین کارپو اور اس کے ساتھیوں کے لیے دکھی تھے لیکن انہیں یہ خوشی بھی تھی کہ ان کی جان بچ گئی ہے اور اب انہیں دربدر پھرنا نہیں پڑے گا۔ یہ وادی مستقل طور پر انہیں مل گئی ہے۔ کیونکہ فوج کے جاتے ہی ڈین نے اپوچی سے کہا۔ ''معاف کرنا دوست، تمہاری جان بچانے کے لیے مجھے یہ ظاہر کرنا پڑا کہ تم لوگ میرے ملازم ہو اور یہ وادی میری ملکیت ہے۔ بے شک کاغذات پر یہ میری ملکیت ہے اور میں مقامی حکام کو دکھانے کے لیے کبھی کبھی یہاں آتا رہوں گا لیکن یہ جگہ حقیقت میں اب تم لوگوں کی ملکیت ہے اور اگر ممکن ہوا تو میں اسے تمہارے قبیلے کے نام منتقل کر دوں گا۔''

اپوچی، ڈین کے گلے لگ گیا۔ ''میرے دوست! میں اور میرا قبیلہ کبھی تمہارا یہ احسان نہیں بھولے گا۔''

''اگر میں نے کوئی احسان کیا ہے تو یہ تمہارے احسان کا بدلہ ہے جو تم نے دو بار میری اور میرے بیوی بچوں کی جان بچا کر ہم پر کیا ہے۔'' ڈین نے کہا۔ ''لیکن میرے دوست، اب تمہیں بھول جانا ہوگا کہ تم لوگ جنگجو تھے اور سفید فاموں سے تمہاری لڑائی ہے۔ اس وادی سے باہر کی دنیا بھول جاؤ اور اپنے قبیلے والوں کے لیے کام کرو۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میں اسے دیکھ لوں گا۔''

ڈین خوش تھا کہ بہت مشکل نظر آنے والا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا۔ اسے فوراً واپس جانا تھا لیکن اپوچی اور اس کے قبیلے والوں نے اسے اتنی جلدی واپس جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اپوچی نے اس سے کہا۔

''جلد ہم تمہارے اور تمہارے خاندان کے لیے یہاں ایک گھر بنائیں گے اور جب تم یہاں آؤ گے تو اس گھر میں ٹھہرو گے۔''

''میں اور میرے گھر والے یہاں آیا کریں گے۔'' ڈین نے اس سے وعدہ کیا اور واپس ڈینور روانہ ہو گیا جہاں اس کے بیوی بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

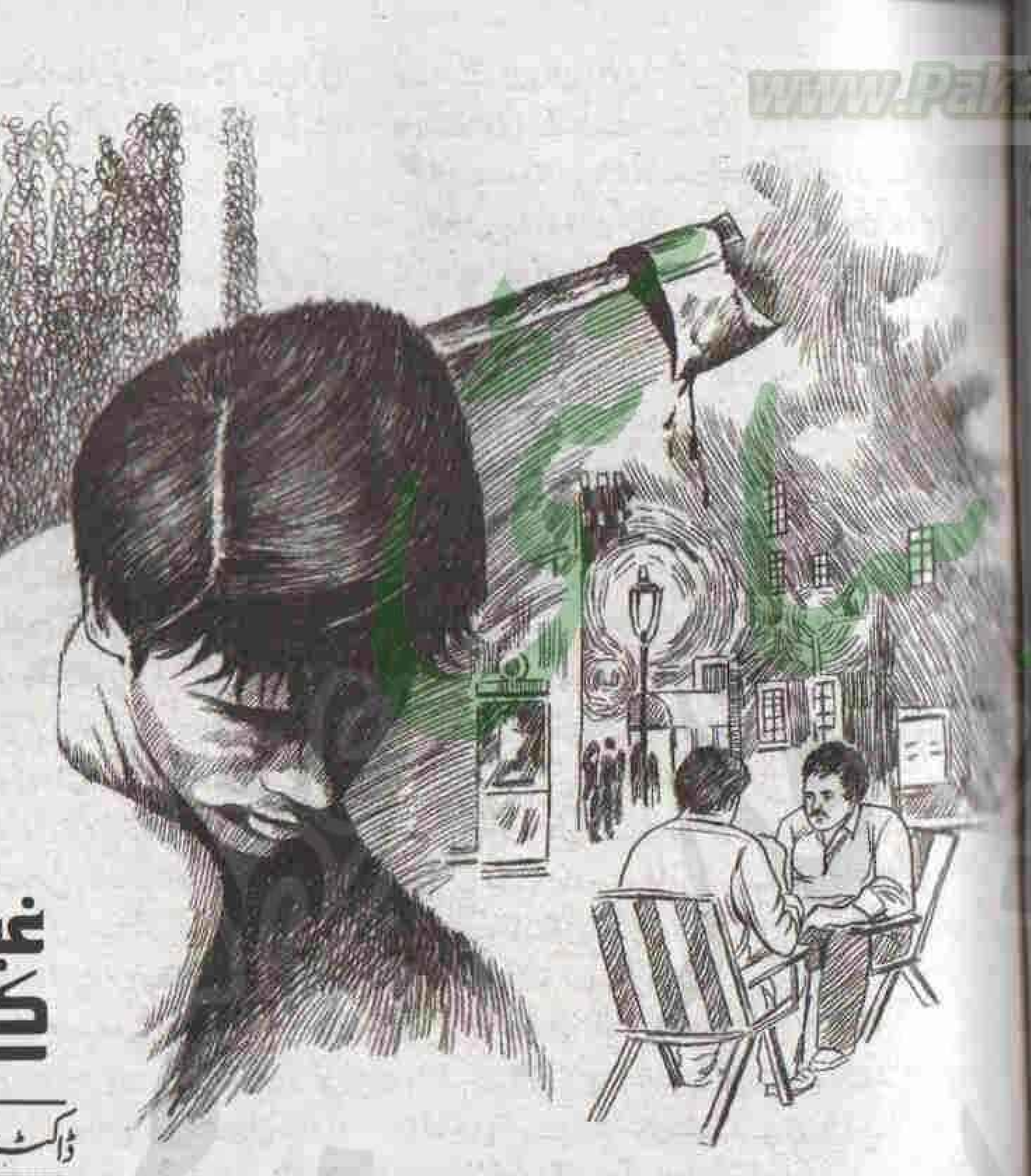

غیرت کے نام پر

ڈاکٹر شیر شاہ سید

جب معاشرے کی خوبصورتی اور معصومیت کو بے غیرتی کی دیمک چاٹ لے اور کھوکھلی رسمیں مہکتی مٹی کو خون آلود کر دیں تو ایسے میں کسی کے پیروں تلے زمین کیسے رہ سکتی ہے... یونہی تو کوئی اپنی مٹی سے جدا نہیں ہوتا... آنکھوں سے خواب اور حسین چہروں کو تصور سے نہیں مٹاتا... اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس کے پس منظر میں کسی بڑے طوفان کا گزر ہوتا ہے۔

اپنایت کے نام پر وحشت و بربریت کی دلخراش تصویر

''ان لوگوں نے سرفراز کو قتل کر ڈالا۔ قبرستان لے جا کر پہلے اس کے ہاتھوں کو کاٹا پھر کلہاڑی سے دونوں پیر کاٹ ڈالے۔ وہ یکایک ہی مر گیا ہوگا۔ پھر انہوں نے بٹو کو بھی گولی مار دی۔ ان دونوں کے مرنے کا مجھے شدید افسوس ہے۔ وہ آج بھی میرے سامنے چلے آتے ہیں۔ دونوں زندہ سلامت چلتے پھرتے میری نظروں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔ بولتے ہیں، ہنستے ہیں، پھر یکایک ان کے کٹے ہوئے سروں سے خون فوارے کی طرح بہہ نکلتا ہے۔ سرفراز ہمارے شہر کا گبرو جوان تھا۔ لانبا، بڑے بڑے ہاتھ، چوڑے شانوں کے اوپر خوب صورت چہرہ۔ وہ سب کے سب کاٹ کاٹ کر الگ الگ ڈال دیے گئے تھے۔ قدرت کا بنایا ہوا پورا انسان اتنی آسانی سے الگ الگ ہو جاتا ہے۔ انسان، انسان کو اس بے دردی سے مار سکتا ہے، ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے۔ پھر بٹو کو تو میں بچپن سے جانتا تھا۔ ساتھ

www.Paksociety.com

کھیلا تھا۔ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلا تھا۔ وہ نازک سی لڑکی خوب صورت سے چہرے کے ساتھ اپنے سر میں سوراخ لیے بار بار مجھے چونکا دیتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی تھی۔ اس کی ویران آنکھوں میں کریڈٹ سوئس اور یو بی ایس بینک کی بلڈنگوں کی شبیہ نظر آ رہی تھی اور چہرے پر چھائے ہوئے کرب سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا دل اداس ہے، کسی شدید درد کا شکار۔ میں نے پہلی دفعہ کسی کے دل کو اس کی آنکھوں، اس کے ماتھے، اس کے چہرے، اس کے ہونٹوں پر اس طرح پھڑکتا ہوا دیکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ رو دے گا۔

وہ مجھے زیورچ کے سٹی سینٹر میں ملا تھا۔ موسم بہار کی بڑی سہانی صبح تھی، میں شہر کے بیچوں بیچ جھیل کنارے مٹرگشتی کرتا ہوا آہستہ آہستہ اپنا وقت گزار رہا تھا۔ میں کراچی سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا تھا مگر زیورچ میں آٹھ گھنٹے رکنے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا۔ زیورچ گئے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے، میں نے سوچا، چلو ایک بار پھر اس پرانے شہر کی سڑکوں اور گلیوں کا دیدار کروں گا جہاں میں نے زندگی کا ایک بھرپور ہفتہ گزارا تھا۔

یہ اس وقت کی بات تھی جب میں لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہا تھا اور اپنے گروپ کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ٹرین کے ذریعے یورپ دیکھنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ یورپ کا ہر شہر طلسماتی شہر ہے، صدیوں پرانی عمارتوں کا شہر، روایتوں اور ثقافتوں کا شہر، انسانی کمزوریوں، خوبیوں، بزدلی اور بہادری کے ریکارڈ محفوظ کیے ہوئے شہر جو اپنے ماضی پر نازاں بھی ہوتے ہیں اور شرم سار بھی۔ ایک عجیب قسم کی پراسراریت ہے ان شہروں میں، ایک طلسم ہے، ایک جادو ہے، ایک سحر ہے جو بار بار اپنی طرف بلاتا ہے۔ زیورچ بھی ایک ایسا ہی شہر تھا جہاں برسوں پہلے کئی پراسرار دن گزارے تھے میں نے۔ وہ ساری یادیں اب بھی ذہن میں تر و تازہ گلاب کی طرح مہک رہی تھیں اور یہی وجہ تھی میں نے سوئس ایئر کا ٹکٹ لیا تھا کہ آٹھ گھنٹے اس شہر میں رکتا چلوں گا۔

زیورچ ایئرپورٹ سے دو منزلہ ٹرین پر بیٹھ کر بارہ منٹ میں سینٹرل اسٹیشن پہنچا۔ پھر چھوٹی چھوٹی سڑکوں اور گلیوں سے ہوتا ہوا جھیل کے ساتھ ساتھ گھومتا ہوا، واپس سٹی سینٹر میں آ کر بان ہوف اسٹریٹ پہنچ گیا تھا۔ بان ہوف اسٹریٹ پر کریڈٹ سوئس اور یو بی ایس کی بلڈنگوں کے سامنے فٹ پاتھ کے اوپر ہی ایک چھوٹا سا شراب خانہ ہے۔ اسی شراب خانے کے فٹ پاتھ پر ہی میز کرسیاں اس طرح سے لگی ہوئی ہیں کہ آتا جاتا ہوا ٹریفک، ٹرام، چلتے پھرتے لوگ دور تک نظر آتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں ان دونوں سوئس بینکوں کے تہ خانے میں ہمارے ملکوں کے بڑے بڑے لوگوں کا بہت سارا کالا پیسا محفوظ ہے۔ وہ کالا پیسا جو ہمارے لیڈروں، رہبروں نے عوام کی جیبوں پر ڈاکا ڈال کر نکالا ہے پھر ان بینکوں کی تجوریوں میں اپنے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ میں تصور کی آنکھوں سے تہ خانے میں اتر کر تجوری تک تو پہنچ گیا مگر یہ تجوری مجھ سے کھلی نہیں اور اس خیال سے مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

میں فٹ پاتھ پر بیٹھا خلقت کو دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ہی جیسی عمر ہوگی۔ خوب صورت پنجابی چہرہ، بھری بھری بھویں اور گھنی مونچھوں کے پیچھے تانبے کا رنگ لیے ہوئے چہرے کی کھال۔ چہرے میں بشاشت تھی اور آنکھوں میں ذہانت۔

وہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ "بہت اچھی ٹی شرٹ ہے آپ کی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں اچھی تو ہے۔ یہ میں نے کراچی میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سیمینار سے 100 روپے میں خریدی تھی۔" شرٹ کے سامنے ایک معصوم سی لڑکی کی تصویر تھی اور نیچے لکھا تھا، کاروکاری بند کرو۔ غیرت کے نام پہ قتل نامنظور۔

Stop Honour Killing Now

"یہ تصویر دیکھ کر کچھ یاد آ گیا اس لیے رک کر پڑھنے لگا تھا کہ کیا لکھا ہے۔ پاکستان سے آ رہے ہیں نا آپ؟"

"جی کراچی سے آ رہا ہوں اور نیویارک جا رہا ہوں۔" میں نے گلاس میں سے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔ "اور آپ بھی ہم وطن ہی لگتے ہیں لہٰذا کچھ دیر ضرور بیٹھیں گلاس بھی آپ کی طرف سے سہی۔" میں نے دعوت قبول کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام امجد ہے۔" وہ میری ٹی شرٹ کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "کیا اب بھی پاکستان میں یہ ہو رہا ہے...... غیرت کے نام پر قتل؟"

"ہاں ہو تو رہا ہے سندھ میں، پنجاب میں، سرحد میں، بلوچستان میں۔ لڑکیاں ذبح کر دی جاتی ہیں، بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ قتل کر دی جاتی ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"یار، شراب پر تو پابندی لگا سکتے ہیں مگر عورتوں کے قتل پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ کیسا ملک ہے ہمارا؟" اس نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"کب سے پاکستان نہیں گئے ہو آپ؟" میں نے

"اب تو یاد بھی نہیں ہے عرصہ پہلے پاکستان چھوڑ دیا تھا میں نے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شراب پر پابندی لگی تھی مگر شراب ملنی بند نہیں ہوئی۔ وہ پہلے بھی ملتی تھی۔ اب بھی ملتی ہے۔ اسی طرح عورت کے قتل پر بھی پابندی ہے مگر وہ پہلے بھی قتل ہوتی تھی، اب بھی قتل ہوتی ہے۔" میں نے اس کے کئی سوالوں کا اکٹھے جواب دیا تھا۔

"ان دونوں کو تو پاکستان میں قتل کر دیں گے نا؟" اس نے میری توجہ ایک نوجوان جوڑے کی طرف دلائی جو سڑک کی دوسری طرف دنیا سے بے نیاز ایک دوسرے کا ہاتھ شدت سے پکڑے ہوئے ایک دوسرے کو چوم رہا تھا۔

"نہیں، قتل تو نہیں کریں گے، دونوں کو پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ بندے سے پیسے لے کر چھوڑ دیں گے، لڑکی کو تھانے میں اس بے باکی کی سزا کے طور پر کچھ پولیس والے تھوڑا زیادہ پیار کر لیں گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یو مین، اس کا ریپ ہو جائے گا؟" اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں! باجماعت عصمت دری ہوگی اس کی، بازار میں یہ سب کچھ کرنے کی کوئی سزا تو ہونی چاہیے نا۔ پاکستان میں سخت قانون ہیں بھائی۔" میں نے جواب دیا تھا۔

"پولیس والے یہ سب کچھ کریں گے تو غیرت کا کیا ہوگا؟ کسی کی غیرت جائے گی کہ نہیں؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔

"میں حکومت پاکستان کا نمائندہ نہیں ہوں بھائی، صرف ایمنسٹی انٹرنیشنل کی یہ شرٹ پہننے سے غیرت کا ٹھیکے دار نہیں بن گیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا مگر چہرہ ویسا ہی سنجیدہ تھا۔ "بٹو اور میں ساتھ ساتھ کھیلے تھے، گجرات کے اس چھوٹے سے محلے میں...... ہرا سمندر، گو بھی چندر، کوڑی پالا اور کبڈی کبڈی۔ میں چوتھی کلاس میں تھا اور وہ تیسری کلاس میں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔" اس نے اپنے سینے کا بوجھ یکا یک ہلکا کر لیا۔

"تیسری چوتھی کلاس میں؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں، نہیں! تیسری کلاس میں جب وہ تھی تب سے میرے ساتھ کھیلتی تھی اور بھی محلے کے بچے تھے اور پھر اسی طرح سے کھیلتے کھیلتے ہم سب بڑے ہو گئے۔ میں کالج چلا گیا اور وہ میٹرک میں آ گئی۔ میں نے نام نہیں پوچھا آپ کا۔" اس نے بات روک کر سوال کیا۔

"وسیم نام ہے میرا۔" میں نے فوراً ہی جواب دیا۔

"بڑی ہی نازک تھی وسیم صاحب وہ۔ بڑی بھولی اور بڑی ہی خوب صورت۔ پورے محلے میں ہر ایک ہی اسے دیکھتا اور ہر ایک اس کو پیار کرتا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی۔ نازک، سادہ اور بہت سیدھی، ہر وقت ہنسنے والی۔ مسکراہٹ تو اس کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔ اس زمانے میں بہت کم لڑکیاں پڑھتی تھیں وسیم صاحب بہت ہی کم مگر نہ جانے کس طرح اس نے اپنے گھر والوں کو راضی کر کے میٹرک کے بعد کالج میں بھی داخلہ لے لیا۔ کہتے ہیں اس کے ماموں نے بہت منع کیا مگر بعد میں راضی ہو گیا تھا۔ سگریٹ پئیں گے آپ؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں یار! بڑی مشکل سے سگریٹ چھوڑی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پھر کالج میں کیا ہوا تھا؟ تم نے عشق وشق کر لیا تھا کیا؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"نہیں، میں نے اسے پسند کیا تھا، مجھے اچھی لگتی تھی، مجھ سے دوستی تھی، وہی معصوم سی دوستی جو اسکول کے زمانے سے تھی، نہ میں نے اسے اس نگاہ سے دیکھا تھا اور نہ ہی وہ مجھے اس طرح سے دیکھ سکی تھی۔ آپ تو جانتے ہوں گے خوبصورتی اور جوانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عشق و عاشقی بھی شروع ہو جائے۔ یہ جو اتنے سارے لڑکے لڑکیاں گھوم رہے ہیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس چوک پر ایک دوسرے کے عشق میں تو مبتلا نہیں ہیں۔" اس نے وضاحت کی تھی۔

"یہ یورپ ہے اور یورپ میں جو ہوتا ہے وہاں نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تیرہ چودہ سال کی عمر میں عشق کی آگ میں جل کے، دلوں کو توڑ کے، جدائی کے غم میں بھسم ہو کے، وصال کا خواب پورا کر کے دلوں کو دوبارہ جوڑ کر زندگی کے پہیے کو چلانے میں لگے رہتے ہیں۔ یہاں کی بات اور ہے اور وہاں کی بات اور۔ ان کا اور ہمارا مقابلہ نہیں ہے بھائی۔" میں نے سرور میں سریلا سا جواب دیا تھا۔

"نہیں، میرا اس سے کوئی عشق نہیں تھا۔" اس نے احتجاج کے سے انداز میں مجھے جواب دیا۔ "میری دوستی تھی۔ میں اسے بھائی بہنوں والے تعلقات بھی نہیں کہتا ہوں اور نہ ہی عاشق و معشوق والے تعلقات۔ ہم دوست تھے صرف دوست...... مگر وہ پسند کرتی تھی اور شادی بھی کر سکتی تھی سرفراز سے' میرے دوست سے۔ سرفراز میرا پرانا یار غار تھا اور وہ بھی اسے چاہتا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں تھا اس پر اور مجھے اعتراض کرنے کا حق بھی نہیں تھا...... سرفراز بہت اچھا بندہ تھا، اچھے ماں باپ کا بیٹا۔ گجرات کے باہر ایک چھوٹا سا

www.Paksociety.com

قصبہ ہے، وہاں سے پڑھنے آتا تھا ہمارے کالج میں اور وہاں ہی بتو سے ملاقات ہوگئی تھی اور وہ دونوں ہی چاہنے لگے تھے ایک دوسرے کو۔ مجھے پتا ہے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں ہوئی تھیں، نہ کوئی وعدے پیمان ہوئے تھے، نہ کوئی قسمیں کھائی گئی تھیں اور نہ ہی گھر چھوڑنے کی باتیں کی گئی تھیں۔ نہ گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ بس معصوم سی دوستی سے بات شروع ہوئی تھی اور دونوں نے یہی سوچا تھا کہ بزرگوں سے بات کرکے شادی کی بات چلائی جائے گی۔''

''اس میں تو کوئی بری بات نہیں ہے۔'' میں نے سوال کی طرح جواب دیا تھا۔

''نہیں، بری بات تو نہیں ہے مگر گجرات چھوٹا سا شہر تھا اس وقت۔ نہ جانے اب کتنا بڑا ہوگیا ہوگا؟'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بات پھیل گئی تھی بلکہ پھیلا دی گئی تھی اور پھیلانے والوں میں سب سے آگے غفور تھا۔ غفور بہت دنوں سے کالج میں پڑھ رہا تھا، اس کا باپ ایک سیاسی پارٹی کا بندہ تھا اور وہ خود بھی سیاسی جماعت کے اسٹوڈنٹ ونگ کا بندہ تھا بعد میں کسی اور سیاسی پارٹی کا لیڈر بن گیا۔ ایک دن اس نے سرفراز کو بلا کر پوچھا کہ اس کے اور بتو کے درمیان کیا چل رہا ہے؟ سرفراز نے کہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہے، ابھی تو دوست ہیں مگر وہ اپنے ماں باپ کو ان کے گھر بھیجنے والا ہے۔

''بتو میری ہے۔'' غفور نے سرفراز کو صاف صاف کہہ دیا تھا۔ یہ بات مجھے سرفراز نے اسی دن بتائی تھی۔ جس پر سرفراز نے غفور سے کہا تھا کہ کوئی بھی کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ اور بتو دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں اس میں کیا بری بات ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کو بتو کے ماں باپ کے گھر بھیجے گا اگر وہ راضی ہوگئے تو شادی ہوجائے گی۔ وہ چاہے تو اپنے ماں باپ کو بھیج دے۔ تھی نا معقول بات؟'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔

میں نے افسوس سے اپنے ختم ہوتے ہوئے گلاس کو دیکھ کر کہا۔ ''ہاں، بات تو معقول ہے مگر پاکستان میں معقول باتیں کون سنتا ہے۔ اگر معقول باتیں سن رہے ہوتے تو میں نیویارک تھوڑی جارہا ہوتا، تم زیورچ میں تھوڑی ہوتے، یورپ اور امریکا میں شہریت کی تلاش میں وہ سب کچھ نہیں کرتے، جو کررہے ہیں۔ یورپ کے ویزے کے لیے ہزاروں ڈالرز خرچ کرتے ہیں لانچوں اور کشتیوں میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ چلتی ٹرینوں سے کود جاتے ہیں۔ ایمبیسیوں کے سامنے بھوک ہڑتال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو آگ لگا دیتے ہیں۔ معقول باتیں صرف کتابوں میں ہوتی ہیں۔ چلو اب ایک گلاس میری طرف سے بھی ہوجائے۔'' یہ کہہ کر میں نے ویٹرس کو اشارہ کیا۔

زیورچ کی خوشبودار ٹھنڈی ہواؤں میں سڑک کے کنارے بیٹھ کر پینے سے مزہ دوبالا ہوگیا تھا، ایک سکون تھا ایک طرح کی قناعت تھی وقت میں۔ کوئی بھی بھاگ نہیں رہا تھا، مجھے ایسا لگا جیسے کسی سوئس کیلنڈر کے کسی ایک صفحے پر وقت تھم گیا ہے۔ پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میں نے صحیح وقت پر کراچی چھوڑ دیا ہے۔ پاکستان میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ نوکریاں تو پہلے بھی نہیں ملتی تھیں مگر انسان مل جاتے تھے۔ پھٹی پتلون میں بھی کراچی پیرس ہی لگتا تھا، مگر اب تعلیم، دولت، گاڑی، مکان ہونے کے باوجود کراچی اجنبی ہوگیا تھا۔ شہر ایسا پھیل گیا تھا بے ہنگم طریقے سے کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ پرانا شہر کھارادر جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا کنکریٹ کا جنگل بن کر رہ گیا تھا۔ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی پرانی عمارتوں پر کے ایم سی اور کے ڈی اے کی بدولت ایسی بے ہنگم اور بے ترتیب عمارتیں کھڑی کردی گئی تھیں کہ شہر اپنا حسن کھو بیٹھا تھا۔ پھر ان سے ابلتے ہوئے گٹر اور گلیوں میں کوڑے اور کچرے کا ڈھیر، پھر آئے دن مذہبی اور سیاسی حوالوں سے قتل اور ہڑتالوں کا ایک سلسلہ سا چلتا تھا۔ شہر ٹوٹتا جارہا تھا، غربت بڑھتی جارہی تھی کہ اسی دوران امریکا کی لاٹری کے لیے کروڑوں کی تعداد میں فارم بھی بھرے جاتے تھے۔ میں بے روزگار تو نہیں تھا، ٹھیک ٹھاک نوکری کررہا تھا اور تنخواہ بھی اچھی مل رہی تھی مگر میں شہر سے پریشان ہوگیا تھا، وہ شہر جس کے لیے لندن میں بیٹھ کر نظمیں لکھتا تھا۔ وہ شہر جس کی یاد میں لندن کی گلیاں بھی سنسان لگتیں، جس کے لیے امتحان پاس ہونے کے فوراً بعد ہی لندن چھوڑ کر واپس آگیا تھا، وہ شہر اب اجنبی لگتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی اجنبی جگہ آگیا ہوں۔ وہ جگہ نہیں ہے جہاں میں پلا بڑھا تھا۔ جہاں سب شہری مل کر ہنسی خوشی رہتے تھے۔ کراچی تو اب ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اس ڈراؤنے خواب میں امریکن لاٹری میں نام نکلنا ایسا ہی تھا جیسے کسی پیاسے کو بہت دور جانے کے بعد دریا مل جاتا ہے۔ میں نے سوچتے سوچتے امجد کو دیکھا پھر بات چیت بڑھانے کے لیے پوچھا۔

''تو بتو، غفور کو بالکل ہی پسند نہیں کرتی ہوگی؟''

''بالکل صحیح کہا آپ نے وسیم صاحب! بالکل یہی بات تھی۔ غفور بے ایمان آدمی تھا، کرائے کا سیاسی کارکن۔ کوئی بھی شریف آدمی اس سے دوستی رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر وہ خطرناک آدمی تھا۔ اس نے بڑی خطرناک حرکت کی تھی۔

صبح سارے شہر کی دیواروں پر نعرے لکھے ہوئے تھے، سرفراز اور بتو کا عشق نہیں چلے گا۔ فحاشی حرام ہے، غیرت پر جان قربان ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے پتا لگا کہ بتو تو اپنے کالج آئی ہی نہیں تھی اور سرفراز کو بھی ہم لوگوں نے کالج سے گھر بھجوادیا اور کہا تھا کہ وہ اپنے گاؤں چلا جائے۔ نہ جانے غفور کے دل میں کیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس طرح معاملہ رفع دفع ہوجائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ معاملہ یکایک بہت ہی بڑھ گیا تھا کیونکہ اسی دن غفور نے جاکر بتو کے ماموں سے بات کی تھی کہ سرفراز اور بتو کے ناجائز تعلقات ہیں اور اس کا حساب کرنا پڑے گا، ورنہ گجرات میں شریف لوگوں کی عزتوں کی دھجیاں اسی طرح سے اڑتی رہیں گی۔ پھر انہوں نے پلان بنالیا تھا مگر یہ کیسے ہوا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔'' اس نے دھیمے دھیمے بڑے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا تھا۔

''کیا پلان بنایا تھا ان لوگوں نے؟'' میں نے سوال کیا۔

''تین دن کے بعد سرفراز میرے گھر آیا تھا، شام کے وقت بتو کے ماموں نے اسے بلایا تھا تاکہ سارے معاملات عزت سے طے ہوجائیں کیونکہ بدنامی تو ہو ہی چکی تھی لہٰذا اب اس طرح سے معاملات کو نیک نامی میں بدل دیا جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ میرا خیال تھا کہ بتو کے ماموں کو سرفراز کے گھر والوں کو بلانا چاہیے تھا کیونکہ اس کے گھر والے تو بہرحال راضی تھے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ میں ساتھ چلتا ہوں مگر سرفراز نے روک دیا تھا کہ یہ تو بالکل ایک ذاتی سی میٹنگ ہے بتو کے ماموں کے ساتھ مگر یہ ذاتی میٹنگ نہیں تھی وسیم صاحب۔ سرفراز سے بتو کا ماموں بات کرتا رہا۔ دنیا جہاں کی باتیں، اچھے طریقے سے، محبت کے انداز میں پھر ٹہلاتا ہوا گھماتا ہوا، باتیں کرتا ہوا اسے قبرستان لے گیا۔ جہاں غفور اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھا ہوا تھا اور وہاں پر ہی ان لوگوں نے کلہاڑی سے سرفراز کے ہاتھ پیر کاٹ دیے اور خون بہہ بہہ کر اس کی جان چلی گئی۔

اسی رات پہلی دفعہ بتو کی ماں نے بتو کو کہا تھا کہ ساتھ کے کمرے میں اکیلی، سوجائے۔ جہاں وہ کبھی اکیلی نہیں سوئی تھی، پھر رات کو اس کے ماموں نے ایک گولی اس کی پیشانی سے سر میں اتار دی تھی۔ اس طرح سے غیرت کے نام پر وہ دونوں قتل ہوگئے تھے۔ غفور، بتو کے ماموں اور بتو کی ماں نے جانے یہ کیسے کیا کرلیا تھا۔ آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کس طرح کوئی ماں اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے موت کے حوالے کرسکتی ہے؟ کیسے کوئی انسان اپنے سے کمزور پر اس طرح کلیجا وار کرسکتا ہے؟ وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جو رشتہ، پیار، محبت سب سے انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ یہ کیسی غیرت ہے جس کا کلیجا صرف انسانی خون پی کر ہی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ غفور کا تو مطلب تھا، اس کی تو ہوس تھی۔ سرفراز اس کے لیے ایک دھمکی تھا۔ مکمل عذاب، جس نے اس کے گھر کی لڑکی کو ورغلا لیا تھا۔ مگر بتو کی ماں کو کیا ہوا تھا؟ وہ کیسے اس سازش میں شریک ہوگئی؟ اس نے کیوں اپنی کوکھ کی جنی کو اس طرح بے مانگ کردیا کیوں؟ کیوں؟ میں اکثر سوچتا ہوں اور سوچتا ہی رہتا ہوں اور میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کاش کوئی مجھے جواب دے، مجھے بتائے سمجھائے۔''

خوب صورت ماحول، دل کشا موسم، حسین چہروں کے درمیان آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بھی مجھے ایسا لگا تھا جیسے متلی ہوجائے گی۔ میں بالکل خاموش ہوگیا تھا۔

پھر وہ خود ہی بولا۔ ''یہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ غفور نے جو کیا وہ کیا، وہ تو سمجھتا تھا کہ بتو اس کی ہے اور اس کا بدلہ لینا ہوگا، ماموں کی غیرت کو اس نے جگایا ہوگا قصے سنائے ہوں گے، افسانے بنائے ہوں گے مگر بتو کے ماموں نے بتو کی ماں کو کیسے راضی کرلیا کہ اس کی بیٹی قتل کردی جائے۔ بھائی اور بیٹی میں ماں اور بہن کا انتخاب بیٹی کی قتل کی صورت میں ہوگا، یہ کون سوچ سکتا ہے؟''

''میری سمجھ سے باہر ہے۔'' میرے اندر سے جیسے کسی نے شدید نفرت کا اظہار کیا تھا۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔ میں نے دل میں ایک بار پھر پاکستان سے نکل بھاگنے پر اطمینان سا محسوس کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آگ کا سمندر بہت دور ہوتا چلا جارہا ہے۔

''غفور اور بتو کا ماموں پکڑا تو ضرور گیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''یہی تو افسوس ہے۔ غفور صوبائی حکومت میں محکمۂ تعلیم کا اعلیٰ افسر ہے اور بتو کا ماموں گجرات میں ہیروئن کا سب سے بڑا سپلائر ہے۔ ایک سنیما بھی ہے اس کا۔ شراب کا اڈا بھی ہے۔ شہر میں بڑا نام چلتا ہے اس کا اور شہر کے ہی ایک اور اڈے میں بتو جیسی کتنی ہی لڑکیاں اس نے پامال کی ہیں۔'' وہ چپ ہوگیا۔

میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں بھائی! تم ایک شہر کا رونا روتے ہو، تمہارے حافظے میں یہ دکھ بھرا ایک واقعہ ہے لیکن اب تو بے غیرتی ہر شہر کا اصول بن گئی ہے اور غیرت کے نام پر معصوم کنواریوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ میں اپنی بات کہنا چاہتا تھا لیکن بولنے کا یارا نہ تھا۔

www.Paksociety.com

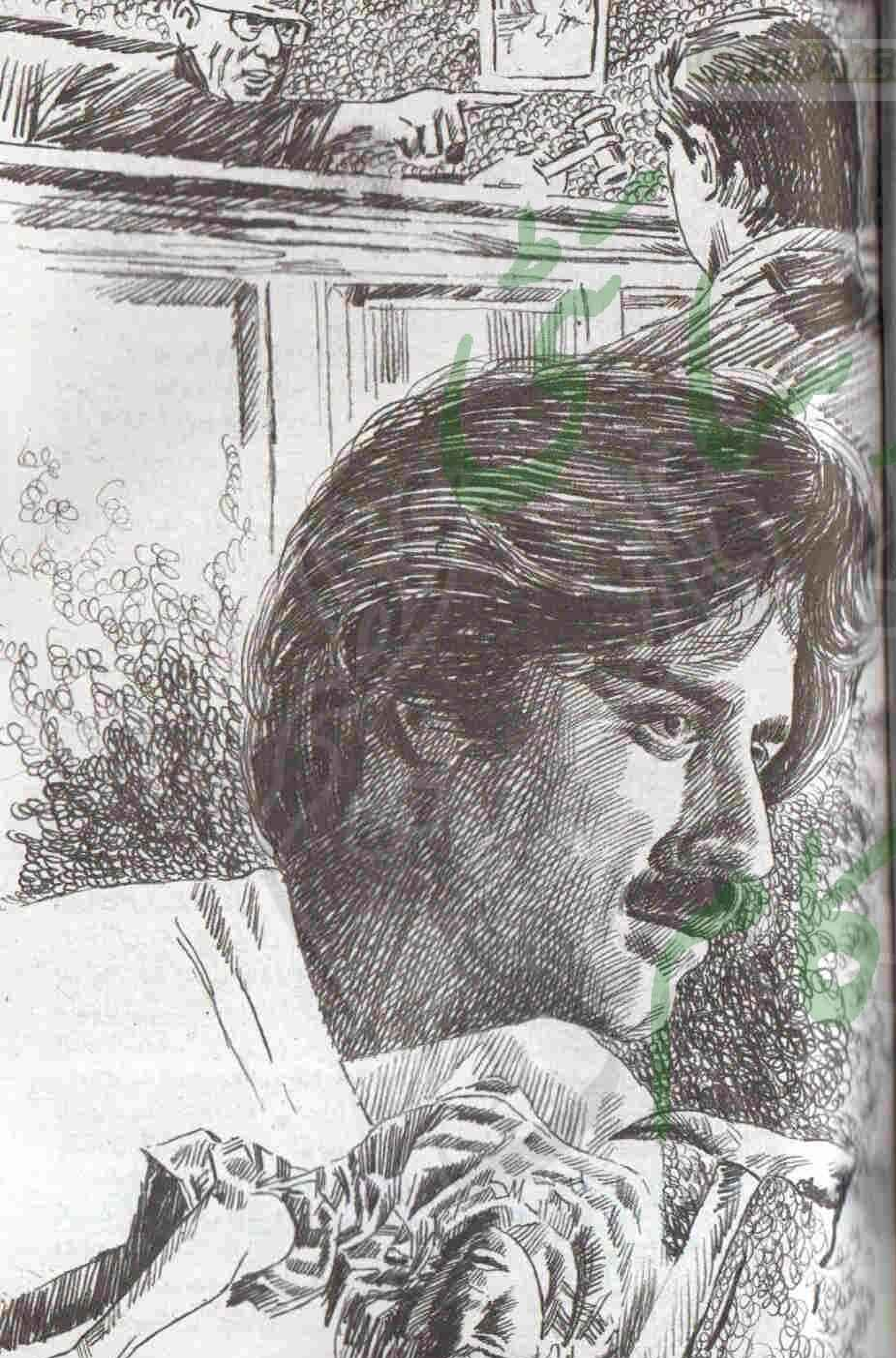

www.Paksociety.com

قتل کی ایک پُراسرار واردات کا تحیر انگیز احوال

ضرورت مند

مرزا امجد بیگ

وہ جو چیونٹی کے مانند بے ضرر نظر آتے تھے اچانک ہاتھی کی ہلاکت کا سبب بن کر سامنے آئے تو کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ "نظریۂ ضرورت" کے تحت بعض اوقات انسان اپنی اوقات سے بڑھ کر اڑان بھرنے کی کوشش کرتا ہے اور منہ کے بل گرتا ہے... کیونکہ کوّا کبھی ہنس کی چال نہیں چل سکا... اور جب جب کسی نے چلنے کی کوشش کی تو مرزا امجد بیگ نے اپنی دلیلوں سے سب کے چال چلن درست کر دیے۔

آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ سماعت تھی۔ عدالت کا کمرا پوری طرح بھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سوائے ایک کرسی کے ہر کرسی پر کوئی نہ کوئی موجود تھا اور وہ خالی کرسی تھی اس شخصیت کی جو اس کیس میں منصف کا کردار ادا کر رہا تھا۔

چند لمحات کے بعد کرسی انصاف بھی خالی نہ رہی۔

جج نے اپنی مسند پر براجمان ہونے کے بعد عدالت کے کمرے میں، ایک جانب سے دوسری طرف تک نگاہ دوڑائی اور تمام متعلقہ افراد کو موجود پا کر اثبات میں گردن ہلا دی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔

پہلے مرحلے پر جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے موکل اور کیس کے ملزم نے نہایت اطمینان کے ساتھ صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا پھر باقاعدہ جرح کا آغاز ہو گیا۔ جج کی اجازت حاصل کر کے وکیلِ استغاثہ ملزم والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

استغاثہ کی جانب سے میرے موکل ساجد علی پر ایک طرح دار عورت کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ بنیادی اور سنگین الزام تو یہی تھا، علاوہ ازیں بھی چند چھوٹے موٹے معاملات اس کے ساتھ ہی نتھی تھے۔ جب عدالت میں اس کیس کا چالان پیش کیا گیا تھا تو میں نے اپنے موکل کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت تقریباً ناممکن ہی ہوتی ہے اور وہ بھی پہلی پیشی پر تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وکیلِ استغاثہ لب کشائی سے پہلے چند سیکنڈ تک ملزم کو گھورتا رہا۔ ایک نفسیاتی ردِعمل کے طور پر میرے موکل نے نگاہ جھکا دی۔ ملزم کی اس حرکت کو وکیلِ استغاثہ نے اس کی کمزوری جانا اور خاصے جارحانہ لہجے میں بولا۔

"گردن اٹھا کر اور نظر ملا کر میری طرف دیکھو۔"

میرے موکل نے خفیف سی بوکھلاہٹ کے بعد وکیلِ استغاثہ کی فرمائش پوری کر دی۔ وکیلِ استغاثہ نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"کیا تم کوئی نشہ وغیرہ کرتے ہو؟"

"نہیں جناب، میں نے ایسا کام اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا۔" ملزم نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "البتہ، دن میں پانچ چھ سگریٹ ضرور پی لیتا ہوں۔"

"کون سی سگریٹ؟" وکیلِ استغاثہ نے چڑھائی جاری رکھی۔

ملزم نے حیرت بھرے انداز میں پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ "جی کیا مطلب......؟"

"بھری ہوئی یا سادہ سگریٹ؟" وکیلِ استغاثہ نے وضاحت کر دی۔

www.Paksociety.com

"سادہ کیں جناب، میں فلٹر والی سگریٹ پیتا ہوں۔"
ملزم کا جواب معصومیت سے معمور تھا۔

"میں نے فلٹر بلٹر کا نہیں پوچھا۔" وکیل استغاثہ نے درشت لہجے میں کہا۔ "بھری ہوئی اور سادہ سگریٹ کا فرق تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔"

"جناب!" ملزم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "میری نظر میں تو ہر سگریٹ بھری ہوئی ہی ہوتی ہے۔ اگر کمپنی سگریٹ میں تمباکو نہیں بھرے گی تو اسے خریدے گا کون۔"

"تم بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش کررہے ہو۔" وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تمہاری آنکھوں میں تیرتی مخصوص سرخی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ تم کوئی تیز نشہ کرتے ہو۔"

میں کافی دیر سے خاموش کھڑا وکیلِ استغاثہ کی موشگافیاں سماعت کررہا تھا۔ جب وہ حد سے تجاوز کرتا نظر آیا تو میں چپ نہ رہ سکا اور تیز آواز میں کہا۔

"آبجیکشن یور آنر......!"

جج نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟"

"جنابِ عالی! وکیلِ مخالف میرے موکل کو خوامخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔" میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اگر ملزم کی آنکھوں میں کسی قسم کی سرخی نظر آرہی ہے تو اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ وہ بھری ہوئی سگریٹ پیتا ہے یا کسی اور نوعیت کا نشہ کرتا ہے اور پھر......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"زیرِ سماعت کیس ایک قتل اور ڈکیتی سے متعلق ہے۔ اس میں ملزم کی آنکھوں کی لالی کا کیا کام۔ وکیل استغاثہ اس نوعیت کی جرح سے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں......اور کچھ نہیں!"

میرے اس وار پر وکیل استغاثہ سلگ اٹھا اور براہ راست مجھ سے مستفسر ہوا۔ "تو آپ ملزم کی آنکھوں میں پائی جانے والی سرخی کے بارے میں کیا کہتے ہیں......؟"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ نشے بازی ہی کا نتیجہ ہو......" میں نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔ "اس کی اور بھی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔"

"دیگر وجوہات آپ کی نظر میں کون سی ہوسکتی ہیں؟" اس نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

"میرے فاضل دوست!" میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر کوئی شخص رات کو ضروری نیند نہ لے سکے یا سرے سے اسے سونے کا موقع ہی نہ ملے تو صبح اس کی آنکھوں میں یقیناً سرخی دیکھنے کو ملے گی۔ اگر کسی شخص کو کچی نیند سے جگا دیا جائے تو بھی ملی جلی صورتِ حال کا سامنا ہوگا۔ علاوہ ازیں آشوبِ چشم اور آنکھوں کی دیگر بیماریاں بھی اسی نوعیت کے اثرات نمایاں کرتی ہیں۔ میں آپ کی اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ نشہ کرنے والے افراد خصوصاً چرس کے رسیا افراد کی آنکھوں کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے لیکن......" میں بولتے بولتے یک دم رکا پھر بڑے ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ان تمام تر وجوہات کا میرے موکل کی موجودہ حالت پر اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی سرخی کا کوئی اور ہی سبب ہے......ایک جینوئن ریزن!"

"اب اس بات کی بھی وضاحت کردیں کہ وہ جینوئن ریزن کیا ہے؟" وکیل استغاثہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

"میرے موکل کی آنکھوں میں پائی جانے والی سرخی پیدائشی ہے۔" میں نے جواباً ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ جیمنی ہے بلکہ اس کے طالع پیدائش میں مرکری بھی پڑا ہوا ہے۔"

"یہ جیمنی اور مرکری وغیرہ تو علم نجوم کی اصطلاحات ہیں۔" وکیل استغاثہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "زیرِ سماعت کیس کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے؟"

"بڑا گہرا تعلق ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "لیکن میں اس کی وضاحت بعد میں کروں گا۔ پہلے آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ جیمنی اور ورگو افراد کی آنکھوں میں قدرتی طور پر سرخی پائی جاتی ہے اور اگر مرکری بھی طالعِ پیدائش میں ہو تو یہ سونے پہ سہاگا والی بات ہوجاتی ہے۔ اب میں آتا ہوں آپ کے سوال کے جواب کی طرف......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک طائرانہ نگاہ حاضرینِ عدالت پر ڈالی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"آپ وکیل استغاثہ ہیں۔ یقیناً آپ کو یہ بات ازبر ہوگی کہ زیرِ سماعت کیس کا وقوعہ کب پیش آیا تھا۔"

"بارہ دسمبر......" وہ ترت بولا۔ "یہ بھی کوئی بھولنے والی تاریخ ہے۔"

"اور آج کیا تاریخ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پانچ اپریل......!"

"ہم عیدالفطر کون سی اسلامی تاریخ کو مناتے ہیں؟"

"یکم شوال۔"

"اور حج بیت اللہ کب ادا کیا جاتا ہے؟"

"نو ذی الحجہ......!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سوال کیا۔ "ان اسلامی اور غیر اسلامی تاریخوں کا حساب ہم کس چیز کی مدد سے لگاتے ہیں۔ اس کائنات میں موجود کون ہمیں بتاتا ہے کہ آج کون سی اسلامی تاریخ ہے اور کون سی غیر اسلامی؟"

"ظاہر ہے، ہم چاند کی مدد سے اسلامی تاریخوں کا تعین کرتے ہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "اور سورج کی حرکات عیسوی تاریخوں کا حساب بتاتی ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے، سن اینڈ مون؟" میں نے تصدیق طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو گھورا۔

"جی ہاں......" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "چاند اور سورج کو عربی میں قمر و شمس اور انگریزی میں مون اینڈ سن ہی کہا جاتا ہے......"

"اتنی اہم معلومات بہم پہنچانے پر میں تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں میرے فاضل دوست!" میں نے خوش اخلاقی سے کہا پھر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس سے پوچھ لیا۔ "تو آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری روزمرہ زندگی کا ہر معاملہ تاریخوں کا محتاج ہے اور یہ تاریخیں ہم سن اینڈ مون کی مخصوص فلکیاتی حرکات سے اخذ کرکے ہجری اور عیسوی کیلنڈر تیار کرتے ہیں۔ زیرِ سماعت کیس میں بھی تاریخوں کا ایک نہایت ہی اہم کردار ہے مثلاً......" میں نے لمحاتی توقف کرکے، کافی دیر کے بعد ایک گہری سانس لی اور قدرے جارحانہ انداز میں کہا۔

"جیسے مقتولہ نورین کو ایک خاص تاریخ کو قتل کیا گیا، ملزم کی گرفتاری، عدالت میں پیشی، چالان، کیس کی باقاعدہ سماعت اور اس کیس کے فیصلے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی تاریخ مخصوص ہوگی لہٰذا یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ زیرِ سماعت کیس کے ساتھ مون اور سن کا بڑا گہرا تعلق ہے......!"

"میں نے اعتراض علم نجوم پر کیا تھا۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "شمس و قمر تو اس کائنات کے رخشندہ ستارے ہیں۔ ان کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔"

"میرے بھائی! کیا عجیب منطق ہے آپ کی۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "سورج، چاند اور ستاروں سے تو آپ بھرپور استفادہ کرنے کو تیار ہیں اور اسی فیملی کے دیگر ممبران عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل......وغیرہ کے اثرات سے انکاری ہیں۔"

اس سے پہلے کہ ہماری بحث طوالت کا کوئی نیا ریکارڈ قائم کرنے میں مصروف ہوجاتی، جج نے بڑی خوب صورت مداخلت کرکے اس سلسلے کو روک دیا اور میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"وکیل صاحب! ملزم کی آنکھوں میں تیرتی سرخی کے حوالے سے اگر آپ کی تحقیق کو تشفی حاصل ہوگئی ہو تو جرح کے سلسلے کو آگے بڑھائیں۔"

وکیل استغاثہ نے خفت بھری نظر سے مجھے دیکھا پھر جلدی سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم ساجد کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میری وضاحت کے باعث اس کی جو سبکی ہوئی تھی اس کا سارا غصہ اس نے میرے موکل پر اتارا۔

"تمہاری ذہانت اور چالاکی بڑی اثر پذیر ہے۔" وہ ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم اپنی جادو اثر شخصیت سے کام لے کر شکار کرتے ہو۔ تمہارے مزاج کی سادگی اور چہرے کی معصومیت کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بھی ذہن میں یہ خیال نہیں آتا کہ تم کتنے خطرناک کھلاڑی ہوسکتے ہو۔" اس نے لمحاتی توقف کے بعد بڑے جارحانہ انداز میں اضافہ کیا۔

"بتاؤ......اس سے پہلے تم نے کتنی وارداتیں کی ہیں۔ مسز نورین تمہارا پہلا شکار تھی یا......؟"

"میں نے نہ تو اس سے پہلے ایسی کوئی حرکت کی ہے اور نہ ہی مسز نورین کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "آپ خوامخواہ مجھے پریشان کررہے ہیں۔"

"تم کہیں سے پریشان لگتے تو نہیں ہو۔" وکیل استغاثہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں میرے موکل کو سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم بڑے ٹھنڈے مزاج کے مجرم ہو......ایک خطرناک مجرم۔"

"آبجیکشن یور آنر!" میں نے ایک مرتبہ پھر نعرۂ احتجاج بلند کیا۔

جج نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

میں نے خاصے دھواں دھار انداز میں کہا۔ "جنابِ عالی! استغاثہ کی طرف سے میرے موکل پر جو الزامات لگائے گئے ہیں، ان میں سے ابھی تک کوئی بھی ثابت نہیں ہوسکا۔ قانون کی نظر میں تاحال میرا موکل ایک ملزم ہے۔ اسے مجرم کہنا سراسر زیادتی ہوگی لہٰذا......" میں نے تھوڑی

www.Paksociety.com

دیر تک غور کر طنزیہ انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا...... استغاثہ کے نمائندے، میرے فاضل دوست کی جانب سے ملزم کے لیے ''خطرناک مجرم'' کے الفاظ کا استعمال انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کرلیا ہے پھر اس نے وکیلِ استغاثہ کو یہ ہدایات دے کر میرے اندازے کی تصدیق کردی۔

''وکیل صاحب! آپ اپنے سوال میں سے لفظ ''مجرم'' کو خارج کرکے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھانے کا عمل جاری رکھیں۔''

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ میرے موکل پر ایک خوبصورت عورت مسز نورین کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ اس کے علاوہ استغاثہ نے مبلغ پچاس ہزار روپے کی چوری بھی اس کے کھاتے میں چڑھا رکھی تھی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ نہ تو میرے موکل نے کسی کو قتل کیا تھا اور نہ ہی وہ کسی چوری یا ڈکیتی میں ملوث تھا۔ اس کی قسمت بری تھی کہ وہ اس کیس میں گردن تک دھنس چکا تھا۔

وکیلِ استغاثہ، جج کی ہدایت سن کر تھوڑا خفیف ہوا پھر مجھ پر ایک ناپسندیدہ نگاہ ڈالنے کے بعد وہ دوبارہ اس کیس کے ملزم اور میرے موکل ساجد علی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ مقتولہ نورین کو تم کافی عرصے سے جانتے تھے؟''

''جی ہاں...... یہ درست ہے۔''

''کتنے عرصے سے؟''

''پچھلے چھ ماہ سے......'' ملزم نے جواب دیا۔

پچھلے چھ ماہ سے۔'' اس کی مراد یقیناً وقوعہ سے چھ ماہ پہلے کے عرصے سے تھی۔ وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ان چھ ماہ میں تم کتنی مرتبہ مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر گئے تھے؟''

مقتولہ نورین ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں چوتھے فلور پر رہائش پذیر تھی اور اس کے قتل والی واردات بھی اسی فلیٹ میں پیش آئی تھی۔ ملزم نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا۔

''میں اس عرصہ کے دوران میں دس سے زیادہ مرتبہ اس کے فلیٹ پر گیا تھا۔''

''مذکورہ فلیٹ میں مقتولہ کے علاوہ اور کتنے افراد رہائش پذیر تھے؟''

''کوئی بھی نہیں......!''

''گویا مقتولہ اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی تھی؟''

''جی ہاں۔'' ملزم نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس کا شوہر روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے...... بلکہ ہوا تھا۔''

''گیا ہوا تھا...... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب وہ واپس پاکستان آچکا ہے۔'' ملزم نے پر اعتماد لہجے میں بتایا۔ ''اس واقعے نے اسے واپس آنے پر مجبور کردیا تھا اور......'' اس نے لمحاتی توقف کرکے حاضرینِ عدالت پر ایک گہری نگاہ ڈالی پھر ایک جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''نجیب غوری اس وقت بھی عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔''

''تو گویا تم مقتولہ کے شوہر کو بھی اچھی طرح پہچانتے ہو؟''

ملزم نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''کیا تم ان لوگوں کے رشتے دار ہو؟'' وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

''نہیں......!'' ملزم قطعی لہجے میں بولا۔

''فیملی فرینڈ ہو؟''

''جی نہیں......!''

''مقتولہ کے شوہر کے ساتھ تمہاری دوستی وغیرہ ہوگی......؟'' وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''جبھی تم چھ ماہ میں دس سے زیادہ مرتبہ مقتولہ کے فلیٹ پر گئے تھے......؟''

''جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں!'' ملزم نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ''دوستی تو بہت دور کی بات ہے، میں تو مسز نورین کے شوہر سے ایک بار بھی نہیں ملا تھا بلکہ اسے تو پہلی مرتبہ میں نے یہیں عدالت میں دیکھا ہے یا پھر اس سے پہلے مقتولہ کے فلیٹ میں اس کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگی دیکھی تھی اسی لیے جب میں نے اسے عدالت میں دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔''

ملزم کی وضاحت ختم ہوئی تو وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔ ''تمہاری نہ تو مقتولہ کے شوہر سے دوستی تھی، نہ تم ان کے رشتے دار اور نہ ہی کوئی اور تعلق ناتا تھا پھر تم گاہے بہ گاہے مقتولہ کے گھر کے چکر کیوں کاٹتے رہتے تھے جبکہ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ مقتولہ کا شوہر گھر پر موجود نہیں تھا؟''

''میں ایک مرتبہ بھی اپنی مرضی سے وہاں نہیں گیا۔'' ملزم نے اپنی صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔

''پھر کس کی مرضی سے وہاں جاتے تھے؟'' وکیل استغاثہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تمہیں اس کام کے لیے کون مجبور کرتا تھا......؟''

''مقتولہ نورین اپنی ضرورت کے پیشِ نظر خود مجھے بلایا کرتی تھی۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی تھی......؟''

''آپ کہہ سکتے ہیں......'' ملزم جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''کہہ سکتے ہیں...... کیا مطلب؟'' وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین نہیں کہ مقتولہ تمہیں بے حد پسند کرتی تھی، اسی لیے اپنی ضرورت کے وقت وہ تمہیں فلیٹ پر بلا لیا کرتی تھی؟''

''آپ بات کو کسی اور رخ پر لے جا رہے ہیں وکیل صاحب!'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے کہنے کا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ عدالت کے سامنے اجاگر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''تم اپنے مطلب کی وضاحت کرو۔'' جج نے براہ راست ملزم کو حکم دیا۔

''جنابِ عالی!'' ملزم کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ مقتولہ مجھے نہیں بلکہ میرے کام کو پسند کرتی تھی، دوسری بات یہ کہ اس نے ایک مرتبہ بھی مجھے خواہ مخواہ اپنے فلیٹ پر نہیں بلایا۔ اسے جب بھی میری ضرورت پیش آتی، وہ مجھے فون کردیتی تھی اور میں اپنی سہولت کے مطابق آکر اس کا کام کردیا کرتا تھا۔ اپنی محنت کا معاوضہ وصول کرکے میں واپس چلا جاتا تھا لیکن وکیل استغاثہ......''

وہ لمحاتی توقف کرکے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پلکیں جھپکا کر اسے تسلی دی کہ وہ بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔ وہ اپنی وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''وکیلِ استغاثہ کی جرح سے بالکل ایک منفی تاثر ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ اس سے نہ صرف میرا بلکہ مرحومہ کا کردار بھی شک کی لپیٹ میں آرہا ہے جبکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ مقتولہ میرے کام سے مطمئن اور خوش تھی اسی لیے جب بھی فلیٹ میں لکڑی کا کوئی کام نکلتا، وہ مجھی سے کراتی تھی۔''

میرا موکل پیشے کے اعتبار سے کارپینٹر (بڑھئی) تھا اور اپنے کام میں اس کے تجربے اور مہارت کو دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ اگر مقتولہ اس کی پیشہ ورانہ صلاحیت اور کارکردگی سے مطمئن تھی تو اس میں حیرت یا اچنبھے والی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی مگر وکیل استغاثہ میرے موکل کو نروس اور پریشان کرنے کے لیے اس معاملے کو خوانخواہ خطرناک انداز میں طول دے رہا تھا۔ میں اپنے موکل کی اس بات سے پوری طرح متفق تھا کہ وکیل استغاثہ کے تیکھے اور ٹیڑھے سوالات مقتولہ اور ملزم کے مابین غیر اخلاقی تعلق کی جانب اشارہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وکیل استغاثہ کو تو اتنا بھی لحاظ نہیں تھا کہ مقتولہ کا شوہر بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں ایسے بے ہودہ استفسارات کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا تھا۔

میں اگر چاہتا تو کسی بھی موقع پر ''آبجیکشن یور آنر'' کا نعرہ لگا کر میدان جنگ میں اتر سکتا تھا۔ وکیل استغاثہ اب تک اعتراض کے بہت مواقع فراہم کرچکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ میرا موکل بڑے خوب صورت انداز میں اپنا دفاع جاری رکھے ہوئے تھا، میں اس کی کارکردگی سے خاصا مطمئن تھا اسی لیے خاموشی سے تماشا دیکھ رہا تھا۔

''تو وقوعہ کے روز بھی تم مقتولہ کے بلانے پر لکڑی کا کوئی کام کرنے اس کے فلیٹ پر پہنچے تھے......؟'' وکیل استغاثہ نے تیز نظر سے ملزم کو گھورا۔

''جی ہاں...... اسے ایک صوفے کی مرمت کرانا تھی۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''کیا تم اس بات سے انکار کرسکتے ہو کہ مقتولہ کے گھر بار بار جانے سے تم وہاں کی تفصیلات سے اچھی طرح واقف ہوچکے تھے۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ ڈرائنگ روم، بیڈروم، کچن، کامن روم اور دیگر مقامات کی کیا پوزیشن ہے...... کون سی چیز کہاں پائی جاتی ہے؟''

''میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''کیونکہ میں نے اس دوران میں مقتولہ کے فلیٹ کے مختلف حصوں میں کام کیا تھا۔ مقتولہ نے اپنے کچن میں مجھ سے ایک دیوار گیر کیبنٹ بنوائی تھی۔ گیلری میں کپڑے سکھانے کے لیے کھونٹیاں لگوائی تھیں، بیڈروم میں موجود کپڑوں کی بڑی الماری کا لاک تبدیل کروایا تھا، ڈرائنگ روم میں رکھے صوفوں کی مرمت کرائی تھی۔ چھوٹے موٹے کام اس کے علاوہ ہیں......''

''وقوعہ کے روز تم کس کام کی غرض سے مقتولہ کے فلیٹ

www.Paksociety.com

پر پہنچے تھے؟" وکیلِ استغاثہ نے سوال کیا۔
"میں تھوڑی دیر پہلے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اس روز مقتولہ نے ایک صوفے کی مرمت کے لیے مجھے اپنے فلیٹ پر بلایا تھا۔ مذکورہ صوفے کا استر کئی جگہ سے نکل رہا تھا لہٰذا اس کی مرمت ضروری ہو گئی تھی۔"

وکیلِ استغاثہ نے فوراً زاویۂ سوالات تبدیل کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "تم جب بھی کسی کام کی غرض سے مقتولہ کے فلیٹ پر جاتے تھے تو وہ تم پر خاصی مہربان ہوا کرتی تھی؟"

"جی...... میں سمجھا نہیں!" ملزم نے حیرت بھری نظر سے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا۔ "آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب یہ کہ......" وکیلِ استغاثہ بڑے مکارانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مقتولہ تمہیں تمہارے کام کا معاوضہ دینے کے علاوہ بھی نوازتی رہتی تھی؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب!" ملزم نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ کام شروع کرنے سے پہلے معاوضہ طے کر لیتا ہوں اور کام ختم کر کے اپنی اجرت لے کر واپس آجاتا ہوں۔ اللہ اللہ، خیر سلا......!"

"کیا مقتولہ کے ساتھ بھی تمہارا ایسا ہی رویہ تھا؟"

"جی ہاں، بالکل......!"

"میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں کہ مقتولہ تمہیں عام کاریگر کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔" وکیلِ استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ تمہارے محنتانے کے علاوہ بھی تمہارا خیال رکھتی تھی جو اس امر کی دلیل ہے کہ وہ تم پر خصوصی توجہ دیتی تھی لیکن......" وہ بولتے بولتے اچانک رکا، جج کی جانب معنی خیز نظر سے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرنے کے لیے دوبارہ ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"لیکن تم نے......" وہ بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔ "تم نے اس مہربان عورت کے خلوص کا ناجائز استعمال کیا...... نہ صرف یہ کہ اس کے اعتماد کا خون کیا...... بلکہ خود اسے ہی خون میں نہلا دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے...... مجھ پر الزام ہے۔" ملزم نے احتجاجی انداز میں کہا۔ "میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مقتولہ کے قتل سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔"

"آبجیکشن یور آنر!" میں نے مداخلت ضروری جانتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ "اس وقت عدالت میں نورین مرڈر کیس زیرِ سماعت ہے لیکن میرے فاضل دوست متعلقہ سوالات کو پس پشت ڈال کر سارا زورِ وکالت اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ مقتولہ کسی خاص زاویے سے ملزم پر مہربان تھی اور ابھی انہوں نے اس حوالے سے ثبوت فراہم کرنے کی بات بھی کی ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وکیلِ استغاثہ کو وہ ثبوت سامنے لانے کا موقع فراہم کیا جائے جو اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مقتولہ اور ملزم کے بیچ کام کے علاوہ بھی کوئی معاملہ چل رہا تھا کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ جب تک......" میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مدلل انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جب تک میرے فاضل دوست اس حوالے سے اپنے دل اور دماغ کا سارا غبار نکال نہیں لیں گے، ان سے ٹو دی پوائنٹ کسی معقول جرح کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ بار بار جس انداز میں مقتولہ اور ملزم کے تعلقات کا بار بار ذکر کر رہے ہیں اس سے معزز عدالت اور یہاں پر موجود تمام سامعین کے ذہن میں مختلف نوعیت کے خدشات اور شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں لہٰذا اس ایشو کو ایڈریس کرنے کے بعد آگے بڑھا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔"

جج نے گہری سنجیدگی سے میری بات سنی اور مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے وکیلِ استغاثہ سے کہا۔ کہنے کا انداز ہدایات دینے والا تھا۔

"وکیل صاحب! آپ ڈیفنس کے اعتراض کے جواب میں کیا کہنا چاہیں گے؟"

وکیلِ استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا، معاندانہ نظر سے مجھے گھورا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "جنابِ عالی! میں اس سلسلے میں ذرا وضاحت سے بات کرنا چاہوں گا۔"

"اجازت ہے!" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جنابِ عالی! ملزم شاندار شخصیت کا مالک ہے۔ مقتولہ اس پر خصوصی توجہ دیا کرتی تھی۔ یہ جب بھی کسی کام کی غرض سے مقتولہ کے فلیٹ پر جاتا، وہ اس کی ٹھیک ٹھاک خاطر تواضع کرتی تھی اور یہ ایسی پیشکش کو فوراً قبول بھی کر لیا کرتا تھا۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ملزم اپنی معصوم شکل سے جتنا سیدھا نظر آتا ہے، ... اس کے برعکس ہے۔ اس نے مقتولہ کی مہربانی اور ... سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے ذہن میں ایک ... ترتیب دیا۔ مقتولہ اس کے ساتھ خاصی گھل مل گئی تھی ... آزادانہ طور پر گھر کے ہر حصے میں جا سکتا تھا۔ اپنے ... میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ملزم نے مقتولہ کی ... کے جواب میں یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ بھی اسے ... کرتا ہے چنانچہ مقتولہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی اور پھر ... کے روز ملزم نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔"

وکیلِ استغاثہ نے بات ختم کی تو میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "جنابِ عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اپنے فاضل دوست سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"پرمیشن گرانٹیڈ!" جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی!" میں نے اپنی بات کا آغاز جج کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔ "گھر آئے ہوئے کسی بھی شخص کو چائے ... کا پوچھنا اخلاقی اقدار کا حصہ ہے اور یہ تو عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ راج مستری، بڑھئی، الیکٹریشن، پلمبر اور اس طرح کے دیگر کاریگر جب کسی کے گھر کے اندر آ کر کام کرتے ہیں اور گھر کے مالک کی ان سے واقفیت بھی ہوتی ہے تو انہیں کھانے پینے کو ضرور پوچھا جاتا ہے۔ مقتولہ کا یہ عمل ... معاشرتی اقدار، ایٹی کیٹس اور مینرز وغیرہ میں شمار ہوتا ہے۔ اگر وکیلِ استغاثہ کے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں اور وہ ... کے ان آداب واخلاقیات کو منفی نظر سے دیکھ کر ایک ... دل کا رنگ دینا چاہتے ہیں تو میں موصوف کی ذہنی ... کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا......!" میں نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر کندھے اچکائے اور وکیلِ استغاثہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"وکیل صاحب! استغاثہ کی جانب سے میرے موکل پر چوری اور قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ آپ نے اب تک ... طرح میں مختلف زاویوں سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرے موکل نے اپنی پر اثر شخصیت کے ... مقتولہ کے دل میں جگہ بنائی اور وہ ملزم پر اندھا اعتماد کرنے لگی۔ ملزم نے وقوعہ کے روز اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ملزم کے ذہن میں ایسا کون سا منصوبہ تھا؟"

"چوری کا منصوبہ......!" وکیلِ استغاثہ نے جواب دیا۔ "ملزم مقتولہ کی الماری کا صفایا کرنا چاہتا تھا...... اور اس نے ایسا کر بھی دکھایا۔"

"آپ کا اشارہ ان پچاس ہزار روپے کی جانب ہے جو بہ قول استغاثہ، ملزم نے مقتولہ کے فلیٹ سے چرائے تھے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "جی ہاں...... آپ بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔"

"تو آپ کے خیال میں پچاس ہزار کی وہ رقم مقتولہ نے اپنی الماری میں رکھی ہوئی تھی؟" میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں...... بالکل......" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "مقتولہ اپنا کیش، کپڑوں والی الماری کے اندر بنے ایک مخصوص لاکر میں رکھا کرتی تھی۔ مذکورہ الماری مقتولہ کے بیڈروم میں موجود تھی...... بلکہ اب بھی وہیں موجود ہے۔"

"آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی کہ مقتولہ بیڈروم والی الماری میں کیش وغیرہ رکھا کرتی تھی؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے۔"

"اور یہ کیسے پتا چلا کہ مقتولہ کے لاکر میں وقوعہ کے روز پچاس ہزار روپے کی رقم موجود تھی جو ملزم چوری کر کے لے گیا؟" ایک بار پھر میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"اس امر کے ٹھوس ثبوت اور شواہد موجود ہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "وقوعہ والے دن شام میں مقتولہ نے ایک پارٹی کو پچاس ہزار روپے ادا کرنا تھے جو اسی روز دوپہر میں اس نے بینک سے نکلوائے تھے۔ مقتولہ کی چیک بک اور متعلقہ بینک کا ریکارڈ اس بات کا گواہ ہے کہ مقتولہ نے اس روز بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے۔ اسے شام میں پیمنٹ کرنا تھی لہٰذا اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مقتولہ نے یہ رقم اپنی الماری کے لاکر میں رکھی ہو گی۔"

"یہ کوئی مسلمہ فارمولا نہیں کہ بینک سے رقم نکلوانے کے بعد گھریلو لاکر ہی میں رکھی جائے۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "رقم کا مالک اپنی رقم کو کہیں بھی رکھنے کا مجاز ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مقتولہ نے وہ رقم اسی پارٹی کو دے دی ہو جس کے لیے اس نے بینک سے نکلوائی تھی۔"

"نہیں جناب...... ایسا ہرگز ممکن نہیں۔" وہ بڑی قطعیت سے بولا۔ "استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اس

شخص کا نام بھی شامل ہے۔ وہ اپنی باری پر اس بات کی گواہی دے گا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی ملاقات شام میں طے تھی اور اس ملاقات سے پہلے ہی سہ پہر میں مقتولہ کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔''

''آپ کا مذکورہ گواہ جب کٹہرے میں آکر کھڑا ہوگا تو اس سے بھی بات ہوجائے گی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ فی الحال مجھے صرف اتنا بتادیں کہ میرے موکل کو یہ بات کیسے پتا چلی تھی کہ مقتولہ کی الماری کے لاکر میں پچاس ہزار روپے کی رقم موجود ہے۔ کیا آپ کی نظر میں ملزم کرنسی نوٹوں کو سونگھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مطلب یہ کہ اسے دور ہی سے نوٹوں کی مخصوص خوشبو آجاتی ہے یا اس کے پاس کوئی پراسرار علم ہے......؟''

''ایسی کوئی بات نہیں جناب!'' وہ میرے سوال کے جواب میں برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''آپ خوامخواہ حقیقت میں فسانہ ملانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

''اگرچہ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے فیکٹس اینڈ فکشن کا فرق بخوبی معلوم ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بہرحال، آپ مجھے صرف اتنا بتادیں کہ ملزم کو یہ کیسے پتا چلا کہ مقتولہ کی کپڑوں والی الماری کے لاکر میں ایک خطیر رقم، مبلغ پچاس ہزار روپے رکھے ہیں؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ ملزم پچاس ہزار روپے کی رقم کے بارے میں جانتا تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ملزم کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ مقتولہ الماری والے لاکر میں رقم رکھا کرتی تھی۔''

''آپ کے خیال میں یہ معلومات مقتولہ نے ملزم کو فراہم کی تھیں؟'' میں نے قدرے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''میں اس بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات طے ہے کہ ملزم اس راز سے واقف ہوگیا تھا کہ مقتولہ اس الماری کے لاکر میں رقم رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ملزم نے معزز عدالت کے سامنے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ مقتولہ نے مذکورہ الماری کا لاک بھی اسی سے تبدیل کروایا تھا۔ اس کام کے دوران میں ملزم نے الماری کے اندرونی حصوں کا بھی جائزہ یقیناً لے لیا ہوگا اور عین ممکن ہے، اس نے نئے لاک کی ایک چابی اپنے پاس رکھ لی ہو اور......''

''اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' عدالت کی مخصوص فضا میں ملزم کی احتجاجی آواز ابھری۔

مجھ سمیت تمام حاضرینِ عدالت نے چونک کر، اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب دیکھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

''سوال نہ پیدا ہونے کا سبب کیا تھا؟''

ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''جناب! پہلی بات تو یہ کہ مقتولہ نے نیا لاک خود مجھے فراہم کیا تھا۔ پرانا لاک نکالنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے......'' اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پہلے سے الماری میں نصب لاک میں کوئی خرابی نہیں تھی بلکہ لاک کی چابی اندر پھنس کر ٹوٹ گئی تھی۔ چابی پھنسنے پر جب مقتولہ نے زور لگا کر گھمانے کی کوشش کی تو چابی کا دندانوں والا حصہ اندر ہی ٹوٹ گیا تھا جسے نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ میں نے مقتولہ پر واضح کردیا تھا کہ اگر لاک کے اندر سے چابی کے ٹوٹے ہوئے حصے کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو لاک کے خراب ہوجانے کے امکانات ہیں چنانچہ مقتولہ نے لاک کی مرمت کے بجائے نیا لاک لگوانے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی کہا تھا کہ گھر میں دو بغلی قفل (ان سائڈ لاکس) رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی فٹ ہوسکتا ہو تو میں وہی لگادوں۔ میں نے دونوں لاکس کا معائنہ کرنے کے بعد ایک کو اس الماری کے لیے پاس کردیا تھا۔ میں نے پرانا لاک نکالنے کے بعد نئے لاک کو الماری میں فٹ کیا اور گھر سے نکل آیا۔ اس موقعے پر مقتولہ نے اپنے ہاتھ سے چابی لگا کر لاک کو چیک کیا تھا اور چابیوں والا ننھا سا رنگ اسی کے پاس رہا تھا لہٰذا اس لاک کی کسی چابی کا میرے پاس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ملزم کی بات ختم ہوئی تو وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم تو اتنے ماہر فن کارپینٹر ہو کہ یہ چھوٹے موٹے لاک کو کھولنے کے لیے تمہیں کسی چابی کی ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی۔''

''آبجیکشن یور آنر......!'' میں نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔ ''وکیل سرکار میرے موکل کے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ کسی ماہر فن کارپینٹر کو کسی چور سے تشبیہ دینا تقاضائے اخلاق کے منافی ہے۔ یہ تو ایسی بات ہوئی کہ کسی تجربہ کار سرجن کو آپ قسائی کہہ دیں۔''

''اگر میں نے ملزم کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے اس کے چور ہونے کا تاثر ابھرتا ہے تو اس میں زیادتی والی کون سی بات ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے چوٹ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''چوری تو اس نے کی ہے نا......

www.Paksociety.com

صرف چوری بلکہ سینہ زوری کا بھی ثبوت دیا ہے...... مسز لورین کا قتل ایک سنگین جرم ہے۔''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''آپ کا فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر ہے......؟''

''میں نے ایسی کون سی فلسفیانہ بات کہہ دی ہے؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیا آپ اپنی بات کی وضاحت فرمائیں گے؟''

''کیوں نہیں جناب!'' میں نے خوش گوار انداز میں کہا۔ ''آپ نے تو بہت چھوٹی سی فرمائش کی ہے۔ میں ضرور اس فرمائش کو پورا کروں گا۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر دوبارہ وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہوگیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میرے فاضل دوست! آپ نے ملزم پر جرح کے ابتدائی اور وسطی حصے میں اپنا پورا زور اس امر کو ثابت کرنے پر خرچ کیا ہے کہ ملزم ایک عیار اور چالاک شخص ہے۔ اس نے اپنی معصوم صورت اور پراثر شخصیت کا جادو چلا کر مقتولہ کو رام کرلیا تھا۔ مقتول، ملزم کو پسند کرنے لگی تھی یعنی ان دونوں کے درمیان دوستی اور اپنایت کا رشتہ استوار ہوگیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا......؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ اپنی گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''اور یہ بھی آپ ہی کا دعویٰ ہے کہ ملزم نے مقتولہ کی الماری کی دراز (لاکر) میں سے پچاس ہزار روپے چرا لیے تھے؟''

''بالکل صحیح......!'' اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق، مقتولہ لورین کو ملزم ہی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں...... میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''یہی تو میرے لیے الجھن کا باعث ہے......؟'' میں نے متاملانہ انداز میں وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا۔

''اس میں تامل یا الجھن والی کون سی بات ہے؟''

''اچھا سوال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میری الجھن اور پریشانی یہ ہے کہ اگر ملزم اور مقتولہ میں خوش گوار تعلقات تھے تو پھر ملزم کا مقتولہ کے گھر سے رقم چرانے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اگر یہ تعلقات ہاتھی کے دانتوں کی حیثیت رکھتے تھے اور ملزم کی نیت چوری پر لگی ہوئی تھی تو پھر مقتولہ کے قتل کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ موقع ملتے ہی مقتولہ کی رقم اڑاتا اور خاموشی سے چلا جاتا۔'' میں نے تھوڑی دیر کو رک کر وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں جھانکا اور معتدل انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب! اب تو آپ میری پریشانی کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے......؟''

''جی ہاں، بالکل سمجھ گیا ہوں۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''اور بڑی آسانی سے میں آپ کی الجھن کو دور بھی کرسکتا ہوں۔''

''یہ تو آپ کا مجھ پر احسانِ عظیم ہوگا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''آپ مجھے اپنی بات مکمل کرنے دیں۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''پھر سب کچھ آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔''

''ارشاد......!'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''جیسا کہ میں نے بتایا......'' وہ بیان کرنے لگا۔ ''ملزم صرف مقتولہ کی الماری کا صفایا کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ مقتولہ کا خون اس کے پروگرام کا حصہ نہیں تھا۔ اس کی خاطر تواضع کا بندوبست کرنے جب مقتولہ کچن کی طرف گئی تو اسے واردات کا موقع مل گیا۔ یہ چپکے سے ڈرائنگ روم سے نکل کر بیڈروم میں پہنچا اور الماری کے لاکر پر طالع آزمائی کرنے لگا لیکن قبل اس کے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتا، مقتولہ کسی کام سے بیڈروم میں پہنچ گئی۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر ملزم بری طرح بوکھلا گیا۔ اس کی چوری رجسٹر ہوجانے کے بعد مقتولہ کی جانب سے مزاحمت ضروری تھی اور اس نے مزاحمت کی بھی چنانچہ ملزم نے اپنا راز افشا ہونے سے بچانے کے لیے مقتولہ کی مزاحمت کے جواب میں، اس کی کنپٹی پر آہنی ہتھوڑی کا وار کرکے اسے موت کی نیند سلادیا...... تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری...... میں جانتا ہوں کہ آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہوں گے......'' اس نے سسپنس پیدا کرنے والے انداز میں بات ادھوری چھوڑی پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

''آپ یقیناً مجھ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ کیا میں جائے واردات پر خود بھی موجود تھا جو اتنی تفصیل سے اس واقعے کی منظر کشی کی ہے...... ہیں نا؟''

''آپ تو بڑے ذہین وکیل ہیں۔'' میں نے ستائشی

نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔“

وہ بڑے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے وہاں موجود ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔ جائے وقوعہ ازخود یہ کہانی سناتی ہے۔ وہاں کی افراتفری کو دیکھ کر یہی تاثر ابھرتا تھا کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل مقتولہ نے ملزم کے خلاف اچھی خاصی مزاحمت کی تھی۔ بیڈروم میں موجود کپڑوں والی الماری کے دونوں پٹ پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور اندرونی لاکر کی بھی یہی کیفیت تھی۔ مذکورہ الماری کے قریب ہی فرش پر مقتولہ کی لاش پڑی تھی۔ اسے جس آہنی ہتھوڑی سے کنپٹی پر ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، وہ بھی لاش کے قریب ہی پڑی مل گئی تھی۔ یہ تمام تر شواہد جن حقائق کی جانب اشارہ کرتے ہیں وہی ایک کہانی کی شکل میں تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں۔“

”میں نے آپ کی وضاحت کو دل و جان سے مان لیا وکیل صاحب!“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”ان تمام تر واقعاتی شہادتوں سے وہی حقیقت اجاگر ہوتی ہے جو ابھی آپ نے بیان کی ہے لیکن میرا وہ سوال ابھی تک تشنۂ جواب ہے جہاں سے اس بحث کا آغاز ہوا تھا۔“

”کون سا سوال؟“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وقوعہ کے روز مقتولہ نے اپنے بیڈروم میں، موت کے منہ میں جانے سے قبل جس ہتھوڑی بردار شخص کے خلاف مزاحمت پیش کی وہ اس مقدمے کا ملزم اور میرا موکل ساجد علی ہی تھا......؟“

”اس امر کا سب سے بڑا ثبوت تو آلۂ قتل ہی ہے۔“ وکیلِ استغاثہ نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

”کیوں...... آلۂ قتل کو کیا ہوا ہے؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ”آلۂ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ”دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!“

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نورین کی موت بارہ دسمبر کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلۂ قتل کیل ٹھونکنے والی آہنی ہتھوڑی تھی جس کی مدد سے مقتولہ کی کنپٹی کو نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ ضرب اتنی کاری ثابت ہوئی تھی کہ مقتولہ تیورا کر وہیں گری تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ استغاثہ کے مطابق انکوائری آفیسر جب وقوعہ پر پہنچا تو اسے بیڈروم کے فرش پر مقتولہ کی لاش پڑی ملی تھی۔ کمرے کے اندر اس نوعیت کی ابتری بھی پائی گئی تھی جیسے مقتولہ نے موت کے منہ میں جانے سے پہلے اچھی خاصی مزاحمت پیش کی ہو۔ کپڑوں والی الماری کے دونوں پٹ بھی کھلے پائے گئے تھے اور اس لاکر کا دروازہ بھی کھلا ملا تھا جس کے اندر سے مبینہ طور پر پچاس ہزار روپے کی رقم چرائی گئی تھی۔

آلۂ قتل یعنی آہنی ہتھوڑی کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ اس ہتھوڑی کے آہنی حصے پر مقتولہ کے خون کے علاوہ اس کے سر کے چند بال بھی چپکے ہوئے پائے گئے تھے جبکہ چوبی دستے پر میرے موکل یعنی اس کیس کے ملزم ساجد علی کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔

اس سے پہلے کہ استغاثہ کی جانب سے گواہوں کی پیشی کا سلسلہ شروع ہوتا، میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

”جنابِ عالی! اگر اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھے اجازت دے دی۔

جج کے اشارے پر مذکورہ آئی او وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا اور منتظر نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگا۔

اس آئی او کا نام امتیاز شاہ تھا۔ وہ ایک دراز قامت، مضبوط کاٹھی کا مالک، سانولا شخص تھا۔ سر کے بال وسطی حصے سے غائب ہو چکے تھے۔ باقی ماندہ بال ایک مناسب سی جھالر کے مانند کنپٹیوں کے اوپر سے ہوتے ہوئے اور کانوں کے عقب سے گزرتے ہوئے سر کے پچھلے حصے کی جانب چلے گئے تھے۔ وہ چہرے کے تاثرات سے خاصا بیزار اور غصیلا نظر آتا تھا۔ عہدے کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا۔

”شاہ جی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”اس واقعے کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟“

”عباسی صاحب نے......“ اس نے جواب دیا۔ ”نادر عباسی نے۔“

”یہ کون صاحب ہیں؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”عباسی صاحب اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتے ہیں جہاں مقتولہ رہائش پذیر تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بس بلاک کا فرق ہے۔ مقتولہ بلاک اے کے فلیٹ نمبر چار سو ایک میں رہتی تھی جبکہ عباسی صاحب بلاک بی کے فلیٹ نمبر تین سو تین میں۔“

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! نادر عباسی نے وقوعہ کے روز آپ کو کیسے اور کتنے بجے اس سانحے کی اطلاع دی تھی؟“

”ہمارے روزنامچے کے مطابق اس واقعے کی اطلاع سہ پہر ساڑھے پانچ بجے دی گئی تھی۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اور یہ اطلاع بذریعہ فون دی گئی تھی۔“

”آپ کتنے بجے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے؟“

”ٹھیک چھ بجے۔“

”کیا اس وقت نادر عباسی بھی وہاں موجود تھا؟“

”جی ہاں، موجود تھا......“

”کیا آپ نے نادر عباسی سے یہ سوال نہیں کیا کہ بی بلاک کے ایک فلیٹ میں رہتے ہوئے اسے یہ کیسے پتا چلا کہ بلاک اے میں کسی خاتون کا قتل ہوگیا ہے؟“

”پوچھا تھا......“ اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ”عباسی صاحب کو بلڈنگ کے چوکیدار حنیف نے اس واقعے سے مطلع کیا تھا۔“

”جب آپ وقوعہ پر پہنچے تو وہاں کی کیا کیفیت تھی؟“ میں نے استفسار کیا۔

انکوائری آفیسر نے بڑے مفصل انداز میں مجھے کیفیت سے آگاہ کیا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

”جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد آپ کے ذہن میں پہلا خیال کیا آیا تھا؟“

”یہی کہ...... یہ ایک قتل اور ڈکیتی کی واردات ہے۔“

”مقتولہ کی لاش بیڈروم کے فرش پر پڑی تھی لہٰذا فوراً ذہن میں قتل کے حوالے سے کوئی خیال ابھر آتا تو نارمل سی بات ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”لیکن آپ کو یہ اندازہ کیسے ہوا کہ وہاں کوئی ڈاکا بھی پڑا ہے یا کوئی چوری وغیرہ ہوئی ہے؟“

”کپڑوں والی الماری کی حالت اس امر کی منہ بولتی تصویر تھی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”رہی سہی کسر زبیر سلطان کے بیان نے پوری کر دی تھی۔“

”زبیر سلطان......“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ بھی اسی کیس کا کوئی کردار ہے......؟“

”جی ہاں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”زبیر سلطان پیشے کے اعتبار سے ایک ریئل اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ مقتولہ وقوعہ کی شام اسی شخص سے ملاقات کرنے والی تھی۔ اس ملاقات میں مقتولہ نے زبیر سلطان کو وہ پچاس ہزار روپے ادا کرنے تھے جو اس نے اس روز بینک سے نکلوائے تھے۔ ان دونوں کے بیچ کسی فلیٹ کی خریداری کے سلسلے میں کوئی ڈیل چل رہی تھی۔“

”اچھا اچھا، یہ وہ صاحب ہیں......“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ان کا نام تو استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں بھی شامل ہے۔“

”جی، شامل ہے۔“ آئی او نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”آئی او صاحب! کیا آلۂ قتل آپ کو آسانی سے مل گیا تھا یا اس سلسلے میں آپ کو دشواری اٹھانا پڑی تھی؟“

”آلۂ قتل مقتولہ کی لاش کے قریب ہی فرش پر پڑا تھا۔“ انکوائری آفیسر نے جواب دیا۔ ”اس کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔“

”آلۂ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”صرف اسی بنا پر آپ نے میرے موکل کو اس کیس کا ملزم قرار دیا ہے یا اس کے علاوہ بھی آپ کو کوئی ثبوت ملا تھا؟“

”آلۂ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس مل جانا ایک اہم ثبوت تھا۔“ تفتیشی افسر نے جواب دیا۔ ”پھر ملزم نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ مذکورہ ہتھوڑی اسی کی ملکیت ہے۔“

”اگر آپ میرے ذاتی پستول سے کسی کو قتل کر دیں تو کیا اس کیس میں مجھے قاتل قرار دیا جائے گا؟“ میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”آئی او صاحب! یہ تو کوئی فارمولا نہ ہوا؟“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں، اس بات کو فارمولا نہیں بنایا جاسکتا۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آلۂ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس غور و فکر کی دعوت دیتے

www.Paksociety.com

ہیں۔ حالات وواقعات اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہ قتل ملزم ہی نے کیا ہے۔''

''آپ نے ملزم کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی دکان سے۔'' آئی او نے جواب دیا۔ ''اور اس وقت لگ بھگ سات بجے کا وقت تھا۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نورین کی موت بارہ دسمبر کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور آپ نے ملزم کو لگ بھگ سات بجے شام یا سات بجے رات گرفتار کیا تھا۔'' میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم انتہائی وقت سمجھتے ہوئے یہ فرض کرلیں کہ مقتولہ کو پانچ بجے قتل کیا گیا تھا تو آپ کے مطابق اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ ملزم اس واردات کے بعد بڑے آرام سے اپنی دکان پر موجود رہا تھا اور اگر آپ وہاں پہنچ کر اسے ہتھکڑی نہ لگاتے تو ممکن تھا یہ مزید کچھ وقت اپنی دکان پر بیٹھا رہتا......؟''

''جی ہاں، حالات تو اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔'' اس نے گول مول سا جواب دیا۔

''کیا گرفتاری کے وقت آپ نے ملزم کی اور اس کی دکان کی تلاشی لی تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''دکان کی تو نہیں البتہ......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے ملزم کی مکمل جامہ تلاشی لی تھی۔''

''کیا آپ نے ملزم کی جامہ تلاشی کے دوران میں مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے چوری ہونے والے پچاس ہزار روپے برآمد کروالیے تھے؟''

''جی نہیں، اس کے پاس سے کوئی رقم برآمد نہیں ہوئی تھی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''اس کے بعد یقیناً آپ نے ملزم کی دکان کو کھنگال ڈالا ہوگا......؟''

''جی نہیں......'' وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد بولا۔

''آئی او صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے ایک بڑی رقم چرالی گئی اور آپ کا دعویٰ ہے کہ یہ رقم میرے موکل نے چرائی تھی تو پھر گرفتاری کے وقت آپ نے اس کی دکان کی تلاشی کیوں نہیں لی......؟''

''جی ہاں، بہت ضروری تھی۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس وقت تک خانہ تلاشی کا جواز سامنے نہیں آیا تھا۔ ہم نے ملزم کی جامہ تلاشی تو موقع کی کارروائی کے تقاضے نبھاتے ہوئے کی تھی۔''

''آپ صرف کمال ہی نہیں بلکہ غضب بھی کررہے ہیں آئی او صاحب!'' میں نے آنکھیں پھیلا کر تیکھے لہجے میں کہا۔ ''معزز عدالت کے سامنے اس بات کی وضاحت کریں کہ ملزم کی گرفتاری کے وقت، اس کی دکان کی تلاشی کا جواز کیوں آپ کو نظر نہیں آرہا تھا جبکہ قتل کی واردات کے ساتھ ہی جائے وقوعہ سے پچاس ہزار روپے بھی غائب ہوئے تھے......؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب......'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''ملزم کی گرفتاری کے وقت صرف مقتولہ کا قتل ہمارے پیش نظر تھا۔ رقم کی چوری کا قصہ تو بعد میں سامنے آیا تھا۔''

''اوہ...... ویری انٹرسٹنگ!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تو گویا رقم کی چوری والا قصہ اس اسٹوری کا ایڈیشن ہے......؟''

''جو بھی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے پچاس ہزار روپے غائب ہوئے تھے۔'' وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ہمارے پاس اس امر کے ٹھوس ثبوت ہیں۔ بینک کی چیک بک کا ریکارڈ، اکاؤنٹ میں سے نکالی جانے والی پچاس ہزار کی رقم کا ثبوت، زبیر سلطان کی گواہی......''

''ان تمام تر واقعاتی شہادتوں اور گواہوں کو ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''سردست معزز عدالت کو آپ یہ بتائیں کہ آپ کوئی بھی ایسا ٹھوس ثبوت پیش کرسکتے ہیں کہ مقتولہ نے مسروقہ رقم واقعتاً اپنی الماری کے لاکرز میں رکھی تھی؟''

''ایسا ثبوت تو وکیل صاحب اسی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے جب کسی نے مقتولہ کو، خود اپنی آنکھوں سے وہ رقم الماری میں رکھتے دیکھا ہو۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ استغاثہ کے پاس اس امر کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے؟''

''جی ہاں......ایسا ہی سمجھ لیں۔''

''سمجھ لیا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر استفسار کیا۔ ''پھر تو استغاثہ کے اسٹاک میں اس امر کا بھی کوئی عینی شاہد نہیں ہوگا جو یہ دعویٰ کرسکے کہ اس نے ملزم کو مقتولہ کی الماری میں سے پچاس ہزار روپے اڑاتے دیکھا ہے؟''

''جی ہاں...... یہی بات ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''مذکورہ رقم کی لاکر میں موجودگی کو بینک کی دستاویزات اور زبیر سلطان کی گواہی کے تناظر ہی میں سمجھا

www.Paksociety.com

اور ثابت کیا جاسکتا ہے۔"

"آخری سوال!" میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "کیا آپ نے ملزم کے پاس سے وہ رقم برآمد کرلی تھی؟"

آئی او نے نفی میں گردن ہلادی۔

میں اس چوبی میز کی جانب بڑھ گیا جہاں آلۂ قتل یعنی کیل ٹھونکنے والی ہتھوڑی سیلوفین بیگ کے اندر محفوظ رکھی نظر آرہی تھی۔ ہتھوڑی کے سر یعنی آہنی حصے پر موجود مقتولہ کا خون اب سیاہی مائل رنگت اختیار کرچکا تھا اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ قائم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے اس کا رنگ سرخ بھی رہا ہوگا۔

میں نے مذکورہ سیلوفین بیگ میز پر سے اٹھالیا اور ایکوزڈ باکس میں کھڑے اپنے موکل کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا۔

"جانتے ہو، اس بیگ کے اندر کیا ہے؟"

"ہتھوڑی ہے......" اس نے جواب دیا۔

"استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس ہتھوڑی کی مدد سے مقتولہ نورین کو قتل کیا گیا تھا۔" میں نے اپنے موکل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

بہت ساری باتیں جو انتہائی سادہ اور سامنے کی ہوتی ہیں انہیں بڑے طریقے سلیقے سے عدالت کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے اور ان لمحات میں، میں یہی کام کررہا تھا۔ میں نے پچھلے دنوں اس کیس کے حوالے سے بڑی بھاگ دوڑ کی تھی اور دو تین ملاقاتیں ملزم سے بھی ہوئی تھیں جس کے نتیجے میں مجھے بیش قیمت معلومات حاصل ہوئی تھیں جنہیں میں گاہے بہ گاہے، مناسب موقع دیکھ کر عدالتی کارروائی کے دوران میں استعمال بھی کررہا تھا۔

ملزم نے میرے استفسار کے جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور نہایت ہی مختصر سا جواب دیا۔ "جی......!"

"کیا تم اس ہتھوڑی کو پہچانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"اس کے دستے پر تمہارے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "کیا اس ہتھوڑی کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق بنتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، یہ تمہارے استعمال میں رہی ہو...... ہوں؟"

"جی ہاں...... آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "اس ہتھوڑی کا مجھ سے بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارا ساتھ پانچ سال سے زیادہ عرصے کا ہے اور یہ میرے استعمال میں بھی رہی ہے جبھی تو اس کے دستے پر میری انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔"

"ویری گڈ......!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "اب ذرا یہ بھی بتادو کہ تمہاری یہ دیرینہ رفیق جائے وقوعہ پر کیسے پہنچی؟"

"میرا خیال ہے......" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "وقوعہ کے روز جب میں مقتولہ کے گھر میں کام ختم کرنے کے بعد واپس آیا تھا تو یہ ہتھوڑی وہیں ڈرائنگ روم میں رہ گئی تھی۔"

"اچھا!" میں نے پرمعنی انداز میں گردن ہلائی۔ "تم جب اپنے اوزار سمیٹ کر مقتولہ کے فلیٹ سے نکلے تو اس وقت تمہیں یہ پتا نہیں تھا کہ یہ ہتھوڑی وہیں رہ گئی ہے؟"

"جی ہاں، مجھے اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔" وہ سادگی سے بولا۔ "میں نے صوفے کی مرمت کے دوران میں سارے اوزار ڈرائنگ روم کے فرش پر پھیلا رکھے تھے اور جب کام ختم ہوگیا تو میں انہیں اپنے مخصوص تھیلے (ٹولز کٹ) میں رکھ کر مقتولہ کے فلیٹ سے نکل آیا تھا۔ مجھے یقین ہے، میں اس ہتھوڑی کو تھیلے میں رکھنا بھول گیا تھا۔"

"تم مقتولہ کے فلیٹ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"میرا خیال ہے، اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تم مقتولہ کے فلیٹ پر کتنی دیر رکے تھے؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا......" وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کام تو میں نے چالیس پینتالیس منٹ میں ختم کرلیا تھا۔ اس کے بعد مقتولہ نے مجھے چائے پینے کو دی جس کی وجہ سے مزید دس پندرہ منٹ مجھے اس کے فلیٹ پر رکنا پڑا تھا لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ......" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "جب میں مقتولہ کے فلیٹ سے نکلا تو اس وقت چار بجنے میں ایک دو منٹ باقی تھے۔"

"یعنی جب تم مقتولہ کے فلیٹ سے باہر آئے تو اس وقت مقتولہ زندہ سلامت تھی؟" میں نے تصدیق طلب انداز میں استفسار کیا۔

"بالکل...... میں اسے صحیح سلامت وہاں چھوڑ کر آیا تھا۔" اس نے میرے حسب توقع جواب دیا۔ "بلکہ وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی تھی اور جب میں فلیٹ سے باہر نکلا تو اس نے دروازہ بند کردیا تھا۔"

"آخری سوال......" میں نے ملزم کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔ "جب تم اپنا کام ختم کرکے مقتولہ کے فلیٹ سے رخصت ہوئے تو کیا اس وقت فلیٹ کے اندر مقتولہ کے علاوہ کوئی اور شخص بھی موجود تھا؟"

"نہیں جناب...... وہ گھر میں اکیلی ہی تھی۔"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد استغاثہ کی طرف سے دو گواہ یکے بعد دیگرے شہادت کے لیے کٹہرے میں لائے گئے جن میں سے ایک تو اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ کا رہائشی تھا اور دوسرا بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ ان دونوں گواہوں کے بیانات اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں کوئی خاص یا نئی بات موجود نہیں تھی۔ دونوں کا موقف وکیل استغاثہ کے ابتدائی زوردار وکالت کا عکاس تھا اور مجھے تو ان کے بیانات میں صرف یہی بات سمجھ میں آئی کہ انہیں ملزم کا مقتولہ کے فلیٹ میں جانا اور اس سے خاطر تواضع کرنا ہضم نہیں ہوتا تھا۔

کوئی عورت اپنے شوہر کے بغیر کہیں اکیلی رہ رہی ہو تو بہت سوں کی ہوس بھری بھوکی نظریں اس پر لگ جاتی ہیں۔ یہ دونوں گواہان استغاثہ بھی اسی چکر میں دکھائی دیتے تھے۔ آپ اسے خواہ مخواہ کا حسد بھی کہہ سکتے ہیں۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے پر جج نے آئندہ پیشی کے لیے تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو ملزم کا بھائی رزاق میرے ساتھ تھا۔ رزاق فریج اور ایئر کنڈیشنز وغیرہ کی ریپئرنگ وغیرہ کا کام کرتا تھا اور اپنے شعبے کا ایک تجربہ کار اور قابل بھروسا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا تو اس کا شیو ہلکا سا بڑھا ہوا نظر آیا۔ وہ درمیانے قد کا ایک فربہ اندام اور ہنس مکھ شخص تھا۔ وہ ہر وقت سر پر ٹوپی لگائے رہتا تھا۔

رزاق نے مجھ سے پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ کی نظر میں اس وقت کیس کی کیا پوزیشن ہے؟"

"انتہائی تسلی بخش۔" میں نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"یعنی ساجد باعزت بری ہوجائے گا نا......؟" وہ متذبذب لہجے میں مستفسر ہوا۔

"آپ مجھے ایک بات بتائیں رزاق صاحب......!" جواب دینے کے بجائے میں نے الٹا اسی سے سوال کرڈالا۔ "کیا آپ کی نظر میں ساجد علی نے یہ قتل کیا ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!" وہ اٹل لہجے میں بولا۔ "ساجد ایسا کام کر ہی نہیں سکتا۔ والد صاحب مرحوم نے ہماری جس انداز میں تربیت کی تھی اس کی روشنی میں چوری، ڈکیتی، ہیرا پھیری کی ہم سے توقع نہیں کی جاسکتی اور انسانی جان کا قتل تو بہت دور کی بات ہے۔"

"گویا آپ کی نظر میں ساجد علی بے گناہ ہے......؟"

"جی ہاں، بالکل!" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

"جب یہ بات اتنے وثوق سے آپ کو معلوم ہے تو پھر وہ قادر مطلق بھی اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہوگا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "وہ ذات پاک تو علیم الخبیر ہے، سمیع البصیر ہے۔"

"اور وہ انصاف کرنے والا بھی ہے؟"

"بے شک!"

"تو پھر آپ مطمئن ہوجائیں۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنے بھائی کو اور میں اپنے موکل کو بے گناہ سمجھتا ہوں اور ہم دونوں کا یہ بھی ایمان ہے کہ وہ قادر مطلق تمام تر زمینی حقائق سے پوری طرح آگاہ ہے۔ جب وہ اپنے بندے پر کرم کرے گا اور میں اپنے موکل کی بریت کے لیے کوشش کروں گا تو پھر ملزم اس عدالت سے باعزت ہی اپنے گھر جائے گا۔"

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی طرف سے پراپرٹی ایجنٹ زبیر سلطان کو سب سے پہلے گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ زبیر سلطان بھاری تن وتوش کا مالک ایک ہشاش بشاش شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تیزی پائی جاتی تھی۔ وہ گندمی رنگت کا مالک ایک دور بین انسان تھا۔

زبیر سلطان نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کرادیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ وہ مختلف سوالات کے ذریعے گواہ کی زبان سے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہا کہ مقتولہ نے وقوعہ کے روز بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے جو وہ شام سات بجے اسے دینے والی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں چیک بک اور بینک کے ریکارڈ کا بھی کئی بار ذکر آیا۔ بہرحال، حاصلِ بحث صرف اتنا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتولہ کے گھر میں پچاس ہزار روپے کی رقم موجود تھی۔

وکیل استغاثہ نے گواہ کو فارغ کیا تو جج سے اجازت

www.Paksociety.com

لے کر میں گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کچھ اس انداز میں اپنی جرح کا آغاز کیا۔

"زبیر صاحب! کیا یہ بات درست ہے کہ آپ کا تعلق ایک خاص کمیونٹی سے ہے؟"

"جی ہاں، یہ بات سولہ آنے درست ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ کی کمیونٹی میں نوکری وغیرہ کرنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" میں نے بڑے میٹھے انداز میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں؟"

"بات محض ترجیح کی نہیں ہے وکیل صاحب......" وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ صرف کاروبار اور تجارت ہی کرتے ہیں۔ ہماری کمیونٹی کے روحانی پیشوا نے ہمیں ملازمت وغیرہ سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ ہم صرف اور صرف اپنا کام کرتے ہیں، چاہے ہمیں چنے کی چھابڑی کیوں نہ لگانا پڑے۔"

"بہت خوب......!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "کامیاب تجارت کے لیے تو ایمانداری بنیادی شرط سمجھی جاتی ہے۔ کیا آپ کے ہاں بھی اس بنیادی لوازم کا خیال رکھا جاتا ہے؟"

"جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، بالکل اسی طرح دنیا میں پائے جانے والے تمام افراد بھی ایک جیسے نہیں ہوسکتے لہٰذا ہماری کمیونٹی میں سو فیصد دیانت دار لوگوں کا پایا جانا لازمی نہیں ہے۔" وہ بڑے خوبصورت پیرائے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "البتہ، آپ نے جس کاروباری اصول کا ذکر کیا ہے اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جو بھی شخص اس اصول پر کاربند رہتا ہے وہ فلاح و ترقی پاتا ہے۔"

"ہم دوسروں کی بات نہیں کرتے، صرف آپ کی ذات کو فوکس کرتے ہیں۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "کیا آپ نے اپنے بزنس میں متذکرہ بالا اصول کے لیے جگہ بنا رکھی ہے؟"

"الحمدللہ......!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"زبیر صاحب!" میں نے اچانک سوالات کا زاویہ بدل دیا۔ "کیا آپ کے پاس کوئی ایسی صلاحیت بھی ہے کہ لوگ آپ کو اپنے گھریلو رازوں میں بھی شریک کرلیتے ہیں؟"

"اگر یہاں لوگوں سے مراد میرے گھر کے افراد ہیں تو الحمدللہ...... اس معاملے میں میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں۔" وہ پراعتماد انداز میں بولا۔ "میرے فیملی کے تمام افراد اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتے ہیں۔"

"میں آپ کے گھر کی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے وضاحت ضروری جانی۔ "دوسرے لوگ جیسے...... مقتولہ نورین......؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب۔" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "دوسرے لوگ بھلا کیوں مجھے اپنے رازوں میں شریک کرنے لگے؟"

"وکیل استغاثہ نے آپ کے ساتھ جو بیس پچیس منٹ صرف کیے ہیں اس کا لب لباب اور اس لب لباب میں سے اٹھنے والے بلبلے اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مقتولہ اپنے مالیاتی راز آپ کے ساتھ شیئر کیا کرتی تھی جبھی آپ کو یہ بات پتا تھی کہ وقوعہ کے روز اس نے پچاس ہزار روپے بینک سے نکلوا کر اپنی الماری کے لاکر میں رکھے تھے......؟"

"نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ نے وکیل استغاثہ کی گفتگو سے خود ہی یہ مطلب اخذ کرلیا ہے ورنہ میں نے تو ایسا کوئی تاثر نہیں دیا۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتولہ نے آپ کو نہیں بتایا تھا کہ اس نے پچاس ہزار کی رقم اپنی الماری کے لاکر میں رکھی تھی؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

"جی، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "وہ بھلا مجھے اپنے بیڈروم اور اس میں رکھی الماری کے لاکر کے حوالے سے کیوں بتانے لگی......"

"تو گویا آپ کی معلومات صرف اس حد تک ہیں کہ مقتولہ نے وقوعہ کے روز بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے؟" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ بات دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ اس نے مذکورہ رقم اپنی الماری کے لاکر ہی میں رکھی تھی؟"

"جی یہی حقیقت ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "مجھے صرف مقتولہ نے یہ بتایا تھا کہ اس نے بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوا لیے ہیں جو وہ شام کو میرے آفس آکر مجھے ادا کردے گی۔ اب اس نے ان پچاس ہزار روپوں کو الماری میں رکھا تھا، تکیے کے نیچے چھپایا تھا، اپنے پرس میں ڈالا تھا یا کسی گلے میں دبایا تھا، یہ تو وہی جانتی تھی اور یا پھر خدا کو معلوم تھا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں زبیر صاحب!" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو معزز عدالت کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ مقتولہ کس سلسلے میں آپ کو پچاس ہزار روپے ادا کرنے والی تھی؟"

اس عدالت میں نورین مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی تھی لیکن زیادہ زور پچاس ہزار روپے کی چوری پر دکھائی دیتا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ استغاثہ نے اس مرڈر کو پچاس ہزار روپے کی چوری کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

استغاثہ کے گواہ نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا کہ مقتولہ اس کے توسط سے ایک فلیٹ کا سودا کر رہی تھی اور وقوعہ کے روز ٹوکن کے طور پر پارٹی کو پچاس ہزار روپے ادا کرنا تھے تاکہ سیل ایگری منٹ تیار کیا جاسکے لیکن مقتولہ کی موت کے باعث یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ میں نے مزید دو چار ضمنی سوالات کے بعد زبیر سلطان کو فارغ کردیا۔

میرے حساب سے زبیر سلطان کی گواہی محض وقت کا زیاں ثابت ہوئی تھی۔ استغاثہ اس کے بیان سے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مقتولہ نے اپنے الماری کے لاکر میں پچاس ہزار روپے رکھے تھے، وغیرہ وغیرہ...... اور میں نے استغاثہ کے اس اسٹینڈ کو قدموں سے اکھاڑ پھینکا تھا۔

اگلا گواہ نادر عباسی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تھانے فون کرکے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ عباسی لوکل گورنمنٹ کا ملازم تھا۔ اس کے محکمے یا عہدے کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ نادر عباسی اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ کے بی بلاک میں رہائش پذیر تھا جس کے بلاک اے میں مقتولہ نورین کا فلیٹ تھا۔ عباسی سانولی رنگت کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح مکمل کرلی تو میں اپنی باری پر گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔ میں چند لحات تک سوچتی ہوئی نظر سے عباسی کو دیکھتا رہا پھر جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"عباسی صاحب! پولیس کے ریکارڈ کے مطابق اس اندوہناک واقعے کی اطلاع آپ ہی نے متعلقہ تھانے کو دی تھی۔ کیا یہ سانحہ آپ کی نظر کے سامنے وقوع پذیر ہوا تھا؟"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وقوعہ استغاثہ کے گواہ نادر عباسی کے سامنے پیش نہیں آیا تھا، تاہم میں نے اسے ایک خاص زاویے سے گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے نہایت ہی مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں وکیل صاحب......!"

"پھر آپ کو اس واقعے کی خبر کیسے ہوئی؟"

"مجھے بلڈنگ کے چوکیدار نے اس بارے میں بتایا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"جب چوکیدار نے آپ کو یہ اطلاع دی اس وقت آپ کہاں تھے؟" میں نے جرح کے سلسلے کو رفتہ رفتہ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"میں چند لمحے پہلے ہی بلڈنگ میں داخل ہوا تھا۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "میں جیسے ہی گاڑی پارک کرکے باہر نکلا، چوکیدار حنیف نے میرے پاس آکر یہ اطلاع دی اور اس کے ساتھ ہی درخواست بھی کی کہ میں اس افسوسناک واقعے کی اطلاع پولیس کو دے دوں، سو......" وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں جلدی سے گھر پہنچا اور متعلقہ تھانے میں فون کر دیا۔"

"آپ نے لگ بھگ کتنے بجے تھانے فون کیا تھا؟"

"میرے خیال میں اس وقت سہ پہر کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔" اس نے جواب دیا۔ "بلکہ شام ہونے والی تھی۔ سردیوں میں دن گھٹ کر کافی چھوٹا ہوجاتا ہے۔"

"آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "آپ کے خیال میں بلڈنگ کے چوکیدار حنیف کو یہ کیسے پتا چلا تھا کہ بلاک اے کے فلیٹ نمبر چار سو ایک میں رہنے والی مسز نورین کو کسی نے قتل کردیا ہے؟"

"آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے وکیل صاحب!" وہ تعریفی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے پولیس کو فون کرنے سے پہلے اس بارے میں چوکیدار سے استفسار کیا تھا۔"

"پھر اس نے آپ کو کیا جواب دیا تھا؟"

"چوکیدار کو یہ بات آمنہ سے پتا چلی تھی۔" عباسی نے جواب دیا۔

اس کیس میں ایک نیا کردار سامنے آیا تھا لہٰذا میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"آمنہ کون؟"

"آمنہ ایک ماسی (نوکرانی) ہے جناب۔" عباسی نے بتایا "وہ ہماری بلڈنگ کے چند گھروں میں کام کرنے آتی ہے۔ مقتولہ کے گھر پر بھی وہی کام کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز سہ پہر میں جب وہ کام کے لیے مقتولہ کے گھر پہنچی تو اس نے مقتولہ کو بیڈروم کے فرش پر مردہ حالت میں پڑے

www.Paksociety.com

دیکھا۔ اس کے بعد ہی وہ دوڑتی ہوئی چوکیدار کے پاس پہنچی تھی۔''

میں نے اپنی فائلوں میں جھانکا اور وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ اور گواہان کی فہرست میں آمنہ نامی کسی کردار کا ذکر نظر نہیں آتا۔ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں؟''

''اس میں آپ کو کیا عجیب محسوس ہو رہا ہے؟'' اس نے اکھڑے ہوئے انداز میں الٹا مجھی سے پوچھ لیا۔

''آمنہ وہ عورت ہے جس نے سب سے پہلے مقتولہ کو مردہ حالت میں دیکھا تھا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''رپورٹنگ پرسن کا نام تو کسی بھی رپورٹ میں بڑے اہتمام کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور یہاں اس ماسی بے چاری کا ذکر تک پڑھنے کو نہیں ملتا۔ اس سنگین نظر اندازی کا کیا سبب ہے؟''

''کوئی سبب نہیں۔'' وہ بہ دستور اکھڑے ہوئے انداز میں بولا۔ ''استغاثہ نے جس بات کو ضروری سمجھا، اسے رپورٹ میں شامل کر لیا اور......''

''اور جس بات کو غیر ضروری جانا اسے گول کر دیا۔'' میں نے اس کا بیان مکمل ہونے سے پہلے ہی طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہی بات ہے نا میرے فاضل دوست؟''

''آپ جو بھی سمجھ لیں......'' وہ رکھائی سے بولا۔

''جو بھی سمجھنے کی بات نہیں ہے مائی ڈیئر......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ترشی سے کہا۔ ''میں نے وہی سمجھا ہے جو آپ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے......'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور نہایت ہی ادب کے ساتھ عرض کیا۔

''جناب عالی! جس عورت نے سب سے پہلے مقتولہ نورین کی لاش کو دیکھا، ڈیفنس کی نظر میں وہ بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ مجھے تو اس بات پر سخت حیرت ہے کہ استغاثہ کی رپورٹ میں آمنہ ماسی کا کہیں ذکر تک نہیں کیا گیا۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مذکورہ ماسی کو عدالت میں حاضر کرنے کا خصوصی بندوبست کیا جائے۔ میں اس گھریلو ملازمہ پر اپنے انداز میں جرح کرنا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے ساتھ ہی بلڈنگ کے چوکیدار حنیف کو بھی اگلی پیشی پر عدالت میں بلایا جائے۔ اس شخص سے پوچھ گچھ بھی اس کیس کے سلسلے میں معاون اور میرے موکل کے حق میں مفید ثابت ہو سکتی ہے۔''

معزز عدالت نے میرے مطالبے کو راست جانتے ہوئے متعلقہ عدالتی عملے کو خصوصی ہدایات جاری کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

☆☆☆

آئندہ پیشی پر آمنہ ماسی عدالت میں موجود نہیں تھی۔ استغاثہ کی طرف سے وضاحت دی گئی کہ آمنہ اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے اور اسے بلانے کی مہم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ آمنہ کا گاؤں بلوچستان کا ایک دور دراز علاقہ تھا اور وہ کراچی کے علاقے گولی مار میں، ندی کے کنارے ایک بستی میں رہتی تھی جہاں زیادہ تر اسی کی ہم پیشہ عورتوں یعنی ماسیوں کے خاندان آباد تھے۔

پتا نہیں کیوں...... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ استغاثہ آمنہ ماسی کے سلسلے میں جان بوجھ کر تاخیری حربے آزما رہا تھا ورنہ دس دن کا وقت کوئی کم نہیں ہوتا۔ اس عرصے میں پاکستان کے کسی بھی کونے سے آدمی کو کھینچ کر عدالت میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ بہر حال، میں نے کراچی لیول پر ملزم کے بھائی رزاق کو خصوصی ہدایات کے ساتھ ایک ڈیوٹی سونپ دی تھی۔ اسے نہایت ہی غیر محسوس انداز میں آمنہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھ تک پہنچانا تھیں۔

اس پیشی پر بلڈنگ کا چوکیدار حنیف عدالت میں حاضر تھا لہٰذا میں نے اس روز اسی پر گزارہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ حنیف کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل نہیں تھا، تاہم اس کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ہی کی تھی۔

حنیف نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ پوچھ گچھ کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ دو چار سرسری سے سوالات پوچھ کر وکیل استغاثہ نے اسے فارغ کر دیا۔ اس کے بعد یقیناً میری باری تھی۔

حنیف کی عمر پینتیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر ہی خلاف عادت براہ راست جرح شروع کر دی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ مقتولہ کی ماسی آمنہ نے تمہیں اس کے قتل کے بارے میں بتایا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں، یہ بالکل صحیح بات ہے۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

www.Paksociety.com

''تم اس وقت کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے جب ماسی نے تمہیں یہ اطلاع دی؟''

''میں بلڈنگ کی چھت سے نیچے آ رہا تھا۔'' وہ بولا۔ ''سیڑھیوں پر ماسی آمنہ سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اندر مقتولہ یعنی نورین کی لاش پڑی ہے۔''

''تم بلڈنگ کی چھت پر کیا کرنے گئے تھے؟''

''پانی کھولنے......'' اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

مجھے مذاق کی سوجھی، ترت پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں نے پانی کو بلڈنگ کی چھت پر کہیں قید کر رکھا ہے جو تم اسے کھولنے گئے تھے؟''

''ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب۔'' وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے تفریحاً پوچھ لیا۔

''جناب، بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بلڈنگ کے گھروں کو پانی سپلائی کرنے والی ٹینکی چھت پر بنی ہوئی ہے۔ میں پانی نہیں بلکہ اس کے والوز کھولنے چھت پر گیا تھا۔ یہ کام میں صبح و شام دونوں وقت کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم ٹینکی کا والوز کھول کر چھت سے نیچے آ رہے تھے تو اس وقت کم و بیش سہ پہر کے پانچ بجے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، میرے خیال میں اس وقت شام کے پانچ دس ہوئے تھے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں والوز کھولنے کے بعد تقریباً دس منٹ تک چھت پر ہی موجود رہتا ہوں۔''

''تم جس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں چوکیداری کرتے ہو اس میں کل کتنے فلور ہیں؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''چھ......'' اس نے بتایا۔ ''یعنی گراؤنڈ پلس پانچ فلور۔''

''مطلب یہ کہ پانچ فلور یعنی چھ منزلیں؟''

''جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہے۔''

''مقتولہ کا فلیٹ کس فلور پر واقع ہے؟''

''فورتھ فلور پر......'' اس نے جواب دیا۔ ''فلیٹ نمبر چار سو ایک۔ یہ فلیٹ زینوں کے سامنے ہی پڑتا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے جلدی سے کہا پھر پوچھا۔ ''جب تم والوز کھول کر بلڈنگ کی چھت سے نیچے آئے تو ماسی آمنہ نے تمہیں مقتولہ کی لاش کے بارے میں بتایا تھا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، تم دونوں کی ملاقات بلڈنگ کے کس حصے میں ہوئی تھی؟''

اس نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی پھر جواب دیا۔ ''جناب! اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔ جب میں اوپر سے نیچے اتر رہا تھا تو فورتھ فلور پر پہنچتے ہی ماسی آمنہ اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔ بس وہیں زینے پر، مقتولہ کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔''

''آمنہ اچانک ہی تمہارے سامنے آ گئی تھی......'' میں نے اسی کے الفاظ دہرائے پھر پوچھا۔ ''وہ آئی کہاں سے تھی؟''

''جج...... جی......'' وہ الجھن بھرے انداز میں بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''میں نے تم سے ریاضی کا کوئی پیچیدہ سوال نہیں کیا جو تم اس قدر پریشان نظر آ رہے ہو؟'' میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ وہ اچانک ہی تمہارے سامنے آ گئی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ زینوں کی طرف سے آئی تھی یا گیلری میں موجود تھی یا چھت سے ٹپکی تھی یا......''

''وہ گھر کے اندر سے نکلی تھی......!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''کس کے گھر سے؟''

''نورین کے گھر سے......'' اس نے جواب دیا۔ ''میں جیسے ہی زینے اترتے ہوئے فورتھ فلور پر پہنچا، فلیٹ نمبر چار سو ایک کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ماسی باہر نکلی۔ وہ اس وقت بہت گھبرائی ہوئی تھی۔''

''اس نے تم سے کیا کہا تھا؟'' میں نے کریدنے والے انداز سے پوچھا۔

''اس نے بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں بتایا کہ اندر نورین کی لاش پڑی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر تم نے کیا، کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھاگتا ہوا نیچے اترا اور عباسی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔ ''میں جب چھت پر تھا تو میں نے ان کی گاڑی کو بلڈنگ میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ عباسی صاحب ایک پڑھے لکھے سرکاری افسر ہیں۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اس واقعے کی اطلاع عباسی صاحب ہی کو دینا چاہیے۔ وہ بلڈنگ کی یونین کے عہدے دار بھی

ہاں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

''میری بات سن کر وہ جلدی سے اپنے گھر گئے پھر انہوں نے اپنے گھر سے پولیس کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔''

''کیا تم نے مقتولہ نورین کی لاش کو اس کے بیڈروم میں پڑے دیکھا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''نن...... نہیں......'' وہ بوکھلا گیا۔ ''ہاں...... دیکھا تھا......''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ''ہاں...... کہ...... نہ؟''

''وہ جناب، بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب ماسی آمنہ نے مجھے مقتولہ کے قتل کے بارے میں بتایا تو میں گھبرا گیا تھا اور میں تیزی سے زینے اتر کر عباسی صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا پھر جب پولیس ہماری بلڈنگ میں آئی تو میں عباسی صاحب اور پولیس والوں کی موجودگی میں مقتولہ کے گھر کے اندر گیا تھا اور میں نے بیڈروم کے فرش پر اس کی لاش پڑی دیکھی تھی۔ پولیس نے مجھے بیڈروم کے اندر تو نہیں جانے دیا تھا۔ میں نے کامن میں کھڑے کھڑے، بیڈروم کے فرش پر پڑی مقتولہ نورین کی لاش دیکھی تھی۔''

''یعنی جب آمنہ ماسی نے تمہیں اس واقعے کی اطلاع دی تو تم اس وقت مقتولہ کے فلیٹ میں داخل نہیں ہوئے تھے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی...... جی ہاں......'' وہ ایک بار پھر اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بعد میں عباسی صاحب کی موجودگی میں مقتولہ کے فلیٹ کے اندر گیا تھا۔''

میں نے چوکیدار حنیف پر اپنی جرح ختم کر دی اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اس کیس کے تمام گواہ بھگتائے جا چکے ہیں سوائے ایک کے اور وہ گواہ ہے...... آمنہ ماسی۔ میری معزز عدالت سے پرزور استدعا ہے کہ آئندہ پیشی پر ماسی آمنہ کی گواہی کو یقینی بنایا جائے تاکہ اس کیس کو جلد از جلد نمٹایا جا سکے۔ دیٹس آل یور آنر......!''

جج نے اثبات میں سر ہلایا اور وکیل استغاثہ کو ضروری ہدایات دینے لگا، پھر ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر اس نے عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور کٹہرے میں آمنہ ماسی کھڑی تھی۔

وہ گھروں میں کام کرنے والی ایک ماسی تھی اور ماسی ہی دکھائی بھی دیتی تھی۔ آمنہ کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ دھان پان، درمیانے قد کی مالک اور گوری چٹی عورت تھی۔ دبلا پتلا ہونے کے باوجود بھی وہ خاصی پھرتیلی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک خاص قسم کی تیزی پائی جاتی تھی۔ اس کے چہرے کی خاص نشانی یہ تھی کہ اس نے اپنے دونوں کانوں کو متعدد مقامات سے چھدوا رکھا تھا اور دونوں کانوں کے بالائی حصوں میں چھوٹی چھوٹی بالیوں کی قطاریں سجا رکھی تھیں۔ یہ طلائی بالیاں، کانوں کے بالائی حصے میں نیچے سے اوپر تک چلی گئی تھیں۔

وکیل استغاثہ نے واجبی سی جرح کر کے جب اسے فارغ کر دیا تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ ان لمحات میں وہ خاصی گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آمنہ میری دریافت تھی لہٰذا اس سے سوال و جواب کی ذمے داری بھی مجھی پر عائد ہوتی تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا خیال ہے آمنہ...... اس مرتبہ تم نے گاؤں میں کچھ زیادہ ہی دن نہیں لگا دیے......؟''

''ہاں، ادھر گاؤں میں کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔'' وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''میرا چاچا فوت ہو گیا تھا۔''

''تو اب تم گاؤں والے معاملات نمٹا کر واپس آ گئی ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تمہارے دل و دماغ سے غم کے بادل چھٹ چکے ہیں اور میں تم سے جو بھی پوچھوں گا، تم حاضر دماغی سے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گی؟''

''جی......'' وہ نحیف سی آواز میں بولی۔ ''آپ پوچھیں......''

میں نے پوچھا۔ ''آمنہ! گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں عموماً صبح ہی آیا کرتی ہیں۔ تمہارے سہ پہر میں آنے کی کوئی خاص وجہ......؟''

''باجی دیر تک سونے کی عادی تھی جناب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ ساڑھے دس، گیارہ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتی تھی اور میرے پاس اس وقت ایک گھر لگا ہوا تھا۔ میں باجی کے پاس صبح دس سے پہلے آ سکتی تھی لہٰذا اس نے مجھے شام میں بلا لیا تھا۔''

www.Paksociety.com

''باجی۔'' سے آمنہ کی مراد مقتولہ نورین تھی۔ میں نے آمنہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تم مقتولہ کے گھر کتنے بجے کام کرنے آیا کرتی تھیں؟''

''جی...... پانچ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تمہارا کام کب تک ختم ہو جاتا تھا؟''

''جب باجی کپڑے بھی دھلاتی تھی تو پھر چھ تو بج ہی جاتے تھے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''اگر صرف جھاڑو پونچھا اور برتن وغیرہ ہوں تو میں یہ کام آدھے گھنٹے میں نمٹا کر فارغ ہو جاتی تھی۔''

''یعنی زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے......؟''

''جی......'' وہ متلاشی نظر سے عدالت کے دروازے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جی ہاں۔''

آمنہ کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کا اضطرار پایا جاتا تھا۔ وہ بار بار عدالت کے دروازے کی جانب اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ جب کوئی شخص پہلی مرتبہ گواہی دینے عدالت میں پیش ہوتا ہے تو اس پر لازماً ایک گھبراہٹ سی طاری ہوتی ہے لیکن آمنہ کی گھبراہٹ بڑی مختلف سی اور انوکھے انداز کی تھی۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آمنہ! کیا وقوعہ کے روز بھی تم پانچ بجے سہ پہر ہی مقتولہ کے گھر پہنچی تھیں؟''

''جی اس روز میں ذرا جلدی آ گئی تھی۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کتنی جلدی؟''

''آدھا گھنٹا پہلے......'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی ساڑھے چار بجے؟''

''جی ہاں!''

''اس روز جلدی آنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

''جی...... میرا بچہ بیمار تھا......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اسے پانچ بجے ڈاکٹر کو دکھانا تھا اسی لیے میں نے سوچا کہ ذرا جلدی چلی جاتی ہوں تاکہ کام جلدی ختم کر کے گھر واپس آ جاؤں۔''

''جب تم مقتولہ کے گھر پہنچیں تو پھر کیا ہوا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''میں گھر میں داخل ہوئی، جھاڑو اٹھائی اور بیڈروم کی طرف چلی گئی۔'' وہ بتانے لگی۔ ''اس دن میں جھاڑو پونچھے کے ارادے ہی سے وہاں گئی تھی اور جھاڑو کا کام میں بیڈروم ہی سے شروع کیا کرتی تھی......'' اس نے بات مکمل کر کے ایک بار پھر عدالت کے دروازے کی جانب نگاہ دوڑائی۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیا تمہیں کسی کا انتظار ہے؟''

''جی...... نہیں!'' اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

''یہاں سے جانے کی جلدی ہے؟''

''ایسی بات نہیں......'' وہ دھیمے انداز میں بولی۔ ''وہ جی...... میں پہلی مرتبہ عدالت میں آئی ہوں نا اس لیے...... دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

''اپنے دل کو قابو میں رکھو آمنہ، ابھی تو جرح کا آغاز ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے ڈھیروں سوالات پوچھنا ہیں۔ تم وہ گواہ ہو جس نے سب سے پہلے مقتولہ کی لاش کو دیکھا تھا۔ اگر تم نے اسی طرح گھبراہٹ کو خود پر طاری رکھا تو مجھے ڈر ہے، تم چکرا کر کٹہرے کے فرش پر گر و گی اور بے ہوش ہو جاؤ گی۔''

''جی...... میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''شاباش!'' میں نے بہ آواز بلند کہا پھر پوچھا۔ ''جب تم جھاڑو اٹھائے مقتولہ کے بیڈروم میں داخل ہوئیں تو تم نے وہاں کیا دیکھا تھا؟''

''باجی...... بیڈروم کے فرش...... پر پڑی تھی۔'' وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''اس کے سر سے خون نکل رہا تھا اور کپڑوں والی الماری بھی کھلی پڑی تھی۔''

''ذرا اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد سے لے کر بیڈروم تک پہنچنے میں تمہیں کتنا وقت لگا ہوگا؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک منٹ جی......''

''وقوعہ کے روز تمہارے بیان کے مطابق تم ساڑھے چار بجے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچی تھیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور ایک منٹ بعد ہی تم نے بیڈروم میں مقتولہ کی لاش پڑی دیکھ لی تھی۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

''جی...... ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پھر تم نے کیا، کیا تھا؟''

''باجی کو مردہ حالت میں فرش پر پڑے دیکھ کر میں تو

گھبرا گئی تھی وکیل صاحب۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ''میری کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں فلیٹ سے باہر کی جانب دوڑ پڑی تھی۔''

''اور فلیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی چوکیدار حنیف سے تمہارا سامنا ہو گیا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ چھت کی طرف سے زینہ اترتے ہوئے نیچے آ رہا تھا...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں نے حنیف کو بتایا کہ اندر باجی کی لاش پڑی ہے۔ یہ بات سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔''

''کیا چوکیدار نے فلیٹ کے اندر آ کر مقتولہ کی لاش دیکھی تھی؟'' میں نے چوکیدار حنیف کے بیان کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

''نہیں جناب، وہ گھر کے اندر داخل نہیں ہوا تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''میری بات سنتے ہی وہ گھبراہٹ بھرے انداز میں نیچے کی طرف چلا گیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ نیچے عباسی صاحب موجود ہیں۔ میں انہیں اس واقعے کے بارے میں بتانے جا رہا ہوں۔''

''پھر چوکیدار نے عباسی صاحب کو بتایا، عباسی صاحب نے پولیس کو فون کیا اور تھوڑی دیر کے بعد پولیس وہاں پر موجود تھی۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''ایسا ہی ہوا تھا نا......؟''

''جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''تم وقوعہ کے روز سہ پہر ساڑھے چار بجے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچی تھیں۔'' میں نے اپنی جرح میں یک دم تیزی بھرتے ہوئے کہا۔ ''چار اکتیس پر تم جھاڑو تھامے مقتولہ کے بیڈروم میں داخل ہوئیں۔ بیڈروم کے فرش پر مقتولہ کی لاش پڑی دیکھ کر تمہارے اوسان خطا ہو گئے اور تم گھبراہٹ کے عالم میں باہر کی طرف دوڑیں۔ تم جیسے ہی فلیٹ سے باہر نکلیں، تمہاری نظر چوکیدار پر پڑی اور تم نے اسے مقتولہ کی لاش کے بارے میں بتایا۔''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم فرض کر لیں کہ بیڈروم سے نکل کر فلیٹ کے داخلی دروازے تک پہنچنے میں تمہیں زیادہ سے زیادہ تین منٹ لگے ہوں گے۔ اس حساب سے جب تم نے چوکیدار کو مقتولہ کی موت کے بارے میں بتایا، اس وقت سہ پہر کے چار بج کر چونتیس منٹ ہوئے ہوں گے۔ اگر میرے حساب میں کوئی غلطی ہو تو بتاؤ......؟''

''نہیں جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ عدالت کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔ ''اس وقت یہی ٹائم تھا۔''

''لیکن......'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''چوکیدار حنیف نے معزز عدالت کے روبہ رو یہ بیان دیا ہے کہ جب تم نے اسے مقتولہ کی لاش کے بارے میں بتایا اس وقت سہ پہر کے پانچ بج کر دس منٹ ہوئے تھے...... یہ لگ بھگ ایک گھنٹے کا فرق کیسے آ گیا؟''

''چوکیدار...... بھول رہا...... ہو گا......'' وہ اٹک اٹک کر بولی۔ ''وقت تو...... وہی تھا جو میں نے...... آپ کو بتایا ہے۔''

میرے سوال نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ خوف کے سائے منڈلاتے دیکھے اور پہلی ہی بار مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی میری جرح میں بھی تندی آ گئی اور میں نے درشت انداز میں آمنہ سے استفسار کیا۔

''چوکیدار کے بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ روزانہ شام میں ٹھیک پانچ بجے چھت کی ٹینکی کے والوز کھولنے اوپر جاتا ہے اور کم و بیش دس منٹ تک وہ چھت پر موجود رہتا ہے۔ وہ چھت سے نیچے آ رہا تھا کہ تمہاری اس سے ملاقات ہو گئی۔ اس وقت لگ بھگ پانچ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ تم اپنی بات پر ڈٹی ہوئی ہو، اس کا مطلب ہے کہ تم سراسر غلط بیانی سے کام لے رہی ہو...... آخر کیوں؟''

''مم...... میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ بولی۔ ''بلکہ چوکیدار جھوٹ سے کام لے رہا ہے۔''

''وہ کیوں جھوٹ بولے گا۔'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ''اس کی تم سے کیا دشمنی ہے؟''

''یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔'' وہ برہمی سے بولی۔ ''مجھے کیا پتا......؟''

''اگر تمہیں نہیں پتا تو فکر نہ کرو، آج پتا چل جائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''چوکیدار کو تو تم نے جھوٹا قرار دے دیا ہے۔ یہ بتاؤ، عباسی صاحب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''عباسی کون......؟'' وہ سوچے سمجھے بغیر بول گئی۔

''لگتا ہے، تمہاری یادداشت رخصت ہو رہی ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''میں ان عباسی صاحب کا

ذکر کر رہا ہوں جو بی بلاک کے فلیٹ نمبر تین سو تین میں رہتے ہیں۔ یہ وہی عباسی صاحب ہیں جن کو چوکیدار نے مقتولہ کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا تھا اور ان کے فون کرنے پر پولیس وقوعہ پر پہنچی تھی؟''

''اچھا اچھا...... آپ ان عباسی صاحب کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ خفت آمیز لہجے میں بولی۔

''اچھا ہوا، تمہیں خود ہی یاد آ گیا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

میرے لہجے کی سنگینی نے اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سی وحشت بھر دی۔ وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ ''ان عباسی صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟''

''انہیں بھی چوکیدار کی طرح جھوٹ کا مرض ہو گیا ہے۔'' میں نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں کہا۔ ''ان کا بیان ہے کہ چوکیدار حنیف نے کوئی سوا پانچ بجے انہیں مقتولہ کی موت کی اطلاع دی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر سے جب متعلقہ تھانے فون کیا تو پولیس اسٹیشن کی گھڑی میں سہ پہر کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔ پولیس کوئی چھ بجے جائے وقوعہ پر پہنچی تھی۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے آمنہ سے کہا۔

''یہ اتنے سارے لوگ جھوٹ بول رہے ہیں اور ایک صرف تم ہی سچی ہو...... ہیں نا؟''

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور اپنی گردن کو نرخرے کے مقام پر سے سہلاتے ہوئے فریادی لہجے میں بولی۔ ''پپ...... پپ...... پانی......!''

''پانی ضرور ملے گا اور ابھی ملے گا۔'' میں نے بلند آہنگ کراری آواز میں کہا۔ ''مگر اس سے پہلے تمہیں بہت سوچ سمجھ کر میرے ایک سوال کا جواب دینا ہو گا۔''

وہ بہ دستور گلے کو سہلاتے ہوئے وحشت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز جب تم خلاف معمول ذرا جلدی کام کرنے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچیں تو گھنٹی کی آواز پر تمہارے لیے دروازہ کس نے کھولا تھا......؟''

وہ سوچ سمجھ کر جواب دینے کا مقام بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ ادھر میرا سوال ختم ہوا، ادھر اس نے کھٹ سے جواب دیا۔ ''باجی نے......!''

''لیکن تمہاری باجی تو اپنے بیڈروم کے فرش پر مردہ پڑی تھی۔'' میں نے طنزیہ نظر سے اسے گھورا۔ ''وہ تمہارے

بے نسوانی حسن کا راز
بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹائٹنگ کریم (ہربل)
چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
Rs.250/=
چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔ قیمت =/125
گلیسی یونانی کریم
قیمتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بدنما داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کر کے رنگ گورا کرتی ہے۔
بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528 اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹریچر مفت منگوائیں
2433682 042-7666264
Cell: 0333-5203553, Website: wwwdevapk.com

لیے دروازہ کیسے کھول سکتی تھی۔ اب ایک ہی بات ممکن ہے کہ......" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے تمسخرانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر دوبارہ آمنہ ماسی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"جب تم مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچیں تو مقتولہ نے تمہارے لیے دروازہ کھولا تھا اور......اور......تم نے اسے قتل کردیا؟"

میری بات کی تکمیل کے ساتھ ہی عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ آمنہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ برسوں کے مریض کی طرح کٹہرے کی ریلنگ کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ وہاں موجود ہر شخص کی نگاہ اسی پر لگی ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس بار آمنہ نے بھولے سے بھی عدالت کے داخلی دروازے کی طرف نہیں دیکھا بلکہ...... یکایک کٹہرے سے نکل کر دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔

اس منظر نے جج سمیت ہر شخص کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ فرار کی راہ اختیار کر کے اپنے جرم کا اقبال کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ عدالت کے دروازے تک پہنچ پاتی، عدالت کے کمرے میں موجود آئی او نے اپنے ایک بیٹی بھائی کے تعاون سے اسے قابو کرلیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھوں میں آہنی زیور پہنا دیا گیا۔

☆☆☆

پچھلی پیشی پر رونما ہونے والی ڈرامائی صورت حال نے میرے موکل کی بے گناہی ثابت کردی تھی لہٰذا آیندہ پیشی پر عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ساجد کو باعزت بری کر دیا۔

آمنہ کو گزشتہ پیشی پر ہی حراست میں لے لیا گیا تھا۔ پولیس کسٹڈی کی پہلی رات ہی اس نے اپنا جرم قبول کرلیا تھا۔ مقتولہ کی الماری سے پچاس ہزار روپے اسی نے چرائے تھے اور پکڑے جانے پر اسی نے ہتھوڑی سے مقتولہ کی کنپٹی پر ایک کاری ضرب لگا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے اقبالی بیان کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

اس نے بچے کی بیماری کا محض بہانہ کیا تھا۔ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وقوعہ کے روز آدھا گھنٹا پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر بکھرے لکڑی اور کپڑے کے کچرے میں اسے ملزم کی ہتھوڑی پڑی نظر آئی تو اس نے ایک فوری خیال کے تحت اس ہتھوڑی کے آہنی حصے یعنی سر کی طرف سے پکڑا اور اپنے ساتھ بیڈروم میں لے گئی۔ اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اگر وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی تو اپنی حفاظت کے لیے اسی ہتھوڑی کو استعمال کرے گی۔ ہتھوڑی کو آہنی حصے کی جانب سے پکڑنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے دستے پر اپنی انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ٹی وی ڈرامے میں دیکھا تھا کہ فنگر پرنٹس کی مدد سے پولیس بہ آسانی مجرم تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ ہتھوڑی ساجد علی کی تھی لہٰذا پولیس کی تحقیق ساجد ہی کو مجرم ٹھہراتی۔ اس نے بہ وقت ضرورت ہتھوڑی کے دستے کو ایک رومال سے پکڑ کر مقتولہ کی کنپٹی پر آزمایا تھا لہٰذا ساجد علی کے فنگر پرنٹس ہتھوڑی کے دستے پر محفوظ رہے تھے۔

اس کیس میں بلکہ آمنہ ماسی کے بیان میں سب سے دلچسپ بلکہ افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ آخر اسے رقم چرانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی۔ آمنہ کے مطابق، اس کے چھوٹے بہن بھائیوں اور بوڑھے ماں باپ کو گاؤں کے سردار نے اپنی پرائیویٹ جیل میں قید رکھا تھا۔ کسی زمانے میں آمنہ کے باپ نے سردار سے پانچ ہزار روپے قرض لیے تھے جو سود در سود بڑھ کر پچاس ہزار ہو گئے تھے۔ سردار نے نہ صرف آمنہ کی فیملی کو اپنی خفیہ قید میں ڈال دیا تھا بلکہ ان کے کچے مکان کو بھی اپنے ایک ملازم کے استعمال میں دے دیا تھا۔ اس سردار کا بس ایک ہی مطالبہ تھا کہ جب تک اس کے پچاس ہزار روپے ادا نہیں کیے جائیں گے، وہ ان لوگوں کو نہیں چھوڑے گا۔ آمنہ کو کسی طرح دو دن پہلے پتا چل گیا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتولہ دوپہر میں بینک سے ایک تگڑی رقم نکال کر گھر لائے گی جو شام تک گھر کے اندر ہی موجود رہے گی لہٰذا اس نے اپنے خاندان کی آزادی کے جرم کی دلدل میں کودنے کا فیصلہ کرلیا تھا...... اس نے یہ جرم نظریۂ ضرورت کے تحت کیا تھا۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ نظریۂ ضرورت کے تحت کیا گیا جرم جائز ہو جائے گا لیکن لمحۂ فکریہ تو یہ ہے کہ آمنہ نے جرم کیا، وہ قانون کی پکڑ میں آئی اور عدالت نے انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس ضرورت مند کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا مگر سرداروں اور وڈیروں کی پرائیویٹ جیلیں اب بھی آباد ہیں اور خدا جانے کب تک آباد رہیں گی۔ قانون کی نگاہ اور ہاتھ وہاں تک رسائی کیوں نہیں حاصل کر پاتے۔

قانون اور انصاف تو ہر شاہ و گدا کے لیے یکساں ہونا چاہیے نا...... آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

(تحریر حُسام بٹ)

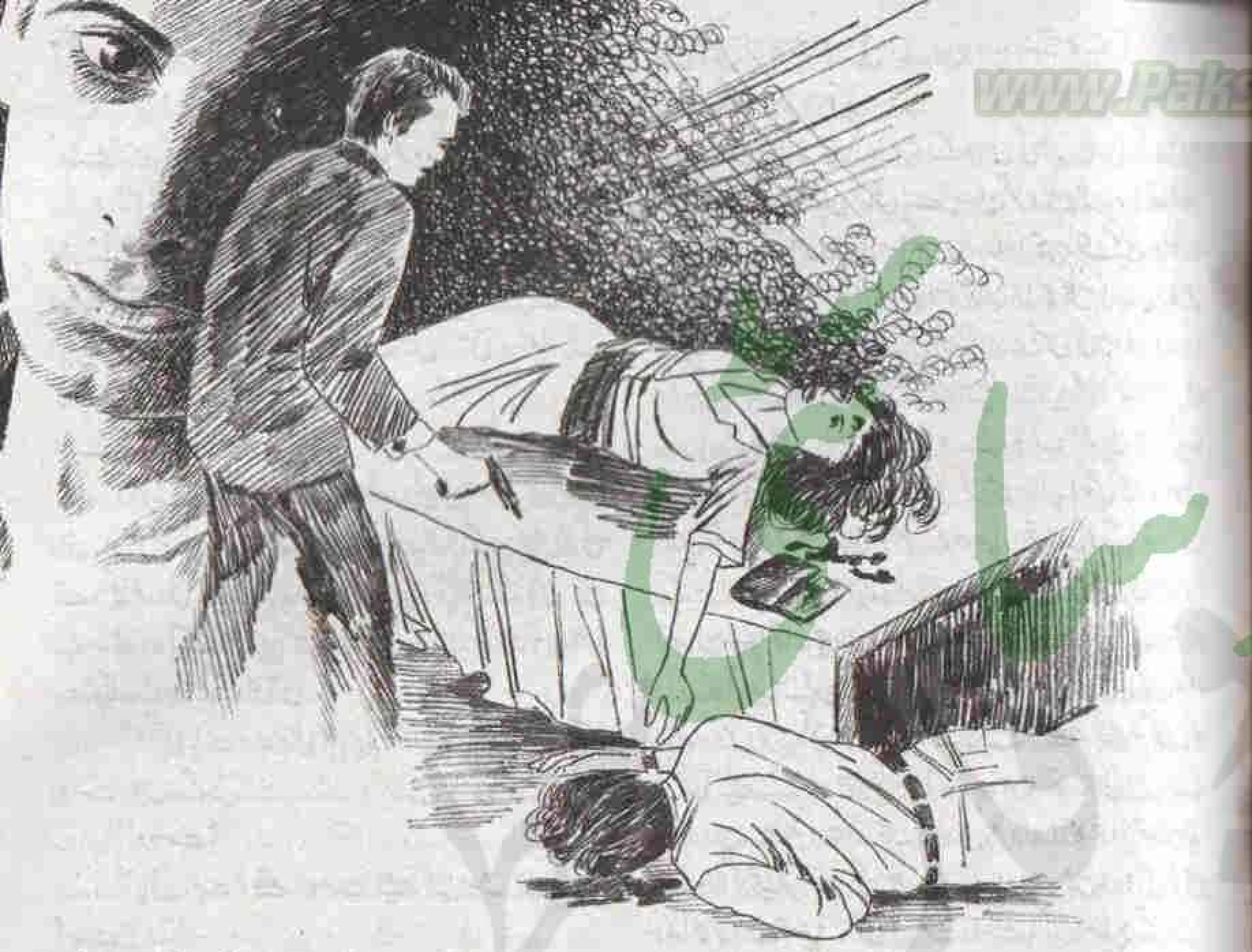

نظرانداز

رضوانہ منظر

محبت دماغ سے نہیں دل سے سوچنے کا نام ہے... محبت اندھی ہوتی ہے... محبت عقل کی دشمن ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ... سیکڑوں کہاوتیں، ہزاروں مثالیں... اور بے چاری محبت ایک... مگر افسوس سچ کو جانچنے کا کوئی فارمولا ہے نہ جھوٹ پکڑنے کا کوئی آلہ۔ فقط دو چار دعوئوں اور وعدوں پر ہی یہ سارا کھیل کھیلتے کھیلتے کوئی دل میں اتر جاتا ہے اور... کوئی دل سے اتر جاتا ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی کچھ ایسی ہی کشمکش کا شاہکار محسوس ہوتی ہے۔

اپنے محفوظ دائرے سے نکلنے والے ایک بے وقوف عاشق کا ماجرا

کلیتیا سیلی نے کاغذات کا پلندا ٹیڈ گرین کی میز پر رکھا تو اس کے نرم ہاتھ ٹیڈ کے ہاتھوں سے مس ہوئے۔ ٹیڈ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ سیلی کے ہاتھوں کا لمس اس کے جسم میں سنسنی پھیلا دیتا تھا اور اس کے کان دور کہیں چاندی کی گھنٹیاں بجنے کی آوازیں سننے لگتے تھے۔

"مسٹر اسٹنسن نے کہا ہے کہ آپ یہ نوٹس دیکھ لیں۔" سیلی نے کہا۔ "ان میں بہت سوں کی میعادی تاریخیں گزر چکی ہیں خاص طور سے مسٹر جارج کی۔"

وہ باتیں کرتے کرتے رک گئی۔ ٹیڈ اس کی طرف اسی انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ سیلی کی نیلی آنکھیں ٹیڈ کی بھوری

www.Paksociety.com

آنکھوں سے ٹکرائیں اور جیسے ان میں الجھ کر رہ گئیں۔

"ٹیڈ ڈیئر۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ میری طرف اس طرح نہ دیکھا کرو، مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھی بات ہے مس سیلی، آئندہ نہیں دیکھوں گا۔" ٹیڈ نے مزاحیہ سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "اب ہمارے درمیان قطعی طور سے دفتری نوعیت کے تعلقات رہیں گے۔"

"جی نہیں، میں یہ بھی برداشت نہیں کرسکتی کہ ہم صرف کام ہی کے بارے میں گفتگو کیا کریں، آخر تم کیوں مجھے ستانے پر تلے ہوئے ہو۔"

وہ ایک لمحے کے لیے وہاں افسردگی کی تصویر بنی کھڑی رہی۔ وہ نوجوان اور بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی جسے دیکھ کر دل بے اختیار اس کی جانب کھنچنے لگے لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک بہترین سیکریٹری بھی تھی اور گزشتہ دو سال سے بینک میں کام کررہی تھی۔

"اچھی بات ہے سیلی ہم بہ دستور ایک دوسرے کے دوست رہیں گے۔"

"دوست؟"

"ہاں بہت اچھے دوست جیسے کہ ہمیشہ سے چلے آرہے ہیں۔"

سیلی کی افسردگی برسات کی دھوپ کی طرح غائب ہوگئی اور اس کے رسیلے ہونٹوں پر وہ میٹھی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے دیکھ کر ٹیڈ کا دل الٹ پلٹ ہونے لگتا تھا۔ سیلی پرسنل لون ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر مسٹر اسٹنسن کی میز کی جانب چلی گئی۔ اسٹنسن بینک کا پریذیڈنٹ تھا اور سیلی گزشتہ سال سے اس کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کررہی تھی۔

سیلی وہ واحد لڑکی تھی جس کے لیے ٹیڈ گرین بینک کے وائس پریذیڈنٹ، کیشیر اور پرسنل لون ڈیپارٹمنٹ کے انچارج کے تمام عہدے چھوڑنے کے لیے تیار تھا۔ جس بینک میں وہ کام کرتا تھا اس کا نام سیکنڈ نیشنل بینک آف فورٹ سانڈرس تھا اور ٹیڈ کو یہ بھی یقین تھا کہ سیلی ہر طرح وہ خطرہ بھی مول لینے کے قابل ہے جو وہ بینک کے محفوظ سرمائے سے ایک لاکھ ڈالرز کی چوری کرکے اپنے سر لینے کے لیے تیار تھا۔ اتنا ہی نہیں وہ سیلی کے لیے اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ تھا۔

ٹیڈ نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اسٹنسن کی طرف دیکھا جس کے سر کے تمام بال سفید ہوچکے تھے مگر اس کے مزاج کی سختی اور طبیعت کی خشکی بہ دستور برقرار تھی۔ وہ سیلی کو ذرا سی توجہ کا مستحق بھی خیال نہیں کرتا تھا۔ اس کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ سیلی ایک نوجوان اور حسین لڑکی ہے یا کوئی ساٹھ سالہ بڑھیا۔

دن گزرتا گیا، روزمرہ کے دنوں کی طرح۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیس سال سے ہر دن گزرتا چلا جارہا تھا اور زندگی کی یہ یکسانیت ٹیڈ کو پاگل بنائے دے رہی تھی۔ دنوں کے ساتھ ساتھ وہ خود ختم ہوا جارہا تھا۔ اس کا کام بس یہ رہ گیا تھا کہ مسز گیٹلنگ کے نوٹ پر غور کرے جس کی سو ڈالرز کی ادائیگی واجب ہوئے کئی ہفتے گزر چکے تھے یا پھر ڈک جنٹری کے بارے میں پریشان ہوتا رہے۔ ڈک جنٹری جو ایک ایماندار آدمی تھا۔ جس کی فصلیں گزشتہ سال اچھی نہیں ہوئی تھیں، جس کا ٹریکٹر عین موسم کے درمیان خراب ہوگیا تھا جس کے گھر اور کھلیان کو ایک طوفان بادوباراں میں بری طرح نقصان پہنچا تھا۔ جو اس سال کے دوران میں پہلے ہی ایک ہزار ڈالرز کا قرضہ لے چکا تھا اور مزید قرض لینے کی کوشش میں تھا، کچھ لوگوں کو یہ وقتی قرضے مدد دے سکتے تھے مگر کچھ لوگوں کو قرض لینے کے باوجود کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قصبے کا ہر فرد امداد کا خواہشمند ہے اور اگر ٹیڈ قرضوں کی منظوری کے بارے میں ذرا بھی نرمی دکھاتا تو اسے مسٹر اسٹنسن کی سخت وسست باتیں سننا پڑتیں۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہورہا تھا جبکہ دوسری جانب ٹیڈ گرین خود بھی دن بہ دن بڑھاپے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ زندگی کی دلچسپیاں جلد ہی اس کے لیے پھیکی پڑ جانے والی تھیں اور سیلی ایسی لڑکی تھی جو زندگی میں صرف ایک بار وہ بھی قسمت کی مہربانی سے کسی کسی کے ہاتھ آتی تھی۔

آخر بینک کے کام کے اوقات ختم ہوگئے۔ بینک کے دروازے پبلک کے لیے بند کردیے گئے۔ اسٹاف جلدی جلدی اپنے گھروں کو رخصت ہونے لگا۔ حساب کتاب کے رجسٹروں میں دن کا آخری اندراج کیا جاچکا تھا۔ بینک میں لگے ہوئے کمپیوٹرز بھی اگلے دن تک کے لیے خاموش ہوگئے تھے۔ ٹیلی فون ایکس چینج پر کام کرنے والی لڑکی اگلی صبح تک کے لیے رخصت ہوگئی تھی۔ ایک ایک کرکے عملے کے تمام افراد باہر چلے گئے۔ سوائے اسٹنسن کے۔ آخرکار اس نے بھی کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اپنا ہیٹ اٹھایا اور یوں سیکنڈ نیشنل بینک کا ایک اور دن قانونی طور پر مکمل ہوچکا تھا۔

لفٹ بوائے اور ملازمہ نے اپنا اپنا کام ختم کیا۔ ٹیڈ نے بینک والٹ کے دروازے کو بند کردیا اور ٹائم لاک کو دوسرے دن پونے نو بجے کے لیے سیٹ کردیا۔ پھر اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ یہ اس کے روزمرہ کے فرائض میں شامل تھا اور

وہ سوچ رہا تھا کہ جب ہاتھ صاف کرنے کا موقع آئے گا تو اس سے کسی قسم کی کوئی غلطی سرزد نہیں ہونی چاہیے۔ اسے اس وقت تک اپنے فرائض کسی کو ذرا سے بھی شک کا موقع دیے بغیر ادا کرتے رہنا چاہیے۔ اسے ہفتے میں پانچ دن بینک بند کرنا پڑتا تھا اور یہ بات اس کے دفتری فرائض میں شامل تھی۔ جس وقت اسٹاف جارہا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کاغذات اور مختلف فارموں کو ایک ترتیب سے لگادیا کرتا تھا تاکہ اسے دوسرے دن اپنا کام شروع کرنے میں آسانی ہو یہ اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جن کا خیال رکھنے کی وجہ سے اسے بینک کا وائس پریذیڈنٹ بنایا گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خزانچی جیسے اہم عہدے کی ذمے داری بھی اسی کے شانوں پر تھی۔ بینک کے متعلق جملہ معاملات اور ان کے بارے میں معلومات گویا ٹیڈ کی نوک برزباں تھیں۔

ایک وقت البتہ ایسا تھا جب اسے بینک میں کام کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ ان دنوں یونیورسٹی سے نیا نیا ڈگری لے کر نکلا تھا۔ اس وقت اس کے لیے بینک کے کام ایک طرح سے ایڈونچر جیسی جاذبیت رکھتے تھے اور اس نے ابتدائی دنوں میں اپنے فرائض میں اسی انہماک اور گہری توجہ سے حصہ لیا جس طرح وہ اسٹیٹ کانفرنس فٹ بال کے مقابلوں میں اپنی ٹیم کے ساتھ کھیلا کرتا تھا یا پھر جس پھرتی، طاقت اور حوصلے سے وہ باکسنگ میں اپنے حریف کا مقابلہ کرتا تھا لیکن یہ سب اس زمانے کی باتیں تھیں جب وہ جوان تھا اور جب اسے زندگی سے یہ دھڑکا نہیں تھا کہ وہ اپنی تمام دلچسپیاں سمیٹ کر اس سے رخصت ہوجائے گی۔

وہ بھی آج کی طرح کا ایک دن تھا جب تین ماہ پہلے اس نے اپنی میز سے نگاہ اٹھائی تو سیلی کو اپنے ڈیپارٹمنٹ کے جنگلے کے باہر کھڑے ہوئے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ نہ معلوم یہ اس کی نظروں کا اثر تھا یا کچھ اور کہ ٹیڈ کو اپنے رگ و پے میں ایک سنسنی خیز ہیجان انگیز لہر سی اترتی محسوس ہوئی۔ نہ سیلی نے زبان سے کچھ کہا اور نہ ٹیڈ نے اور نہ ہی کچھ کہنے سننے کی ضرورت تھی۔ بینک کا تمام عملہ جاچکا تھا۔ ٹیڈ اپنی جگہ سے اٹھا اور سیلی کو بیتابانہ اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے پیار کرلیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سیلی خود بھی یہی چاہتی ہے اور عورتوں کی نظروں کا مطلب پڑھنے میں وہ بوڑھے اسٹنسن کی طرح کند ذہن واقع نہیں ہوا تھا۔

اس دن کے بعد سے یہ سلسلہ رکا نہیں بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا گیا۔ وہ دونوں بینک کے اوقات کے بعد چھپ چھپ کر ملتے اور کبھی کبھی جب ٹیڈ کو گھر سے باہر رات گزارنے کا کوئی معقول بہانہ مل جاتا تو دونوں کسی موٹل کے کیبن میں رات بھر کے مہمان بھی بن جاتے تھے اور ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹیڈ گرین جو اپنی زندگی کی یکسانیت سے بور ہوچکا تھا اس کے لیے زندگی دوبارہ ایک دلچسپ اور رنگین شے بن گئی۔ اس نے دوبارہ زندگی سے لطف اندوز ہونا شروع کردیا۔

میری، جیک اور ٹیڈ نے رات کے کھانے پر مختصر سی گفتگو کی اور رہائشی کمرے میں آگئے تاکہ اخبار پڑھیں یا ٹیلی وژن دیکھیں۔ یہ رات جیک کی اسکاؤٹ میٹنگ کی رات تھی اور جب جیک کے اسکول کی کار اسے لینے آئی تو ٹیڈ کو اس کا جانا اچھا معلوم نہیں ہوا۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا پسند کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک اچھا ایتھلیٹ بننے کے بارے میں جیک اس سے مختلف سوالات پوچھے اور وہ ان کے جوابات دے۔ جب جیک چلا گیا تو ٹیڈ اپنے اسٹڈی روم میں آگیا۔ یہ کمرا اسے کالج کے زمانے میں ایتھلیٹ کے سلسلے میں ملنے والے انعامات، کپوں اور ٹرافیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے کالج کے زمانے میں ٹیڈ چار کھیلوں میں بڑی کامیابی سے حصہ لیتا رہا تھا۔ وہ فٹ بال، باسکٹ بال اور بیس بال کا ایک اچھا کھلاڑی تھا جبکہ باکسنگ میں بھی اس نے بہت سے مقابلے جیتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ریس میں بھی حصہ لے لیکن جس زمانے میں دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے وہی زمانہ اس کی پڑھائی یا امتحانات کا ہوا کرتا تھا۔ اس لیے وہ دوڑ میں حصہ نہیں لے سکا۔ کمرے میں ہر طرف تصاویر آویزاں تھیں، اس کی اپنی تصویریں جن میں اسے مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے یا انعامات وصول کرتے دکھایا گیا تھا۔

ٹیڈ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کا بیٹا جیک بھی بہترین ایتھلیٹ بنے گا۔ اس کے جسم کی بناوٹ، مختلف کھیلوں سے اس کا والہانہ لگاؤ ایسی باتیں تھیں جو ایک دن اسے کسی بھی ٹیم کا مایہ ناز کھلاڑی بنا سکتی تھیں۔ پھر اسے اپنے باپ کی صورت میں ایک بہترین کوچ بھی میسر تھا لیکن یہاں پہنچ کر ٹیڈ کے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اب آئندہ زندگی کے بارے میں اس کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ اب جس وقت جیک کسی ٹیم میں شامل ہونے کے قابل ہوگا تو ٹیڈ اس کی کامیابی دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہوگا۔ وہ دور کہیں سمندر پار سیلی کے ساتھ ان ایک لاکھ ڈالرز سے عیش و عشرت کی رنگین زندگی گزار رہا ہوگا جو وہ عنقریب بینک کے محفوظ سرمائے سے نکالنے کا پلان بنا رہا تھا۔

اسے امید تھی کہ اس کا یہ اقدام اس کے بیٹے کے مستقبل پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ ٹیڈ نے پہلے ہی جیک کے لیے

www.Paksociety.com

ایک تعلیمی انشورنس پالیسی خرید لی تھی اور اس کے تمام واجبات بھی ادا کرچکا تھا اور یہ انشورنس پالیسی اتنی بڑی رقم کی تھی جس کی مدد سے جیک کسی بھی اچھے کالج میں داخلہ لے کر اپنے تعلیمی مدراج طے کرسکتا تھا۔ اب جہاں تک میری کا سوال تھا تو وہ ہمیشہ ٹیڈ سے یہ کہتی رہی تھی کہ اگر وہ چاہتی تو سام ولنز سے شادی کرسکتی تھی۔ سام ولنز جواب سینیٹ کا ایک رکن تھا۔ جب بھی ان کے درمیان جھگڑا ہوتا میری ہمیشہ طنزیہ انداز میں سام ولنز کی مثال دیتی اور اسے برا بھلا کہتی کہ وہ سام کی طرح ترقی نہیں کرسکا۔ میری کا کہنا تھا کہ اس کے کھیلوں کے شوق نے اسے دنیا کے کسی کام کا نہیں رکھا۔ ٹھیک ہے، وہ چلا جائے گا تو میری کو بھی آئے دن کے جھگڑوں سے نجات مل جائے گی۔ پھر یہ کہ وہ بالکل بے سہارا بھی نہیں ہوگی۔ اس نے اپنا مکان میری کے نام کردیا تھا۔ اس کے علاوہ بینک میں اس کے اکاؤنٹ میں بھی مناسب رقم موجود تھی۔ ٹیڈ کو یقین تھا کہ اس کے جانے کے بعد میری کو کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ اسٹنسن اسے بینک میں ہی کوئی جگہ دیدے۔

⁂

سیلی نے پروگرام کے مطابق اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ چلتے وقت وہ بہ ظاہر رخصت ہونے کے لیے ٹیڈ کے پاس آئی۔

''گڈ بائی مسٹر گرین۔'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کی ممنون ہوں کہ جب تک بھی میں یہاں کام کرتی رہی آپ نے ہر ممکن طریقے پر میری مدد کی، میری ہمت افزائی کی۔ آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے میرا وقت اچھی طرح گزرا۔''

ٹیڈ نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

''مجھے تمہارے ملازمت چھوڑ کر جانے پر افسوس ہے مس سیلی۔'' اس نے کہا۔ ''اس طرح ہم ایک اچھی اور محنتی کارکن سے محروم ہوگئے۔''

اور یہ کہتے ہوئے وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ اچھا ہی تھا کہ وہ اس کے جانے سے بہت پہلے ملازمت چھوڑ کر جارہی ہے۔ اس میں کئی فائدے تھے۔ اول تو اب ان کے باہمی تعلقات ایسے موڑ پر آگئے جہاں ان کا راز رہنا مشکل تھا۔ اگر سیلی ایک ہفتہ اور ٹھہر جاتی تو ممکن تھا کہ لوگ ان کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگتے۔ اس کے علاوہ اس کے اپنے منصوبے کے مطابق بھی یہ ضروری تھا کہ سیلی پہلے چلی جائے تاکہ ٹیڈ کی روانگی کو سیلی کے ساتھ منسلک نہ کیا جاسکے اور پھر سیلی کو کچھ انتظامات بھی کرنا تھے۔

سیلی بینک سے چلی گئی تو اسٹنسن اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹیڈ کے پاس آیا۔

''سیلی کا یوں چلے جانا ہمارے لیے اچھا خاصا نقصان ہے۔'' اس نے ٹیڈ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت اچھی اور محنتی لڑکی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ مستقبل میں وہ ہمارے لیے اور بھی بہتر ثابت ہوگی۔''

معلوم نہیں یہ بات کہنے سے اسٹنسن کا اصل مقصد کیا تھا۔ بہرحال ٹیڈ نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنی جگہ واپس بیٹھتے ہوئے اپنی سیکریٹری جینی کو مختلف خطوط کے جوابات لکھوانے لگا۔

⁂

اس رات گھر پہنچ کر ٹیڈ نے میری سے کہا۔

''میری، میں اگلے ہفتے نیویارک جارہا ہوں۔ اسٹنسن بینک کے کچھ ضروری کاموں سے مجھے وہاں بھیج رہا ہے۔''

''اوہ۔'' میری نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس بات کا تو کوئی امکان نہیں ہوگا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چل سکوں؟''

''نہیں ڈیئر۔ اس مرتبہ تو تم نہیں جاسکتیں۔ مجھے یمفس میں کچھ لوگوں سے ملاقات کرنا ہے اور پھر ان کے ساتھ نیویارک جانا ہے اور مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہاں میری مصروفیات کتنی اور کس نوعیت کی ہوں گی۔ میں ابھی تو یہ بھی نہیں بتاسکتا کہ واپسی کب تک ممکن ہوگی۔''

''ویسے بھی شاید یہ مناسب نہ ہوتا کہ ہم دونوں گھر سے غائب ہوجائیں۔'' میری بولی۔ ''یہاں جیک کی دیکھ بھال کے لیے کسی نہ کسی کو تو رہنا ہی ہوگا۔''

''تم اور جیک بعد میں ایک بار نہیں کئی مرتبہ میرے ساتھ کہیں نہ کہیں باہر جاسکو گے۔''

''کیا یہ وعدہ ہے؟''

''یقیناً۔''

''تم جانتے ہو ٹیڈ کہ اب ہم بوڑھے ہوتے جارہے ہیں اور ابھی تک ہمیں کوئی ایسا مناسب موقع نہیں ملا کہ ہم کسی جگہ ساتھ جاسکتے یا کسی جگہ کی سیاحت کرسکتے، کچھ دیکھ سکتے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ موسم گرما میں ہمیں اپنے پس انداز سرمائے سے کچھ رقم اس مصرف کے لیے ضرور نکالنا چاہیے کہ ہم سیر و تفریح کرسکیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب ہم جوان تھے تو کس طرح مختلف مقامات پر گھومنے پھرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔''

''مجھے افسوس ہے میری۔'' ٹیڈ نے واقعی کچھ ندامت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ میں اپنے بہت سے وعدے پورے نہیں کرسکا۔ شاید میں تمہیں اتنا عیش و آرام بھی نہیں دے سکا جس کی تمہیں مجھ سے توقع تھی لیکن ہوسکتا ہے کہ آئندہ کبھی حالات بہتر ہوجائیں۔ ہم ہمیشہ ہی تو ذمے داریوں میں اس طرح گھرے ہوئے نہیں رہیں گے جس طرح آج کل ہیں۔''

''لیکن میں کوئی شکایت تو نہیں کررہی ہوں۔'' میری نے جواب دیا۔ ''مجھے اب بھی اگر انتخاب کا موقع ملے تو میں تمہیں...... میں تمہیں......''

''سینیٹر سام ولنز کے مقابلے میں ترجیح نہیں دوگی۔'' ٹیڈ نے مزاحیہ انداز سے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

میری نے ایک ہلکا قہقہہ بلند کیا۔

''مجھے اندیشہ تھا کہ تم یہی کہو گے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اگر میں چاہتی تو ایک سینیٹر کی بیوی بن سکتی تھی۔''

''پھر تم نے سام سے شادی کیوں نہیں کرلی۔'' ٹیڈ نے کہا۔ ''تم یہ بات مجھ سے اتنی مرتبہ کہہ چکی ہو کہ میں بھی کبھی حیرت کے ساتھ سوچنے لگتا ہوں کہ اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی۔''

میری نے آگے بڑھ کر اپنی بانہیں ٹیڈ کی گردن میں حمائل کردیں۔

''میں نے سام سے اس لیے شادی نہیں کی کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ میں نے پوری آزادی رائے سے تمہارا انتخاب کیا تھا۔''

ہوائی جہاز صبح کے ساڑھے پانچ بجے پرواز کرگیا۔ میری اور جیک، ٹیڈ کو الوداع کہنے ایئرپورٹ تک آئے تھے۔ ٹیڈ نے میری کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں میری۔ ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ بس یہ بات یاد رکھنا۔'' اس نے کہا۔ پھر اس نے جیک کے گالوں کو چوما۔ ''اپنا اور اپنی ماں کا خیال رکھنا جیک۔'' وہ بولا، میری ہنسنے لگی۔

''تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے میدان جنگ میں جارہے ہو یا ایک طویل مدت کے لیے رخصت ہورہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''مجھ جیسے بوڑھے آدمی کو نیویارک کا سفر بھی کافی دور دراز کا معلوم ہوتا ہے۔'' ٹیڈ نے جواب دیا۔

جب جہاز رن وے پر دوڑنے لگا تو اس نے طیارے کی کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور اس وقت بے اختیار اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اسی وقت طیارے سے اتر جائے اور اپنی بیوی بچے کو یوں چھوڑ کر نہ جائے لیکن طیارہ پرواز کرنے لگا تھا اور اب اس خواہش پر عمل کرنا اس کے بس سے باہر ہوچکا تھا۔ طیارے کے پہلے اسٹاپ لٹل راک پر ٹیڈ جہاز سے اتر گیا۔ اپنا سامان لیا جو دو سوٹ کیسوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک خالی تھا۔ اب اسے واپس فورٹ سانڈرس جانے کے لیے تین گھنٹے تک انتظار کرنا تھا۔ وہ کچھ دیر ٹہلتا رہا پھر ایک ریسٹورنٹ میں شام کا کھانا کھایا۔ اس کے سامنے ایک میز پر بیٹھی ہوئی سرخ بالوں والی لڑکی اسے سیلی کی یاد دلا رہی تھی۔ لڑکی اسے دیکھ کر دعوت آمیز انداز میں مسکرائی جواباً وہ بھی مسکرایا۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوا۔ یہ لڑکی سیلی سے کتنی مختلف ہے، ٹیڈ نے سوچا۔ وہ سیلی سے یہ توقع نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر یوں مسکرائے گی۔ کھانے سے فارغ ہوکر وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اگر تمام باتیں خاطر خواہ طریقے پر انجام پاگئیں جیسا کہ ان میں کسی قسم کی گڑبڑ کا بہ ظاہر کوئی امکان نہیں تھا تو وہ آج رات اوکلاہا کے ایک قصبے مسکوجی کے اسٹار موٹل میں کاٹیج نمبر 54 میں قیام پذیر ہوگا اور اس کے ساتھ سیلی بھی ہوگی اور کل رات وہ اس وقت تک سیلی کے ساتھ میکسیکو سٹی تک پہنچ چکا ہوگا اور ایک دوسرے ملک میں زندگی، رومان اور ایڈونچر سے بیک وقت لطف اندوز ہورہا ہوگا۔ اس نے اپنی بیوی اور بیٹے سے نیویارک جانے کے بارے میں جھوٹ بولا تھا اور اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ اسی طرح بروئے کار آرہا تھا جیسی کہ اسے توقع تھی۔

تقریباً چار گھنٹے اور دس منٹ بعد ٹھیک ساڑھے نو بجے وہ لٹل راک سے فورٹ سانڈرس واپس پہنچ گیا۔ ایک ٹیکسی لے کر سانتافی ریلوے اسٹیشن گیا۔ یہاں اس نے اپنا وہ سوٹ کیس لگیج روم کے لاک میں رکھ دیا جس میں اس کے کپڑے وغیرہ تھے اور پھر خالی سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر وہ وارڈ ہوٹل پہنچا جو صرف ایک بلاک کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہوٹل کلرک کیمرون نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''گھر میں بیوی کے کچھ عزیز مہمان آگئے ہیں۔'' ٹیڈ نے کیمرون کو بتایا۔ ''اس لیے مجھے لامحالہ رات گھر سے باہر بسر کرنا پڑے گی۔''

''اوہ۔''

ٹیڈ نے کمرے کا کرایہ وغیرہ پیشگی ادا کردیا اور کلرک سے کہا کہ اس کا ارادہ صبح صادق ہی ہوٹل سے چلے جانے کا ہے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں گیا۔ بستر پر بیٹھتے ہوئے اس

www.Paksociety.com

نے اپنی جیب سے چمڑے کا ایک کیس نکالا جس میں اس کی بیوی میری اور بارہ سالہ بیٹے جیک کے فوٹو لگے ہوئے تھے۔ وہ انہیں پر بہ غور دیکھنے لگا۔ وہ ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن وہ اپنے دل کی اس بے چینی و بے قراری سے بھی مجبور تھا جو بیس برس تک ایک ہی میز کرسی پر بیٹھے اس کے اندر پیدا ہوچکی تھی اور جس کی تسکین صرف سیلی جیسی حسین لڑکی ہی کرسکتی تھی جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ یوں وہ اب بھی اسی وقت اپنے گھر واپس جاسکتا تھا۔ میری سے کہہ سکتا تھا اسٹنسن نے لٹل راک پر ٹیلی گرام بھیج کر اسے واپس بلالیا۔ پھر صبح کو حسب معمول اپنی ملازمت پر جاسکتا تھا۔ دوپہر کو برس ہا برس کے معمول کے مطابق کسی کیفے یا ریسٹورنٹ میں کھانا کھا سکتا تھا۔ پھر شام کو ٹیلی وژن دیکھتے ہوئے تھکے تھکے انداز میں جماہیاں لیتے ہوئے اپنے کمرے میں سونے کے لیے جاسکتا تھا اور پھر اگلے دن صبح پھر اپنی ملازمت پر......

ٹیڈ نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں، لعنت ہو۔ ایک آدمی آخر کب تک اس لگے بندھے معمول کو برداشت کرسکتا ہے۔ اگر اسے اپنی زندگی میں واقعی خوشی اور مسرت سے بھرپور لمحات حاصل کرنا تھے تو پھر انہیں حاصل کرنے کا یہی ایک موقع تھا۔ اگر اس نے اس وقت اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر ایسا کوئی سنہری موقع اسے حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وقت اس پروگرام پر عمل ملتوی کرنے کا مطلب تھا کہ وہ پھر ہمیشہ کے لیے اپنے اس خواب کو بھول جائے اور یہ اس سے نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ سیر و تفریح کرنا چاہتا تھا۔ گھومنا پھرنا چاہتا تھا۔ ایک دوسری عورت کے ساتھ رہنا اور خود کو ایک مرتبہ پھر جوان دیکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ اسے معلوم تھا کہ بڑھاپا بہت جلد اس پر قابو پالے گا اور پھر زندگی سے لطف اندوز ہونے کا ہر موقع اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

دس بجے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ لفٹ سے نیچے پہنچا۔ سڑک پر آیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ صرف ایک دو ریسٹورنٹ ابھی تک کھلے ہوئے تھے یا پھر سڑک کے بالکل آخری کنارے پر ایک سینما گھر میں آخری شو چل رہا تھا۔ وہ بڑے پُراعتماد انداز سے چلتے ہوئے اپنے بینک کے سائڈ والے دروازے تک آیا۔ اسے کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ لابی میں جگہ جگہ آلے نصب تھے جن سے نکلنے والی شعاعوں کے سامنے آجانے سے بینک میں خطرے کا الارم بج سکتا تھا لیکن چونکہ وہ آلوں کی موجودگی سے واقف تھا اس لیے شعاعوں کی زد سے بچتے ہوئے آگے بڑھا اور اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں بینک والٹ لگا ہوا تھا۔ اس نے آج سہ پہر بینک بند کرتے ہوئے والٹ کے دروازے کو دانستہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے والٹ کے اندر قدم رکھا اور دروازہ بند کرتے ہوئے اندر کی بتیاں روشن کردیں۔

اس سیف کو کھولا جس کے اندر محفوظ سرمایہ رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیبیں بیس ڈالر کے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرنا شروع کردیں۔ ہر گڈی میں ایک سو نوٹ تھے۔ اس نے پانچ پانچ گڈیاں کوٹ کی ہر جیب میں رکھیں پھر پانچ گڈیاں کوٹ کی اندرونی جیبوں میں ڈالیں اور دس گڈیاں پتلون کی مختلف جیبوں میں بھریں۔ روشنیاں گل کیں۔ والٹ سے باہر نکلا۔ دروازے کو بہ دستور کھلا چھوڑ کر شعاعوں سے بچتا ہوا بینک سے باہر آیا۔ سائڈ کا دروازہ مقفل کیا اور تیزی سے اپنے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ کسی نے اسے بینک میں جاتے یا وہاں سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ سڑک پر ایک دو راہگیر تھے جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنی تمام جیبوں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سوٹ کیس میں رکھ دیں۔ کل پچیس گڈیاں تھیں اور ہر گڈی میں دو ہزار ڈالر کے نوٹ تھے۔ گویا یہ کل رقم پچاس ہزار ڈالرز بنتی تھی۔

ٹیڈ نے کمرا بند کیا اور دوبارہ بینک کی طرف چل دیا۔ علاقہ اب بھی سنسان تھا۔ اب تک اس کا ہر اقدام منصوبے کے عین مطابق اور کامیاب تھا۔ جب ٹیڈ اس مرتبہ والٹ سے باہر آیا تو اس کی جیبیں دوبارہ نوٹوں کی گڈیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے والٹ کا دروازہ بند کیا اور دروازے پر لگے ہوئے ٹائم کلارک کو اس طرح سیٹ کردیا کہ اگلے دن دروازہ ٹھیک پونے نو بجے خود بخود کھل جائے جس طرح وہ ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے دروازے کو جہاں جہاں سے چھوا تھا وہاں سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کردیے اور ایک مرتبہ پھر سائڈ دروازے کو مقفل کرتے ہوئے بینک سے باہر آگیا اور پھر جب اس نے اپنی جیبوں سے تمام گڈیاں نکال کر سوٹ کیس میں رکھیں تو سوٹ کیس میں رکھی ہوئی کل رقم ایک لاکھ ڈالرز تک پہنچ چکی تھی۔

اس نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ اسے بس اسٹاپ تک پہنچنے کے لیے جو صرف ایک بلاک کے فاصلے پر واقع تھا، بیس منٹ کی مہلت حاصل تھی۔ ابھی تک ٹھیک اسی طرح ہوا تھا جس طرح اس نے سوچا تھا۔ ایک لاکھ ڈالرز اس کے قبضے میں آچکے تھے اور سیلی اس سے صرف ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جلدی سے ہوٹل سے نکلا۔ دولت سے بھرا ہوا سوٹ کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔

سالنامی ریلوے اسٹیشن پر اس نے لاکر سے اپنا دوسرا سوٹ کیس بھی نکال لیا اور جب سکوجی کے لیے بس روانہ ہوئی تو وہ اس بس میں موجود تھا۔

گشتی پولیس کا سپاہی پیرسن اپنے راؤنڈ پر گشت لگاتا ہوا اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک آیا۔ ٹیڈ نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا۔ یہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا جب ایک پولیس مین کی موجودگی نے اسے خوف زدہ کردیا تھا لیکن اسے حقائق سے آنکھیں چرانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ اب قانون کے یہ محافظ اس کے دشمن نمبر ایک بن چکے ہیں۔ جس وقت بس روانہ ہوئی تو ٹیڈ نے اطمینان کی گہری سانس لی اور جس وقت فورٹ سانڈرس کی روشنیاں دور ہوتے ہوتے اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئیں تو اس نے بڑی احتیاط سے اپنے اب تک کے ہر اقدام کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں اس سے کسی قسم کی کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوگئی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے ایک نوٹ لکھ کر اسٹنسن کی میز پر چھوڑ دیا تھا۔ جس میں اسے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ وہ اور اس کی بیوی کینساس سٹی جا رہے ہیں جہاں انہیں اپنے ایک عزیز کی تشویش ناک علالت کی اطلاع ملی تھی اور یہ کہ وہ کئی دن تک دفتر نہیں آسکے گا۔ اسے امید تھی کہ یہ تحریر اسٹنسن کو اس کے گھر فون کرنے سے باز رکھے گی اور رہی میری تو ظاہر ہے کہ وہ تو پہلے ہی یہ سمجھ رہی ہے کہ وہ بینک کے کام سے نیو یارک جاچکا ہے اور یہ عین ممکن تھا کہ محفوظ سرمائے میں ایک لاکھ ڈالرز کی کمی کئی دن تک معلوم نہ کی جاسکے۔ زیادہ نہ سہی اس طرح اسے کم سے کم دو دن کی مہلت تو ضرور ہی مل جائے گی اور اگر کوئی ایسا...... واقعہ نہ ہوا جس سے اس کی چوری کا حال کھل جائے تو یہ مہلت زیادہ دن کی بھی ہوسکتی تھی اور جب یہ انکشاف ہو بھی جائے گا تب بھی بینک کی کوشش یہی ہوگی کہ ابتدا میں اس کی روپوشی کو ممکن حد تک راز رکھا جائے تاکہ اس دوران میں پولیس اور ایف بی آئی کے ایجنٹ اسے تلاش کرسکیں لیکن اس وقت تک وہ میکسیکو سٹی یا اس جیسے کسی اور شہر میں غائب ہوچکا ہوگا۔ اس نے سیلی کو اتنی رقم دے دی تھی جس سے وہ میکسیکو سٹی جانے والے طیارے کے دو ٹکٹ خرید سکے۔ سکوجی سے ایک طیارہ تلسا تک جاتا تھا اور وہاں سے پھر سیدھا میکسیکو سٹی پرواز کرتا تھا اور دوسرا دن طلوع ہونے سے پہلے وہ میکسیکو سٹی پہنچ چکا ہوگا۔

سکوجی پہنچ کر اس نے اپنے سوٹ کیس ٹیکسی ڈرائیور کے سپرد کیے تاکہ وہ انہیں ڈکی میں رکھ دے اور اسے اس موٹل تک چلنے کی ہدایت کی جہاں سیلی ٹھہری ہوئی تھی۔ موٹل پہنچ کر اس نے ہرم وافرٹی کے نام سے ایک کمرا کرائے پر لیا۔ اس کا کرایہ ادا کیا یہ کہتے ہوئے کہ وہ علی الصباح روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے کمرے کا نمبر 108 تھا۔ سیلی اسی منزل کے ایک کمرے میں مقیم تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کھڑکیوں کے پردے گرادیے۔ بستر پر

اقوال زریں

☆ رب سے محبت اور انسان سے محبت میں یہ فرق ہے کہ انسان سے محبت آپ کی سب سے بڑی کمزوری اور رب سے محبت آپ کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے۔

☆ جب آپ کسی کو بہتر مشورہ دیتے ہیں تو وہ تبدیل نہیں ہوتے۔ صرف اسی وقت تبدیل ہوتے ہیں جب انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا مشورہ بھی ہے۔

☆ اپنے متعلق کوئی بھی بری بات نہ کہو، آپ کے رشتہ دار اس موضوع پر بحث کرنے کے لیے کافی ہیں۔

☆ زندگی توقعات کے پورا نہ ہونے اور غیر متوقع حادثات و واقعات کا سامنا کرنے کا نام ہے۔ جب آپ درست ہوں تو کوئی بھی آپ کو یاد نہیں کرتا مگر جب آپ غلط ہوں تو کوئی بھی آپ کو بھول نہیں پاتا۔

☆ اگر آپ اپنے کسی درست موقف پر ڈٹ جائیں تو اپنے آپ کو کسی تنہا درخت کی طرح اکیلا رہ جانے کے لیے تیار کرلیں، لیکن اگر آپ زمین پر گر جائیں تو اس بیج کی طرح گریں، جو زمین میں اگ کر دوبارہ لڑنے کے لیے کسی پودے کی شکل میں سر اٹھا لیتا ہے۔

☆ کسی کو تکلیف دے کر سوری (اظہار ندامت) کہنا بڑا آسان ہوتا ہے، مگر تکلیف اٹھا کر مسکرا کے ٹال دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم

www.Paksociety.com

اپنا سوٹ کیس رکھ دیا۔ پھر کمرے کی روشنی گل کرتے ہوئے وہ خاموشی سے باہر نکلا اور وہ سوٹ کیس بھی ساتھ لیتا گیا جس میں رقم موجود تھی۔ سیلی کے کمرے کا نمبر 54 تھا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ ٹیڈ کا دل ایک رنگین رات بسر کرنے کے خیال سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ سیلی کے خوبصورت چہرے نے جھانک کر دیکھا۔

''کیا یہ تم ہو ڈارلنگ؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں مائی سوئٹ ہارٹ۔ میں وعدے کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ گیا ہوں۔''

دروازہ پورا کھول دیا گیا۔ ٹیڈ اندر داخل ہوا اور اس نے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ ایک لمحے کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں سما گئے۔

''کیا تم رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ڈارلنگ؟'' سیلی نے پوچھا۔

اور جواب میں ٹیڈ نے سوٹ کیس بستر پر رکھتے ہوئے اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ اندر بیس بیس ڈالر کی پچاس گڈیاں بڑے سلیقے سے چنی ہوئی رکھی تھیں۔

''اوہ ڈارلنگ، تم کتنے ہوشیار، کتنے عقل مند ہو۔'' سیلی نے جوش کے ساتھ کہا۔ ''تم نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا۔''

''کیا تم نے طیارے کے ٹکٹ خرید لیے ہیں؟''

''ہاں ٹھیک اسی طرح جس طرح تم نے ہدایت کی تھی۔ اگلی پرواز ہمیں اس شہر سے میکسیکو سٹی لے جائے گی۔''

ٹیڈ اسے دوبارہ آغوش میں لینے کے لیے آگے بڑھا، مگر اسے حیرت ہوئی کہ سیلی پیچھے ہٹ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس سے دور رہنا چاہتی ہو لیکن کم سے کم آج کی رات ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ سیلی تو ہمیشہ اس کے جذبات کی پذیرائی کے لیے تیار رہتی تھی۔

اور ٹھیک اسی لمحے ٹیڈ نے سنگار میز کے بڑے آئینے میں ایک طویل قامت سیاہ بالوں والے آدمی کا عکس دیکھا جس کی آنکھیں اٹلی کے باشندوں کی طرح تھیں اور جو بڑی خاموشی سے باتھ روم سے نکل کر باہر آ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک اور چیز بھی دیکھی۔ یہ ایک ریوالور تھا جو اس طویل قامت آدمی کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ ریوالور، جس میں سائلنسر بھی لگا ہوا تھا، ٹیڈ کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں مگر اس نے خود کو سنبھالا۔

''میں تمہارے لیے ایک قیمتی تحفہ بھی لایا ہوں ڈارلنگ۔'' اس نے سیلی سے کہا۔ ''ہیروں کا ایک نیکلس بہت ہی خوبصورت، بہت ہی قیمتی۔ تم اسے ابھی دیکھنا چاہتی ہو یا بعد میں؟''

''میں اسے ابھی دیکھنا چاہتی ہوں سوئٹ ہارٹ۔'' سیلی نے فوراً جواب دیا۔

ٹیڈ آہستہ آہستہ الماری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہیروں کے نیکلس کی بات سن کر اس آدمی نے اپنے ریوالور کا رخ نیچے کی جانب کر لیا ہے۔ ظاہر تھا کہ جب تک وہ نیکلس کے بارے میں یقین نہ کر لے کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ ٹیڈ نے اپنی جیب سے چمڑے کا وہ کیس نکالا جس میں اس کی بیوی اور بیٹے کا فوٹو لگا ہوا تھا اور اسے سیلی کی طرف بڑھا دیا، جیسے ہی سیلی نے وہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا، ٹیڈ نے الماری کے قریب میز پر رکھا ہوا بھاری ٹیبل لیمپ اٹھا لیا اور خود گھوم کر فرش پر گرتے ہوئے لیمپ اس شخص کی طرف کھینچ مارا۔ لیمپ اس شخص کے پیٹ پر لگا اور وہ اس کی چوٹ کھا کر فرش پر لڑھک گیا۔ ٹیڈ نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جگہ سے جست ماری اور...... اس شخص پر اس طرح جا گرا کہ اس کا ریوالور والا ہاتھ اپنے قابو میں کر لیا۔ چند لمحوں کی کشمکش کے بعد ریوالور ٹیڈ کے قبضے میں تھا۔

''سنیور پلیز!''...... اطالوی اجنبی خوف زدہ ہو کر گڑگڑایا مگر ٹیڈ نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اطالوی کے گھونگھریالے بالوں سے گزرتی ہوئی اس کے سر میں گھس گئی۔

ٹیڈ اسے چھوڑ کر اچھلتے ہوئے کھڑا ہو گیا، اسے توقع تھی کہ سیلی اپنے ساتھی کی مدد کے لیے آگے بڑھے گی لیکن وہ کمرے میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں بارود کے دھوئیں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اجنبی شخص مر چکا تھا اور اب اس کے سر سے خون نکل کر کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر جمع ہو رہا تھا اور تب ٹیڈ نے کمرے کے دوسرے حصے میں بستر کے قریب سیلی کو فرش پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے دل کے مقام پر گولی کا نشان نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب ٹیڈ نے اس کے اطالوی ساتھی پر لیمپ کھینچ کر مارا تھا تو حادثاتی طور پر اس کی انگلی ٹرائیگر پر دب گئی تھی اور اس طرح ریوالور سے چلنے والی گولی نے سیلی کو، جو اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی، اپنا نشانہ بنا لیا تھا۔

ٹیڈ بے جان سا بستر پر گر پڑا۔ آن کی آن میں اس کے تمام خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ سیلی نے اسے ڈبل کراس کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شروع سے اب تک اسے بے وقوف بنا رہی تھی اور اب اسے اپنی اس بے وفائی کا خمیازہ اپنی جان دے کر اٹھانا پڑا تھا، پھر چند لمحے پہلے خود اس کی زندگی موت سے کس قدر قریب پہنچ گئی تھی۔ تمام ...... پھر، دنیا کی سیر و سیاحت کا شوق، ایک خوبصورت لڑکی سے محبت کرنے کا ولولہ، سب کچھ دودھ کے ابال کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت وہ خود کو ایک ایسے بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا جس کے خوبصورت اور پسندیدہ غبارے میں دفعتاً چھید ہو گیا ہو اور اس کی تمام ہوا باہر نکل گئی ہو۔ گزشتہ چند منٹ کے دوران وہ ایسے خوفناک تجربے سے گزر چکا تھا جس کی یاد تمام زندگی ایک کانٹا بن کر اس کے دل میں چبھتی رہے گی لیکن یہ وقت پچھتاوے کا نہیں تھا۔ اسے تیزی سے عمل کرنا تھا۔ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا تھا۔ اگر وہ جلد ہی یہاں سے نہیں نکلا تو پھر اسے قتل اور غبن، دو سنگین جرائم کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دفعتاً اسے طیارے کے ٹکٹوں کا خیال آیا۔ اس نے سیلی کا پرس دیکھا مگر ٹکٹ وہاں نہیں تھے۔ پھر اس نے اجنبی مقتول کی جیبوں کی تلاشی لی اور اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک لفافہ مل گیا جس کے اندر دو ٹکٹ رکھے ہوئے تھے۔ ایک ٹکٹ پر سیلی کا اور دوسرے پر جوآن گونزل کا نام تحریر تھا۔ یہ اطالوی مجرم جوآن گونزل غالباً سیلی کا شوہر وغیرہ تھا۔ ٹیڈ نے غصے میں آ کر ٹکٹوں کے پرزے پرزے کر دیے اور انہیں واش بیسن میں بہا دیا۔ پھر اس نے رومال لے کر ہر اس چیز کو صاف کرنا شروع کر دیا جہاں جہاں اسے اپنے ہاتھ لگنے کا شبہ تھا۔ پرس، لیمپ، الماری اور دوسری تمام چیزیں۔

پھر اس نے ریوالور اٹھایا۔ بڑی احتیاط سے اسے رومال سے صاف کیا۔ پھر رومال ہی سے پکڑے ہوئے اس نے ریوالور کو اطالوی کے سیدھے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کی انگلیاں پوری طاقت سے ریوالور کے دستے پر جما دیں تاکہ ان کے نشانات آ جائیں اور پھر اس نے ریوالور کو بہ دستور رومال سے پکڑے ہوئے اس کے ہاتھ سے چند انچ کے فاصلے پر ڈال دیا۔

اس نے سوٹ کیس بند کیا۔ کمرے کی روشنیاں بجھا دیں اور سوٹ کیس لیے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر اس نے دروازے کے ہینڈل کو بھی رومال سے صاف کر دیا۔ جلدی سے اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اسے جلد سے جلد سکوجی سے چلے جانا تھا۔ اپنے کمرے سے اس نے ایک ٹیکسی کے لیے فون کیا۔ ٹیکسی پانچ منٹ میں پہنچ گئی۔ اگرچہ یہ پانچ منٹ ٹیڈ کو پانچ گھنٹوں سے زیادہ طویل محسوس ہو رہے تھے بہرحال...... وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بس اسٹاپ پہنچا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ فورٹ سانڈرس کے لیے بس ابھی نصف گھنٹے میں روانہ ہونے والی ہے۔

☆☆☆

اور اس کے نصف گھنٹے بعد ٹیڈ اس بس پر سوار اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ ابھی اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ بینک جا کر ایک لاکھ ڈالرز اپنی میز کی درازوں میں چھپا دے پھر جب کل صبح پونے نو بجے والٹ کا دروازہ کھلے تو وہ دن میں کسی بھی وقت موقع پا کر رقم کو دوبارہ والٹ کے اندر جا کر محفوظ سرمائے کے سیف میں واپس رکھ دے۔ بینک میں ایک لاکھ ڈالرز اپنی میز میں چھپانے کے بعد وہ اسٹنسن کی میز سے اپنا وہ تحریری پیغام بھی اٹھا کر ضائع کر سکتا تھا جو وہاں چھوڑ آیا تھا۔ پھر وہ باقی رات اسی ہوٹل کے کمرے میں گزار دے گا جس کا کرایہ وہ پہلے ہی ادا کر چکا ہے اور صبح کو کسی وقت میری کو فون کر کے اس سے کہے گا کہ اسٹنسن نے اپنا پلان عین وقت پر تبدیل کرتے ہوئے اسے یمفس سے واپس بلا لیا۔ وہ اپنا کپڑوں والا سوٹ کیس اسٹیشن کے لاکر میں چھوڑ دے گا اور دوسرا سوٹ کیس نوٹ نکالنے کے بعد کہیں پھینک دے گا مگر نہیں...... یہ ایک غلطی ہوگی۔ میری اسے دو سوٹ کیسوں کے ساتھ روانہ ہوتے دیکھ چکی تھی چنانچہ وہ اس خالی سوٹ کیس میں کچھ کاغذات رکھ دے گا اور کسی ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ دوپہر کو گھر بھجوا دے گا۔ لیکن اسے سب سے زیادہ دشوار کام چرائی ہوئی رقم کا سیف میں واپس رکھنا محسوس ہو رہا تھا، اس کے چرانے سے بھی زیادہ مشکل۔

آخرکار اس نے اس مشکل کا بھی ایک حل سوچ لیا اور پھر اطمینان سے اپنی سیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ اب محسوس کر رہا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ حماقت ہی تھی۔ بہرحال ایک بات یقینی ہے کہ میری کو اس بارے میں زندگی بھر کبھی کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے اور جہاں تک خود اس کا تعلق ہے، وہ آئندہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا چاہے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بوڑھا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایک ہی رات میں اس نے ایک ایسے ایڈونچر کا مزہ چکھ لیا تھا جو اسے تمام زندگی پچھتاوے میں مبتلا رکھنے کے لیے کافی تھا۔

اور تب اچانک ٹیڈ کو اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ چمڑے کا کیس، وہ کیس جس میں اس کی بیوی اور لڑکے کے فوٹو لگے ہوئے تھے، اس کی جیب میں موجود نہیں تھا۔ اس نے اضطراب کے عالم میں درجنوں مرتبہ اپنی ہر جیب کی تلاشی لے ڈالی مگر وہ موجود ہوتا تو ملتا۔ وہ تو سکوجی کے اسی موٹل میں کمرا نمبر 54 میں، شاید بستر کے نیچے یا پھر...... یا پھر سیلی کی لاش کے نیچے دبا ہوا پڑا تھا۔

www.Paksociety.com

محفلِ شعرو سخن

❄ ڈاکٹر ایچ اے لطیف...... فقیروالی
نہ تخت وتاج کی ہے آرزو نہ بزمِ شاہ کی ہے جستجو
جو نظر سے دل کو بدل سکے مجھے اس نگاہ کی تلاش ہے

❄ محمد قیصر شہزاد...... جام پور، ضلع راجن پور
ساون بھی میرے تم ہو، میری پیاس بھی تم ہو
صحرا کے بگولوں میں چھپی آس بھی تم ہو
تم یوں تو بہت دور بہت دُور ہو مجھ سے
محسوس یہ ہوتا ہے میرے پاس بھی تم ہو

❄ محبوب علی...... ٹورنٹو، کینیڈا
مانی نہ میری اک بھی بہت خودسر ہے تو اے دل
اب خود ہی تڑپ میں تو تیرا کچھ نہیں لگتا

❄ ابرار وارث...... دراآباد سندھیلیانوالی
اسے یہ شکوہ ہے کہ میں اسے سمجھ نہ سکا
اور مجھے یہ مان ہے کہ میں جانتا فقط اسی کو ہوں

❄ محمد بشارت...... کنگر دودرہ
پھر فضا دُھندلا گئی آثار ہیں طوفان کے
کانپتے ہیں پھول کمرے میں میرے گلدان کے

❄ عمران حیدر بلوچ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تم تو غیروں کی بات کرتے ہو
ہم نے اپنے بھی آزمائے ہیں
لوگ کانٹوں سے بچ نکلتے ہیں
ہم نے پھولوں سے زخم کھائے ہیں

❄ ڈاکٹر وسیم خالق گہیاں...... گجرات
اب کہاں ملاقات میں وہ جذبات کی گرمی
اب تو وہ رکھنے محبت کا بھرم آتے ہیں

❄ تفسیر عباس بابر...... اوکاڑہ
آنکھوں کا رنگ لال ہوا تو باتیں کرنا بھول گئے
شہرِ دل پامال ہوا تو باتیں کرنا بھول گئے
کب سے بارش کر رکھی تھی ہم پر لاکھ سوالوں کی
خود پر ایک سوال ہوا تو باتیں کرنا بھول گئے

❄ سائرہ، صائمہ...... کھاتاں
اس نے کہا مفہوم غلط فہمی کیا ہے؟
میں نے کہا تم سے امیدِ وفا کرنا

❄ عون عباس بابر...... اوکاڑہ
تیری معراج کہ تو لوح وقلم تک پہنچا
میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

❄ شبیر علی خان...... اسلام آباد
تاریخ اگر ڈھونڈے گی کہیں ثانیِ محمدؐ
ثانی تو بڑی چیز ہے سایہ نہ ملے گا

❄ حجاب کنول خان...... ملکوال
تیرے خیال میں رہتی ہوں پاؤں ڈرتے ہوئے
کہ گر پڑوں نہ کہیں سیڑھیاں اترتے ہوئے
میں لڑکی ہو کے بھی اپنے وعدوں پہ قائم ہوں!
مگر حیا نہ آئی؟ تجھے مکرتے ہوئے

❄ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی...... خوشاب
سر جھکایا تو پتھر صنم بن گئے
عشق بھٹکا تو حق آشنا ہو گیا
رشک کرتا ہے کعبہ میرے کفر پر
میں نے جس بت کو پوجا خدا ہو گیا

❄ جنید احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
تو ہار مجھے زخمِ جدائی نہ دیا کر
تو اگر میرا نہیں ہے تو دکھائی نہ دیا کر

❄ رمضان پاشا...... گلشن اقبال، کراچی
نئے دور کے نئے خواب ہیں، نئے موسموں کے گلاب ہیں
محبتوں کے چراغ ہیں انہیں نفرتوں کی ہوا نہ دے

❄ شوکت علی...... گلبرگ، لاہور
تو کہیں بھی رہے تجھ پر میرا الزام تو ہے
تیرے ہاتھوں کی لکیروں میں میرا نام تو ہے

❄ یوسف مرزا...... ملتان شریف
اس عشق میں کیا کیا ہوتا ہے عاشق جانے یارب جانے
اس بار نہ جانے کیا ہوگا پہلے بھی ہوئے تھے دیوانے

❄ راحیل نواب...... ملتان
ہم خون کی قسطیں تو بہت دے چکے، لیکن
اے خاک وطن، قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

❄ صوبیدار انوار بنگش (ر)...... بلیر کینٹ
چراغِ زندگی ہوگا فروزاں، ہم نہیں ہوں گے
جوانو، اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے

❄ محمد آصف ساجد...... ارزانی پور، قصور
یوں تو اس جلوہ گرِ حسن میں کیا کیا دیکھا
اب تجھے دیکھ چکے کوئی نہ تجھ سا دیکھا

❄ شہباز اکرم نوئی...... پاکپتن شریف
شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں
اک دل ہی کافی ہے تیری یاد میں جلنے کے لیے

❄ حبیبہ احمد...... نوشہرہ
تم ہی نہ سن سکے اگر قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے
ہوش میں آچکے تھے ہم جوش میں آچکے تھے تم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

❄ مسز رباب احمد حسن عرضی خان...... قبولہ شریف
بچھڑ کر مجھ سے کبھی یہ سوچا ہے
ادھورا چاند بھی کتنا اداس لگتا ہے

❄ شمس الدین سیال...... نوشہرو فیروز
حادثے کیا کیا تیری بے رخی سے ہوں گے
ساری دنیا کے لیے ہم اجنبی سے ہوں گے

❄ کاشف محمود...... لاہور
آ زندگی تجھے قاتل کے حوالے کر دوں
ہر روز کا مرنا مجھے اچھا نہیں لگتا

❄ نیر زیدی...... سرگودھا
جس نے پڑھی ہی نہیں عشق ووفا کی تاریخ
اس سے کیا ہوگی کسی تاج محل کی تعریف

❄ اختر شاہ عارف...... ڈھوک جمعہ، جہلم
رو پڑے گا اب کے وہ ویران کاغذ دیکھ کر
آخری خط میں اسے میں نے لکھا کچھ بھی نہیں

❄ عمران علی...... جھنگ
میں چاہت کی اس منزل پر کھڑا ہوں فراز
کوئی اس کی طرف دیکھے بھی تو اچھا نہیں لگتا

❄ ریاض بٹ...... حسن ابدال
تم سن کے کیا کرو گے مجھ سے میری کہانی
بے لطف زندگی کے قصے ہیں پھیکے پھیکے

❄ مرزا طاہر الدین بیگ...... میرپور خاص
کوئی جھونکا تو ادھر آئے گا خوشبو لے کر
سوچ کر ہم بھی یہی وقتِ سحر بیٹھے ہیں
یاد کا دیپ جلا ہے تو یہ لگتا ہے خلیل
میرے پہلو میں کئی شمس و قمر بیٹھے ہیں

❄ راجا ضیاالحسن کیانی...... ساہیوال
ہزاروں بار اس نے مات دی فولاد وآہن کو
محبت ریشمی ڈوری سہی، کچی نہیں ہوتی

❄ محمد اشفاق سیال...... شورکوٹ سٹی
دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے

❄ راشد حبیب تابش...... اٹک
آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقع پر کہ شاید تو پلٹ کر دیکھے

❄ فضل لہری...... چمن
محبت کو کوئی سمجھے تو آخر کس طرح سمجھے
یہ ظالم انتہا تک ابتدا معلوم ہوتی ہے

❄ محمد مقبول عاشق...... خوشاب
کہساروں کے دل پگھلے تو دریا ہوئے جاری
اور لوگ کہتے ہیں کہ پتھر نہیں روتے

www.Paksociety.com

❁ احمد خان توحیدی...... پاکستان اسٹیل، کراچی

سہے لاکھ ستم نہ کی آہ وفغاں اب تک
زبان رکھتے ہوئے بھی رہے، ہم بے زباں اب تک

❁ محمد رشید سیال...... سنجرانی محلہ، سکھر

کچھ اور بڑھ گئے اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

❁ محمد قدرت اللہ نیازی...... حکیم ٹاؤن، خانیوال

بیٹھ جاتی ہے میرے پہلو میں آ کے کچھ اس طرح
اس کی یاد میرے گھر کا کوئی فرد ہو جیسے

❁ ہارون ظفر...... لیہ

بتاؤں کہ ہر جواب میں بس مختصر سی ہاں
لگتا ہے میری ذات سے اکتا گیا ہے وہ

❁ ارشد وارثی...... ملتان

باز آجاؤ تغافل سے ورنہ اہلِ دل اکثر
جسے بھول جاتے ہیں اسے بھول جاتے ہیں

❁ فرہاد احمد...... میانوالی

دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے
میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

❁ ظہیر عباس...... کراچی

وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے یہ کام کس کا تھا

❁ رحمت شاہ...... اٹک

بے نور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم

❁ رحمان بلوچ...... مکران

میری بھی کچھ خطائیں تھیں قاضیِ شہر نے مگر
اپنے بھی جتنے جرم تھے میرے ہی سر لگا دیے

❁ رمشہ علی...... شیخوپورہ

وہ ہمیں جب تک نظر آتا رہا، تکتے رہے
گیلی آنکھوں، اکھڑے لفظوں سے دعا دیتے ہوئے

❁ ہمایوں اختر...... فیصل آباد

دشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں

❁ فرح ناز...... لاہور

ہجرت کی گھڑی ہم نے ترے خط کے علاوہ
بوسیدہ کتابوں کو بھی سامان میں رکھا

❁ زوہیب احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی

کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی

❁ طاہرہ یاسمین...... ضلع سرگودھا

میں فقط خاک ہوں مگر نام محمدؐ سے نسبت میری
یہی اک رشتہ ہے جو میری اوقات بدل دیتا ہے

❁ عدنان صدیقی...... ملتان

عمر بھر کا یاد ہے بس ایک افسانہ مجھے
میں نے پہچانا جسے اس نے نہ پہچانا مجھے

❁ محمد عزیز...... کراچی

جس سورج کی آس لگی ہے شاید وہ بھی آئے
تم یہ کہو، خود تم نے اب تک کتنے دیے جلائے

❁ راجا افتخار علی افتی...... چوآسدن شاہ

ہم تو سوکھے ہوئے پتے ہیں بھلا کون پوچھے
لوگ اٹھاتے ہیں ضرورت میں جلانے کے لیے

❁ کمال انور...... اورنگی ٹاؤن، کراچی

کوئی جنت کا طالب ہے تو کوئی غم سے پریشاں ہے
ضرورت سجدہ کرواتی ہے عبادت کون کرتا ہے

❁ عبدالواسع...... ماڈل کالونی، کراچی

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جاسکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جاسکتا ہے

❁ ذیشان منہاس...... گلشن اقبال، کراچی

میں پانی اور آگ سے اک مٹی کی خاطر لڑتا تھا
اور یہ دونوں عالم کھیل تماشا دیکھنے والے تھے

کوپن
برائے
شمارہ
اپریل
2012

محفلِ شعر و سخن

نام : ------------------------------------

پتا : ------------------------------------

گمنام مہربان

تنویر ریاض

خدا کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے... کسی کو آزادی دے کر اور کسی کو قید میں رکھ کر آزماتا ہے... کچھ ایسی ہی کشمکش اسے بھی درپیش تھی... اس کے ساتھ جو واقعات رونما ہو رہے تھے، اس کی کوئی بھی وجہ اس کی عقل سے بالاتر تھی مگر... اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا... اور وہ کرتی گئی حتیٰ کہ ایک دن ایسا کچھ ہو گیا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

معاشرتی تلخ رویوں کا شکار ایک دوشیزہ کا ماجرا

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیل کی زندگی بہت سخت [illegible] ہے اور یہاں ان آسائشوں اور سہولتوں کا تصور بھی نہیں [illegible] جاسکتا جو ہمیں اپنے گھروں میں میسر ہوتی ہیں۔ مثلاً [illegible] نے کے ٹب کی مثال ہی لے لیجیے جو جیل میں ناپید ہے۔ [illegible] یاد ہے کہ آخری بار میں فیرن اور سونی کے ڈبل ٹب میں نہائی تھی۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ میں اس میں گلے تک ڈوب جاتی تھی۔ باتھ آئل کے چند قطروں اور شاور سے نکلی گرم پانی کی پھوار جسم پر پڑتے ہی میری ساری تھکن اور پریشانیاں فضا میں تحلیل ہو جاتیں۔ جبکہ یہاں جیل میں لڑکیوں کو شاور لینے کی اجازت ہے جس میں کبھی نیم گرم اور کبھی ٹھنڈا پانی آتا

ہے اور دروازے پر انتہائی بدصورت اور کیم شحیم گارڈ پہرا دیتی رہتی ہے...... اس بے وقوف کو اتنی بھی عقل نہیں کہ کوئی لڑکی برہنہ حالت میں بھلا جیل سے فرار ہو سکتی ہے؟ اسی لیے مجھے یہاں غسل کرنا اچھا نہیں لگا بلکہ سچ پوچھیں تو ایک نہانے پر ہی کیا منحصر ہے، یہاں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ سکتا۔

میں اپنے آپ کو اس گندے ماحول سے دور رکھنے کے لیے ماضی میں کھو جاتی ہوں۔ آج صبح بھی جب ہمیں جگانے کے لیے گھنٹی بجی تو میں فیرن اور سونی کے بڑے سے ماربل ٹب میں اپنے آخری غسل کو یاد کر رہی تھی۔ اس میں لگی ہوئی سنہری ٹونٹیوں کو گھمانے سے بھاپ برآمد ہوتی اور میں اپنے پورے جسم کو بھاپ اور گرم پانی سے بھگو لیتی پھر سفید تولیا سے اپنا جسم خشک کرتی اور اسے اچھی طرح لپیٹ کر وارڈ روب میں چلی جاتی۔ جانتی تھی کہ سونی کی نظریں میرا طواف کر رہی ہوں گی۔ اسے تاک جھانک کی عادت تھی۔ آخر وہ کب تک میرے خوب صورت جسم اور نرم و نازک جلد کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ یہاں آ کر میرے تصورات کا محل دھڑام سے زمیں بوس ہو گیا کیونکہ وہی منحوس صورت گارڈ زور زور سے دروازہ پیٹ رہی تھی اور چلا چلا کر ہمیں بستر چھوڑنے اور ناشتے کے لیے قطار بنانے کی ہدایت دے رہی تھی۔

⊹⊹⊹

میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگلی بار جب میری وکیل ملاقات کے لیے آئے گی تو اس سے ہاتھ آئل منگواؤں گی۔ ہمیں جیل میں یہ چیزیں مہیا نہیں کی جاتی تھیں لیکن ہم اپنے طور پر انہیں استعمال کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ تکیہ بھی۔ کیونکہ انہوں نے ہمیں جو تکیہ دے رکھا تھا۔ اسے تکیہ کہنا بھی اس نام کی توہین تھی۔ ایک پلاسٹک کے تھیلے میں دو انچ موٹا فوم کا ٹکڑا ڈال کر اسے تکیہ کا نام دے دیا گیا تھا جس میں عجیب سی بو آتی رہتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دونوں گالوں پر ہاتھ آئل لگانے سے یہ بدبو دب جائے گی اور میں آرام کی نیند سو سکوں گی۔ مشکل یہ تھی کہ وکیل بھی میرا دکھڑا سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی باتیں میرے خلاف جا سکتی ہیں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی کہ میں کسی ایسے جرم کا اعتراف نہیں کر رہی جو مجھ سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ اگر انہوں نے ان باتوں کو میرے خلاف استعمال کیا تب بھی وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا، اس سے زیادہ اور کیا برا ہو سکتا تھا۔

میری وکیل کا حلیہ ایسا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کا منہ خطرناک حد تک چوڑا تھا جس میں ہونٹوں کی جگہ ایک باریک سی لکیر نظر آتی تھی۔ اس کے خشک الجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر چڑیا کا گھونسلا یاد آ جاتا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے کالج کا امتحان پاس کرنے کے بعد کبھی ان بالوں کو نہیں ترشوایا تھا۔ وہ عموماً گہرے رنگ کا سوٹ پہنتی تھی جو اس کے جسم پر بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتی۔ میری ماما بھی ایسا ہی کرتی تھی۔ مجھے ہمیشہ سے دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادت تھی اور میں نے کبھی اسے ناراض کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ میری خواہش تھی کہ وہ صبر سے میری بات سن لیا کرے۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ جیل میں قید کاٹنے والی لڑکی کسی کے رنگوں کے انتخاب کے بارے میں کیونکر فیصلہ کر سکتی ہے۔ جبکہ مجھے بچپن سے ہی رنگوں کی سمجھ بوجھ تھی۔ میں نے بہت چھوٹی عمر میں ہی ماڈلنگ اور مقابلۂ حسن میں شرکت کرنا شروع کر دیا تھا اور ان شوز میں خوب بھاری بھرکم میک اپ کر کے حصہ لیا کرتی تھی۔ البتہ ہفتے کے باقی دنوں میں ماما اور میں عام زندگی گزارتے تھے۔ وہ گھروں کی صفائی کرتی اور میں اسکول جایا کرتی تھی لیکن اختتام ہفتہ ہمارے درمیان مقابلہ ہوتا تھا۔ ہم جارجیا، جینیا اور ہر اس شہر میں جاتے جہاں سے اچھے معاوضے کی پیشکش ہوتی۔ میں بینجو بجایا کرتی تھی اور ماما نے اس کی تربیت بہت پہلے مجھے دے دی تھی۔ کیونکہ میری آواز اتنی اچھی نہیں تھی لیکن بینجو پر میری انگلیاں خوب چلتی تھیں اور میں چند مرتبہ ہی کوئی دھن سن کر اسے بینجو پر بجانا شروع کر دیتی۔ میرا بینجو پورٹیبل تھا اور ہم اسے بہ آسانی دوسری جگہ لے جا سکتے تھے۔ اس بینجو نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب ماما بیمار پڑ گئی اور اس کی بیماری کا خرچ بڑھتا گیا۔ پیسوں کی بروقت ادائیگی نہ ہونے پر ایک قرض خواں نے ہمارے ٹریلر میں تالا ڈال دیا اور ہم آٹھ مہینے تک کار میں سفر کرتے رہے۔ اس دوران ہم نے مختلف چھوٹے چھوٹے کام کر کے ایک ایک پیسا بچایا تاکہ میرے لباس اور داخلہ فیس کے لیے رقم جمع ہو سکے۔ کار میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس میں ٹی وی نہیں ہوتا۔ اس طرح مجھے سیکھنے کے لیے کافی وقت مل گیا۔

دسویں سالگرہ سے ایک دن پہلے میں نے ایک شو میں حصہ لے کر لٹل مس ساؤتھ ایسٹ، کا خطاب حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بیس ہزار ڈالرز کا نقد انعام بھی لیا۔ اب ہم نے ایک کمرا کرائے پر لے لیا تھا۔ میں اس کے ہاتھ ٹب کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اس کے بعد میں نے اگلے سال کے دوران کئی مقابلوں میں حصہ لے کر اتنے ڈالرز جمع کر لیے کہ

www.Paksociety.com

اپنے رہنے کے لیے ایک نیا ٹریلر خرید سکیں۔

میں اٹھارہ سال کی تھی لیکن جسم پر فالتو چربی چڑھ جانے کی وجہ سے اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی اسی لیے خوب صورت ہونے کے باوجود میرے چہرے اور جسم میں کوئی کشش نہیں تھی۔ ایک طرف میرا قد بڑھ رہا تھا تو دوسری جانب چہرے کی سوجن اور کمر کی موٹائی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس حلیے کے ساتھ میں کسی مقابلہ حسن یا فیشن شو میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے تک محدود کر لیا اور تین سال تک گٹار بجانے کی پریکٹس کرتی رہی۔

ماما صحت یاب ہو چکی تھی لیکن اسے میرے مستقبل کی بڑی فکر تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے دبلا اور اسمارٹ رہنے کی ترکیبیں بتاتی رہتی لیکن میں اپنی کاہلی اور سستی کی وجہ سے ان پر عمل کرنے سے قاصر تھی۔ تنگ آ کر اس نے مجھے جم بھیجنا شروع کر دیا۔ چند ماہ بعد ہی میرے جسم کی چربی پگھلنا شروع ہو گئی اور میں نے مس نارتھ کیرولینا کا مقابلہ جیت لیا۔ وہ میری زندگی کا یادگار لمحہ تھا جب سابقہ مس نارتھ کیرولینا نے مجھے تاج پہنایا۔ اس کے بعد میں نے مس ہائی پوائنٹ کا مقابلہ جیتا جو میرے کیریئر کا نقطۂ عروج تھا پھر میرا زوال شروع ہو گیا۔ میں اگلے برس مس نارتھ کیرولینا کے مقابلے سے خارج کر دی گئی۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں نے مقابلے میں شامل ایک لڑکی کو دھکا دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ معمولی سی زخمی ہو گئی۔ کسی نے مجھ سے اس کی وجہ دریافت نہیں کی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کتیا نے میرے پرس سے میک اپ کا سامان چرایا تھا۔

⊹⊹⊹

میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ سوشل ورک میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے مجھے بھی غربت مٹانے اور خاندانوں کو جوڑنے میں دلچسپی تھی۔ وہاں میرا واسطہ ڈاکٹر وو سے پڑا جو چینی نژاد تھا۔ میں جب بھی اس سے کوئی سوال کرتی تو وہ اپنی سرد آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیتا اور پھر اس کی نظریں میرے پورے جسم کا طواف کرنے لگتیں۔ مجھے اپنے بدن میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوتی تھیں پھر اس نے کلاس کے بعد مجھے اپنے کمرے میں بلانا شروع کر دیا۔ اس کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی چنانچہ وہ مجھے گھنٹوں اپنے پاس بٹھا کر میرے سوالوں کے جواب دیتا رہتا۔ پھر ایک دن اس نے میرے ساتھ دست درازی کی کوشش کی تو میں نے جنگلی بلی کی طرح اس کا چہرہ نوچ لیا۔ اس کی چیخیں سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ یہاں بھی کسی نے میری نہیں سنی اور مجھے کالج سے نکال دیا گیا۔

⊹⊹⊹

ماما کے زور دینے پر میں نے ایک ایجنسی سے رابطہ کیا جو ضرورت مند لوگوں کو آیا کی خدمات فراہم کرتی تھی۔ ماما کی کیموتھراپی ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی صحت میں بہتری کے آثار نہیں دکھائی دے رہے تھے اس لیے وہ چاہتی تھی کہ میں جلد از جلد کسی ٹھکانے لگ جاؤں۔ ایجنسی کے ڈائریکٹر نے اپنی طرف سے میری پوری حوصلہ شکنی کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہت کم عمر ہوں اور بچوں کو نہیں سنبھال پاؤں گی کیونکہ اس کام کے لیے عمر رسیدہ اور سمجھ دار عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب میں نے اسے گھریلو حالات بتائے تو اس کا دل پسیج گیا اور اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ جلد از جلد کسی اچھی فیملی میں مجھے ملازمت دلوا دے گا۔ شروع کے چند انٹرویوز مایوس کن رہے، ایک فیملی کو اپنی دو جڑواں بچیوں کے لیے آیا کی ضرورت تھی لیکن انہوں نے مجھے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ابھی بہت چھوٹی ہوں اور بیک وقت دو بچیوں کو نہیں سنبھال سکوں گی۔ ایک اور فیملی کو اپنے تین بیمار لڑکوں کے لیے ایسی عورت کی ضرورت تھی جو آیا کے ساتھ ساتھ نرس کے طور پر بھی کام کر سکے جبکہ مجھے تو دوائیوں کے نام بھی معلوم نہیں تھے۔ غرضیکہ میری کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باعث کوئی بھی مجھے ملازمت دینے کے لیے تیار نہ ہوا۔

اس موقع پر ایجنسی کے ڈائریکٹر نے مجھے بہت حوصلہ دیا اور مسلسل یہی کہتا رہا کہ مجھے اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی فیملی کو میری خوبیاں پسند آ جائیں اور وہ مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہو جائے۔ اس کا کہا سچ ثابت ہوا جب ایک روز فیرن اور سونی اس کے دفتر میں آئے، انہیں اپنی دس سالہ بیٹی کے لیے ایک آیا کی ضرورت تھی۔ سونی سیلز مین تھا اور اس کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر سفر میں گزرتا جبکہ اس کی بیوی فیرن کسی اسٹیٹ ایجنسی میں کام کرتی تھی اور اس کی واپسی بھی رات گئے ہوتی۔ ان دونوں نے ایجنسی کے دفتر میں ہی مجھ سے ملاقات کی۔ فیرن نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”سچی بات تو یہ ہے کہ میں تم سے بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی کیونکہ تم مقابلۂ حسن میں شرکت کر چکی ہو۔ بھلا کون عورت اپنے گھر میں ملکۂ حسن کو رکھنا چاہے گی لیکن یہاں کے لوگوں نے تمہاری اتنی تعریف کی کہ میں تم سے انٹرویو کرنے کے لیے تیار ہو گئی

اور تم سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس جاب کے لیے بالکل مناسب ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بیٹی کی اچھی تربیت کر سکو گی۔‘‘

پہلے تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری بے عزتی کر رہی ہو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی کیونکہ مجھے ملازمت کی سخت ضرورت تھی تاکہ اپنا گزارہ کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے بھی کچھ پس انداز کر سکوں۔ ساری عمر تو آیا کے طور پر کام نہیں کر سکتی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو اپنا بیوٹی پارلر اور ٹریننگ سینٹر کھول لوں۔ اس طرح ماما کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی اور وہ سکون سے مر سکیں گی۔

سونی نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’فیرن میرے خیالات پڑھ لیتی ہے، اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔‘‘

میں بچی نہیں تھی جو اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر نہ پڑھ سکتی۔ وہ اپنی بیوی کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلا رہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ پہلی نظر میں ہی مجھے پسند کر چکا تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ میں یہ ملازمت قبول کر لوں۔

⇢⇢⇢

جیسا کہ پہلے بتا چکی ہوں کہ جیل میں زندگی بہت مشکل سے گزرتی ہے۔ میں ہمیشہ سے ہی پرسکون زندگی گزارنے کی عادی تھی لیکن یہاں اتنا شور رہتا ہے کہ آدمی دو منٹ کے لیے بھی سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ عورتیں ہر وقت ادھم مچائے رکھتی ہیں۔ زور زور سے باتیں کرنا، لڑنا اور چیخنا چلانا۔ اس پر مستزاد یہ کہ سارا دن انٹر کام کی گھنٹی بجتی رہتی ہے۔ میری کوٹھری میں ساتھ رہنے والی لڑکی ہر دو ماہ بعد بدل جاتی ہے۔ ان دنوں سوسی نام کی لڑکی میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ ہیروئن کی عادی ہے اور جیل اس کے لیے دوسرے گھر جیسی ہے۔ البتہ مجھے ایک بات بہت پسند آئی اور وہ یہ کہ بہت خوش مزاج ہے اور ان عورتوں میں سے نہیں جو بات بات پر لڑنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ رہ کر میں نے بھی خوش ہونا سیکھ لیا ہے، ویسے بھی میرے کون سے بچے ہیں جن کے لیے اداس ہوتی رہوں۔

⇢⇢⇢

بہ ظاہر فیرن اور سونی بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے، کم از کم میرے اور ماما کے مقابلے میں ان کے حالات بہت بہتر تھے۔ ان کا تین منزلہ مکان ماما کے چھوٹے سے ٹریلر کے مقابلے میں بہت کشادہ اور تمام سہولتوں سے آراستہ تھا لیکن جب میں نے وہاں رہنا شروع کیا تو چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ وہاں صرف گلاب ہی نہیں بلکہ کانٹے بھی بکھرے ہوئے تھے۔

فیرن بے حد بدمزاج عورت تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اٹھتی۔ مثلاً یہ کہ خالی گلاس لیونگ روم میں کیوں رکھا ہوا ہے۔ ماریا کی جیکٹ فرش پر کیوں پڑی ہوئی ہے۔ الماری کا دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس میں تحمل و برداشت کا مادہ بالکل نہیں تھا اور معمولی معمولی باتوں پر الجھنا اس نے اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔ سونی جب بھی کام سے واپس آتا، وہ اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی مثلاً یہ کہ تم کس سے بات کر رہے تھے؟ تم نے لنچ کہاں کیا اور تمہارے ساتھ کون تھا؟ میں نے تمہیں دوپہر میں دو دفعہ فون کیا لیکن تم اپنی جگہ پر موجود نہیں تھے۔

وہ پیسوں کا حساب کتاب رکھنے کے معاملے میں بھی بہت سخت تھی۔ یہاں تک کہ وہ گروسری کے سامان کی رسیدیں دیکھ کر گھر کی ملازمہ انجیلا سے بحث کرنے لگتی۔ اس کا خیال تھا کہ انجیلا ضرورت سے زیادہ خریداری کرتی ہے تاکہ وہ ان اشیا کو اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر سکے جو ایک قریبی کارخانے میں کام کرتے تھے۔

انجیلا کھانا بنانے کے علاوہ گھر کی صفائی کرتی اور بازار سے سودا سلف لانا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ وہ سارا دن کام کے دوران میکسیکن گانے گاتی رہتی۔ وہ چالیس سال پہلے اس گھر میں سونی کی آیا کے طور پر آئی تھی لیکن نارتھ کیرولینا میں اتنا طویل عرصہ قیام کرنے کے باوجود وہ ڈھنگ سے انگریزی نہیں بول سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ماریا بھی اس کی دیکھا دیکھی ہسپانوی زبان بولنے لگی۔ وہ دونوں سارا دن اسی زبان میں باتیں کرتی رہتیں۔ میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا۔ ممکن ہے کہ وہ میرے بارے میں بھی باتیں کرتی ہوں لیکن میں اس پر مسکرانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے ماریا کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ اپنے ہونٹ سختی سے بھینچے رکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ساری دنیا سے خفا ہے بالخصوص فیرن سے جو زیادہ تر گھر سے باہر رہتی اور اس کا بالکل خیال نہیں رکھتی تھی۔

ایک دن فیرن غصے میں بھری ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ ’’مجھے اس کی بالکل پروا نہیں۔ وہ جہاں مرضی جائے۔ یہ تو مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اپنا بیشتر وقت عورتوں کے ساتھ گزارتا ہے۔ کام کا تو بس بہانہ ہے۔‘‘

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہی تھی۔ میں اس کی رازدار تو نہیں تھی۔ شاید وہ سمجھتی ہوگی کہ میں بھی سونی کی طرف داری کروں گی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ آہستہ سے بولی۔ ’’دراصل بات یہ ہے کہ بعض اوقات وہ عورتیں ہی اس کے پیچھے لگ جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ مشکل میں پڑ جاتا ہے۔‘‘

میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ’’تم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے برداشت کر رہی ہو؟‘‘

’’یہ میری مجبوری ہے۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’سونی کی ساری جائداد ٹرسٹ کے پاس ہے اور اس میں سے مجھے اس وقت تک کچھ نہیں مل سکتا جب تک کہ ہماری شادی کو دس سال نہ ہو جائیں۔ ابھی چار سال باقی ہیں۔ تب تک مجھے اس سے نفرت کرنے کے باوجود یہ وقت گزارنا ہوگا۔‘‘

حقیقت تو یہ ہے کہ ماریا بھی اس سے نفرت کرتی تھی۔ گوکہ زبان سے اس نے کبھی اظہار نہیں کیا لیکن فیرن سے بات کرتے وقت اس کے چہرے کے تاثرات سب کچھ عیاں کر دیتے تھے جن کا مفہوم کچھ یوں ہوتا۔ ’’تم میری ماں نہیں ہو، میں تم سے نفرت کرتی ہوں، ڈیڈی بھی تم سے نفرت کرتے ہیں۔ تم نے صرف دولت کی خاطر ان سے شادی کی ہے، وغیرہ وغیرہ۔‘‘ عام طور پر وہ فیرن کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی جیسے وہ گھر میں موجود ہی نہ ہو، یہ کام سونی کا تھا کہ وہ ماریا کو سمجھاتا اور اس کے دل میں فیرن کے لیے پائی جانے والی نفرت کو کم کرتا لیکن اسے اپنے کام سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے اس کی واپسی ہوتی لہٰذا اب یہ میری ذمے داری تھی کہ ماریا کو اپنی ماں کی عزت کرنا سکھاؤں لیکن میں دل سے اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

ماریا کے بال سیدھے اور گہرے سیاہ تھے لیکن وہ ان کا خیال نہیں رکھتی تھی اور اکثر انہیں پونی ٹیل کی شکل میں باندھا کرتی جو کہ بالوں کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ اس سے بال ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نے اسے شیمپو کی بوتل دی اور کہا کہ وہ صبح اسکول جانے سے پہلے اس سے اپنا سر دھویا کرے۔ وہ نہانے کے بعد لباس تبدیل کر کے مجھے کنگھی کرنے کے لیے بلاتی۔ میں ڈرائر سے اس کے بال خشک کر کے انہیں برش سے سیدھا کرتی۔ مجھے معلوم تھا کہ چند ہی مہینوں میں اپنی کلاس کی لڑکیوں میں اس کے بال سب سے زیادہ خوب صورت اور چمکدار ہو جائیں گے۔

⇢⇢⇢

ماریا بڑی ہو رہی تھی اور اس کے جسم میں ہونے والی تبدیلیوں کے لحاظ سے اس کے کپڑے چھوٹے پڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جیکٹ کی زپ بہ مشکل لگا پاتی جبکہ فیرن کا کہنا تھا کہ اس کے پاس کپڑوں کی خریداری کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ مجھے ماریا کی حالت پر بڑا ترس آیا اور میں نے اس سے ایک دن پوچھ ہی لیا۔ ’’تمہاری ماں کہاں ہے؟ کیا تم اس سے پیسے نہیں لے سکتیں؟‘‘

’’میری ماں مر چکی ہے۔‘‘ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ اس کے چہرے پر چھائی افسردگی دیکھ کر میری ہمت نہ ہوئی کہ اس بارے میں مزید سوالات کرتی۔ میں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ دوسرے دن میں اسے اپنے ہمراہ لے کر بازار گئی اور اسے ایک جیکٹ، تین پتلونیں، چار قمیصیں اور دو عدد سوئٹر دلوائے۔ ان چیزوں کی خریداری پر میرے کافی پیسے خرچ ہو گئے اور جوتوں کے لیے گنجائش نہ نکل سکی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس بار سونی گھر آئے گا تو اس کے لیے جوتے بھی خریدوں گی۔

’’فیرن کو کچھ مت بتانا۔‘‘ وہ خوشی سے چہچہاتے ہوئے بولی۔ ’’وہ مجھے خوش نہیں دیکھ سکتی اور تم پر بھی ناراض ہوگی کہ میرے اوپر اتنے پیسے کیوں خرچ کیے۔‘‘

’’تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی۔‘‘ میں نے اس کے گال پر چپت مارتے ہوئے کہا، اس کے بعد ہم دونوں میں دوستی ہو گئی۔ میں نے اسے بینجو سکھانا شروع کر دیا۔ وہ بہت ذہین تھی اور اسے موسیقی سے بھی لگاؤ تھا لہٰذا بہت تھوڑے عرصے میں وہ بہت اچھا بینجو بجانے لگی۔

⇢⇢⇢

ہماری زندگی میں بہت کچھ ایسا ہو جاتا ہے جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ نہ جانے کب اور کیسے سونی میرے قریب آ گیا۔ ویسے تو پہلی ملاقات میں اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا، میں ان کا مفہوم سمجھ گئی تھی پھر جب سونی نے پیش قدمی کی تو میں مزاحمت نہ کر سکی اور ہم چوری چھپے ملنے لگے۔ ماریا کو اسکول لے جانے اور واپس لانے کی ذمے داری میری تھی۔ میں اس کی چھٹی سے ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے گھر سے نکل جاتی اور شہر کے شمال میں واقع جنگل کا رخ کرتی۔ وہاں گاڑی کھڑی کر کے میں اس پگڈنڈی پر ہو لیتی جو کسی کھیت کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں ایک بڑا سا درخت آتا تھا۔ میں اس کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی اور گہری گہری سانسیں لینے لگتی پھر کچھ دیر انتظار کے بعد مجھے اس کی آواز سنائی دیتی۔ ’’بے بی، تم کہاں ہو؟‘‘

www.Paksociety.com

میں نے مقدمہ شروع ہونے کے بعد یہ آواز پھر کبھی نہیں سنی۔

+++

یہ سلسلہ اچانک ہی ختم ہوگیا۔ جب فیرن کی موت واقع ہوئی تو میں گھر پر موجود نہیں تھی لیکن انجیلا نے اپنے بیان میں میری موجودگی کی تصدیق کر دی۔ حقیقت کچھ اور تھی، اس روز فیرن دوپہر میں کہیں گئی ہوئی تھی لہٰذا سونی نے موقع غنیمت جانا اور مجھے لے کر کمرے میں بند ہوگیا۔ باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوا اور موسلا دھار بارش کے شور کی وجہ سے ہم فیرن کے کار کی آواز نہ سن سکے اور نہ ہی ہمیں سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ سیدھی کمرے میں آئی اور ہمیں قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر چھتری سے دونوں کو مارنا شروع کر دیا۔ شور کی آواز سن کر انجیلا بھی دوڑی چلی آئی۔ میں اور سونی چادریں لپیٹے اپنے آپ کو فیرن کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ پاگل عورت بری طرح چلا رہی تھی اور انجیلا بھی ہسپانوی زبان میں زور زور سے کچھ کہہ رہی تھی۔ فیرن نے غضب ناک لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”بدمعاش لڑکی، فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ۔“

شکر ہے کہ اس وقت ماریا اسکول گئی ہوئی تھی۔ میں نے کپڑے پہنے اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ میں ماریا کو خدا حافظ کہنا چاہ رہی تھی مگر فیرن نے اس کی مہلت بھی نہیں دی اور کہا کہ میں فوراً اس کے گھر سے چلی جاؤں۔ تب میں نے ماریا کے نام ایک خط لکھا کہ میں بہت مجبوری کے عالم میں اس سے ملے بغیر جا رہی ہوں وہ ہمیشہ مجھے یاد آتی رہے گی۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا مستقبل بہت اچھا ہے پھر میں نے اپنا سامان اٹھایا اور بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔ میں نے وہاں سے روانہ ہوتے وقت کسی کو خدا حافظ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

+++

دو سال جیل میں گزارنے کے بعد میں نے اپنی وکیل سے کہا کہ وہ جیل انتظامیہ سے کہہ کر مجھے بیوٹی شاپ کھولنے کی اجازت دلوا دے تاکہ لڑکیاں اپنے بالوں، چہرے اور جسم کی دیکھ بھال پر توجہ دے سکیں گو کہ جیل میں ان کے لیے نہانے کا بندوبست تھا لیکن وہاں وہ نہ تو اپنے بالوں کو دھو سکتی تھیں اور نہ ہی ان کی تراش خراش پر کوئی توجہ دے سکتی تھیں جس کی وجہ سے ان کے بال روکھے، خشک اور بے ترتیب ہو گئے تھے۔ جب میں ان کے بال سنوارتی تو اس دوران میں وہ مجھے اپنی کہانیاں سناتیں۔ ہر ایک کی الگ الگ داستان تھی لیکن کم و بیش سب ہی میری کہانی جیسی تھیں۔ کہانی سنانے کے بعد وہ اپنی ماؤں اور بچوں کو یاد کر کے روتیں لیکن کبھی ان کی زبان پر کسی مرد کا نام نہیں آیا اور نہ ہی انہوں نے بار بار اپنی کہانی دہرانے کی کوشش کی کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر وہ فخر کر سکتیں، گو کہ میری اپنی کہانی بھی کچھ کم دردناک نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں ان لوگوں کی کہانیاں سن کر میں افسردہ ہو جاتی۔

+++

میں نے اپنے بیان میں یہی کہا تھا کہ جب فیرن نے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہا تو میں اپنا سامان سمیٹ کر گھر سے چلی آئی اور بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگی۔ میری وکیل نے بہت کوشش کی کہ کوئی ایسا گواہ مل جائے جس نے مجھے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے دیکھا ہو لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ سوموار کے روز اس روٹ پر بسیں نہیں چلتیں لہٰذا میرے دیکھے جانے کا امکان بہت کم تھا جبکہ میں وہاں بہت دیر سے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر میں نے فیرن کو وہاں سے گاڑی میں گزرتے ہوئے دیکھا لیکن اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ کچھ دیر بعد وہ ماریا کو اسکول سے واپس لے کر آئی جو اپنی سیٹ پر جھکی مجھے دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں ایک گھنٹے بعد بھی اسی بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھی جب ایک ایمبولینس وہاں سے گزری۔ میں اس وقت بھی وہاں موجود تھی جب پولیس مجھے گرفتار کرنے آئی۔ یہ ہے وہ سچائی جو میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انجیلا نے اپنے بیانِ حلفیہ میں کیا کہا تھا۔

+++

وکیل کا کہنا تھا کہ سزا کے خلاف اپیل کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہاں پر موجود ثبوتوں اور انجیلا کی چشم دید گواہی نے استغاثہ کے کیس کو مزید مضبوط کر دیا تھا۔ استغاثہ نے مجھ پر الزام لگایا تھا کہ میں نے اپنے ہیئر ڈرائر کا پلگ ایک دور تک پھیلے ہوئے تار کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ ڈرائر میں نے فیرن کے بھاری سے بنے ٹب میں رکھ دیا۔ اس مکان میں بجلی کی وائرنگ بہت پرانی ہو چکی تھی اور کرنٹ سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا لہٰذا فیرن جیسے ہی نہانے کے لیے ٹب میں اتری۔ اسے بجلی کا جھٹکا لگا اور وہ موقعے پر ہی ہلاک ہوگئی۔ پولیس کو نہ صرف وہاں سے میرا ہیئر ڈرائر مل گیا بلکہ باتھ ٹب پر میری انگلیوں اور فرش پر میرے قدموں کے نشان بھی ملے۔ تفتیش کے دوران جب ماہر نفسیات نے مجھ سے سوالات کیے تو پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر میرے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے یا کوئی کام میری مرضی کے خلاف ہو تو میں فوری ردعمل ظاہر کرنے کی عادی تھی لہٰذا یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ میں نے فیرن کو فوری اشتعال کے تحت ہلاک کر دیا کیونکہ اس نے مجھے گھر سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ میری وکیل کا کہنا تھا کہ میں اقبال جرم کر لوں اور یہ کہ مجھ پر جنون سوار ہوگیا تھا۔ ایسی صورت میں مجھے کم سزا ملے گی لیکن میں نے اس کی بات نہ مانی اور اقبال جرم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جیوری نے میرے موقف سے اتفاق نہیں کیا اور مجھے قتل کا مجرم قرار دیتے ہوئے عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ انہوں نے مجھے پیرول کی رعایت بھی نہیں دی۔

+++

میرے لیے جیل میں ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ میری وکیل جب بھی مجھ سے ملنے آتی تو یہی کہتی کہ وہ اس سزا کے خلاف اپیل دائر کرنے کی تیاری کر رہی ہے لیکن اسے کسی ایسے مضبوط ثبوت کی تلاش ہے جس کی بنیاد پر وہ میری سزا ختم کروا سکے۔ آہستہ آہستہ میں جیل کی زندگی کی عادی ہوتی چلی گئی اور میں نے اپنے آپ کو اس کے معمول کے مطابق ڈھال لیا۔ میں ہر اتوار کو جیل کے چھوٹے سے گرجا میں بینجو بجاتی۔ میں نے وہیں رہ کر بیوٹیشن کا کورس بھی کر لیا تھا اور وکیل کی کوششوں سے مجھے بیوٹی پارلر کھولنے کی اجازت بھی مل گئی تھی جہاں میں قیدی خواتین کے بالوں، چہرے اور جلد کی حفاظت کے لیے نت نئے نسخے آزماتی رہتی۔ ان کی دیکھا دیکھی جیل کے عملے نے بھی میرے پاس آنا شروع کر دیا تھا۔ خاص طور پر وہ گارڈ تو مجھ پر اتنی مہربان ہوئی کہ کتوں کی طرح بھونکنے کے بجائے اب بڑے پیار سے مجھے ناشتے کے لیے بلاتی کیونکہ میں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے چہرے کے اضافی بال صاف کر دیے تھے۔ اس کا نام ایما تھا اور صرف اڑتیس سال کی عمر میں ہی وہ نانی بن چکی تھی۔ وہ ہر وقت اس لڑکے کو کوستی رہتی جو اس کی بیٹی کو اٹھارہ سال کی عمر میں ہی ماں کے رتبے پر فائز کر کے خود کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اسے گانے کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اگر جیل میں موسیقی کے دو تین دلدادہ اور مل جائیں تو ہم اپنا بینڈ قائم کر سکتے ہیں۔ شب و روز یونہی گزر رہے تھے اور میں نہیں جانتی تھی کہ آنے والے دنوں میں کون سی بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔

+++

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور مجھے جیل میں رہتے ہوئے چھ برس بیت گئے۔ میری رہائی کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی تھیں اور وکیل بھی مایوس ہو چکی تھی لیکن اس نے مجھ سے ملنا ترک نہیں کیا تھا اور گاہے بہ گاہے خبر گیری کے لیے آتی رہتی تھی پھر ایک دن وہ دھماکا ہوا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ میں اس خوش گوار صبح کو کبھی نہیں بھول پاؤں گی جب مجھے ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔ میں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بھیجنے والے کا نام دیکھ کر چونک گئی، وہ خط انجیلا نے لکھا تھا۔

”پیاری نووی!

شاید میں کبھی یہ خط نہیں لکھتی لیکن ضمیر کی خلش نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھ سے ایک سنگین غلطی سرزد ہوگئی تھی اور وہ یہ کہ میں نے تم پر فیرن کے قتل کا الزام عائد کیا جبکہ میں جانتی تھی کہ تم بے قصور ہو۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔ شاید اس کا جواب کبھی نہ دے سکوں بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی مجبور ہوگئی تھی۔ میں گناہ کے اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہوں۔ جانتی ہوں کہ اب چند دن کی مہمان ہوں۔ اس لیے مرنے سے پہلے اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ میں نے پادری کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا ہے اور اس نے مجھے یہی نصیحت کی ہے کہ جو سچ ہے وہ دنیا کو بتا دوں لہٰذا میں اس خط کے ذریعے یہ اعتراف کر رہی ہوں کہ میں نے اس وقت جھوٹ بولا تھا۔ تم نے فیرن کو قتل نہیں کیا۔ خدا مجھے معاف کرے۔

بدنصیب انجیلا۔“

میں یہ خط پڑھ کر حیران رہ گئی۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ فیرن کو کس نے قتل کیا ہوگا؟ انجیلا نے لکھا تھا کہ وہ مجبور ہوگئی تھی۔ آخر کیوں؟ اسے کیا مجبوری تھی؟ کیا وہ کسی کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی میری سوچ کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ذہن کے پردے پر ایک نام ابھرا تو میں نے فوراً ہی سوچ پر پہرا بٹھا لیا۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کمزور لمحے میں وہ نام میری زبان پر آ جائے اور انجیلا نے جس کو بچانے کی کوشش کی تھی، وہ میری کسی حماقت سے رائگاں جا سکتی تھی۔ میں نے احتیاط سے وہ لفافہ اپنے پاس محفوظ کر لیا اور وکیل کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

+++

وکیل نے وہ خط پڑھا تو اس کی آنکھوں میں امید کے

www.Paksociety.com

چراغ روشن ہوگئے۔ وہ خوشی سے لہراتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ایسے ہی کسی ثبوت کی تلاش تھی، میں کل ہی اپیل دائر کردوں گی۔“

”ہاں۔ تمہیں یہ کام فوراً کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ عورت مر جائے۔“ میں نے پرجوش انداز میں کہا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ میری رہائی کے لیے یہ ثبوت کافی ہے؟“

”میرے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“ وہ رکھائی سے بولی۔ ”اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ میں تو وہی چاہوں گی جو تمہارے حق میں بہتر ہو۔“

”کیس کا فیصلہ ہونے میں کتنا وقت لگ سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور بولی۔ ”کم از کم چھ ماہ یا ہوسکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ وقت لگ جائے۔“

”کوئی بات نہیں۔ کم از کم یہ اس سے تو بہتر ہوگا کہ میں پیرول کے بغیر ہی ساری زندگی اس جیل میں گزار دوں۔“

”میں کوشش کروں گی کہ تم جلد از جلد رہا ہو جاؤ۔“ وہ مجھے تسلی دے کر چلی گئی۔

اپیل کا فیصلہ ہونے میں گیارہ ماہ لگ گئے۔ جیوری نے مجھے باعزت طور پر بری کرتے ہوئے پولیس کو ہدایت کی کہ اصل قاتل کو گرفتار کرکے دوبارہ چالان عدالت میں پیش کیا جائے۔ میں جیوری کے ارکان سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ ایک جھوٹی گواہی کی بنیاد پر مجھے عمر قید کی سزا سنائی گئی اور میری زندگی کے چھ قیمتی سال جیل کی نذر ہوگئے۔ اس کے علاوہ جو ذلت اور رسوائی میرے حصے میں آئی اس کی تلافی کیسے ہوگی لیکن میں یہ سب نہ کہہ سکی کیونکہ سانپ نکل چکا تھا۔ اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ مجھے وکیل نے بتا دیا تھا کہ انجیلا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

میں نے اپنا سوٹ کیس اور بینجو اٹھایا اور جیل کی چار دیواری سے باہر آگئی۔ مرکزی دروازے پر وکیل میرا انتظار کررہی تھی۔ اس نے مجھے اپنی کار میں بٹھایا اور اخبارات کا ایک پلندا میری گود میں ڈال دیا۔ تقریباً بھی اخباروں میں میری تصویر کے ساتھ رہائی کی خبر شائع ہوئی تھی اور سب نے کم وبیش ایک جیسی سرخی لگائی تھی۔ ”بے گناہ عورت قتل کے الزام سے بری۔“ مجھے ان خبروں کو پڑھ کر تھوڑا سا سکون ملا۔ میری بے گناہی ثابت ہوگئی تھی۔ اب میں معاشرے میں سر اٹھا کر چل سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کی کار ایک شاندار عمارت کے پاس جاکر رکی۔ وہ ایک کھلی پرفضا جگہ تھی۔ وکیل نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور ہم درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے مرکزی عمارت کی جانب بڑھنے لگے۔ ٹینس کورٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے وکیل بولی۔ ”یہاں سوئمنگ پول اور فٹنس سینٹر بھی ہے۔“ پھر ہم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پہلی منزل پر گئے۔ ایک اپارٹمنٹ کے دروازے پر رک کر اس نے جیب سے چابی نکالی اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ”اب تم یہاں رہوگی۔“

میں نے قفل میں چابی گھما کر دروازہ کھولا اور اس عالیشان اپارٹمنٹ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”اس اپارٹمنٹ کا ایک سال کا کرایہ پیشگی ادا کیا جاچکا ہے اور تمہارے اکاؤنٹ میں بھی گزارے کے لیے ایک معقول رقم جمع کرادی گئی ہے۔“ اس نے مجھے ایک چیک بک پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”البتہ بینک کے اکاؤنٹنٹ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مہربانی کس نے کی ہے، شاید وہ سامنے آنا نہیں چاہتا۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کون ہوسکتا ہے جو مجھ پر اتنا مہربان ہے لیکن مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ فی الحال مجھے ایک ٹھکانا میسر آگیا تھا۔ میں وکیل کے جانے کے بعد خوشی اور مسرت کے عالم میں پورے اپارٹمنٹ میں گھوم کر اس کا جائزہ لیتی رہی۔ الماریاں اور درازیں کھول کر دیکھیں۔ بالکنی میں گئی جہاں خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا تو خوشی کے مارے میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہاں ایک بڑا سا سفید ٹب موجود تھا جس میں نہانے کے لیے میں سات سال سے ترس رہی تھی۔ میں نے کپڑے اتار کر ٹب میں غوطہ لگایا اور گرم پانی کا شاور کھول دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے جیل میں گزارے ہوئے ہر لمحے کی تلخ یاد بھاپ بن کر اڑ گئی ہو۔ میں اپنے آپ کو بے حد پرسکون محسوس کرنے لگی۔ اب میرے کان دروازے پر کوئی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ میں جانتی تھی کہ گمنام مہربان زیادہ دیر مجھ سے دور نہیں رہ سکتا پھر مجھے باتھ روم کے دروازے کے باہر اس کی سرگوشی سنائی دی۔ ”بے بی۔ تم کہاں ہو؟“ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس کی جانب ہے لیکن میں اپنی زبان پر اس کا نام نہیں لاسکتی کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

ادھوری تصویر

ایم اے راحت

دنیا کا دستور بھی نرالا ہے... جہاں وجود کے بجائے پرچھائی میں لوگ زندگی تلاش کرتے ہیں... جہاں عکس کی سرگوشی تو سن لیتے ہیں مگر دل کی دھڑکن کسی کو سنائی نہیں دیتی... جہاں بے جان تصویر انمول ہوتی اور جیتی جاگتی زندگی بھکارن بن کر جگہ جگہ دستک دینے پر مجبور ہو جاتی ہے... ایسے میں اگر دلوں پر قیامتیں نہ گزریں تو کیا ہو؟

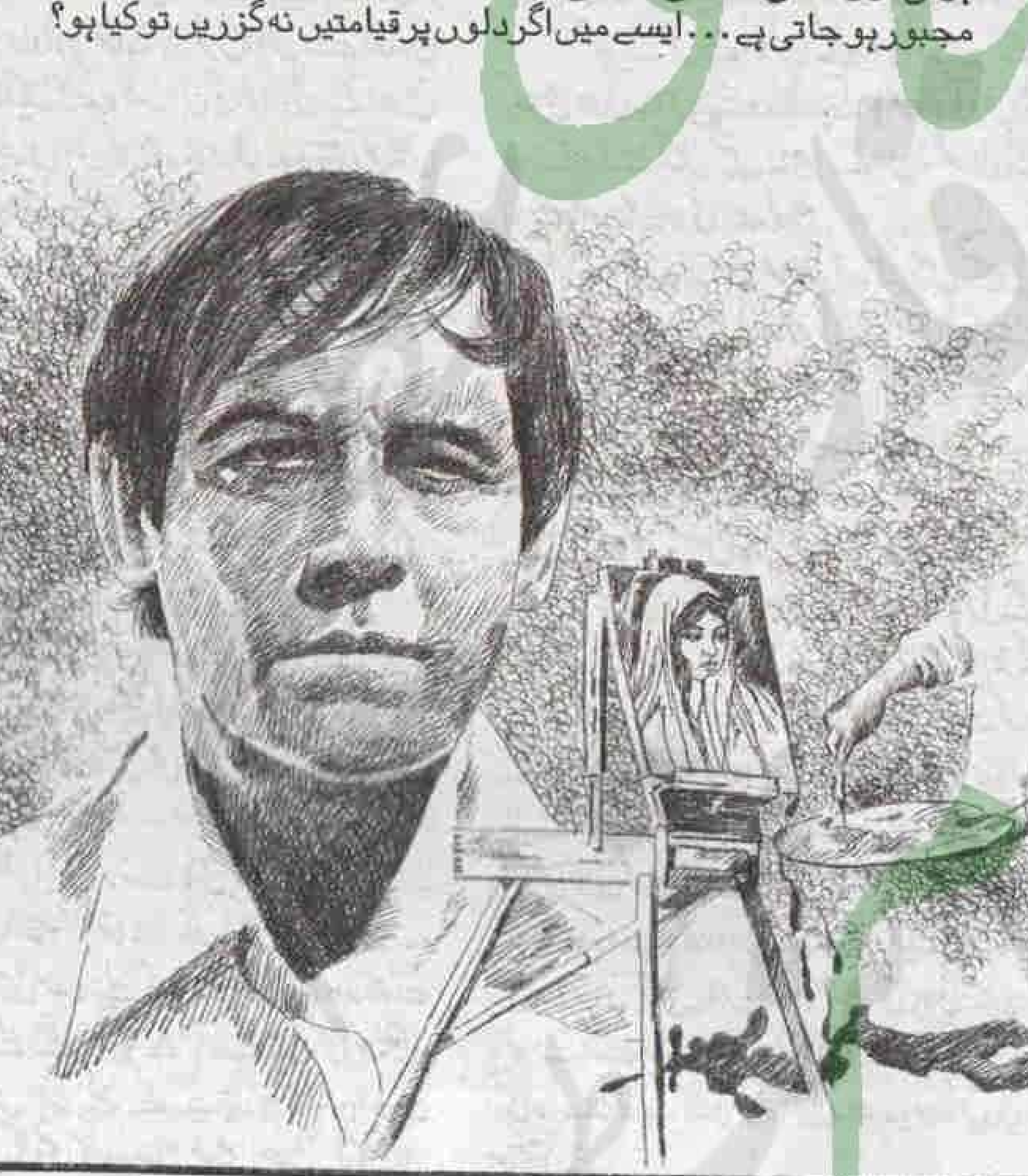

ایک باکمال مصور...... ایک ادھوری زندگی اور مکمل شاہکار

کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسا شاہکار جو ہمیشہ کی طرح ہلچل مچا دے۔ ایک بار پھر ثابت ہو جائے کہ معیز اپنے فن میں منفرد ہے۔ فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے اعلان کردیا تھا کہ وہ اس نمائش میں حصہ لے گا۔ اور جب مصوروں کی فہرست شائع ہوئی تو فن شناسوں نے رائے دے دی کہ معیز کا مقابلہ مشکل ہے۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوا تھا۔ ملک بھر کے مصور بار بار اس کے مقابل آچکے تھے لیکن اس جیسی سوچ، جدت اور اس کا سا

www.Paksociety.com

خیال نہ لاسکے۔

وہ مصورِ فطرت تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کا عکاس، رنگ اور برش اس کے ہاتھوں میں آکر گویا باتیں کرتے تھے، رنگ اپنی جگہ کا تعین خود کردیتے، لکیریں اپنی سمتیں بناتیں اور وہ ان کی مدد سے شاہکار تخلیق کرتا چلا جاتا اور جب یہ شاہکار منظرِ عام پر آتے تو فن شناس سر دھن لیتے تھے۔ دیکھنے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ملک سے باہر بھی کئی بار اس کی تصویروں کی کامیاب نمائش ہوچکی تھی۔

مرزا شمشیر بیگ ساری والے ہر چند کہ فن مصوری کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھے لیکن اکلوتے بیٹے کے شوق کو انہوں نے بھی بڑھاوا دیا تھا۔ ہر طرح اس سے تعاون کرتے۔ نورولاز کا ایک علیحدہ حصہ اس کی خواہش کے مطابق تعمیر کرایا گیا تھا۔ جہاں اس کا نگارخانہ تھا جو وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے قرب وجوار کی جگہ کو ایک مصور کی نازک خیالیوں کا نمونہ بنایا گیا تھا۔ عام کیا خاص لوگوں کی بھی اس نگارخانے تک رسائی نہیں تھی۔ نورولاز خود بھی ایک عالیشان عمارت تھی اور مرزا شمشیر بیگ کے شناسا اکثر اپنے ملکی اور غیر ملکی دوستوں کو یہاں کی سیر ضرور کراتے تھے۔ لیکن خود مرزا صاحب بھی کسی سے اس نگارخانے کو دکھانے کا وعدہ نہیں کرسکتے تھے۔ معیز شاذ و نادر ہی کسی کو نگارخانے میں داخل ہونے کی اجازت دیتا تھا۔

درحقیقت وہ ایک باکمال مصور تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور پھر رنگ اور برش کے ملاپ سے کسی بھی خیال کو زندہ کرلینا اس کے لیے کوئی مشکل امر نہیں تھا۔

اس بار بھی کلر اینڈ آرٹسٹ نامی ایک سوسائٹی نے تصاویر کی نمائش کا انعقاد کیا تھا اور ملک میں بڑے بڑے مصوروں کو مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دی تھی اور دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے۔ معیز کے بارے میں کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوگا لیکن اس کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ وہ مقابلے میں حصہ لے گا۔ پھر حصہ لینے والے مصوروں کے ناموں کی فہرست شائع ہوئی تو بہت سے چراغ بجھ گئے اور فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والے نمائش کی تاریخ کا انتظار کرنے لگے۔

معیز نے پھر ایک ذمے داری قبول کرلی تھی اور ان دنوں وہ کسی اچھوتے خیال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس کی خوبصورت کار سڑکوں، بازاروں اور ویرانوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ اس بار کس خیال کو موضوع بنائے۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسی چیز ہو جو ہلچل مچادے۔

پھر اسے اس کا خیال مل گیا۔ اس کی لمبی کار ایک سگنل پر رکی تھی۔ سامنے والی کار کی کھڑکی سے ایک بھکارن نے ہاتھ اندر ڈالا اور جواب ملنے پر مایوسی سے گردن جھکا کر آگے بڑھ گئی۔ اس بار وہ معیز کے پاس آئی تھی۔ بوسیدہ، میلا کچیلا لباس، پیوند لگا ہوا۔ مٹی سے اٹے ہوئے بال، دبلا پتلا بدن، سوکھا چہرہ لیکن حسین ترین نقوش۔ ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ جن پر اگر خشک پپڑیاں نہ جمی ہوتیں تو ان کا یہ گلابی رنگ نمایاں ہوتا۔ سفید رنگ جسے گرد اور دھوپ نے ماند کردیا تھا۔

گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی وہ معیز کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اس کے دبلے پتلے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں معیز کے سامنے پھیل گئیں۔ معیز نے ان آنکھوں کے سوالات کو پڑھا اور پھر جلدی سے بولا۔

”سگنل کے اس طرف آجاؤ۔ میں تمہیں بہت کچھ دوں گا۔ فکر مت کرو، کوئی بدتمیزی نہیں ہوگی تمہارے ساتھ۔“

اس کی آنکھوں میں شبہات ابھر آئے۔ ہاتھ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ معیز نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا اور اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ”ایسے بہت سے نوٹ مل سکتے ہیں تمہیں، اس طرف آجاؤ۔“

سگنل کی روشنی سبز ہوگئی اور اس نے کار آگے بڑھادی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بائیں طرف کا انڈیکیٹر آن کردیا تھا۔ کار کو آہستہ آہستہ اس نے بائیں سمت کرکے سڑک کے کنارے روک دیا اور عقب نما آئینے میں بھکارن کو تلاش کرنے لگا۔ وہ آئینے میں نظر نہ آئی تو اس نے کھڑکی سے گردن نکال کر پیچھے دیکھا۔

چوراہے کے دوسری جانب وہ ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اس کار کی سمت لگی ہوئی تھیں۔ معیز نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا اور انتظار کرنے لگا لیکن وہ جھجک رہی تھی۔ بے وقوف کہیں کی، اس سے زیادہ اس کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔

معیز کو جھنجلاہٹ ہونے لگی۔

ایک بار پھر اس نے جھلائے ہوئے انداز میں ہاتھ ہلایا اور وہ اس طرح آگے بڑھنے لگی جیسے اسے پیچھے سے کوئی دھکیل رہا ہو۔ نہ جانے کون سا خیال اسے دھکیل رہا تھا۔ جب وہ سڑک عبور کرنے لگی تو معیز کو کسی قدر سکون ہوا اور چند لمحات کے بعد وہ معیز کے پاس آگئی۔ وہ اب بھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

”خدا سلامت رکھے بابوجی! اللہ کے نام پر......“

”نخرے کیوں دکھا رہی تھی تو؟“ معیز بولا۔

”خدا خوش رکھے بابوجی! اللہ کے نام پر۔ جمعرات ہے۔“ اس نے پھر کہا۔ معیز کی بات کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

”اچھا جمعرات ہے آج...... اس اطلاع کا شکریہ۔ نام کیا ہے تیرا؟“

”خوشبو، بابوجی کچھ اللہ......“

”ہاں...... ہاں...... ایک ہی رٹ مت لگا۔ یہ بتا تو سو روپے روز پر کام کرے گی؟ دو سو روپے روز بھی مل سکتے ہیں، جواب دے۔“

”نہیں بابوجی، ہم عزت نہیں بیچتے۔ اللہ کے نام پر کچھ دے سکتے ہو تو دے دو۔“

”بے وقوف ہے تو...... تجھ سے عزت کون مانگ رہا ہے۔ میں مصور ہوں۔ تیری تصویر بنانا چاہتا ہوں، تصویر سمجھتی ہے؟“

”ہاں، بابوجی!“

”بس! میں تیری تصویر بناؤں گا۔ روزانہ دو گھنٹے کے لیے تجھے میرے پاس آنا پڑے گا۔ کم از کم ایک ہفتے کا یہ کام ہے، دو سو روپے روز دوں گا تجھے، بول منظور ہے؟“

”نہیں بابوجی۔ دے دو کچھ اللہ کے نام پر۔“

”جہنم میں جا۔ تیرا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ پارسا بن رہی ہے۔ دیکھ مجھ پر بھروسا کر، میں صرف تیری تصویر بناؤں گا۔ ایسی تصویر کہ تو دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔ جس جگہ تجھے آنا پڑے گا وہ میرا گھر ہے، وہاں میری ماں ہے، بہنیں ہیں، بہت سے لوگ ہیں وہاں۔ تو ایک مرتبہ میری بات مان لے۔ اگر کوئی پریشانی ہو تجھے تو آئندہ مت آنا۔“

معیز کو اس کے انکار سے سخت جھنجلاہٹ ہورہی تھی۔ وہ ایک دفعہ میں کیوں نہیں مان جاتی۔ بھکارن کچھ سوچنے لگی، پھر بولی۔

”ہم مان جائیں گے بابوجی! پر ایک بات سن لو۔“

”ہاں کہو۔“ معیز خوش ہوکر بولا۔

”ہمیں سانس کا مرض ہے اور...... اور...... دق بھی ہے۔ سردیوں میں سانس اکھڑتا ہے اور گرمیوں میں منہ سے خون آتا ہے، یہ چھوت کی بیماری ہے۔ ہمیں چھوؤ گے تو خود بھی نقصان اٹھاؤ گے۔“

”میں صرف تیری تصویر بناؤں گا اور تصویر بنانے کے لیے کسی کو چھونا نہیں پڑتا۔ سمجھی تو؟“

”ٹھیک ہے، کہاں ہے تیرا گھر؟“

”بیٹھ جا پیچھے۔ چل بیٹھ جا۔“ معیز نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن جھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھے ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

”ابے کیا گھٹیا ٹیسٹ ہے، کوئی ڈھنگ کی لونڈیا نہیں ملی تجھے؟“

معیز نے سنی ان سنی کردی اور کار آگے بڑھادی۔ دکان پر بیٹھے لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔ ”سن لیا تم نے بابوجی؟“

”ذلیل تھے، آوارہ کہیں کے؟“

”ہمارا یہ ٹھکانا تو آج چھن گیا بابوجی۔“

”کیوں؟“ وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کردیں گے۔“

”ہوں...... تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔“ معیز نے کہا اور وہ خاموشی سی بیٹھ گئی۔ سہمی سہمی سی۔ معیز نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

وہ نورولاز کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عقبی پورچ میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

”آجا......“ اس نے بھکارن کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اور ست گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیز کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگارخانے میں داخل ہوگئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابلِ حیرت، بھکارن کی زبان بند ہوگئی۔ یہ طلسم کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا، تو اس کے بدن میں خوف کی لرزش پیدا ہوگئی۔

”تم نے بولا تھا بابوجی! تمہاری ماں اور بہن......؟“ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا کرنا ہے، تجھے ان لوگوں کا۔ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور تھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگارخانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن سہمی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے

www.Paksociety.com

والے وقت کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

معیز تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ مصور تھا۔ اس کی نگاہ میں اپنا شاہکار گردش کر رہا تھا۔ وہ گہری نظروں سے بھکارن کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی ہر نگاہ سے کانپ رہی تھی۔ پھر معیز نے کیمرا سنبھال لیا اور مختلف زاویوں سے اس کی تصاویر اتارنے لگا۔ درجنوں تصاویر اتاریں اس نے بھکارن کی۔ اور مطمئن ہو گیا، آج کا کام بس اتنا ہی تھا۔ اب ان تصاویر میں سے کوئی ایک پوز منتخب کرنا تھا اور اسی اینگل سے تصویر بنانی تھی۔

''بس اتنا سا کام تھا جس سے تو مری جا رہی تھی۔ لے یہ نوٹ رکھ لے اور یہ سو روپے اوپر سے۔ کل سے تجھے دو گھنٹے یہاں روز صرف کرنا ہوں گے اور اتنے ہی روپے روزانہ ملیں گے؟''

''روزانہ؟'' بھکارن کی آواز بھنچ گئی۔

''ہاں، روزانہ...... کہاں رہتی ہو؟'' اس نے کہا اور بھکارن نے اپنا ٹھکانا بتا دیا۔ ''چل میں تجھے تیرے گھر چھوڑ آؤں۔ تیرا گھر بھی دیکھ لوں گا تاکہ اگر تو غائب ہونے کی کوشش کرے تو تجھے تیرے گھر سے پکڑ لاؤں۔'' بھکارن تیار ہو گئی۔ معیز اسے کار میں لے کر چل پڑا۔ بھکارن کا گھر ایسی جگہ تھا جہاں سے معیز کو گزرتے ہوئے ناک پر رومال رکھنا پڑا۔ واپسی پر اس نے ملازم کو ہدایت کر دی کہ کار کی سیٹ کو دھو دے اور اس کے بعد وہ اپنے نگار خانے میں داخل ہو گیا۔

تصاویر کے پرنٹس بنائے اور ان میں سے سب سے عمدہ پوز کا انتخاب کرنے لگا۔ ہر تصویر اپنا جواب آپ تھی۔ انتخاب مشکل ہو گیا، بہرحال اس نے کافی جانچ پڑتال کے بعد ایک تصویر منتخب کر لی اور اس پر کام شروع کر دیا۔

دوسرے دن وہ ہمت کر کے دوبارہ بھکارن کے مکان پر پہنچ گیا۔ بھکارن اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ آج وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس نے خود ہی کار کا عقبی دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ راستے میں اس نے کہا۔

''یہی جگہ ٹھیک رہے گی بابو جی! ہم تمہیں یہیں مل جایا کریں گے، یہیں ہمیں اتار بھی دیا کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ مختصراً بولا۔

''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے یہ بات کیوں کہی؟''

''بتا دو۔''

''لڑکیاں چھیڑ رہی تھیں۔ پوچھنے لگیں کار والا بابو کون تھا؟ کیسا ہے؟ ایسی ہی بے شرمی کی باتیں۔'' وہ شرما کر بولی۔

''ہوں......'' وہ بے خیالی کے انداز میں بولا۔

بھکارن کی باتیں اس کے لیے قابل توجہ نہیں تھیں۔ نورولاز میں پہنچ کر وہ نگار خانے میں داخل ہو گیا۔ بھکارن کو اس نے سامنے بٹھایا اور کام شروع کر دیا۔ وہ بے خودی کے عالم میں کام کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بھکارن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان نگاہوں میں پیار تھا، وارفتگی تھی۔ وہ اس تصویر کو آنکھوں میں اتار رہا تھا اور اس کے ہاتھ اس کے ذہن سے عکس لے کر اسے کینوس پر منتقل کر رہے تھے۔ لیکن بھکارن کے سوکھے مدقوق چہرے پر بار بار رنگ آ رہے تھے۔ کئی بار اس نے شرما کر نگاہیں جھکائی تھیں اور معیز کو اسے ٹوکنا پڑا تھا۔

''بابو جی!'' تیسرے دن اس نے کہا۔

''ہوں؟''

''تھک گئی ہوں۔ رات کو طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ خون تھوکا تھا میں نے۔'' اس کی آواز میں ایک مان تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا۔ جیسے وہ پریشان ہو جائے گا، بے چین ہو جائے گا خون تھوکنے والی بات سن کر۔ امید بھری نظروں سے وہ اسے دیکھنے لگی لیکن معیز کا ذہن تصویر میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے سپاٹ سے انداز میں یہ بات سنی۔

پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''آرام کر لو چند منٹ۔'' اس نے پنسل رکھ دی اور خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کب سے بیمار ہو؟''

''تین سال سے۔''

''کون...... کون ہے گھر میں؟''

''چاچا...... اور بس۔''

''باپ نہیں ہیں؟''

''نہیں مر گئے بہت دن ہوئے۔''

''چاچا کیا کرتا ہے؟''

''یہی دھندا کرتا ہے، خاندانی کام ہے ہمارا۔''

''تمہاری شادی نہیں ہوئی؟''

''نہیں جی۔'' اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

''کرو گی بھی نہیں؟'' معیز نے سرسری انداز میں پوچھا اور اس کے زرد چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ ناراض تھی وہ اس بات پر کہ وہ اس کے خون تھوکنے کی خبر سے پریشان کیوں نہیں ہوا۔ لیکن اس سوال سے اس کی ناراضی دور ہو گئی۔ اس نے شرما کر کہا۔

''مجھے کیا معلوم؟''

''ہاں۔ یہ بات تو تمہارے چاچا کو معلوم ہو گی مگر تمہیں تو ٹی بی ہے۔''

www.Paksociety.com

''ٹھیک ہو سکتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اگر علاج ہو جائے تو میں ٹھیک ہو سکتی ہوں۔''

''علاج کیوں نہیں کرایا؟''

''ہم غریب لوگ ہیں بابو جی اور علاج بہت مہنگا ہے، تین ہزار روپے مہینا کی دوائی آتی ہے۔''

''اوہ...... اچھا یہ بات تھی۔'' وہ بہ دستور سادہ سے لہجے میں بولا۔ کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا اس کے دل میں۔ کوئی احساس نہ تھا اس کے چہرے پر۔ وہ مصور تھا، اپنے فن میں کھویا ہوا۔ دوسری باتوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

''پر اب میں نے علاج شروع کرایا ہے۔ تم نے جو پیسے دیے تھے نا، اس میں سے دوا لی اور تھوڑے چاچا کو دیے۔ میں نے بتایا تھوڑی ہے انہیں تمہارے بارے میں۔''

''ہوں......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''بابو جی۔ پہلے میں ڈرتی تھی تم سے۔''

''مجھ سے...... کیوں؟''

''بس بابو جی ایک بات ہو گئی تھی، ایسی ہی۔''

''کیا؟''

''تمہاری طرح کا ایک بابو مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے گیا تھا، کہنے لگا ابا کی نیاز ہے۔ کھانا اور کپڑے دینے ہیں، مگر......'' وہاں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور بابو جی...... اس نے...... اس نے......'' وہ شرما گئی۔

اس نے اپنا پھٹا دوپٹا منہ میں ٹھونس لیا۔ انتظار کرتی رہی وہ کہ بابو کچھ بولے لیکن بابو ایک برش اٹھا کر صاف کرنے لگا۔

''پھر بابو...... میری طبیعت خراب ہو گئی، میں بیمار رہنے لگی، الٹیاں آنے لگیں مجھے، چکر آتے رہتے تھے ہر وقت۔ چاچا نے مائی بشیراں کو دکھایا اور مائی بشیراں نے چاچا کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ چاچا میرے اوپر ڈنڈا لے کر پل پڑا۔ کئی لاتیں ماریں اس نے میرے پیٹ پر۔ میں بیمار ہو گئی۔ میری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ میرے پیٹ میں بچہ آ گیا ہے۔ خدا قسم بابو میں تو حیران رہ گئی۔ کہاں سے آ گیا یہ بچہ میرے پیٹ میں۔ وہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ بچہ آیا بھی اور چلا بھی گیا۔ بس اس کے بعد مجھے دق ہو گئی۔ نہیں تو پہلے میں بہت اچھی تھی۔

''اچھا......'' وہ بولا۔ ''چل اب کام شروع کریں۔''

اور وہ جل گئی، خاموشی سے وہاں آ بیٹھی جہاں وہ چاہتا تھا۔ ایک گھنٹا ہو گیا اسے بیٹھے بیٹھے، تب وہ اچانک بول پڑی۔ ''میں تو اس دن میں تم سے ڈر رہی تھی۔''

عام عقیدے

کے برخلاف بطخوں کو برساتی موسم ذرا نہیں بھاتا بلکہ انہیں تو اس موسم سے سخت نفرت ہے۔

بارش کے سبب سے بطخوں کے لیے نقل و حرکت مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت اس وقت منظر عام پر آئی جب پرندوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے والوں نے دیکھا کہ بطخیں بارش کے دوران تالاب کے وسط میں کبھی نہیں ٹھہرتیں بلکہ کنارے پر پناہ تلاش کرتی ہیں۔

''ایں......'' معیز خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''مگر تم تو سن ہی نہیں رہے میری بات۔ نہ سنو...... میرا کیا ہے۔''

دوسری صبح جب وہ اسے لینے گیا تو وہ پہلے ہی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ معیز نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا تو تھا لیکن پہچان نہیں سکا تھا۔ یہ وہ تو نہیں تھی۔ گہرے نیلے رنگ کی شلوار، خوبصورت پرنٹڈ قمیص، میچ کرتا ہوا دوپٹا، سلیقے سے بندھے ہوئے بال۔ اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ خود اس کے پاس پہنچ گئی۔

''مجھے تلاش کر رہے ہو بابو، میں یہ کھڑی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں مسرت ناچ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی لیکن وہ پریشان ہو گیا۔

''یہ...... یہ کیا حلیہ بنا لیا تو نے؟ پاگل ہوئی ہے کیا؟'' وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''ارے خوب چکمہ دیا ہے چاچا کو۔ کیا یاد کرے گا۔ میں نے کہہ دیا کہ آج میں شہزادی کی منگنی پر جا رہی ہوں۔ خوب دانت پیسے اس نے، بڑبڑانے لگا کہ کام پر نہیں جائے گی تو کھائے گی کیا۔ پر میں نے بھی ایک نہ سنی۔ اچھی لگ رہی ہوں ناں میں؟'' وہ کار کے دروازے کی طرف بڑھی۔

''سن تو سہی، پاگل ہو گئی ہے کیا؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''تیرے وہ کپڑے کہاں ہیں؟''

''گھر میں ہیں۔''

''بیکار ہے۔ تو نے اپنی شکل بھی بگاڑ لی ہے، آج کام نہیں ہو سکتا۔''

www.Paksociety.com

"بگڑ گئی ہے میری شکل؟" وہ منہ بسور کر بولی۔

"ہاں تصویر کیسے بنے گی اس حلیے میں، دماغ خراب ہوگیا ہے تیرا۔ جاہل احمق کہیں کی...... جاو ہی کپڑے پہن کر آ۔ میں انتظار کر رہا ہوں، جلدی کر۔"

اس کے چہرے کی دیوالی ماند پڑ گئی۔ سارے چراغ بجھ گئے۔ وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر واپس لوٹ گئی۔

کافی دیر سے کام شروع ہوا تھا۔ وہ بہت اداس تھی۔ دن بھر خاموش رہی۔ شام کو پیسے لے کر خاموشی سے چلی گئی اور پھر دوسرے دن اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"کل میں نے دوا بھی نہیں لی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ دن بھر بس بھوکی رہی۔"

"ہوں......"

"آج بھی دوا نہیں لوں گی۔ سوچ لیا ہے، اچھا ہے مر جاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا اور وہ حیران رہ گئی پھر خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن اور تیسرے دن بھی کچھ نہیں کہا۔ اب وہ کچھ ویران ہوگئی تھی۔ معیز نے اس کے چہرے کی ساری ویرانیاں تصویر میں سمو دی تھیں تصویر مکمل ہوگئی۔

"بس خوشبو، تیرا کام ختم۔" اس نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہیں پنسل سے بنے ہوئے اس خاکے پر جمی ہوئی تھیں جن میں بس اب رنگ بھرنے تھے، سارے جہاں کی ویرانیوں کے رنگ۔

"میں جاؤں؟"

"ہاں...... یہ پیسے رکھ لے۔" اس نے کہا اور وہ پیسے لے کر چلی گئی۔ دوسرے دن دوپہر کو جب وہ نگار خانے سے نکلا تو ملازم ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"چھوٹے حضور! باہر وہ بھکارن کھڑی ہے۔ گیارہ بجے سے کھڑی ہے۔ پریشان تھی...... پاگل۔ پوچھنے لگی کہ صاحب بیمار تو نہیں ہوگئے۔ آج مجھے لینے نہیں آئے؟"

"اوہ۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کام ختم ہوگیا ہے۔ جاؤ اس سے کہہ دو۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اندرونی عمارت کی طرف چل پڑا۔ دوسری دوپہر ملازم نے پھر اسے بھکارن کے بارے میں اطلاع دی۔

"وہ بری طرح رو پیٹ رہی ہے چھوٹے حضور۔ آج نو بجے ہی آگئی تھی، کہہ رہی ہے، بس ایک بار اسے آپ سے ملا دوں۔" وہ ملازم کو خونخوار نگاہوں سے گھورنے لگا۔ "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"جی...... وہ سرکار......" ملازم بوکھلا گیا۔

"دوبارہ مجھے اس کے بارے میں اطلاع نہ ملے۔" اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور تیز تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔

اس کے بعد اسے اس بھکارن کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔ تصویر مکمل ہوگئی تھی۔ جس کے پس منظر، پیش منظر میں بھکارن کا چہرہ تھا۔ حسرت ویاس کی تصویر، سوکھا چہرہ، تیکھے خدوخال، پپڑائے ہوئے ہونٹ۔ پس منظر میں بھی وہی چہرہ تھا۔ سرسبز و شاداب، تروتازہ، زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور۔ وہی خدوخال تھے جو پیش منظر میں تھے لیکن پس منظر میں وہ حسن و دل کشی کا مجسمہ تھی۔ اس تصویر میں معیز نے انسان کی بے بسی پیش کی تھی۔ دل میں چھپے ہوئے، اس درد کو لکیروں میں سمو دیا تھا جو انسانیت کا درد تھا۔ افلاس، سرسبز و شاداب چہروں کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔

تصویر نمائش میں رکھی گئی اور لاکھوں نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ نقادان سر دھننے لگے۔ مقابلے میں حصہ لینے والوں کے دلوں پر پہلے ہی دن اوس پڑ گئی تھی۔ وہ خود اس تصویر کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے۔ معیز نے ایک بار پھر ایک شاہکار تخلیق کر دیا تھا۔

اخبارات نے لکھا:

نمبر ایک...... فن کار ہمیشہ سچ کہتا ہے۔ پس منظر میں معیز نے ایک افلاس زدہ بھکارن کو پیش کیا ہے جو نوجوان ہے، تیکھے خدوخال کی مالک ہے، لیکن اس کے حسین نقوش افلاس اور فاقہ کشی کی چادر کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ پس منظر میں اس کا دلکش روپ نظر آتا ہے، لیکن حقیقت برہنہ ہے۔

نمبر دو...... نور محل کا شہزادہ عظیم ہے کہ اس کی نگاہ زمین کی گہرائیوں پر رہتی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کسی گندی سی کھولی میں رہنے والے مصور کا ذہن اگر اس منظر کی عکاسی کرتا تو یہ بات اس قدر قابل ستائش نہ ہوتی لیکن فن کار دولت کی چمک سے اندھا نہیں ہوتا جس کا ثبوت پس منظر ہے۔ معیز ایک ارب پتی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ مرزا معیز بیگ، بلکہ یہ صرف معیز ہے۔ صرف ایک فنکار۔"

نمبر تین...... سچ کو پرکھ کر، خون دل میں ڈبو کر معیز نے پس منظر تخلیق کیا ہے اور ایک بار پھر اپنے فن کا لوہا منوا لیا ہے۔ اس کا حساس دل انسانیت کے دکھوں سے لبریز ہے۔ پس منظر کے عظیم فنکار کو ہمارا اسلام۔"

www.Paksociety.com

فیصلہ ہوگیا۔ متفقہ طور پر اس تصویر کو اوّل قرار دا دگیا۔ معیز کو پھولوں سے لاد دا گیا۔ الٹرا ماڈرن لڑکیوں نے اس کے ہاتھ چومے، فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والی ایک خاتون نے کہا۔

"معیز۔ کاش تمہارے ہاتھ کی پرچھائیں ہی ہمیں نصیب ہو جائے۔ کاش......" ایک شوخ و شنگ اخباری رپورٹر لڑکی نے کہا۔

"پلیز مسٹر معیز! صرف چند سوال۔ سنا ہے، آپ اخبار نویسوں کو مایوس نہیں کرتے۔"

"جی فرمائیے۔" وہ پروقار لہجے میں بولا۔

"آپ یہ خیال کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟"

"خیالات حاصل نہیں کیے جاتے۔ ان کا تعلق ذہن و دل کی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ تصویر صرف خیالی ہے یا حقیقی؟"

"یہ ایک حقیقت ہے۔"

"گویا۔ آپ نے کسی کو ماڈل بنایا ہے؟"

"ہاں......"

"کون ہے، یہ لڑکی؟ کہاں ہے؟"

"میرے وطن، میرے شہر کی گلیاں اور سڑکیں غربت و افلاس کے ایسے ماڈلوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ لڑکی خوشبو ہے، ہاں...... اس کا نام خوشبو ہے، لیکن یہ بھوک، پیاس، افلاس اور بیماری کے جہنم میں رہتی ہے۔ شہر کی کسی سڑک پر تلاش کر لیں۔ یہ آپ کو ضرور مل جائے گی۔ یہ بدنصیب ٹی بی کے مرض میں مبتلا تھی۔ زندہ رہنے کی خواہش رکھتی تھی لیکن اس کی غربت، اس کا افلاس بالآخر اسے موت کی وادیوں تک لے جائے گا۔ مجھے یقین ہے، وہ طویل عرصہ زندگی کے اس بوجھ کو گھسیٹ نہ سکے گی۔" معیز کی آواز بھرا گئی۔

"آپ نے اس کی صرف تصویر بنائی ہے معیز، یا اس کی غربت کا علاج...... آپ تو ایک دولت مند خاندان کے چشم و چراغ ہیں؟" لڑکی نے سوال کیا۔

"ایکسکیوزمی معیز، آپ اس تصویر کو فروخت کریں گے۔ سنا ہے، فن مصوری کے سب سے بڑے قدردان سیٹھ نظام شاہ اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں؟" ایک اور رپورٹر نے اسے اس نازک سوال کے جواب سے بچا لیا۔

"میں اپنا شاہکار فروخت نہیں کرتا۔" اس نے ایک شان سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

نمائش گاہ کے باہر، درمیانی سڑک کی دوسری جانب فٹ پاتھ پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سیٹھ نظام شاہ اپنی شاندار مرسڈیز کے پاس کھڑے کہہ رہے تھے۔

"کسی طرح اسے تیار کرو جیلانی صاحب! میں اس تصویر کے پچاس لاکھ سے پچھتر لاکھ تک دینے کو تیار ہوں۔ کم بخت نے کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے، کیا چیز بنائی ہے۔ جیلانی! اس کے بغیر میری آرٹ گیلری نامکمل ہے۔ تم پھر بات کرو، اس سے۔ یہ ڈرائیور کم بخت کہاں مر گیا۔ دیکھو اس بھیڑ میں تو نہیں ہے؟"

"ابھی دیکھتا ہوں، سرکار!" جیلانی آگے بڑھ گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک نوجوان بھکارن کی لاش پڑی تھی جس کے قریب ایک بوڑھا بیٹھا رو رہا تھا۔

"ہائے، خوشبو! میری بچی! اب میں کیا کروں گا اس دنیا میں جی کر۔ ہائے اس جوانی میں مرنا تھا تجھے۔ میری خوشبو! لوگو، اس کے کفن کے لیے کچھ دو۔ ارے اس بے کفن کو کفن تو دے دو۔ دوائی تو کوئی نہ دے سکا۔ اسے کفن ہی دے دو۔ ہائے میری خوشبو۔"

"کیا ہوگیا تھا اسے بابا؟" مجمع میں سے کسی نے دریافت کیا۔

دق کی مریض تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اگر علاج ہو جائے تو ٹھیک ہو سکتی ہے، مگر علاج...... ہائے میری خوشبو!" بوڑھے نے روتے ہوئے کہا۔

جیلانی نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں کھڑے ہو۔ میاں صاحب! اتنی دیر سے گاڑی کے قریب کھڑے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کیسا مجمع ہے یہ؟"

"ایک بھکارن مر گئی ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

"ارے...... اوہ...... یہ تو...... یہ تو وہی ہے، بالکل وہی تصویر والی۔" جیلانی نے بھکارن کے مردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دوڑتا، ہانپتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگا۔

"صاحب...... صاحب وہی ہے...... وہی تصویر والی...... مر گئی۔ فٹ پاتھ پر پڑی ہے۔ بالکل وہی ہے، آپ دیکھیں تو سہی۔" اور صاحب کی گھورتی ہوئی نگاہوں کو دیکھ کر وہ سنبھل گیا۔ ڈرائیور نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جیلانی! تمہاری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہوگئی ہے۔ شاید بالکل ہی سٹھیا گئے ہو۔ مجھے تصویر چاہیے...... مجھے صرف تصویر چاہیے...... تصویر والی نہیں...... کیا میں اس کی لاش کو لٹکاؤں گا آرٹ گیلری میں؟ چلو ڈرائیور...... آگے بڑھو۔"

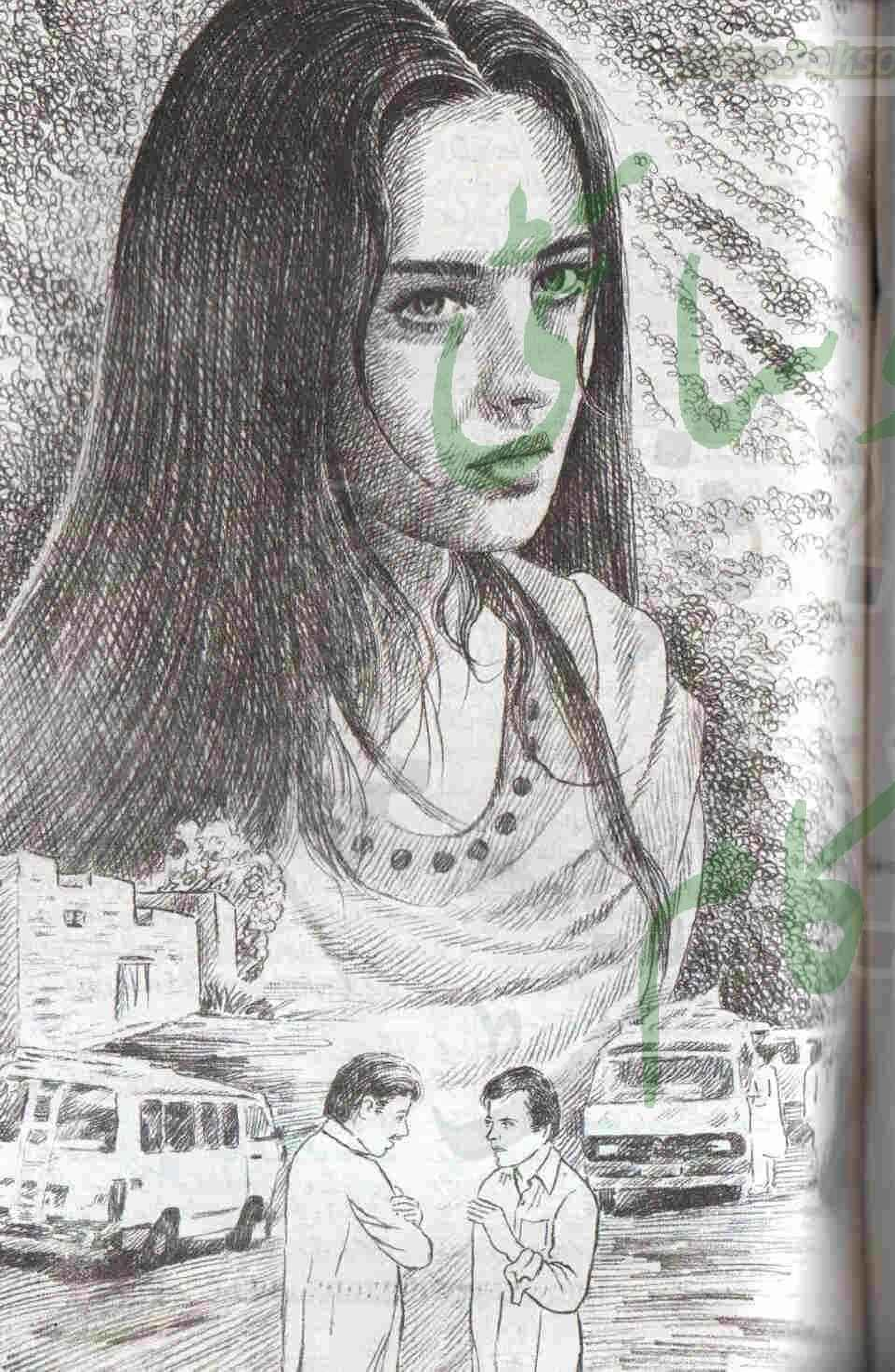

www.paksociety.com

ناصر ملک

مسافر

گل وگلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بےنوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

سفر کا آغاز آنکھ کھلنے پر ہوتا ہے اور تب تک جاری رہتا ہے جب تک آنکھ کھلی رہتی ہے۔ مسافرت کسی نہ کسی رنگ میں اپنے فطری تسلسل کے ساتھ زندگی کو گھن کی طرح چاٹتی جاتی ہے۔ بدن شکست خوردہ ہوتا جاتا ہے اور پھر ایک دن سپر ڈال کر کھوکھلا ہوجاتا ہے۔ تب مضمحل روح گردِ سفر میں اَٹ کر بے وفائی کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ ہر شخص مسافر، ہر زندگی مسافرت اور تمام تر اعمال زادِ سفر ہیں۔ میں بھی خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافرِ جذباتِ سوختہ ہوں جس نے ایک دور اُفتادہ بستی نور پور میں آنکھ کھولی۔

میرا نام شہر یار ہے۔ میری داستان معاشرے کی ناہمواریوں سے آلودہ فضا میں سانسیں لیتے ہوئے ان گنت

www.paksociety.com

لوگوں سے ہٹ کر نہیں بلکہ ملتی جلتی ہے۔ فرق شاید یہی ہے کہ ان کی کہانیاں صفحۂ قرطاس پر نہیں آسکیں جبکہ میں نے اپنے واقعات کو لفظوں کا پیراہن دے کر ہر نظرِ احساس پر آشکار کر دیا ہے۔

خوف، ہمدردی اور پسپائی...... یہ سب بہت پہلے کی باتیں ہیں، جب میں ایک بے ضرر انسان تھا اور میری خواہشیں اس نہج تک نہیں پہنچی تھیں کہ میں اپنے اور بیگانے کی پہچان بھول جاتا۔ انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں، یہ بساط تو پل دو پل کی تحریک ہوتی ہے۔ میں بھی کسی ایسے ہی لمحے کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور بے دھیانی میں اس قدر دور نکل گیا کہ میرا اپنا سایہ مجھ سے گریزاں دکھائی دینے لگا۔

سوچتا ہوں کہ اچھا ہوتا اگر میری زندگی بھی ان ہزاروں لاکھوں اشخاص کے جیسی ہوتی جو اس کائنات میں آتے ہیں اور بغیر کچھ کیے واپس چلے جاتے ہیں۔ معدودے چند لوگ انہیں جانتے ہیں اور مابعد اُن کا تذکرہ اچھے یا بُرے لفظوں میں کرتے ہیں، پھر بھول جاتے ہیں۔

کافی عرصہ پہلے میرے ماں باپ بھی کھیتوں سے رزق اُگاتے، مزدوری کرتے تھے اور ایک رات مجھے اور پروین کو دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔ میرا باپ امام دین بڑا وجیہہ اور وضع دار انسان تھا۔ قد آور، خوب رو اور خوش لباس تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ بڑے دھیمے لہجے میں مسکرا کر بات کرنے کا عادی تھا۔ اکثر ماں کی بھی ڈانٹ ڈپٹ یاد آتی ہے مگر یہ یاد نہیں آتا کہ مجھے کبھی باپ نے کسی بات پر ڈانٹا ہو یا مارا پیٹا ہو۔ پروین میری سگی بہن تھی جو مجھ سے تین سال چھوٹی تھی۔ جب ایک اندوہناک شب خون میں ماں اور باپ کا انتقال ہوا، تب وہ محض پانچ سال کی تھی۔ اگر میرے والدین کی موت طبعی ہوتی تو شاید مجھے اُن کا محبت بھرا دورانیہ یاد تک نہ رہتا۔ اَب یہ حتمی جدائی ایک کسک، ایک نہ بھلائی جانے والی چبھن بن کر ہمیشہ ذہن میں ابھرتی رہتی تھی۔

زمین و جائداد تو تھی نہیں جس پر ہم عیش سے زندگی گزارتے اس لیے ہم دونوں طفیلئے بن کر چچا چراغ دین کے گھر آ گئے۔ وہ ہمارا سگا چچا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جو ابھی چند سال کا ہی تھا۔ آبائی زمین بہ مشکل ان کا پیٹ پالتی تھی۔ جب ہم بھی مستقل بوجھ کی صورت ان کے سروں پر آن وارد ہوئے تو معاشی مشکلات دو چند ہو گئیں۔ قریبی قصبے سے ایف ایس سی کرنے کے بعد میں نے بہ امرِ مجبوری تعلیم کو خیر باد کہنا چاہا مگر چچا چراغ نے کہا ”نہیں پتر نہیں...... تیرا باپ، میرا بڑا بھائی مجھے پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانا چاہتا تھا۔ میں اُس کی بے چارگی کی موت کا مداوا تو نہیں کر سکا مگر اُس کی خواہش کو پروان ضرور چڑھا سکتا ہوں۔ تم اللہ کا نام لو اور آگے پڑھنے کے لیے شہر چلے جاؤ۔“

شہر سے اُس کی مراد ملتان شہر تھی۔ ملتان یہاں سے گھنٹا بھر کی مسافت پر واقع تھا۔ میں نے اُس کی پُراصرار خواہش پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ملتان کا قصد کیا۔ پہلی مرتبہ شہر دیکھا تھا۔ پریشان ہو گیا مگر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لینے اور ہوسٹل میں چند دن رہنے کے بعد میں نے اپنی راہیں متعین کر لی تھیں۔ اولین روز جس احساسِ کمتری سے واسطہ پڑا تھا، جلد ہی میں نے اُس سے جان چھڑا لی تھی۔ اِس کالج میں امرا اور اعلیٰ افسروں کے لڑکے زیرِ تعلیم تھے جن کی فضول خرچیاں مجھ سمیت تمام دیہاتی لڑکوں کو کمتری کے احساس میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ ابتدائی دو تین مہینوں میں ہی میں اِس ماحول میں رَچ بس گیا اور مزاحمت کرنے کے لائق ہو گیا۔

کالج کی فضا پر ایک سیاسی جماعت کی مکمل اجارہ داری قائم تھی۔ اِس جماعت کا طلبہ ونگ جو چاہتا، وہی کرتا تھا۔ کالج کی انتظامیہ اس طلبہ تنظیم کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی تھی۔ اِنہی دنوں ایک اور بڑی سیاسی جماعت نے بھی یہاں ڈیرا ڈال دیا۔ پہلے سے موجود تنظیم کے ہاتھوں ستائے ہوئے لڑکوں نے اُسے جوائن کر لیا۔ یوں کالج میں دو متحارب دھڑے بن گئے۔ مجھے بھی ایک تنظیم کی رکنیت اختیار کرنا پڑی۔ چند مہینوں میں ہی مجھے تنظیم کا ایک کلیدی عہدہ میسر آ گیا اور مجھ پر غیر نصابی سرگرمیوں کا بوجھ لد گیا۔

گاؤں کی فضا سے نکلنے والے سادہ لوح شہریار کو یہاں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ دلیرانہ فیصلوں، جذباتی مزاج اور چہرے کے بھولپن نے مجھ سے وہ کام بھی کروائے جن کے بارے میں کالج میں آنے سے قبل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کالج بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا ہی ایک اور کالج پڑوس میں موجود تھا۔ اِسی سڑک کے آخر پر یونیورسٹی کی طویل و عریض عمارت بھی سر اُٹھائے موجود تھی۔ کہنے کو یہ علاقہ تعلیمی زون کہلاتا تھا مگر عملی طور پر تمام متصلہ رہائشی کالونیوں اور سڑکوں پر طلبہ کا راج قائم تھا۔ یعنی یہ کہنا بجا تھا کہ ہوسٹ تنظیم کے واسطے سے میری دہشت چار سُو طاری تھی۔ میں نائب صدر تھا۔ عرفان مرزا گزشتہ کئی سالوں سے صدر چلا آ رہا تھا۔ اُس کا رابطہ تنظیم کے بڑوں سے رہتا تھا۔ حکم تنظیم کے ہیڈ آفس سے جاری ہو کر صدر تک پہنچتا تھا، پھر مجھ تک اور پھر تنظیم کے ہر رُکن تک پہنچتا تھا۔ ہم اسلحے کے جلو میں ہوسٹل سے آندھی اور طوفان کی طرح نکلتے اور اپنا مشن مکمل کر کے عام طالب علموں میں شامل ہو جاتے۔

جب میں بوسن روڈ پر واقع اِس عظیم الشان سرکاری تعلیم گاہ سے نکلا تو نہ صرف یہ کہ میرے ہاتھوں میں گریجویشن کی ڈگری دَبی ہوئی تھی بلکہ میں کئی اقسام کا اسلحہ استعمال کرنے میں بھی طاق ہو چکا تھا۔ میری تنظیم کے بڑوں نے بہت کوشش کی کہ میں کالج میں رہوں، ایم ایس سی پارٹ ون میں داخلہ لے لوں تاکہ ان کے تنظیمی معاملات پہلے کی طرح چلتے رہیں مگر میں اِس دلدلی زندگی سے اکتا گیا تھا۔ دو سالوں میں ہی میری طبیعت بھر گئی تھی۔ تنظیم کے بڑے، عرفان مرزا کے توسط سے مجھ تک اپنی پیشکش متعدد بار پہنچا چکے تھے کہ وہ میرے تعلیمی اخراجات برداشت کریں گے۔ چونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ میں جس راستے پر چل نکلا ہوں، اِس کی منزل اندھی کھائی، بے زمین آسمان یا آگ بھری جہنم تھی اس لیے میں یہاں سے جلد از جلد بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں تنظیم نے مجھ سے کئی ایسے کام بھی لیے تھے جن کا تعلق کسی بھی لحاظ سے کالج کے معاملات سے نہیں تھا۔

غیر نصابی سرگرمیوں میں غیر معمولی شرکت کے باوجود میں نے فرسٹ ڈویژن میں بی ایس سی کیا تھا۔ جب میں مٹھائی کا ڈبا تھامے نور پور میں داخل ہوا تو نہ جانے کتنے گھروں کے دروازے کھلے تھے، کتنی مبارکبادیں میسر آئی تھیں اور نہیں معلوم کہ کتنے چہروں سے ستائش اور داد و آفریں کے ڈونگرے برسے تھے۔ پروین، غزالہ اور فرزانہ میٹرک کر چکی تھیں اور اَب فراغت کے ایام گزار رہی تھیں۔ اُنہوں نے اپنے انداز میں مجھے ملنے والی اِس خوشی کو جشن کی صورت میں منایا تھا۔

غربت حوصلہ دیتی ہے۔ اس کے دامن میں دلاسوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ چاچا اگر امیر ہوتا اور عہدِ حاضر کی نام نہاد تہذیب میں رنگا ہوتا تو ہم دونوں بہن بھائیوں کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتا۔ شکر تھا کہ وہ غریب محنت کش تھا۔ چونکہ غربت کے ماروں کو اپنی عزت دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی عزیز ہوتی ہے اور خون کے رشتوں کی کشش مستزاد، اسی لیے اس نے ہمیں اپنی اولاد کی طرح سینے سے لگا لیا۔ چاچی بھی بھلی مانس دیہاتی عورت تھی جس نے مسکینوں کی بددعا سے ڈرتے ہوئے اپنی سلطنت میں قبول کر لیا۔ وہ اکثر اپنی ملنے جلنے والیوں سے کہا کرتی تھی ”یتیموں اور مسکینوں کی دعا تو سیدھی عرش پر جاتی ہے۔ مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ میں کہیں ان دونوں کی بددعا نہ لے بیٹھوں۔“

اسی گاؤں میں، ہماری ہمسائیگی میں، میری پھوپی رہتی تھی۔ پھوپی کبریٰ مجھ سے اور پروین سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس پیار کے عقب میں یتیم اور مسکین ہونے کی وجہ سے ہمدردی کار فرما تھی یا خونی رشتوں کی ان دیکھی کشش، یہ تفریق کرنا بہت مشکل تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی چاچی کی طرح مسکینوں کی بددعا سے ڈرتی ہو اور عرش والے کو ناراض نہ کرنا چاہتی ہو۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ میری ماں، رضیہ بی بی عرف رجو نے اپنی زندگی میں ہی اپنی نند زادی غزالہ کے ساتھ میری منگنی طے کر دی تھی۔ تب شاید مجھے اِس لفظ کے معانی کا بھی علم نہیں تھا۔ اب جبکہ میں اِس میں پنہاں مفہوم و لذت سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا، غزالہ نویں کلاس میں پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں پر منگنی کی روایتی پابندیاں عائد ہو چکی تھیں لیکن قریبی رشتہ دار اور ہمسایہ ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے بہ آسانی بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ شادی سے قبل آزادانہ ملاقاتوں کا سلسلہ مناسب نہیں مگر دل میں اک چور چھپا رہتا تھا جو ہر دم چوری پر اُکساتا رہتا تھا۔ ہم جب بھی دل کی کوئی بات کرنے لگتے، ہمارا احساس ہمیں چوکنا کر دیتا۔ کچھ آزادی اور کچھ رکاوٹیں عشق کو ہوا دیتی ہیں۔ ہم دونوں بھی اس ہوا کے دوش پر لہراتے ڈگمگاتے رفتہ رفتہ محبت کی عمیق دلدل میں گرتے چلے گئے۔

پرانے زمانے میں جنوں، پریوں کی جان کسی دور پار کے جزیرے میں سونے کے پنجرے میں بند طوطے یا مینا میں قید ہوتی تھی اور اگر اس طوطے یا مینا کی گردن مروڑ دی جاتی تھی تو وہ جن یا پری فوراً ہی ہلاک ہو جاتی۔ اسی طرح شاید میری جان بھی پروین کے وجود میں اَٹکی ہوئی تھی۔ اسے بخار آن لیتا تو میں جاں بہ لب ہو جاتا اور یوں دکھائی دیتا کہ اس کے بجائے میں بخار کی آگ میں تپ رہا ہوں۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد میں ہی اُس کا سہارا تھا، میں ہی غم گسار تھا اِس لیے وہ میرے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار پاتی تھی۔ میں اگر دو تین دنوں کے لیے کہیں چلا جاتا تو وہ رو رو کر ہلکان ہو جاتی۔ فطرتاً کم گو نہیں تھی اور اک بے نام سی خاموش مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت رقصاں رہتی۔ اسے ہنسنے کے لیے کسی خاص لطیفے کی ضرورت نہیں تھی، وہ کسی بھی لمحے، بات بے بات کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔

چچا اور چچی کا اس کے ساتھ رویہ بہت مشفقانہ اور محبت بھرا تھا۔ چچا کی دونوں بیٹیاں، فرزانہ اور شبانہ، پروین سے

www.Paksociety.com

عمر میں کچھ ہی بڑی تھیں۔ بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے پروین کو اپنی تیسری بہن اور مجھے اپنا بھائی مان لیا تھا۔ چاچا چراغ عام دیہاتیوں کی طرح بیٹیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے بیاہ کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور جب اس نے پروین کو دیکھا تو اس کی نیم خمیدہ کمر میں ایک بل اور بڑھ گیا۔ دو سے تین ہو گئیں تو فکر دو چند ہو گئی۔

گاؤں کے نمبر دار حیات خان کا بیٹا میرا دوست تھا۔ چونکہ میرے پاس ایف ایس سی کر لینے کے بعد کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں سارا دن اس کے ساتھ گھومتا پھرتا اور اس کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ یہ بڑے لوگ بہت سیانے ہوتے ہیں۔ امیر نواز کی میرے ساتھ دوستی بھی شاید اس وجہ سے تھی کہ میں اس کے عام نوعیت کام کاج کر دیا کرتا تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اس کے والد حیات خان کا ایک طرح سے منشی بھی تھا۔

میرا دوسرا دوست خالد عرف کھالا تھا جو گاؤں کی اکلوتی ویگن کا ڈرائیور تھا۔ یہ کھٹارا سی ویگن حیات خان کی تھی جس پر کھالا ماہانہ تنخواہ پر کام کرتا تھا۔ میں بھی کبھار اس کے ساتھ دس کلومیٹر کی دوری پر واقع بستی قریشی موڑ تک چلا جاتا اور وہاں گھوم پھر کر واپس آ جاتا تھا۔ کھالے کی دوستی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے تھوڑے ہی عرصے میں ڈرائیونگ سیکھ لی۔ میری کارکردگی سے مطمئن ہو کر وہ اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ میرا لائسنس بن جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہنر انسان کے کبھی نہ کبھی کام آ جاتا ہے۔ لائسنس ڈرائیونگ کے ہنر کا دستاویزی ثبوت تھا۔ وہ کہتا تھا ''لائسنس کے بغیر شہر میں ڈرائیوری کی نوکری نہیں مل سکتی۔ اسٹیرنگ وہیل پر تمہارا ہاتھ ٹک گیا ہے، اب کوشش کرو، چار پیسے خرچ کرو اور اپنا لائسنس بنوالو۔''

مجھے اس کا مشورہ پسند آیا۔ سرِ دست میرا نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس صلاحیت سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

کھالا میرا ہم عمر، میٹرک تک ہم جماعت اور لنگوٹیا تھا۔ جان وجثے میں مجھ سے برتر ہونے کے باوصف مجھ سے دَب کر رہتا تھا۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ وہ پڑھائی میں نالائق واقع ہوا تھا جبکہ میں ہونہار طالب علم مانا جاتا تھا۔ اُس کی شرارتوں، پٹائی، چھوٹی موٹی چوریوں اور اسکول سے غیر حاضری سمیت اَن گنت عیوب پر پردہ اسی صورت میں ہی پڑ ا رہ سکتا تھا کہ وہ مجھ سے بنا کر رکھے۔

اُس نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی اور حیات خان کی ویگن پر بہ طور کنڈیکٹر ملازم ہو گیا تھا۔ ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی سیکھتا رہا۔ جب اُس کے استاد کو ملتان ڈیرا رُوٹ پر جی ٹی ایس کے کوسٹر پر نوکری ملی، کھالے کو ویگن کی ڈرائیونگ عنایت ہو گئی۔ وہ عام سے خدوخال کا چالاک اور زیرک انسان تھا۔ جھوٹ بڑے دھڑلے سے بولتا، جمعہ کے جمعہ سستی شراب ''کچی'' پیتا اور اپنے پیشے کو اپنے ہر عمل و فعل سے آشکار کرتا تھا۔ اُس کا باپ گاؤں کا واحد لوہار تھا۔ اللہ بخش عرف بخشو لوہار تمام دن اپنے گھر سے ملحقہ دُکان پر درانتیاں، دَہولے، کلہاڑے اور تر ینگل بنایا کرتا تھا۔ اُس کے بنائے ہوئے اوزار مقامی سطح پر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جایا کرتے تھے۔ اپنے بیچے ہوئے آلات کی مرمت کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ کھالا اپنے باپ کی دُکان کے پہلو میں پختہ سڑک کے کنارے پر کھلے میدان میں ویگن کھڑی کرتا تھا۔ یہ ایک طرح کا بستی کا ویگن اسٹینڈ قرار پا چکا تھا۔ ویگن بھرنے تک سواریاں اپنے سامان سمیت بخشو لوہار کے سرکنڈوں کے چھپر تلے بیٹھی رہتی تھیں۔

جب سواریوں کی مطلوبہ تعداد پوری ہو جاتی، اللہ بخش گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوتا، کمر پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے دکان اور گھر کے درمیانی دروازے میں آن کھڑا ہوتا۔ دونوں بانہیں دروازے کی اوپر والی چوکھٹ پر ٹکا کر کھالے کو زوردار آواز دیتا اور کہتا ''چل اوئے کھالیا! گڈی اُڈّے وِچوں کڈھ کھن......''

کھالا ایک شانِ بے نیازی سے اپنی مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے برآمد ہوتا اور سواریوں پر طائرانہ نگاہ ڈال کر اپنی سیٹ پر براجمان ہو کر ہارن بجانے لگتا۔ اُس کا خالہ زاد بھائی، عبدالرشید عرف شیدو، فٹافٹ سواریوں کو بٹھانے لگتا۔ سامان ویگن کی چھت پر رکھواتا۔ وہ کنڈیکٹر تھا۔ گہری سنولائی رنگت والا شیدو چاق و چوبند، چست اور خاصا پھرتیلا واقع ہوا تھا۔ بہ مشکل بارہ تیرہ کے سن میں ہو گا۔

کچھ لوگ ویگن اسٹینڈ کے عین مشرق میں واقع حیات خان کے بڑے سے مہمان خانے کے برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ کر کھالے کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ وہ بھی اپنا اپنا سامان اُٹھائے لپک کر آ جاتے۔ خواتین کو ویگن کی سیٹوں پر بٹھا دیا جاتا جبکہ مرد ویگن کے عقبی حصے میں کھڑے ہو جاتے۔ کچھ چھت پر چڑھ جاتے اور باہر کی سمت ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتے۔ میں نے کبھی لوگوں کو سیٹ کے حصول کے لیے آپس لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا بلکہ ایک خاموش اور خودکار معاہدہ بستی والوں کے بیچ طے پا چکا تھا۔ یہ شاید علاقے

کی واحد ٹرانسپورٹ سروس تھی جو سواریوں کو بہ وقتِ ضرورت 'اُدھار' کی شاندار سہولت بھی فراہم کرتی تھی۔

میرا تیسرا دوست ڈاکٹر منور علی شاہ تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کے چھوٹے سرکاری اسپتال میں تعینات تھا۔ میں اس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ علاقے کے ہر بڑے چھوٹے کی طرح میں بھی اُسے 'شاہ جی' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس سے میری شناسائی کی ابتدا تب ہوئی تھی جب میں گندم کی کٹائی کے موسم میں بیمار ہو کر اس کے پاس گیا تھا۔

وہ درویش منش ہونے کے باوجود انتہائی آدم بیزار شخص واقع ہوا تھا۔ کسی کے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا مگر مریضوں کو ضرورت پڑنے پر اپنے خون کا عطیہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس کی شخصیت میں بڑا تضاد تھا۔ اس نے کبھی اس بارے میں کوئی بات کھل کر نہیں بتائی تھی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اسے کرید نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ نہ صرف مجھ سے عمر میں بلکہ تعلیم، مرتبہ الغرض ہر لحاظ سے بڑا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ شادی نہیں کی تھی، اس لیے بال بچوں کے جھنجٹ سے دور تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے میرے استفسار پر کہا تھا۔ ''میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا، مجھے عورتوں سے نفرت ہے۔''

مجھے اچنبھا ہوا، زیرِ لب بڑبڑایا ''بھلا عورت سے بھی کسی کو نفرت ہو سکتی ہے؟''

میں اس کے چھوٹے موٹے گھریلو کام کر دیا کرتا تھا۔ وہ خود کھانا پکایا کرتا تھا۔ ایسے میں اگر میں اُس کی کوٹھی پر ہوتا تو اس کی مدد کر دیتا۔ اُس کی سرکاری کوٹھی کی ہفتہ وار صفائی بھی کر دیا کرتا۔ کوٹھی سے ملحقہ چھوٹا سا لان مستقلاً میرے سپرد تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ مجھے پیسے دینا چاہے تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں پیسوں کے لالچ میں کام نہیں کرتا۔ وہ اس بات پر بہت پریشان ہوا تھا۔ بڑا افسر تھا مگر اُس میں افسروں والی کوئی بات میں نے نہ دیکھی تھی۔

دیہاتیوں کے پاس وقت وافر مقدار میں ہوتا ہے۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد ہم گھر والے اکٹھے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ ایسے میں کوئی موضوع بھی ہاتھ لگ جاتا جس پر دل کھول کر بحث کی جاتی۔ اسلم کریانہ والے کے مویشی کیوں بیمار رہتے ہیں، جمیل ڈونہ کے بکروں کا بڑا ریٹ لگا ہے، ہمسائے بدر دین کے بیٹے صادق کو نمبر دار نے پانی چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو اس نے کیسے جرمانہ دے کر جان چھڑائی، وغیرہ۔ میں البتہ کبھی کبھار ڈاکٹر منور علی شاہ کے پاس چلا جاتا جہاں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن کھانے کے بعد چاچا چراغ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''پتر! بات دراصل یہ ہے کہ تینوں لڑکیاں سفیدے کے بوٹے کی طرح بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان کی شادیوں پر سیکڑوں نہیں، ہزاروں روپے خرچ ہوں گے۔ ان کا جہیز بھی ابھی بنانا ہے اور تم جانتے ہو کہ ہماری زمین بہ مشکل ہمیں پال رہی ہے۔ روٹی مشکل سے بنتی ہے، کپڑا لتّا کہاں سے بنے گا، تروڑ (زیور) اور بھانڈے ٹنڈر (برتن) کا کیا ہو گا۔ میں اکیلا کام کرتا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ صرف میرے کرنے سے شادی کے لیے چار پیسے اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ پانچ سات سال اور بھی کر لوں گا۔ اتنا عرصہ تم شہر میں جا کر کام کر سکتے ہو اور چار ٹکے جوڑ سکتے ہو۔ شہر میں محنت مزدوری کی کمی نہیں۔ تم تو پڑھے لکھے بھی ہو، تمہیں آسانی سے کوئی، لکھائی پڑھائی والا کام مل جائے گا۔''

چاچا درست کہتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا ''تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تم میرے جوان جہان پتر ہو۔ اولاد کو کوئی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا مگر میں کیا کروں۔ تین بیٹیوں کا باپ ہوں جنہیں اُن کے اصل گھر بھیجنا میری ذمے داری ہے۔ شہرے! یہ ذمے داری تمہارے کندھوں پر بھی ہے۔ زیادہ نہ سہی، تھوڑا ہی سہی، کچھ نہ کچھ تو گھر میں آئے گا ناں......''

مجھے شش و پنج میں دیکھ کر وہ رَسان سے بولا۔ ''پتر! کیا تم اپنی بہن کی وجہ سے کہیں جانا نہیں چاہتے ہو؟''

میں نے آہستگی سے کہا۔ ''چاچا! میں کچھ کرتا ہوں۔''

''نور پور میں؟''

''ہاں......'' میں نے نیم دلانہ انداز میں کہا۔ ''یا نزدیک میں۔''

''کوئی دُکان ہی بنا لو قریشی موڑ پر...... ہیں؟''

''اتنا پیسا کہاں سے آئے گا چاچا؟'' میں نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا۔

''میں حیات خان سے بات کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے، وہ مجھے اُدھار دیدے جو تھوڑا تھوڑا کر کے چکا دیا جائے۔''

''چاچا! دکان کے لیے کم از کم چالیس پچاس ہزار رُوپے چاہئیں۔''

''میں جانتا ہوں پتر......''

''خان نہیں دے گا۔'' میں نے اپنے تئیں فیصلہ سنایا۔

''کوشش کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بہر حال پتر! کچھ نہ کچھ کرنے کی سوچو...... ایسے کام نہیں

www.Paksociety.com

چلتا۔'' چاچا چراغ نے گفتگو کی بساط سمیٹتے ہوئے کہا اور حسبِ عادت مجھے میرے حال پر چھوڑ گیا۔

فطرت دکھائی نہیں دیتی، مظاہر بنا کر اپنا آپ سُجھاتی ہے۔ چڑیاں جب انڈے دینے پر آتی ہیں تو ان کے لاشعور میں یہ بات آپوں آپ سما جاتی ہے کہ انڈوں اور ان سے نکلنے والے بچوں کے لیے نرم اور حدت انگیز جگہ کا ہونا ضروری ہے اور وہ ایک لگن کے ساتھ تنکے اکٹھے کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ ثمر رُت کے آنے تک وہ اپنا آشیانہ تیار کر چکی ہوتی ہیں۔ یہی حال انسانوں کا ہوتا ہے۔ آنول کٹتی ہے تو نوزائیدہ بچے کو عرفان مل جاتا ہے کہ اب اسے خوراک اس نالی کے ذریعے نہیں، منہ کے ذریعے ملے گی۔ ساتھ ہی چوسنے کا ہنر مل جاتا ہے۔ ماں کے سینے سے دودھ کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور بچہ اپنے لب ان سوتوں پر رکھ دیتا ہے۔ جب یہ نوری دھارے اُس کی بھوک مٹانے کے لیے ناکافی ہو جاتے ہیں تو وہ فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر پہلی بے وفائی کا ارتکاب کرتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے۔ تب ذائقوں کا اِک جہان اُس پر کھل جاتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو ماں یا باپ بننا چاہتا ہے اور اس لگن میں سب کچھ کرتا جاتا ہے۔ صدیوں سے اس عمل کو دُہرائے جانے کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا اور نہ ہی کبھی آئے گا۔ تن ڈھانپنے اور پیٹ پالنے کا چکر بھی فطری تقاضوں پر مبنی ہے۔

چاچے کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ چاچا کیا، ہر کوئی کہتا ہے کہ گھر کے سبھی افراد نہ کمائیں تو گزر بسر نہیں ہوتی۔ شہروں میں جوان لڑکیاں کمانے کے لیے روزانہ گھر سے دفتر یا فیکٹری کے لیے نکلتی ہیں۔ میں تو پھر مرد تھا۔ مرد بھی وہ جس پر ایک نہیں تین بہنوں کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے مگر ہم غریبوں کے ہاں بیٹی کسی کڑے امتحان کی خبر سے کم نہیں ہوتی۔ مجھے چاچے کی بات سے کوئی اختلاف نہ تھا مگر شہر میں جا کر کام کرنا بڑا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان بنانے کے لیے سرمایا نہیں تھا۔ مانگے تانگے سے کام چلتا تو ہر کوئی چلا لیتا۔

انہی سوچوں میں غلطاں ڈاکٹر شاہ جی کے پاس چلا گیا۔ آج پی ٹی وی پر ہفتہ وار نشر ہونے والے ایک ڈرامے کی آخری قسط تھی جسے میں مس نہیں کر سکتا تھا۔ ڈراما شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ نے مجھے کہا۔ ''شہر یار! چائے کا موڈ ہے، بنا لو یار۔ بڑا جی چاہ رہا ہے مگر سستی کی وجہ سے اٹھا نہیں جا رہا۔''

گاؤں میں وہ واحد شخص تھا جو مجھے میرے پورے نام سے پکارتا تھا۔ مجھے عجیب لگتا تھا تبھی میں نے ایک مرتبہ اُس سے دریافت کیا تھا۔ ''شاہ جی! آپ مجھے پورے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟''

وہ حیرت سے بولا۔ ''تو اور کیا کروں؟''

''سبھی مجھے 'شہرا' یا 'شیرا' کہتے ہیں، آپ بھی اسی نام......''

اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور کہا۔ ''نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ سلجھی ہوئی کمیونٹی میں آدھا، نامکمل یا بگڑا ہوا نام لینا بدتہذیبی اور بدکلامی میں شمار کیا جاتا ہے۔''

اپنے غیر معمولی درشت رویے کے باوجود وہ اپنے ہاں آنے والے غریب مریضوں کو بھی ایسے ہی احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

میں نے کچن کا رخ کیا۔ دو کپ چائے بنائی اور ٹرے میں رکھ کر ڈاکٹر کے کمرے میں آ گیا۔

ہم ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ بجلی چلی گئی۔ چارسُو پُرسکوت اندھیرا طاری ہو گیا۔ گاؤں کی فضا جب اندھیرا پکڑتی ہے تو اتنی پُرسکون ہو جاتی ہے کہ ساگر کی بے موج نیند کا سا گماں اُبھرنے لگتا ہے۔ کہیں کوئی مینڈک یا جھینگر ٹرّاتا ہے تو کئی فرلانگ تک اُس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہم نے ڈرامے کی وجہ سے بجلی کے آنے کا کچھ دیر انتظار کیا مگر نہ آئی تو ڈاکٹر نے کہا۔ ''چل کر باہر بیٹھتے ہیں، کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

میں نے چارپائی نکال کر صحن میں بچھائی۔ وہ سرہانے کی جانب جبکہ میں پائنتی پر بیٹھ گیا۔ اچانک سیاہ بدلی کی اوٹ سے چاند جھانکنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پوری روشنی سمیت آشکار ہو گیا۔ سفید ریشمی چادر جیسی چاندنی میں ڈاکٹر منور کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بے حد خوبرو انسان تھا۔ میں سوچنے لگا کہ ایسے آدمی نے اب تک شادی کیوں نہیں کی حالانکہ وہ جس لڑکی کو چاہتا، اپنی نوکری اور شخصی جاذبیت کی بدولت حاصل کر سکتا تھا۔ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا ہونے کے باوجود وہ پُرکشش تھا اور چاہتا تو اب بھی اُسے خوبصورت بیوی مل سکتی تھی۔

اس نے میرے انہماک کو تاڑ لیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں چونک گیا۔ ''شاہ جی! ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور......''

''آپ کا گھر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے عجیب نگاہوں سے مجھے گھورا۔

میں گڑبڑا گیا۔ ''میرا کہنے کا مقصد ہے کہ آپ گھر کیوں نہیں جاتے؟ چھٹیاں بھی یہیں گزارتے ہیں اور عیدیں بھی، کیا آپ اپنے گھر والوں سے ناراض ہیں؟''

آنکھوں کا مستقل الاؤ سمٹ گیا، طنزیہ مسکراہٹ آہستگی سے افسردگی میں تبدیل ہو گئی اور ماحول میں نامانوس خاموشی چھا گئی۔ وہ ہونٹ بھینچے بہت دیر تک بیٹھا رہا، پھر بولا۔ ''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔''

''گھر والے؟'' میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''جب گھر ہی نہیں تو گھر والا کون ہو گا؟''

میں نے اچنبھے سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے؟''

وہ مجبوراً مسکرایا۔ ''تمہارے ماں باپ فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ نہ کرے تمہاری بہن بھی فوت ہو جائے تو تم کیا کہو گے؟...... یہی کہو گے ناں کہ تمہارے گھر والے نہیں ہیں؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''چاچا چراغ، چاچی، فرزانہ اور شانو تو ہوں گے ناں!''

اُس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رقصاں ہو گئی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''نہیں شہر یار! ماں جائے بھی اپنے نہیں ہوتے، دل میں بسنے والے بھی اپنے نہیں ہوتے، تم رشتہ داروں کی بات کرتے ہو۔ یہ جھوٹے رشتے ہیں۔ یہی لوگ تو منافقت کا کاری وار کرتے ہیں۔ جیتے جی مارنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔''

میں نے اختلاف کیا۔ ''نہیں شاہ جی! میرے رشتہ دار ایسے نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے اور میری بہن سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''محض دھوکا، بہلاوا...... حقیقت میں کچھ نہیں۔'' اُس کی آواز بڑبڑاہٹ میں تحلیل ہو کر گم ہو گئی۔

میں نے یہ سوچ کر کہ اس کے ماں باپ فوت ہو گئے ہوں گے اور رشتہ داروں نے کسی موڑ پر اُسے بے وفائی یا بے اعتنائی کا دُکھ دیا ہو گا، دکھ سے کہا۔ ''پھر آپ شادی ہی کر لیتے!''

وہ بوریت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آج تم کیسی باتیں لے بیٹھے ہو شہر یار! فضول تذکرہ چھوڑو، کوئی اچھی سی بات کرو۔''

میں خاموش ہو گیا۔ عادتاً چارپائی کے بان کے ساتھ الجھتا رہا اور ڈاکٹر شاہ جی کے بارے میں سوچتا رہا۔

ایک طویل توقف کے بعد وہ ازخود گویا ہوا۔ ''ہر انسان کی طرح میں بھی اس دنیا میں تنہا آیا تھا مگر میرا دُکھ اِس لحاظ

MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074
معقول فیس میں ہُنرمند بنیں
بذریعہ ڈاک
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھیے
ہنر سیکھیے روزگار لیجیے
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
اگر آپ مندرجہ ذیل کورسز کے علاوہ کسی بھی فیلڈ میں تجربہ رکھتے ہوں اور اس کا سرٹیفکیٹ آپ کے پاس موجود نہیں ہے، سرٹیفکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی ترقی کی راہ میں یا ملازمت میں رکاوٹ ہو رہی ہے۔ ہم آپ کا ٹیسٹ لے کر سرٹیفکیٹ جاری کریں گے، نیچے دیے ہوئے ایڈریس پر رابطہ کر کے تفصیلات منگائیں
ڈینٹل ٹیکنیشن ۔ لیبارٹری ٹیکنیشن ۔ کشیدہ کاری ۔ لیڈیز ٹیلرنگ ۔ حکمت ۔ ڈسپنسر ۔ ایکوپنکچر ۔ زرعی کیڑے مار ۔ جینٹس ٹیلرنگ ۔ میڈیکل اسسٹنٹ ۔ اے سی ٹیکنیشن ۔ U.P.S ٹیکنیشن
علاج نبوی ۔ ڈریس ڈیزائنر ۔ ہومیو تھراپی ۔ ہڈ و انگری ۔ معالج حیوانات ۔ سلمنگ ۔ بیلی پلاننگ ۔ کیمیکل ۔ عینک سازی ۔ شمسی توانائی ۔ بزنس مینجمنٹ
یوگا ۔ انٹیریئر ڈیکوریشن ۔ ایریبک ۔ بیوٹی پارلر ۔ ایئر ٹکٹنگ ۔ مہر سازی ۔ کوکنگ ۔ سروئیر ۔ کمپیوٹر ۔ کمپیوٹر ہارڈ ویئر
ہیلتھ ورکر ۔ ابتدائی طبی امداد ۔ ہوٹل مینجمنٹ ۔ شارٹ ہینڈ ۔ آٹو الیکٹریشن ۔ جنریٹر ٹیکنیشن ۔ اردو عربی خطاطی
فارمیسی ۔ ہومیو پیتھک کورس ۔ ایکوریم ۔ انگلش لینگویج ۔ فلاور میکنگ ۔ ویلڈنگ ۔ الٹراساؤنڈ ۔ فنِ مصوری ۔ میجک
ایکسرے ٹیکنیشن ۔ فزیو تھراپی ۔ ڈرائنگ پینٹنگ ۔ آٹو سروسنگ ۔ کچن گارڈننگ ۔ جیولری میکنگ ۔ بلڈنگ سپروائزر ۔ فش فارمنگ ۔ کورین لینگویج ۔ موبائل فون ریپیئرنگ ۔ فائر فائٹنگ
باڈی بلڈنگ ۔ خرادکا ہنر ۔ اسٹیل فکسنگ ۔ جدید مرغبانی ۔ باغبانی ۔ سیٹ ڈیزائنر ۔ فیٹ ورکنگ ۔ مونٹیسوری ٹیچنگ ۔ موٹر سائیکل ورکنگ ۔ چائلڈ کیئر کورس ۔ ٹیلی کمیونیکیشن
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

www.Paksociety.com

سے جداگانہ رہا کہ میں اپنی مکمل تنہائی کی گود میں ہی پلا بڑھا۔ مجھے کسی کے ساتھ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کبھی اپنی نسل بڑھانے کی تمنا رہی ہے۔ آج میں تنہا ہوں تو خوش ہوں، جب کچھ عرصہ کے لیے تنہا نہیں تھا تو میں نے بہت سارے دکھ دیکھے تھے۔"

اس کا لہجہ اچانک غیر معمولی حد تک سخت ہو گیا اور پھر مجھے جرأت نہ ہوئی کہ بات کو آگے بڑھاتا۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک کے لیے خاموشی عود کر آئی۔ میں کبھی کبھی نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیتا۔ وہ میرے اور آسمان پر چمکتے چاند کے درمیان حائل تھا۔ اس کے وجود کے گرد روشنی کا سفید ہالا قائم تھا جو اس کے وجود کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ بڑا پراسرار اور عجیب لگ رہا تھا۔

آخر میں نے ہی اس اعصاب شکن سکوت کو توڑا اور آہستگی سے کہا۔ "شاہ جی! میرا جی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں۔ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ بہت سارا پڑھوں، اتنا، جتنا آپ نے پڑھ رکھا ہے مگر کیا کروں؟ چاچا کہتا ہے کہ میں شہر چلا جاؤں یا کوئی کام کروں۔ یہاں ایسا کوئی کام دکھائی نہیں دیتا۔ شہر سے دل ڈرتا ہے۔ آپ کہیں، کیا کروں؟"

"مجھے تمہاری یا کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے انسانوں کو دودھ پلایا اور اپنی رگوں میں زہر اُترتا محسوس کیا۔ اُن خوش نصیبوں کو نہیں دیکھ پایا جن کے ہاتھوں دودھ پی کر جوان ہونے والے سانپ اپنی زہر چکاں سرشت بھول جاتے ہیں۔ تم وہی کرو جو تمہارا چاچا کہتا ہے۔ وہ تمہارے بارے میں واقعی فکرمند ہے۔ پرسوں مجھ سے بھی کہہ رہا تھا کہ شہریار کو کہیں جا کر کام وام کرنا چاہیے تاکہ گاڑی چل سکے۔"

کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ "دیکھو ناں! وہ بوڑھا آدمی ہے۔ آج نہیں تو کل اس کے ہاتھ پیر جواب دے جائیں گے اور تمہیں گھر کا بوجھ اُٹھانا پڑ جائے گا۔ آج اُٹھا لو گے تو کل تنگی محسوس نہیں ہوگی۔ کیا تمہارا کوئی جاننے والا شہر میں نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کوئی کام وام جانتے ہو؟"

"میں کوئی کام نہیں جانتا مگر......" میں نے سوچ کر کہا۔ "کھالے سے ڈرائیونگ سیکھ رکھی ہے پر ابھی لائسنس نہیں بنا۔"

"ہوں......" اس نے کہا اور کچھ دیر کے لیے سوچ میں گم ہو گیا۔ ناخن سے چارپائی کی چوبی بانہہ کو کھرچنے لگا۔

"میرا ایک جاننے والا ہے شہر میں......" وہ خودکلامی کے سے انداز میں بولا پھر چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اپنے سینے کے گھنیرے سفید و سیاہ کھچڑی بالوں میں کھجلی کرنے کے سے انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "تم ایسا کرو کہ اس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمہاری ہر ممکن مدد کرے گا۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "کس کے پاس؟"

"اُس کے پاس...... وہ، ایک ہے...... میرا دوست ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔" اُس کا بیان بے ربطگی کا شکار تھا۔

"کہاں......؟ ملتان میں؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں، لاہور میں......" اس نے کہا۔

میں قدرے مایوس ہو گیا، بولا۔ "نہیں شاہ جی! پروین اکیلی رہ جائے گی۔ رو رو کر پاگل ہو جائے گی۔"

وہ میرا شانہ تھپکتے ہوئے بولا۔ "جب کام کرنے اور کمانے کے لیے گھر سے نکلنا ہے تو پھر قریشی موڑ کیا اور لاہور کیا؟ وہاں تم سُوکھے رہو گے۔ بڑا شہر ہے، زیادہ مزدوری ملے گی اور کام بھی آسانی سے مل جائے گا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "نہیں شاہ جی!"

"تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"مجھے اگر چالیس پچاس ہزار رُوپے مل جائیں تو میں قریشی موڑ میں دکان کھول لوں گا تاکہ میں روزانہ شام کو گھر آ جایا کروں۔"

"اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟"

شاہ جی کے اِس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا تبھی خاموش ہو گیا۔ ایک پل کو سہارا اُبھرا کہ اپنے مال مویشی بیچ دوں...... ساتھ ہی اِس ناتواں سہارے پر سے ہاتھ پھسل گیا۔ مال مویشی بیچ دیے تو پھر دودھ کہاں سے آئے گا؟ گھر کی گزربسر کہاں سے ہوگی؟ اُس کے علاوہ کچھ بیچنے کو نہیں تھا۔ ماں کے چھوڑے ہوئے چند گہنے تھے جنہیں بیچنے کی بات سن کر پروین کمر کے بل جا گرے گی اور کبھی نہیں اُٹھے گی۔

شاہ جی نے اپنا سوال دُہرایا۔ "شہریار! تم نے بتایا نہیں، اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟"

"چاچا کہہ رہا تھا کہ وہ حیات خان سے اُدھار مانگے گا۔"

"مجھے حیات خان سے توقع نہیں ہے۔"

توقع تو مجھے بھی نہیں تھی، تبھی کہا۔ "شاہ جی! آپ کوئی راہ دکھائیں ناں!"

"سوچوں گا، پھر کچھ کہہ سکوں گا!"

اس کے بعد ہم کافی دیر تک بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں

کرتے رہے۔ گیارہ کے لگ بھگ اسے نیند ستانے لگی تو میں نے گھر کا راستہ لیا۔ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس کے آنے یا نہ آنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ہمارے گاؤں میں سوائے ہماری برادری کے چند بڑے گھروں، جیت شاہ کے مزار اور سرکاری اسپتال کے، کسی گھر تک بجلی نہیں پہنچی تھی۔ بدقسمتی سے یہ سرکاری اُجالے ہماری دسترس سے بھی کہیں دُور تھے۔ سردار حیدر خان نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر گھر گھر میں بجلی پہنچانے کا وعدہ کیا تھا، بڑھ چڑھ کر تقریریں کی تھیں مگر ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب بھی تور پور آتا، لوگ وعدے کی تکمیل کا مؤدبانہ تقاضا کرتے مگر ابھی تک وعدہ وفا نہیں ہوا تھا۔

کھالا حسب معمول شام کو مجھ سے ملنے کے لیے آیا تو خاصا پُرجوش دکھائی دیا۔ میں نے پوچھا "خیر تو ہے کھالے؟ آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔"

اُس نے میرے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔ بولا "ہاں یار! سمجھو، لاٹری نکل آئی ہے۔"

ہم دونوں گھر سے نکل کر حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے واقع پکے کھالے کے نکے (کنارے) پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ہم عموماً اس جگہ پر آن بیٹھتے تھے اور دن بھر کی کارگزاری پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا "کیسی لاٹری؟"

اُفق کی ڈھلتی سرخی اُس کی آنکھوں میں چمک اُٹھی، بولا۔ "کسی سے ذکر تو نہیں کرو گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "پہلے کبھی ایسا ہوا ہے؟"

وہ بولا۔ "نہیں مگر اس امانت کا بوجھ کہیں بھاری ہے۔"

"میرا حوصلہ بھی تم نے آزما رکھا ہے کھالے!"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر......"

میں نے قدرے مایوسی سے کہا "اگر تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں تو دل کی بات دل میں ہی رکھو۔"

وہ عجیب ادھیڑ بن میں پڑ کر تذبذب کا شکار ہو گیا۔ جوتے اُتارے، پاؤں کھال کے مٹیالے پانی میں ڈالے اور تھرکانے کے سے انداز میں جھٹکنے لگا۔ مجھے اُس کا مسرت آمیز اضطراب بُری طرح کھلنے لگا۔ میں نے قدرے خفگی سے کہا۔ "میں نے کہا ہے کہ مجھے شریکِ راز مت کرو مگر یہ نہیں کہا کہ یوں سر جھکا کر بیٹھ جاؤ۔ تم اپنی نکلنے والی لاٹری کے علاوہ کوئی اور بات تو کر ہی سکتے ہو، کرو ناں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "بتاتا ہوں یار! ذرا سا صبر بھی نہیں کر سکتے ہو؟"

میں خاموش ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے کچھ بتائے، نہ بتائے، پھر ازخود فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔ "اسما کو جانتے ہو ناں؟"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "اسما!"

"ہاں اسما...... سردار حیدر خان کی بیٹی...... وہی جو ملتان میں پڑھتی ہے۔" اُس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔

"ہاں یار! جانتا ہوں اُسے، پَر یہ بتا کہ ہوا کیا ہے؟"

"یہ پوچھ کہ کیا نہیں ہوا ہے؟"

میں نے زِچ ہو کر پوچھا۔ "اچھا چلو یونہی سہی۔ یہ بتا کہ کیا نہیں ہوا ہے؟"

وہ مزید میرے قریب ہو کر سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ "اُس نے مجھے سردار حیات خان کی نوکری چھوڑنے کا کہا ہے۔"

مجھ پر مایوسی کا شدید حملہ ہوا۔ کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔ میں نے نیم اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یار! یہ بات تو وہ پہلے بھی کئی مرتبہ تجھے کہہ چکی ہے۔"

"سن تو سہی یار!" وہ عادتاً بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "اَب کی بار اُس نے مجھے سنجیدگی سے کہا ہے۔"

"پہلے مخول کرتی تھی کیا؟" میں نے جھٹ سے پوچھا۔

اُس نے اِک شکایت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

"تو اُس کی بات مان لو ناں، کون روکتا ہے تجھے؟"

میں نے بے دلی سے کہا۔ "اُس سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ یہ نوکری چھوڑ کر کیا کروں، کیا گلے میں ڈھول ڈال کر شادی بیاہ پر خسروں کی طرح ناچوں یا گھر میں باپ کے ساتھ بیٹھ کر لوہا کوٹوں؟"

"ہاہ! ناچوں، لوہا کوٹوں!" اُس نے منہ بنایا، پھر اپنی ترنگ میں لوٹ آیا۔ "یہی تو خوشی کی بات ہے کہ اُس نے مجھے ملتان بلایا ہے۔ وہاں اُس نے میرے لیے اِس سے کہیں بہتر نوکری تلاش کر رکھی ہے۔ سچ شہرے! زندگی کا مزہ آ جائے گا۔" کھالے کے انگ انگ سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔

مجھے خاموش پا کر اُس نے پھر میرا کندھا ٹھونکا "اوئے! تجھے سانپ سونگھ گیا یا زبان پر تالا لگ گیا، بولتا کیوں نہیں تُو؟"

مجھے اُس پر افسوس ہوا۔ میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "اوئے کھالے! تو ایک لڑکی کی خاطر اپنے ماں باپ، بہنوں اور ہم سب کو چھوڑ جائے گا اور تجھے ذرا دُکھ بھی نہیں

www.Paksociety.com

ہوگا۔ ہیں؟"

وہ بھڑک گیا۔ "میں اسما کے لیے نہیں، زیادہ پیسوں والی نوکری کے لیے ملتان جا رہا ہوں۔ حیات خان مجھے اَسّی روپے روزانہ دیتا ہے۔ بیس پچیس روپے کی چھٹی لگ جاتی ہے۔ اسما بتا رہی تھی کہ وہاں میری تنخواہ پانچ ہزار ہوگی، پانچ ہزار......" اُس نے مضحکہ خیز انداز میں اپنے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں، دونوں آنکھیں اور منہ پوری وسعت میں کھول کر کہا۔ "روٹی پانی بھی مالک دیں گے۔ کچھ نہ کچھ اُوپر سے بھی بن جایا کرے گا۔"

"یہاں بھی تم اچھی خاصی نوکری کرتے ہو، پیسا کماتے ہو اور ہر رات اپنے گھر میں گزارتے ہو۔ سردار حیات خان تمہیں اپنا پتر سمجھتا ہے اور کسی بھی شے کی کمی نہیں آنے دیتا۔ پھر بھی تم اتنی خوشی کے ساتھ ملتان جانے کی خبر سنا رہے ہو؟" میرا غصہ فزوں تر ہوگیا۔

"سمجھانے کے بجائے سمجھنے کی کوشش کرو بے وقوف انسان! میں ایک دو روز میں ملتان چلا جاؤں گا۔ کل صبح حیات خان سے بات کر کے اپنی جگہ پر تجھے ویگن پر رکھوا دوں گا۔ موج میلا کرنا اور اپنے یار کھالے کو دُعائیں دینا کہ تجھے بیٹھے بٹھائے 'اچھی خاصی نوکری' مل گئی۔" اُس نے 'اچھی خاصی نوکری' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بکواس نہ کرو، تم کہیں نہیں جاؤ گے۔" میں نے فیصلہ سنایا۔

"تم مجھے ملتان جانے سے کیوں روکتے ہو؟" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "میرے دل کی دُنیا موج میں ہے، تم جانو، نہ جانو، مجھے فرق نہیں پڑتا۔ یہاں چوری چھپے اسما سے ملاقات ہوتی ہے، وہاں جب جی چاہے گا، مل لیا کروں گا۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ ترقی کرنے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اماں اَبا سے بات کر لی ہے۔ جب میں نے اُنہیں تنخواہ کے بارے میں بتایا تو مارے خوشی کے اُن کی باچھیں کانوں سے جا لگیں۔ ایک تم ہو کہ میری خوشی دیکھ کر کالے سیاہ ہوگئے ہو۔ ہے ناں!"

کوئی جواب دیے بغیر، میں نے اُس کے چہرے پر خوشی کے اَن گنت عکس، جوش اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت دیکھ کر اپنا سنایا ہوا فیصلہ واپس لیا اور خاموشی کی چادر اوڑھ لی کہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ وہ اپنی مستی میں مست، اپنی محبت کی الوہی ترنگ کے بہاؤ میں رقصاں کافی دیر تک مسرت بھری بہکی بہکی باتیں کرتا رہا، خواب بُنتا رہا اور میں 'ہاں، ہوں' میں جواب دیتا رہا۔ گاؤں میں اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی ہماری محفل اُجڑ گئی۔

بے رغبتی کے ساتھ کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ پروین دودھ کا بھرا ہوا پیالہ تھما کر چلی گئی اور میں چاند کے نُور تلے دودھ بھرے پیالے میں اُبھرتی ہوئی اسما کی شبیہ میں کھو گیا۔ دودھ حلق سے اُترنے والی توانائی تھی۔ اسما آنکھوں کے راستے گزر کر دل کی گہرائیوں تک کو چھیدنے والے حسن کا نام تھا جو دِل سے اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ آواز دیتی، کھالا تو کیا، دُنیا کا مضبوط سے مضبوط تر مرد بھی خود کو صدائے حسن کی کشش کے ہاتھ میں گروی رکھ چھوڑتا، تھم جاتا۔ میں جب اُسے کھالے کے لیے بے چین دیکھتا تو اِک بے نام سا حسد میرے روم روم میں بھر جایا کرتا تھا۔

سردار حیدر خان نور پور کے نمبردار حیات خان کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ بڑے کروفر والا آدمی تھا۔ قریشی موڑ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع بلوچ موڑ کے اطراف کی تمام تر اراضی اُسی کی ملکیت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ کم و بیش پچاس مربع زمین کا مالک تھا۔ صوبائی اسمبلی کے ہر انتخاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اَب تک دو مرتبہ ممبر بن چکا تھا۔ اِس سال بھی وہ اپنے روایتی حریف کو پچھاڑ کر اسمبلی میں پہنچ گیا تھا۔ باوجود کہ وہ جس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا تھا، وہ حکومت بنانے میں ناکام ہوگئی تھی، اُس کے اختیارات اور رسوخ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی پارٹی حزبِ اختلاف میں آجانے کے باوجود خاصی مضبوط تھی۔

بلوچ موڑ سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر اُس کی عالیشان کوٹھی، اُس کے جاہ و جلال کا استعارہ، سڑک پر سے دکھائی دیتی تھی۔ کوٹھی کے اطراف میں چونکہ اُسی کی اراضی واقع تھی، اِس لیے بلوچ نگر، سردار حیدر خان کی بستی میں صرف اُس کے مزارعین اور نوکر چاکر ہی رہائش پذیر تھے۔ گاہے بہ گاہے وہ سردار حیات خان اور وریام خان کے پاس آتا رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اُس کی حریف سیاسی پارٹی کے فعال کارکن امان اللہ قریشی کی بھی بڑی سی حویلی واقع تھی جہاں اُس کے مخالفین مہینے میں ایک آدھ چکر لگا لیا کرتے تھے۔ انتخابات کے دنوں میں کئی مرتبہ نور پور میں دونوں پارٹیوں کے کارکن دست و گریباں بھی ہو چکے تھے۔

سردار حیدر خان چونکہ سردار حیات خان کی سرپرستی کرتا تھا، اس لیے انتخابات کے دنوں میں سردار حیات خان اُس کی بھرپور معاونت کرتا تھا۔ کھالا بھی انتخابی دنوں میں سردار حیدر خان کی کوٹھی پر چلا جاتا تھا۔ بہ طور ڈرائیور وہ الیکشن کے

نتائج تک انتخابی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا تھا۔

یہیں کہیں اُس کی نظر حیدر خان کی پُرشکوہ کوٹھی کے چاند پر پڑ گئی۔ سردار حیدر خان کی بیٹی، اسما حیدر پر کھالے کی نگاہ یوں پڑی کہ پلٹنا بھول گئی۔ جب اُس نے میرے سامنے اسما کے ماورائی حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے تو اُسے دیکھنے کا تجسس مجھ میں ہلکورے لینے لگا۔ چونکہ انتخابی دنوں کے علاوہ کھالے کا بلوچ نگر میں آنا جانا نہیں تھا، اِس لیے میری یہ خواہش پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے کھالے کو سمجھایا کہ وہ اِس نظر بازی سے پرہیز کرے۔ سردار حیدر خان بہت ظالم فطرت وڈیرا تھا۔ وہ اپنے غصے اور جلال کی تاب خود بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا، کھالے کے لیے معافی کی گنجائش کہاں رکھتا؟ مگر کھالے کے سر پر نہایت غیر فطری اور ناموزوں عشق کا بھوت ایسے چڑھا کہ اُس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا بلکہ سرپٹ اندھی راہوں پر دوڑتا چلا گیا۔

اُس نے کھوج نکال لی۔ پتا چلا کہ اسما ملتان میں پڑھتی ہے۔ وہ گاہے بہ گاہے اُس کا دیدار کرنے کے لیے ملتان جانے لگا۔ وہ کالج کے گیٹ سے کچھ دوری پر جا کھڑا ہوتا۔ چھٹی ہونے پر سلور کلر کی نئی چمکدار گاڑی کے شیشوں میں مقید حسن کا لمحاتی دیدار کرتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا لوٹ آتا۔

مجھے وہ دِن بہ خوبی یاد ہے جب اس نے ایک شام مجھے مایوسی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ "شہرے! سچ کہتے ہیں، اپنے سے بڑے کی نہ یاری چنگی نہ دشمنی۔ اگر وہ نور پور میں رہنے والی ہوتی یا قریشی موڑ کی، تو میں اُسے جی بھر کے دیکھ لیا کرتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اَب تک راہ و رسم بھی پیدا کر چکا ہوتا۔ وہ بڑے گھر کی کڑی ہے۔ دیکھنے سے میلی ہوتی ہے۔ اُسے جی بھر کے دیکھنے اور چھونے کی حسرت میں تمہارا یار 'کھالا' دنیا سے گزر جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "جب تمہیں اپنی اوقات کا علم ہے تو کیوں چاند کو چھونے کی خواہش کرتے ہو؟"

"مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں ہے۔"

"کب تک ملتان کی خاک چھانتے رہو گے؟"

"جب تک وہ جاتی رہے گی۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کی شادی ملتان میں ہی ہو جائے، پھر؟"

"تو کیا ہے؟ اَب بھی جاتا ہوں، دیکھ کر پلٹ آتا ہوں۔ تب بھی جایا کروں گا اور اُس کی ایک جھلک دیکھ کر آجایا کروں گا۔"

"اِس سے تمہیں حاصل کیا ہوگا؟" میں متعجب ہوا۔

"مجھے حاصل کی پروا نہیں۔"

"تجھے تو شاید اپنی اور اپنے خاندان کی عزت اور سلامتی کی بھی پروا نہیں ہے۔" میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"اگر سردار حیدر خان کو پتا چل گیا تو وہ تجھے اور تیرے گھر بار کو آگ لگا دے گا۔"

"اُسے کیسے پتا چلے گا؟" وہ عام سے لہجے میں بولا۔ "میں نے اسما کا ذکر سوائے تمہارے، کسی سے بھی نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ عزت کے معاملے میں سردار حیدر خان اور اُس کا خاندان کتنا ظالم اور سخت گیر ہے۔ ویسے بھی، میں نے کبھی اسما کو مخاطب نہیں کیا، کبھی چھیڑنے کی کوشش نہیں کی، پھر اُسے کیا شکایت ہوگی؟ کسی کو دیکھنا تو کوئی جرم نہیں ہے۔"

مجھے اُس کے حماقت آمیز رویے پر دُکھ ہوا۔ جب کچھ لینا دینا ہی نہیں تھا تو پھر خود کو اِس عذاب میں ڈالنے کی ضرورت کیا تھی۔ میں نے کہا۔ "دیکھ کھالے! سردار حیات خان اور امیر نواز کے سامنے کبھی بھول کر بھی حیدر خان کے گھر کی بات نہ کرنا ورنہ وہ تمہیں الٹا لٹکا دیں گے۔ تم نے دل لگانا ہی ہے تو کوئی ہم پلہ لڑکی دیکھو۔ اُس کی یاد میں آہیں بھرو جس تک تمہاری آہ کا اثر پہنچ سکتا ہو۔ اُسے شوق سے دیکھو جس تک تمہاری نظر کی حدت پہنچ سکتی ہو۔ میں تو ویسے بھی عاشقی معشوقی کے معاملات کو اچھا نہیں سمجھتا، ایسے نامعقول رومانس پر سوائے سر پیٹنے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ خود پر رحم کرو، اپنے خاندان کی فکر کرو اور سکون کے ساتھ روزی کماؤ۔ یہ جو تم پیتے پلاتے ہو ناں، یہ دیسی کچی کا نشہ کرتے ہو ناں، اِس سارے خرابے کی جڑ یہی ہے۔ یہی نشہ تمہیں ایک نہ ایک دن لے ڈوبے گا۔ تمہیں ہوش نہیں رہتا۔ کیا کہنا ہے، کیا نہیں کہنا ہے، سدھ نہیں رہتی۔ نشے کے خمار نے تمہیں پاگل کر رکھا ہے اور تم 'اسما، اسما' کا ورد کرتے رہتے ہو۔ کبھی امیر نواز کے سامنے تمہارے لبوں پر یہ نام آ گیا تو سمجھو قیامت آ گئی۔"

اُس نے بے پروائی سے کہا، "اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا، خواہ مخواہ دل ڈرانے والی باتیں نہ کرو۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنی خوبصورت لکھائی میں ایسا خط لکھ دو جسے پڑھتے ہی اسما کی آنکھیں کھل جائیں اور......"

"اور اُس کے باپ کی توپوں کا منہ بھی کھل جائے...... ہے ناں؟" میں نے اُسے ڈانٹا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" کھالے نے بُرا سا منہ بنایا۔ "تم

سردار حیدر خان سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟ انسان ہی تو ہے وہ۔ کیا ہے؟ اُس کی بیٹی کیا عورت نہیں ہے؟ کیا اُس کے سینے میں دل نہیں ہے یا وہ کسی سے پیار نہیں کرسکتی۔ ہوسکتا ہے، جیسے میں اُس کے بارے میں رات دن سوچتا رہتا ہوں، وہ بھی میرے بارے میں دن رات سوچتی ہو۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ کوٹھیوں میں رہنے والی امیر زادیوں کے تعلقات ہمیشہ اپنے ڈرائیوروں کے ساتھ قائم ہوجاتے ہیں۔ بعض گھروں سے بھاگ کر شادیاں بھی کرلیتی ہیں اُن بے اوقات نوکروں کے ساتھ۔"

میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں اُتر گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک آگے نکل چکا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے آگے جوڑ دیے۔ "کھالے! مجھے معاف کردے بھئی، اپنے گھر والوں کو معاف کردے...... تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ تو پی پی کر پاگل ہوگیا ہے اور اگر تیرے شغل میلے کی کیفیت یہی رہی تو وہ دن دور نہیں، جب نور پور کی گلیوں میں تجھ پر بچے پتھر مارا کریں گے اور تو ننگے پنڈے اِدھر اُدھر دوڑا پھرے گا۔ اسما کو مت دیکھ، اپنی اوقات کو دیکھ۔ اپنی شکل وصورت اور اپنی حیثیت پر نگاہ ڈال۔ تجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے جس کی بنیاد پر تجھے کوئی پڑھی لکھی عام سی لڑکی بھی چاہے۔ وہ تو پھر بڑے گھر کی لاڈلی بیٹی ہے۔ وہ تجھے زندہ زمین میں گاڑ دے گی یا کسی دیوار میں چنوا دے گی۔"

وہ اپنے مخصوص بے نیازانہ انداز میں گویا ہوا۔ "پروا نہیں...... میں پہلا آدمی نہیں ہوں گا جسے زمین میں گاڑا جائے گا یا دیوار میں چنا جائے گا۔ عشق تو عشق ہے، کبھی ایسی دھمکیوں سے خوفزدہ نہیں ہوا۔ تم اگر میرے سچے یار ہو تو مجھے اُس کے نام پیارا سا خط لکھ کر دو، یہ اگر نہیں کرسکتے تو اپنی زبان بند رکھو اور مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔"

میں خاموش ہوگیا۔ اُس کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ یہ بلا جس کا سر پر چڑھ جائے، اردگرد کی سوجھ بوجھ ختم کردیتی ہے۔

اُسے سمجھانے کا عمل میں نے گاہے بہ گاہے جاری رکھا۔ بات بے بات اُس کی مرمت کرتا مگر میں جوں جوں اُسے باز رکھنے کی کوشش کرتا، توں توں اُس کا جنوں شدت اختیار کرتا گیا۔ میں ناتجربہ کاری میں اُس کے شوق کو مہمیز کرتا گیا۔

ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ ہم شام کا دھندلکا گزارنے حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے پختہ کھال کے نکے پر حسبِ عادت بیٹھ کر خوش گپیاں کررہے تھے کہ یک لخت کھالے کے منہ سے پھوٹا۔ "شہرے! مزے کی بات سناؤں؟"

میں متفسر ہوا۔ "ہاں، ہاں! کیوں نہیں۔"

"میں نے آج اسما کو جی بھر کے دیکھا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ملتان میں اور کہاں!" وہ بولا۔ "میرے عین سامنے سڑک پر اُس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ ڈرائیور ٹائر بدلنے لگا۔ وہ گاڑی کا گیٹ کھول کر سڑک پر آگئی۔ کچھ دیر کھڑی ٹائر کو دیکھتی رہی، میں اُسے دیکھتا رہا، پھر وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں بت کی طرح کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اوئے شہرے! ایمان سے سچ کہہ رہا ہوں، اُس نے بھی مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اُس کے دیکھنے سے مجھے یوں لگا تھا جیسے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا ہو، جیسے میرے بدن کا سارا خون نچڑ کر میری آنکھوں میں آگیا ہو۔ غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ اُس کے جیسی تو پوری دُنیا میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اتنے لمبے لمبے سیاہ بال...... موٹی موٹی کالی آنکھیں...... سیبوں کی طرح لال لال گال......"

"اچھا اچھا...... زیادہ تعریف مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ اُس نے تمہیں پہچانا تو نہیں؟"

"کیا مطلب؟" وہ حیرانی سے بولا۔ "اُسے کیا پتا، میں کون ہوں؟ جب میں نے بلوچ نگر میں اُسے دیکھا تھا تو وہ گاڑی سے اُتر کر حویلی کے بڑے پھاٹک میں داخل ہورہی تھی۔ اُس نے یقیناً مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھا بھی تھا تو اتنے آدمیوں میں اُسے میری شکل کہاں یاد رہی ہوگی۔"

"تم تو کہا کرتے تھے کہ ہوسکتا ہے وہ بھی تمہیں یاد کرتی ہو؟" میں نے غصے سے کہا۔

"وہ تو میں ایسے ہی کہتا تھا۔ لیکن آج وہ ضرور میرے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔"

"وہ کیوں؟"

"آج اُس نے مجھے غور سے دیکھ جو لیا ہے۔"

میں ہنسا۔ "تب تو وہ ڈر کے مارے کانپ رہی ہوگی۔"

"کیا میں اتنا ہی بدصورت ہوں؟"

"تو اور کیا تم خوب صورت ہو؟ مجھے یقین ہے کہ تمہارے بچے بھی تمہیں دیکھ کر ڈر کے مارے ماں کی گود میں چھپ جایا کریں گے۔" میں نے کہا۔

اُس نے قہقہہ لگایا۔ "وہ نہیں ڈریں گے شہرے خان!"

"کیوں؟"

www.Paksociety.com

''اس لیے کہ وہ میرے بچے ہوں گے، مجھ پر ہی جائیں گے بلکہ مجھ سے بھی دو چار قدم آگے ہوں گے۔''

اُس کی زبانِ شوق پر اسما کی خوب صورتی اور خوش لباسی کے نہ ختم ہونے والے تذکرے چپک گئے۔ آنے والے کئی دنوں تک وہ جب بھی ملتا، اُسی نازنین کا قصہ چھیڑ لیتا۔ وہ کیسے چلتی ہے، وہ کیسے دکھائی دیتی ہے اور باتیں کرتی ہے تو اُس کے نین ونقوش کیسے مدمقابل کے ساتھ گویائی چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔

میں اُس سے مذاق کرتا۔ ''ابھی تو تم نے محض اُسے ایک نظر دیکھا ہے، اگر کبھی حسنِ اتفاق سے مل بیٹھے تو پھر کیا ہوگا؟''

روز بہ روز اُس کی دیوانگی فزوں تر ہوتی گئی۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ اُس کا جنوں، محض لمحاتی اور جذباتی ہے۔ جب بھی اُسے اپنی اور اسما کی حیثیتوں کے مابین حائل فرق کی آگہی ہوگی، مایوس ہوکر پلٹ آئے گا اور پھر کبھی اُس کا نام بھی نہیں لے گا۔ اس کا باپ لوہار تھا۔ نور پور کے زمینداروں کا سیپی تھا۔ پاکستان کے دوسرے تمام زمینداروں کی طرح نور پور کے زمیندار بھی اپنے مقرر کیے ہوئے کمین لوگوں کو ایک حد تک قریب آنے دیتے تھے۔ بلاشبہ کھالے اور اُس کے باپ کا ہر گھر میں کھلا آنا جانا تھا اور کسی گھر میں بھی اُن سے پردہ نہیں کیا جاتا تھا مگر اِس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ انہیں اپنا ہم سر قرار دیا جاتا تھا۔

یہی صورتِ حال سردار حیدر خان اور اُس کے خاندان کی تھی۔ وہ خاندانی پس منظر کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ اِس پر مستزاد اُس کا صوبائی اسمبلی کا ممبر بن جانا تھا۔ اس کی جوان سال بیٹی ملتان کے کالج میں پڑھتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ وہاں کیا پڑھتی ہے مگر یہ ضرور اندازہ تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہی وہاں مقیم ہوگی۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ عام سے خدوخال والے سانولے لوہار کے لیے اپنے دل میں نرم جذبات پالتی۔ یہ بعید نہیں تھا کہ اگر کبھی کھالا اپنی اوقات سے اوپر اُٹھ کر اُسے دیکھنے کی غلطی کرتا تو وہ اپنے باپ کے کارندوں کے ذریعے اُسے بالکل اوپر اُٹھوا دیتی۔

میں نے یہ باتیں وقتاً فوقتاً کھالے سے بھی کی تھیں۔ اُسے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی تھی مگر اُس کے پاس اپنے موقف پر ان گنت جذباتی استدلال تھے۔ بجز یہ کہ وہ سبھی استدلال کتابی تھے، وہ بہ ضد تھا کہ ممکن ہے کہ اسما اُس کے جنون ومحبت اور شوق کو دیکھتے ہوئے مائل ہوجائے۔ وہ احمقوں کی جنت میں رہنے والا تو نہیں تھا مگر نہ جانے اُس کی ذہنی رو اِس قدر کیوں بھٹک گئی تھی۔

ہم دونوں جب بھی حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے سیمنٹ والے تکیے پر بیٹھتے، بلا اِرادہ اسما کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ ہم نے ہمیشہ یہ احتیاط برتی تھی کہ امیر نواز یا سردار حیات خان کے کسی بھی عزیز کی موجودگی میں اسما کا تذکرہ نہ چھڑے۔ ہم اِس پیش بندی پر بہ حسن وکامیابی گامزن تھے۔ یہ بھی ہوا تھا کہ کھالے کی باتیں سن سن کر میرے من میں اسما کو دیکھنے کا تجسس حد سے تجاوز کر گیا تھا اور میں گاہے بہ گاہے اُسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کرنے لگا تھا۔

ایسے میں کھالا بڑی شکست خوردہ سی آواز نکالتا۔ ''یار! میں ابھی خود دیکھنے سے عاری ہوں، تمہیں اُس ماہ جبیں کا دیدار کیسے کروا سکتا ہوں۔ میرے لیے دعا کرو، وہ مجھے اپنا دیدار بخش دیا کرے، میں تھوڑا بہت حصہ تجھ تک پہنچا دیا کروں گا۔''

میں نے بھلا اُس کے شوقِ دیدار کی آبیاری کے لیے کیا دعا کرنا تھی البتہ اُس کی خیریت اور سلامتی کے لیے دل ہی دل میں دعا گو رہتا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ ستائے رکھتا تھا کہ اُس کی یک طرفہ نظربازی کا علم اگر حیدر خان یا اُس کے خاندان کے کسی فرد کو ہوگیا تو اُس کی تکہ بوٹی کردی جائے گی۔ کھالا یا کھالے کا غریب خاندان اُس فرعون صفت وڈیرے کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

ایک صبح کھالا مجھے لینے کے لیے میرے گھر پہنچ گیا۔ اُس کا کنڈیکٹر 'شیدو' پنکچر ہوگیا تھا۔ اُس کے دائیں گھٹنے کی چپنی ہڈی کے عین اوپر پھنسی نکل آئی تھی جس کی وجہ سے اُس کا چلنا پھرنا یکسر موقوف ہوکر رہ گیا تھا۔ اِسی پھنسی کی وجہ سے ہی اُسے بخار نے آن لیا اور وہ چارپائی کا ہوکر رہ گیا۔ کھالا مجھے اپنے ساتھ بہ طور کنڈیکٹر دو چار روز کے لیے رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دلچسپی نہیں تھی مگر کھالے کی منت سماجت پر اُس کی مدد کے ارادے سے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ ویگن پر سامان لادنے اور سواریاں بٹھانے کے مشکل کام میں اُس نے میری رہنمائی کی۔ مجھے کرایہ وصول کرنے کے زریں اصول بتائے۔ نور پور سے قریشی موڑ تک دو بڑے اسٹاپ تھے۔ پہلا اسٹاپ نوری چوک تھا۔ کوٹ ادو سے قریشی چوک جانے والی بڑی سڑک پر نور پور کی لنک روڈ یہیں آن ملتی تھی۔ کہنے کو یہ چوک تھا مگر یہاں تین سڑکوں کا اتصال ہوتا تھا۔ چوتھی سڑک نہیں تھی۔ یہ نور پور سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر بلوچ موڑ تھا۔ قریشی موڑ یہاں سے مزید تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ اِن بڑے اڈوں کے علاوہ چند ایک چھوٹے چھوٹے اسٹاپ بھی

واقع تھے۔ ویسے تو نور پور وائی اِس کھٹارا ویگن کے ہر مسافر کو حق حاصل تھا کہ وہ جہاں چاہتا، ویگن کو رُکوا سکتا تھا۔

نوری چوک پر واقع خستہ حال 'خٹک ہوٹل' کے سرکنڈوں کے بنے ہوئے چھپر کے عین سامنے کھالے نے ویگن روکی۔ ہوٹل والے کا ننھا کارندہ چائے کا پیالہ تھامے بھاگتا ہوا آیا۔ کھالے نے ڈپٹ کر کہا۔ ''چل اوئے کے! ایک پیالہ اور پکڑ......''

میلے چیکٹ کپڑوں میں ملبوس لڑکے نے الٹے پیروں دوڑ لگادی۔ کھالے نے 'پائلٹ گیٹ' کھولا، اشارے سے مجھے اپنی جانب بلایا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ''شہرے! دعا کر۔ پیر کا دن ہے، بلوچ موڑ پر جل پری کا دیدار نصیب ہوجائے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''پیر کا دِن خاص ہے؟''

''ہاں...... وہ ہفتہ کی شام کو گھر آتی ہے۔ پیر کی صبح کو ملتان جاتی ہے۔ کبھی کبھی بلوچ موڑ پر یا قریشی موڑ تک کہیں راستے میں مڈبھیڑ ہوجاتی ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اُس پر چار حرف بھیجے اور ہوٹل والے لڑکے کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ تھام کر چسکیاں لینے لگا۔ ایسے میں ویگن میں مقید سواریوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ وقت کی کمی کا رونا رونے لگے۔ کھالا حسبِ مراتب اُن کا کی تواضع کرنے لگا۔ مجھے کھالے کا رویہ کھلتا تھا مگر وہ جواباً ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ ''تم اِن لوگوں کو نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ اِن کے ساتھ تمیز اور ادب کے ساتھ بات کرو تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر رکھو تو سیدھے رہتے ہیں اور کبھی پریشانی کا سبب نہیں بنتے۔''

چائے کا پیالہ حلق سے اُتارنے کے بعد کھالا اپنی 'پائلٹ سیٹ' پر بیٹھ گیا۔ اُس کی ڈرائیونگ نشست بھی عجوبہ تھی۔ سیٹ کا فوم بیٹھ گیا تھا اور سیٹ کی اونچائی کو برقرار رکھنے کے لیے کھالے نے اپنے گھر سے ایک سرہانہ اُٹھا کر یہاں رکھ دیا تھا۔ پھر سیٹ کی ٹیک بھی پیچھے کی طرف جھک گئی تو ایک سرہانہ وہاں پر بھی رکھنا پڑا۔ مہینوں تک نہ دھلانے کی وجہ سے دونوں سرہانوں کا اصل رنگ میل میں چھپ گیا تھا اور وہ سیاہ افیونی رنگت اختیار کر چکے تھے۔ سن ستر ماڈل کی فورڈ ویگن کی رفتار کی حد بھی بہ مشکل چالیس پچاس ہی تھی۔ کبھی یہ چاروں طرف سے بند ہوا کرتی تھی۔ باڈی گل کھپ گئی تو اس پر ملتان کے ایک باڈی میکر سے ڈالہ نما باڈی بنوا کر رکھ دی گئی تھی۔ یہ شترغربہ ویگن دیکھنے کے لائق تھی اور اِس روٹ پر یقیناً ایسی ہی ویگن کی ضرورت تھی۔

بلوچ موڑ پر پہنچ کر کھالے نے پھر بریک لگا دیے۔

کچھ دیر گزر رہی، ایک مسافر نے ویگن کے اندر سے ہی چلا کر کہا۔ ''کھالے اُستاد! دور دور تک کوئی سواری دکھائی نہیں دیتی، چلتے رہو۔''

کھالے نے اِک نگاہِ غیظ اُسے دیکھا اور مغرب کی جانب جاتی سرمئی سڑک پر نگاہیں ٹکالیں۔ چند ثانیے بعد اُس نے آواز لگائی۔ ''شہرے! ذرا ٹائروں کی ہوا چیک کرلے۔ مجھے لگتا ہے کہ کنڈیکٹر سائڈ والا ٹائر گڑبڑ کر رہا ہے۔''

میں اُس کی پیشہ وارانہ چالاکی کو سمجھ گیا۔ طوعاً وکرہاً ویگن کے پچھلے بمپر سے اُترا۔ باری باری چاروں ٹائروں کو ہاتھ سے ٹھونک بجا کر ہوا کی کمی کا جائزہ لیا۔ کچھ وقت یوں گزر گیا۔ کھالے نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ مجھ سے رپورٹ لینے میں کچھ گھڑیاں بیت گئیں۔ ایسے میں اُس کی دعا کی قبولیت کی گھڑی آگئی۔ دور مغرب میں کار کے آثار دکھائی دیے۔ چند ہی لمحوں میں کار بلوچ موڑ پر پہنچ گئی اور ڈرائیور اِدھر اُدھر دیکھ کر کار کو مین روڈ پر چڑھانے لگا۔ کھالے نے میرے پہلو میں ٹہوکا دیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر کار کے پچھلے حصے میں جھانکا۔ ایک چاند گاڑی میں سمٹا دکھائی دیا۔ چند ثانیوں کے دیدار نے ہی مجھے باور کرا دیا کہ کھالے نے اسما کے بارے میں اَب تک جو بھی کہا تھا، وہ بکواس نہیں تھا، عین حقیقت پر مبنی اظہار تھا۔ چونکہ چند ثانیوں میں حسن کی محض ایک جھلک، سرخ وسپید رنگت اور وڈیرہ زادی کا کروفر ہی ملاحظہ ہوا تھا، اِس لیے اُس کے خال وخد بصارت میں ٹھہر نہ پائے۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ مجھے اپنے عقب میں کھالے کے حلق سے پھوٹتی آہ کی صدائے موہوم سنائی دی اور میں بھاگ کر ویگن کے بمپر پر چڑھ گیا۔

کھالے نے شترِ بے مہار کی طرح ویگن کو سرپٹ دوڑایا مگر کھالے اور اسما کی حیثیتوں میں موجود فرق کی طرح دونوں گاڑیوں کی رفتار میں بھی زمین وآسمان کا فرق موجود تھا۔ ویگن کی باڈی سے مختلف اقسام کی آوازیں نکلنے لگیں۔ مسافر خوف زدہ ہوگئے۔ اُنہیں جو آیات اور وظائف یاد تھے، چند منٹوں میں اُنہیں پڑھ بیٹھے اور تیز رفتاری کے نقصانات پر بحث کناں ہوگئے۔

میں نے گردن باہر نکالی۔ ویگن کا سائڈ مرر ٹوٹا ہوا تھا۔ آدھا آئینہ موجود تھا، آدھا غائب تھا۔ میں نے آدھے سائڈ مرر میں جھانکا اور کھالے کو مخاطب کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''استاد! ہولی چل متاں گڈی سڑک اُتے اِی کھلر جاوے......''

www.Paksociety.com

کھالے نے پیر کا دباؤ کم کر دیا۔ قریشی موڑ پہنچ کر گاڑی اَڈے پر لگائی اور ہم دونوں اِک شانِ بے نیازی کے ساتھ قریبی ہوٹل کے ہماچے (بڑی چارپائی) پر جا بیٹھے۔ میری ران پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر کھالے نے پوچھا۔ ”سنا بھئی شہرے! دیکھا اُسے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں...... دیکھ لیا۔“

”پھر؟“ اِک عجب شوق آمیز سوال اُس کے چہرے سے ہویدا تھا۔

”دُکھ ہوا۔“

”کیوں؟“

”میرے بے وقوف یار نے اپنا دل ایسی جگہ پر لگایا جہاں مراد براری کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”تمہاری اوقات دیکھ کر۔“

”کیا ہوا میری اوقات کو؟“ وہ جھلا کر بولا۔

”تم چاند کو دیکھ سکتے ہو، اُس کی خواہش کر سکتے ہو مگر اُسے کبھی چھو نہیں سکتے۔“

”کیا اِس لیے کہ میں غریب ہوں؟“

”نہ صرف غریب بلکہ خاندانی پس منظر اور شکل و صورت کے لحاظ سے اسما سے بہت کم تر ہو۔“ میں نے حق گوئی میں اُس کی دل آزاری کا دھیان نہیں کیا۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے کے بدلتے تاثرات پر میری نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ چائے کا آرڈر دے کر اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، چند ثانیوں بعد بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”شہرے! میں اُسے حاصل نہیں کر سکتا مگر اُس کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر سکتا ہوں۔ دیکھ لینا، وہ کسی دن میرا نام لے کر آہیں بھرے گی، مجھے دیکھے گی۔ مجھے بس یہی چاہیے۔“

میں اُس کی حالتِ زار پر ہنس پڑا۔ اُسے رنج ہوا، بولا۔ ”ہاں! تم بھی مجھ پر ہنستے ہو۔ جب میں اسما کے بارے میں سوچتا ہوں تو میں بھی اپنی سوچ پر ہنسے بنا نہیں رہتا مگر عشق ذاتیں اوقاتیں نہیں پوچھتا، بس ہو جاتا ہے اور مجھے بھی اسما سے عشق ہو گیا ہے۔“

عشق ہر نوع میں ایسے ہی تند رو ثابت ہوتا ہے مگر عشق کا ثمر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ کہیں گل و گلزار مہکتے ہیں، کہیں بادِ سموم چلتی ہے تو کہیں پر آگ کے جھلساوے مقدر ٹھہرتے ہیں۔ کھالا فطرتاً ضدی اور انا پرست واقع ہوا تھا۔ میرے سمجھانے سے سمجھنے والا نہیں تھا۔ مجھے ہی سمجھنا تھا کہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دینے میں ہی عافیت تھی۔ آنے والے کل وقت میں اُسے شعور از خود عطا ہو جانا تھا۔

میں نے اُس کی توجہ بٹانے کے لیے شموں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ پوچھا۔ ”اسما کے چکر میں تم اپنی شموں کو بھول ہی گئے ہو۔ کیا اُسے پتا ہے کہ تم نے اپنی راہ بدل لی ہے؟“

اُس نے نیم بے پروائی سے کہا۔ ”کبھی کبھی شکوہ کرتی ہے۔ میں نے اُسے سمجھا دیا ہے کہ میری اور اُس کی راہیں الگ ہیں اِس لیے مجھے نہ بلایا کرے اور نہ ہی تحفے بھیجا کرے۔“

”کیا شیرے قسائی کو تمہاری اُس عشق کہانی کا پتا چل گیا تھا؟“

”اگر پتا چل گیا ہوتا تو اپنے بڑے سے بغدے کے ساتھ میرے ٹکڑے کر چکا ہوتا اور اَب تک نور پور کے آلسی کتے میری بوٹیاں ہضم بھی کر چکے ہوتے۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔

شیرا قسائی شموں کا باپ تھا۔ وہ بخشو لوہار کی ملحقہ دکان کے آگے گوشت کا پھٹا لگایا کرتا تھا جبکہ اُس کا گھر کھالے کے گھر کے سامنے، جنوب مغربی جانب میں کرکٹ کے میدان کے پار واقع تھا۔ عام دیہاتی گھروں کی طرح شیرے قسائی کے گھر کی چہار دیواری بھی بلند نہیں تھی۔ صحن میں چلتی پھرتی ہوئی اُس کی بیوی اور بیٹی شمیم عرف شموں پکی سڑک پر کھڑے ہونے والے ہر فرد کو بہ آسانی دکھائی دیتی تھیں۔

کھالے اور شموں کا انکھ مٹکا بھی اِسی دستیاب سہولت کے سبب شروع ہوا تھا جو ہوتے ہوتے اچھے خاصے پُرجوش عشق میں بدل گیا تھا۔ اگر بیچ میں اسما کا معاملہ کھڑا نہ ہوتا تو اَب تک اُس عشق کی وارداتوں میں خاصا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ شموں کھالے کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ اُس نے اپنے اور کھالے کے مابین استوار ہونے والے جذباتی تعلق کو ازلی رابطہ سمجھ لیا تھا اور اُس کی ڈولی میں بیٹھنے کے خواب دیکھ رکھے تھے۔

میں نے آنے والے چند دن، جب تک شیدو تندرست نہیں ہوا، کھالے کے ساتھ گزارے اور سمجھ گیا کہ اُس نے اپنی دل پھینک فطرت کو ایک ہی جستجو پر مرتکز کر دیا ہے۔ وہ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اسما کے نام کا ہی ورد کرنے لگا تھا۔ وہ کھالا جو ہر واقعے میں حظ کے پہلو ڈھونڈا کرتا تھا اور ہر دن کی گزران کے لیے نئی جہت تلاشتا تھا، بالکل بدل گیا تھا۔ اُس کی عادات میں نمایاں تبدیلیاں رُونما ہو چکی تھیں۔ اُس

کے حوالے سے میرا بھی اسما کے ساتھ ایک بے عنوان ربط استوار ہو گیا تھا۔

شیدو کے گھٹنے میں لگی ہوئی پھنسی کی آگ بجھ گئی اور میری جان اُس جاں کش ویگن سے بھی چھوٹ گئی۔

مہینے بھر بعد سردار وریام خان کی بیٹی کی شادی سرانجام پائی تھی۔ مجھ سمیت نور پور کے لڑکے بالے وریام خان کے گرد جمع تھے۔ وریام خان اور حیات خان اپنے روایتی خاندانی لباس میں ہر ایک کو اُس کی ذمے داری سمجھا رہے تھے اور بار بار تاکید کر رہے تھے کہ برات کی آمد پر انتظامات بالکل بے داغ ہونے چاہئیں وگرنہ نور پور کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ ہمیں بہ خوبی احساس تھا کہ ایسے نازک موقع پر سردار حیات اور وریام خان کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کریں گے۔ اُن کے متوقع مہمان اُنہی کے ہم مرتبہ تھے یا اُن سے بھی اونچے شملے والے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کھالے کا چہرہ کسی نامعلوم خوشی کے باعث دمک رہا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر کام کرتا دکھائی دیتا تھا۔ کبھی ٹرالیوں سے ٹینٹ، قناتیں اور شامیانے اتارنے والوں کے ساتھ ہوتا، کبھی دیگوں اور برتنوں کو سنبھالنے میں مشغول ہوتا تو کبھی اپنی کھٹارا ویگن کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان سودا سلف کی پرچی پر نظریں گاڑے منہمک دکھائی دیتا۔

میں نے چھیڑا۔ ”کیوں بھئی خالد محمود! آج کوئی خاص بات ہے؟“

اُس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے گھورا۔

”آج تم بڑے شوق سے شادی کے انتظامات میں جتے ہوئے ہو حالانکہ تم فطرتاً بیگار کو بیگار سمجھنے اور جان چھڑانے والے شخص ہو۔“ میں نے اُسے ٹٹولا۔

اُس کے گہرے سانولے رنگ پر کئی رنگ جھلملا گئے۔ میرے بہت زیادہ قریب ہو کر رازداری سے بولا۔ ”زنان خانے میں اسما آئی ہوئی ہے۔“

میں نے ایک طویل سانس حلق سے خارج کی۔ اس کی غیر معمولی خوشی کا سبب معلوم ہونے پر میں حیران نہیں ہوا تھا مگر مجھے بتائے جانے سے پہلے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے دیکھا ہے اُسے؟“

اُس نے بتایا۔ ”ہاں! میں اُسے دو تین مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔“

”کیسے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

اُس نے مجھے بازو سے پکڑا، ٹینٹ کے ایستادہ بانسوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے دارے (بیٹھک) کی مغربی دیوار کے پاس لے گیا اور دیوار کی جانب منہ کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ تب وہ روزن دکھائی دیا جو اینٹ کے نکلنے سے دیوار میں پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے روزن پر آنکھ ٹکائی۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”وہ دیکھو...... وہ بڑے برآمدے کے تیسرے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی ہے۔“

میں نے دیکھا، کچھ لمحوں تک منظر پوری طرح آشکار نہیں ہوا، دھندلا دھندلا منظر اترتے ہی ستون کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑی اسما دکھائی دی۔ اُس کا منہ شمال کی جانب تھا اور روزن سے دیکھنے پر اُس کے چہرے کی ایک سائڈ دکھائی دے رہی تھی۔ کھالے نے اچانک مجھے شانے سے دھکیل کر پرے ہٹا دیا۔ خود آنکھ لگا کر چند لمحے دیکھتا رہا، پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”میں اُسے یہاں سے دیکھتا ہوں کیونکہ سنتھے کی باڑھ کی وجہ سے کوئی مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ نہیں سکتا۔ چلو، اس کی طرف چلیں۔“

ہم دونوں واپس آ کے صحن میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے ہم عمر، کچھ کم و بیش عمر والے، تفویض شدہ کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سرگرداں تھے۔ آواز نیچی رکھتے ہوئے کھالا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے رات کو اسما کو ناچتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔“

”سچ؟“ میری حیرانی فزوں تر ہو گئی۔

”ہاں تو......“ وہ اپنی آنکھوں کو پوری وسعت میں کھول کر بولا۔ ”وریام خان کی بیٹی کی مہندی کی رسم کا دھوم دھڑکا رات بھر چلتا رہا۔ باری باری سبھی لڑکیوں نے ڈانس کیا، ڈھولک بجی اور خوب دھما چوکڑی ہوئی۔ میں یہاں پانی چھڑکنے پر مامور تھا۔ پانی والا پائپ درست کرنے کے بہانے بار بار سنتھے کی باڑھ کے پیچھے چلا جاتا اور روزن سے جھانک کر اُسے دیکھتا۔ اچانک لڑکیوں نے اُس سے ناچنے کی فرمائش کی جو اُس نے پوری کی اور میں دُنیا سے بے خبر اُسے تھرکتے ہوئے دیکھتا رہا......“

”کیا واقعی اُس نے ڈانس کیا؟“

”تو اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ وہ نیم خفگی سے بولا۔ ”یار کیا بتاؤں تمہیں؟ وہ جب ناچ رہی تھی تو یوں لگ رہا تھا جیسے پورا زمانہ اُس کا ساتھ دے رہا ہو۔ اُس کے بدن کی معمولی سی حرکت پر زمین حرکت میں آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اُس نے سب سے عمدہ ڈانس کیا تھا۔“

وہ جھوٹ نہیں کہتا تھا۔ وہ اُس ذہنی سطح پر پہنچ چکا تھا کہ

اُسے اسما کی معمولی اچھل کود بھی دنیا کا سب سے بہترین رقص محسوس ہونا چاہیے تھی۔

میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ ”اگر کوئی تمہیں چوروں کی طرح تا کا جھانکی کرتے ہوئے دیکھ لیتا تو؟“

”رات کے اُس سمے یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔“

علاقائی روایات کھالے کے لیے بہت بڑی رکاوٹ تھیں۔ وہ شادی کے پُر ہجوم موقعے پر بھی زنان خانے کا دروازہ عبور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سرحد صرف سردار حیات خان اور وریام خان کے خاندان کے لڑکوں اور مردوں کے لیے کھلتی تھی۔ ہمیں بھی اگر کوئی کام ہوتا یا کچھ درکار ہوتا تو ہم اُنہیں کہتے۔ وہ زنان خانے میں جاتے اور ہماری مطلوبہ شے ڈھونڈ لاتے۔ جب دن چڑھے نور پور والی سڑک پر شہنائیاں گونجیں، پٹاخے پھوٹے تب شاید کھالے کی قسمت بھی ہڑبڑا کر جاگ گئی۔ سردار وریام خان کا بڑا بیٹا، بہرام خان بھاگا ہوا دارے میں داخل ہوا۔ ہماری ٹولی پر نگاہ پڑی تو تیر کی طرح ہماری طرف بڑھا۔ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”شہرے! تم اندر جا کر بتاؤ کہ برات آ گئی ہے۔ یہ بھی بتانا کہ پھول آخری کمرے میں سفید چادر کے نیچے چارپائی پر رکھے ہوئے ہیں۔“

وہ کافی جلدی میں تھا، حکم دے کر اُلٹے پیروں باہر کی طرف بھاگا۔ اُسے یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ اُن کے ہاں مہمانوں کی آمد کے بعد ہمارا زنان خانے میں داخلہ ممنوع قرار پایا تھا۔ میں نے قدم بڑھانا چاہے تو کھالے نے جلدی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کھالے کی آنکھوں میں ایک ہی التجا تھی۔ میں اُس کے بولنے سے پہلے ہی سمجھ گیا اور اُنھی پیروں تھم گیا۔ اُسے زنان خانے میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی ٹولی کے ہمراہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

برات کا شاندار استقبال ہوا۔ نور پور کی لڑکیوں نے برات پر پھول نچھاور کیے۔ میں نے اِس موقعے پر پہلی مرتبہ اسما کو بہ حسن و کمال دیکھا تھا۔ کھالا ابھی وفورِ شوق سے اُسی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جب براتی دارے میں بچھی ہوئی چارپائیوں اور لال پیلی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اُن کی تواضع کا کام شروع ہو گیا جو ہمیں سونپا گیا تھا۔

جب کچھ فرصت ملی تو میں نے کھالے کو علیحدہ کر لیا، پوچھا۔ ”سناؤ بھئی مجنوں میاں! کیا رہا؟“

وہ بولا۔ ”اللہ تیرا بھلا کرے شہرے! تیرے طفیل آج مجھے اسما سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔“

میں نے اشتیاق سے دریافت کیا۔ ”وہ کیسے؟“

”زنان خانے میں داخل ہوتے ہی میں نے اسما کو تاڑ لیا۔ بس پھر کیا تھا، تیر کی طرح اس کے پاس پہنچا۔ براہِ راست، اسی کو بہرام خان کا پیغام دیا۔ اُس نے 'اچھا' کہا اور ہاں شہرے! آج میں نے اُسے قریب سے دیکھا ہے۔ وہ تو بہت ہی سوہنی ہے۔ دور سے دیکھنے پر بھی خوب صورت لگتی تھی مگر نزدیک سے دیکھنے پر یوں محسوس ہوا جیسے عین آنکھوں کے بیچ چاند چمک اُٹھا ہو۔ اُس نے مجھے کہا کہ 'اب کھڑے کیوں ہو، جاؤ، اُسے کہہ دو کہ تمام انتظامات مکمل ہیں، ہم نے برات پر گل پاشی کا اہتمام کر لیا ہے'...... پھر میں اُسے اپنی آنکھوں میں بسا کر لوٹ آیا۔“

”اُس نے اور کچھ نہیں کہا؟“

”نہیں تو......“

”اکیلی تھی؟“

”نہیں۔ اُس کے ساتھ پانچ چھ لڑکیاں اور بھی کھڑی تھیں۔“

”انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا؟“

”نہیں۔“

نور پور کا مولوی نکاح پڑھانے میں مصروف تھا۔ کھالا مجھے پڑھانے میں مشغول تھا۔ عشق کی نگاہ سے دیکھے ہوئے محبوب کے حسن کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے وہ ماحول سے یکسر بے خبر دکھائی دیتا تھا۔ لباس، خوشبو، آنکھیں، زلفیں، چال...... اُس نے چند ہی منٹوں میں کس کس موضوع کو نہیں چھیڑا تھا۔ مولوی نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ ہم نے بھی اُٹھا دیے۔

کھالے نے کھسر پھسر کی۔ ”شہرے! میرے ہاتھوں میں اُسی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔“

میں نے ڈانٹا۔ ”انسان بنو اور دعا کو غور سے سنو۔“

اُسے مولوی صاحب کی مانگی جانے والی دعا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ آنے والے کئی دِنوں تک اِسی ملاقات کے حصار میں گم رہنے والا عاشق تھا۔ برات آئی، بیٹھی اور چلی گئی مگر کھالے کی نگاہوں میں پڑا جما کر بیٹھی ہوئی محبوبہ نے پردۂ بصارت سے کبھی نہ اُترنے کی قسم کھالی تھی۔

رخصتی کے بعد شادی والے گھر میں خوشیوں اور پُر مسرت افراتفریوں کی جگہ ملال، اضمحلال اور تھکن نے لے لی تھی۔ عجیب اداس اور بے نام سی کیفیت میں لتھڑی ہوئی فضا دِل میں حبس پیدا کرنے لگی تو میں چپکے سے وریام خان کے دارے سے نکل آیا۔

وریام خان کے عین سامنے مشرقی سمت میں سردار بخت خان کی حویلی واقع تھی۔ وہ وریام خان کا سگا بھائی تھا مگر دونوں کے بیچ اختلافات اِس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ دشمنی کی واضح اور ناپسندیدہ فضا دونوں گھر پر مسلط ہو گئی تھی۔ سردار بخت خان اپنی بھتیجی کی شادی میں مدعو ہونے کے باوجود شریک نہیں ہوا تھا۔ شادی سے چند دن قبل وریام خان نے برادری کے رسم و رواج کے مطابق اُس کا 'میلا' کیا تھا۔ اُس کے گھر میں سردار حیات خان، اپنی بیوی اور بچوں اور برادری کے چند معززین کو لے کر گیا تھا اور شادی میں شریک ہونے کی استدعا کی تھی مگر اُس نے سب کو ناراض کر کے گھر سے اُٹھا دیا۔ اُس نے رسماً بھی تو شادی میں شرکت کی ہامی نہیں بھری تھی۔

میں نے نظر اُٹھا کر جاہ و حشم والی حویلی کو دیکھا۔ عجب یاسیت اور تنہائی کا احساس دل میں جاگزیں ہو گیا۔ بخت خان اپنے رویے اور خود ساختہ اصولوں کے باعث عملی طور پر نور پور میں بالکل تنہا ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی برادری کے ہم پلہ گھرانوں کے علاوہ، ہم جیسے درجۂ دوم کے باسی بھی اُسے ناپسند کرتے تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ اُس کے مرمریں ڈیرے پر کوئی پنچایت بیٹھی ہو، کوئی سائل یا فریادی آیا ہو یا کوئی مہمان آن ٹھہرا ہو۔ میرا بھی اُس کے ساتھ تعلق بس 'السلام علیکم' تک ہی محدود رہا تھا۔

وریام خان اور بخت خان کی حویلیاں گلی کے چوک میں غربی اور شرقی کونوں میں واقع تھیں۔ یہی گلی مشرقی سمت میں میرے گھر کی طرف جاتی تھی۔ بخت خان کے پچھواڑے پھوپی کبریٰ کا گھر واقع تھا۔ اُس سے ملحقہ گھر لعل خان کی ملکیت تھا جبکہ لعل خان کی شرقی جانب میرا یعنی چاچے چراغ کا گھر واقع تھا۔ اپنے والدین کی زندگی میں ہم دونوں بہن بھائی اپنے گھر میں رہتے تھے جو وریام خان کی حویلی کے جنوب میں گلی کے آخر پر واقع تھا۔ وہ گھر اَبھی تک خالی پڑا تھا۔ چونکہ گھر کی تعمیر کچی اینٹوں اور چکنی مٹی کے ساتھ ہوئی تھی، اِس لیے وہ زمانہ بردگی کا شکار ہو چکا تھا۔ مناسب دیکھ بھال اور رہائش نہ ہونے کی وجہ سے اَب وہ گھر نہیں، کھنڈر دکھائی دینے لگا تھا۔

یہ کھنڈر مجھے پیارا تھا۔ یہ مجھے ایک ایسا آکساوا دیا کرتا تھا جو بھری دُنیا میں مجھے کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ بے اختیار میرے قدم اُس طرف اُٹھنے لگے اور میں عجیب سی خالی الذہنی کی سی کیفیت لیے اپنے آبائی گھر کی طرف چل دیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ پہلو کی جیب میں گیا، نامراد پلٹا کیونکہ

ہر شمارہ خاص شمارہ

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

مارچ 2012ء کے نئے شمارے کی جھلکیاں

سوز و ساز

اردو ادب میں غزل گوئی کی ابتدا کرنے والے ایک باکمال شاعر کا زندگی نامہ

لینس ڈاؤن برج

پاکستان کی شان کہے جانے والے پل کا تاریخی پس منظر

چلبلا

بولی وڈ کے ایک معروف اداکار کے حالاتِ زندگی

پراسرار مخلوق

امریکا اسپیس ریسرچ سینٹر میں کیا واقعی ایلیئن قید ہیں؟ کیا دوسرے سیاروں کی کسی مخلوق کا زمین سے رابطہ ہے؟

ان کے علاوہ

پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کر کے بدنامی اٹھانے والے شخص کی روداد ”سربلند“ یورپ سے درآمد ایک پراسرار واقعہ ”دوسری زندگی“ افریقا کی سفر کہانی ”شب رنگیں“ اور بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے واقعات، معلوماتی قصے

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

اس سے میرے پاس گھر کی چابیاں نہیں تھیں۔ ناچار مجھے اپنے کھنڈر نما گھر میں جا کر یادوں کے اعادے کو اگلے دن پر موقوف کر کے اُدھر رستے سے پلٹنا پڑا۔

اگلے دن سہ پہر کو میں اپنے آبائی مکان کی طرف نکلا۔ سالخوردہ چابیوں کا گچھا میرے ہاتھ میں تھا جس میں کی رنگ کی جگہ سرخ رنگ کے کپڑے کا پٹی نما ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ حویلی کا بڑا چوبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ صحن میں ہر سُو ویرانی کا راج تھا۔ برسوں کی دھول کواڑوں اور تالوں پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ پر واقع آخری دروازے کا قفل کھولا۔ چرچراہٹ کی مخصوص آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحوں بعد میں کمرے کے عین وسط میں کھڑا تھا۔ دائیں ہاتھ پر تین چار چارپائیاں ایک دوسرے پر رکھی نظر آرہی تھیں جبکہ سامنے، دیوار کے ساتھ پیٹیاں اور پیٹیوں کے اوپر چند ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔

پیٹیوں اور ٹرنکوں پر میلی سی چادریں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے بائیں ہاتھ پر کمرے کی نکڑ میں چکنی مٹی کا بنا ہوا ایک بڑے سائز کا بھڑولا موجود تھا جس کے عین وسط میں ایک سوراخ تھا۔ سوراخ کا سائز محض اتنا سا تھا جس میں سے بہ مشکل ہاتھ کا انگوٹھا گزر سکتا تھا۔ میں اس بھڑولے کو، بھڑولے کے غیر روایتی سوراخ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں مٹی کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور میں اس اکھاڑ کے پسِ منظر سے بہ خوبی آگاہ تھا۔

میں گرد میں اَٹی ہوئی چیزوں پر حسرت کناں نگاہ ڈال کر بھڑولے تک گیا اور اُس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سوراخ کے اندر جھانکا، سوائے اندھیرے کے کچھ دکھائی نہ دیا تو میں بھڑولے کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ میری حالت خاصی دگرگوں ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن بھی حد سے متجاوز تھی۔ میرے دونوں ہاتھ بھڑولے کی نچلی کناری پر ٹک گئے اور میں سسک سسک کر رونے لگا۔ کمرے میں میری سسکیاں آسیبی آوازوں کی طرح گونجنے لگیں مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ ایسے میں اچانک کمرے میں دہشت زدہ چیخیں گونجنے لگیں۔ میرے کانوں کے پردے پھٹنے کو آگئے۔ میں نے بھڑولا چھوڑ کر دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر سختی سے رکھ دیے مگر شاید یہ آوازیں باہر سے نہیں، اندر سے پھوٹ رہی تھیں جن کا کوئی علاج نہیں تھا۔

ہاتھوں کے لمس نے بتایا کہ میرا چہرہ میرے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ میں نے آنکھیں سختی سے بند کیں۔ اچانک ناک پر بڑے سے تل والا ایک بھیانک چہرہ اُبھر کر سامنے آ گیا۔ میری ہی جانب اُٹھا ہوا، قدرے زمین کی طرف جھکا ہوا، بڑی مونچھوں والا خونخوار چہرہ جسے میں شاید زندگی کے آخری منظر کو دیکھنے تک فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

میں بہ دقت تمام اُٹھا اور دروازے کے دائیں ہاتھ پر دیوار میں بنی ہوئی الماری کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ یہاں عام استعمال کی اشیا کے نرغے میں ایک پرانی طرز کا چوبی فریم موجود تھا۔ اس طرز کے تصویروں والے فریم نور پور کے ہر گھر میں موجود تھے مگر اِس جیسا تو شاید دُنیا میں کہیں بھی نہیں تھا۔ میں نے قمیص کے اگلے دامن سے شیشے پر جمی ہوئی گرد صاف کی۔ ایک خوب صورت جوڑے کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر دکھائی دینے لگی۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر حسین اور خوش دکھائی دیتے تھے۔ ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے ہو کر تصویر کھنچوانے کا مسرت آمیز ہیجان الوہی مسکراہٹوں کی صورت میں اُن کے چہروں پر ثبت تھا۔ عورت دلہن تھی، میری ماں تھی۔ مرد دولہا تھا، میرا باپ امام دین تھا جسے اُس کی خوب روئی کے غیر معمولی وصف کی بنا پر نور پور والے پیار سے 'سوہنا خان' کہا کرتے تھے۔

فریم میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ میں نے گردن موڑ کر بھڑولے کے سوراخ کو دیکھا اور پھر میری نظریں بے اختیار اکھڑے ہوئے فرش پر جم گئیں۔ میرے ہاتھوں میں تھامی ہوئی تصویر کے حقیقی کردار اِسی فرش پر ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہوئے تھے۔ جہاں یہ بے ڈھنگا گڑھا سا دکھائی دے رہا تھا، وہاں دونوں کا خون ایک دوجے میں خلط ملط ہوا تھا۔ کیڑوں مکوڑوں نے خون کے ساتھ فرش کی مٹی بھی چاٹ لی تھی جس کی وجہ سے چکنی مٹی کے لیپ والا فرش اکھڑ گیا تھا۔ میں سست روی سے چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آ گیا۔ تصویر کو سینے سے لگا کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر جھکتے جھکتے زمین پر دراز ہو گیا اور پھر دیوانہ وار زمین کو جانوروں کی طرح چاٹنے لگا تھا۔ مٹی کا ذائقہ میرے دہن میں گھل گیا مگر مجھے اِس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

مجھے تو اپنی نمک آلود پانی ابلتی ہوئی آنکھوں کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں کتنا رویا، کیسے رویا، کچھ خبر نہیں تھی۔ بہت دیر گزر گئی۔ شاید گھنٹے گزر گئے تھے جب میں شکست خوردہ انداز میں اس محشر بداں کمرے کو تالا لگا کر باہر نکل آیا تھا۔

میں گلی کے چوک میں کچھ دیر رُکا پھر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنے گھر سے بھی آگے نکل گیا۔ افسر علی کے گھر کی شرقی جانب پختہ کھال گلی کو کراس

کرتا تھا۔ اُس پر پکی پُلی بنی ہوئی تھی۔ میں پلی پر جا کھڑا ہوا۔ لہلہاتی فصلوں سے ٹکرا کر آنے والی ہوا مجھے اپنے سحر میں لینے لگی، اپنی سرمستی میں مگن میرے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے لگی۔ میرا گاؤں بہت خوب صورت تھا۔ یہاں کے لوگ سادہ دل اور منافقانہ رویوں سے نسبتاً ناشناسا تھے۔

میں نے پُلی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایستادہ دیسی کیکر کی ایک ٹہنی توڑی، اُس کے کانٹے توڑ پھینکے اور دانتوں میں کچلتے ہوئے کھال کے پختہ کنارے پر چلنے لگا۔ میرے بائیں ہاتھ پر سردار حیات خان کے ڈیری فارم کا اونچی چھت والا شیڈ تھا جبکہ دائیں ہاتھ پر تاحدِ نگاہ لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ فارم کا شیڈ حیات خان کی حویلی سے ملحق تھا اور حویلی کی سیدھ سے آٹھ دس فٹ باہر کی طرف نکلا ہوا تھا جس کی وجہ سے کھال میں شیڈ اور حویلی کے اتصال پر بل پڑا ہوا تھا۔ میں وہ موڑ عبور کر کے آہستہ روی سے چلتا ہوا حویلی کی عقبی سمت میں واقع نکے پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہ میری اور کھالے کی مخصوص نشست گاہ تھی اور ہر لحاظ سے طویل اور رازدارانہ گفتگو کے لیے بہت موزوں تھی۔

مسواک کرتے ہوئے میں مسلسل آج سرانجام پانے والی شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ چند دن پہلے تک پورے گاؤں میں خوشیاں اور مسرت کی عجیب کیفیات دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ برات کے جاتے ہی جیسے ہر وجود پر غیر مرئی تھکن اُتر آئی تھی۔ رخصتی کے بعد میں نے سردار وریام خان کے سرخ وسپید چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ سارا رعب و دبدبہ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا، معدوم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ شکست خوردگی، بے بسی اور وفورِ حزن نے لے لی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اشک نہیں تھے مگر اُس کی ایک ایک ادا اشک بار تھی۔ اُس کی مونچھوں کے اکڑے ہوئے سرے بھی جھکے جھکے محسوس ہوتے تھے۔ ایک ہی وقت میں جب کوئی دِلاسا دے رہا تھا، کوئی فرض کی انجام دہی پر مبارک باد دے رہا تھا اور زنان خانے سے اُٹھتی سسکیوں اور آہوں کی آواز کانوں میں مسلسل روزن کاری کر رہی تھی، وہ مجھے نہایت عجیب لگا۔ جب ہر نوع کے جذبات ایک ہی وقت میں انسان پر یلغار کرتے ہیں تو شاید ایسی ہی ملی جلی عکاسی چہرے پر بکھر جاتی ہے۔

بخت خان کی بے پروائی اور سفاکی پر دل ایک پل کو بے چین ہوا۔ کیا تھا، اگر وہ اپنی بھتیجی کے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے زنان خانے میں چلا جاتا۔ اختلافات اور عداوت تو اُس کی اپنے بھائی کے ساتھ تھی، اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کے ساتھ تو دشمنی نہیں تھی۔ شادی میں شریک ہو جاتا، بھلے اپنے بھائی کو نہ بلاتا مگر جو ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر جا رہی تھی، اُس کی دل جوئی تو کر دیتا۔ شاید اُس کا خون سپید ہو گیا تھا، جذبات پر سنگین خصلتیں اپنا تسلط جما چکی تھیں یا کیا تھا کہ اُسے رخصت ہوتی ہوئی بیٹی بھی اپنے پاس بلانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

میں کچھ دیر تک نکے پر بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر کھال کے پختہ کنارے پر چلتا ہوا شمال کی جانب واقع سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ حیات خان کی حویلی کے ملحقہ مکانات کے بعد ناپختہ گلی تھی جس کی دوسری جانب اسپتال کی سرکاری ہیئت والی عمارت واقع تھی۔ یہ کھال بنیادی مرکزِ صحت کے پچھواڑے سے گزر کر ایک لکیر کی صورت اختیار کر جاتا تھا اور دور گھنے درختوں کے جھنڈ میں گم ہو جاتا تھا۔

اسپتال کی عقبی دیوار کا ایک بلاک بہت عرصہ پہلے گر چکا تھا جہاں سے میں بہ آسانی گزر کر کوارٹروں کے بیچ سے گزرتے ہوئے راستے پر پہنچ جاتا تھا۔ اِسی راستے کے دائیں طرف لان تھا جس کی نگہداشت میری عملداری میں تھی جبکہ بائیں ہاتھ پر اسپتال کے عملے کے لیے ایک قطار میں تعمیر کیے گئے چار کوارٹر موجود تھے۔ ان میں سے ایک کوارٹر غیر آباد تھا جبکہ باقی تینوں میں اسپتال کا عملہ رہائش پذیر تھا۔ لان کے ساتھ، اینٹوں کی اس روش کے دائیں ہاتھ پر بھی تین کوارٹر ایک لائن میں بنے ہوئے تھے۔ ان تینوں میں قریبی گاؤں کے سیکنڈری اسکول میں پڑھانے والے اساتذہ رہائش پذیر تھے۔ اُن کو دی جانے والی یہ ناجائز سہولت ڈاکٹر منور علی شاہ کی مرہونِ منت تھی۔

میں آہستہ روی سے چلتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی کے کوارٹر میں داخل ہوا۔ توقع کے عین مطابق اُسے صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر نیم دراز ایک ضخیم کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔

وہ مطالعہ کا بے حد شائق تھا۔ فارغ وقت میں کوئی نہ کوئی کتاب اُس کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ تنخواہ لینے کے لیے جب بھی ضلعی ہیڈ کوارٹر، مظفر گڑھ جاتا، دو چار نئی کتابیں اور رسائل کا پلندا اُٹھا لاتا۔ جو کتاب اُس کے شوق کو سیراب کر دیتی، وہ مجھے عنایت ہو جاتی۔ میں ڈاکٹر شاہ جی کے اِس اصول کی پاسداری کیا کرتا تھا کہ جو کتاب پڑھ لیتا، کوئی وقت ضائع کیے بغیر واپس کر دیتا اور دوسری اُٹھا لیتا۔

قریب پہنچ کر میں نے اپنی موجودگی کی خبر دینے کی خاطر آہستگی سے کہا۔ ”ڈاکٹر شاہ جی! کس کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں؟“

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا، کتاب بند کی اور

www.Paksociety.com

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کمرے سے دوسری چارپائی نکال لانے کا حکم صادر کر دیا۔ میں نے تعمیل کی۔

چارپائی پر بیٹھ گیا تو اُس نے پوچھا۔ ”وریام خان کی بیٹی کی شادی کیسی رہی؟“

”بہت اچھا انتظام تھا۔“

”پیسا تو پانی کی طرح بہایا گیا ہوگا؟“

”جی! سردار لوگ شادی بیاہ کے موقعے پر سدھر اُتارتے ہیں۔“

”یہ سدھر کیا بلا ہے؟“ وہ متحیر ہوا۔

”یہ مقامی زبان کا لفظ ہے۔ اِس کے معانی ہیں ’شوق پورا کرنا‘“ میں نے تفصیل سے بتایا۔ ”شادی کے موقعے پر جب برادری اکٹھی ہوتی ہے تو ہمارے یہاں کے لوگ اپنی اوقات سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں اور اپنی سدھریں اُتارتے ہیں یعنی اپنے شوق پورے کرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اس موقعے پر اگر پیسا پانی کی طرح نہ بہایا گیا تو برادری میں ناک کٹ جائے گی۔“

اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کی استہزائیہ لکیر کھنچ گئی۔ قدرے توقف کے بعد گویا ہوا۔ ”میں نے تعلیم حاصل کرنے کے دوران کسی نصابی کتاب میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ وہ ایک پنجابی زمیندار کی ایسی ہی سدھروں اور نام نہاد رسومات کی ادائیگی پر لکھی گئی تھی۔ وہ اپنی سدھریں پوری کرتے کرتے خود پورا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں، شادی بیاہ کے موقعے پر لوگ اتنے فضول خرچ ہو جاتے ہیں کہ چند لمحوں میں ہی خون پسینے کے عوض حاصل کی گئی جمع پونجی کو بے دردی سے لٹا دیتے ہیں۔“

”شاہ جی! یہ کہاں خون پسینا بہاتے ہیں؟“ میرا لہجہ طنز سے معمور تھا۔

”ہاں! مگر حلال کمانے والے بھی اِس موقعے پر بھول جاتے ہیں کہ اُنہوں نے بڑی جانفشانی سے چند ٹکے جوڑ رکھے ہیں۔“ شاہ جی نے کہا اور میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

قدرے توقف کے بعد ڈاکٹر شاہ جی نے اپنی مخصوص بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شادی، دو انسانوں کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ بقیہ زندگی مشترکہ طور پر گزارنے کے عہد کا نام ہے۔ اِس میں دکھاوے اور زمانے کو اپنی امارت دکھانے کی گنجائش نہیں ہے۔ معاشرے کی رگوں میں سرایت شدہ عدم مساوات کو آشکار کرنے کی ضرورت بھی تو نہیں دکھائی دیتی، پھر نہ جانے کیوں لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بنیادی ضرورت اِس امر کی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے اِس نئے تعلق کے پسِ منظر میں دونوں کی کامل رضامندی شامل ہو۔ اِس پر توجہ نہیں دی جاتی بلکہ غیر ضروری معاملات کو خوشی کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔“

”آپ کے خیال میں شادی کا طریقِ کار کیا ہونا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی دانش بھری باتیں اچھی لگتی تھیں۔ وہ مذہبی، سماجی یا معاشرتی، کسی بھی موضوع پر پوری دیانت داری اور غیر جانبداری سے بات کرتا تھا۔ لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ ہونے والی عالمانہ نشستوں، اُس سے لے کر پڑھی جانے والی کتابوں اور میری ذہانت نے میرے ذہن میں بے شمار معلومات اکٹھی کر دی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں محض گریجویٹ ہونے کے باوجود اپنی گفتگو کی سلاست اور روانی سے کسی طرح بھی ماسٹرز سے کم سمجھا نہیں جاتا تھا۔

اُس نے اپنے مخصوص گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”شہر یار! دُنیا میں دو ہی خاندان آباد ہیں۔ ایک انسان، دوسرا انسان کا دشمن۔ انسان کے دشمن کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان نفرت، ناانصافی اور عدم توازن کے بیج بوتا رہے۔ چونکہ اِس خاندان کے افراد کے پاس لفاظی، بہروپ سازی اور جھوٹے دلائل کی اجلی شکلیں موجود ہیں، اِس لیے یہ اپنے مذموم مقاصد میں ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔ انسان بھولا بھالا اور سادہ لوح رہا جس کی وجہ سے انارکی، انتشار اور خون کے بے دریغ بہاؤ نے اُسے کبھی آسودہ نہیں رہنے دیا۔“

چند لمحے لمبی لمبی سانسیں لیں، پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”وریام خان، جس نے میرے اندازے کے مطابق لاکھوں روپے شادی پر ضائع کر دیے مگر اُس نے یہ نہیں سوچا کہ اپنی بیٹی کے ساتھ ساتھ وہ گاؤں کے کسی غریب گھر کی لڑکی کی رخصتی کا بھی اہتمام کر دیتا تو کیا بھوکا رہ جاتا...... اپنی بیٹی کے جہیز میں ایک غریب خاندان کی مخلصانہ دعائیں بھی شامل کر دیتا جو اُسے سدا خوش حال رکھتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر انسانوں کے دشمن قبیلے نے انسانوں کی سوچ اور عمل کو یرغمال بنا رکھا ہے۔“

میں بڑی توجہ اور انہماک سے ڈاکٹر شاہ جی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ دھیمے اور گمبھیر لہجے میں بڑی تلخ اور سفاک باتیں روانی میں کر جاتا تھا۔ مجھے متوجہ پا کر بولا۔ ”تمہیں یاد ہوگا، جب شیرے قسائی کی بہن کا ہاتھ چارہ کاٹنے والی مشین میں آ کر کٹ گیا تھا اور اُس کا شوہر اُسے اسپتال میں لے آیا تھا، یاد ہے ناں؟...... تب اسپتال میں روایتی دوائیں موجود تھیں

مگر وہ دوائیں موجود نہیں تھیں جن کی ضرورت تھی۔ شیرے کی بہن کی معاشی حالت ایسی تھی کہ وہ ایک وقت کی دوا بھی خرید نہیں سکتی تھی۔ مجھے ترس آیا، میں نے اپنے ڈسپنسر کو بھیج کر تین دنوں کی دوا اپنی گرہ سے منگوا لی کیونکہ اُن دنوں اسپتال میں ایل پی (لوکل پرچیزنگ) کی سہولت موجود نہیں تھی۔ دوا کا استعمال ایک ماہ کے لیے ناگزیر تھا۔ میرے کہنے پر شیرے کا بہنوئی اپنی بیوی کو لے کر وریام خان سمیت نور پور کے سبھی خانوں کے گھروں میں گیا تھا۔ دو چار ہزار کی بات تھی، لاکھوں کا معاملہ نہیں تھا اور فاطمہ نے تو اپنی تمام عمر ان لوگوں کی خوشامد کرنے، ان کے گھروں کے کام کاج کرنے میں گزار دی تھی۔ کیا تھا کہ چار ٹکے اُس کی خدمت کا عوضانہ سمجھ کر دے دیے جاتے۔ کسی نے نہیں دیے۔ اُس کا زخم خراب ہو گیا۔ جب میں فاطمہ کو لے کر مظفر گڑھ کے اسپتال کی طرف روانہ ہوا تو میرے اور فاطمہ کے علاوہ ساتھ چلنے والا بھی کوئی نہیں تھا...... پھر؟ وریام خان کی بیٹی کی رخصتی پر مجھے کیا خوشی ہو، فاطمہ اور اُس کے خاندان کو کیا مسرت ہو، مگر یقیناً وہی فاطمہ اپنے ایک ہاتھ کے ساتھ وریام خان کے زنان خانے میں پھرکی کی طرح پھرکتی ہوئی دکھائی دیتی ہوگی۔ ایسا ہی ہے ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ بات کرتے کرتے نڈھال سا ہو گیا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے مجھے انسانوں کے بیچ میں پلنے والی بے عنوان نفرت اور عدم تعاون پر مبنی سوچوں کے بارے میں متعلقہ واقعات سناتا اور اپنے آپ میں کڑھتا رہتا تھا۔ پورے گاؤں میں اُس کا میں ہی سامع تھا اور بارہا تجربے سے ثابت ہوا تھا کہ میں بہت اچھا سامع تھا۔

اُس نے موضوع بدل دیا۔ ”کافی دِنوں سے خالد محمود دکھائی نہیں دے رہا، کہیں گیا ہوا ہے؟“

”وہ کئی دن وریام خان کے دارے پر، شادی کے کام کاج میں مصروف رہا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”حیات خان کی ویگن چلا رہا ہے؟“

”جی! اچھی دیہاڑی بن جاتی ہے اُس کی۔“

”وہ اگر ویگن چلانے کے بجائے اپنے باپ کے کام کاج کو سنبھال لے تو کہیں زیادہ بچت متوقع ہے۔“

میں نے بلاوجہ ہنس کر کہا۔ ”اُسے اپنے باپ دادا کے کام سے نفرت ہے۔“

”اُس کی احمقانہ سوچ پر تعجب ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”کسی کی نوکری سے اپنا کاروبار بہرحال بہتر ہوتا ہے۔“

میں نے کندھے اُچکائے، خاموش رہا، پھر بولا۔ ”آپ شادی میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟“

”میں ایسی محفلوں سے کتراتا ہوں۔“

”کیوں؟“ میرے منہ سے بے ساختہ برآمد ہوا۔

اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کچھ کہہ نہ پایا۔ کوٹھی کے مرکزی دروازے پر اچانک شور بپا ہو گیا۔ شور میں نسوانی آواز نمایاں تھی۔ ہم دونوں اَبھی معاملے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ فاطمہ، جس کا تذکرہ ہمارے درمیان کچھ دیر پہلے چھڑا تھا، دوپٹے سے بے نیاز بھاگتی ہوئی صحن میں گھس آئی۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پھولی ہوئی سانس میں بہ وقت تمام بولی۔ ”ڈاکٹر جی! وہ...... حویلی میں چلو...... وہ...... وہ بیمار ہو گئی ہے......“

”کس حویلی میں؟ کون بیمار ہے؟ ذرا دم لے کر بتاؤ تو کچھ سمجھ آئے۔“ ڈاکٹر شاہ جی نے نامانوس کوفت زدگی کے عالم میں کہا۔

میں چارپائی سے اُترا اور اُس کے قریب ہو کر بولا۔ ”کون بیمار ہوا ہے ماسی فاطمہ؟“

وہ ایک ذرا تھم گئی، گردن میں دوپٹے کی غیر موجودگی کو بھانپا اور نہ پا کر شرمسار سی ہو گئی، بولی۔ ”خان صاحب دی مزمان (مہمان) بیمار تھی گئی اے ...... پیٹ میں بڑا سخت مروڑ اُٹھا ہے بے چاری کے، دہری ہو گئی۔ ڈاکٹر جی! فوراً میرے ساتھ چلیں، خان صاحب بڑے پریشان ہیں۔“

”کون خان صاحب؟“ ڈاکٹر شاہ جی کے تیور بدل گئے۔

”اپنے خان صاحب، وریام خان...... بلوچ نگر سے شادی پر اُن کے مزمان (مہمان) آئے ہوئے تھے۔ اُن کی بچی......“

ڈاکٹر شاہ جی نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ”تم منہ اُٹھا کر میرے پاس دوڑی چلی آئی ہو، جاؤ، اپنے خان صاحب سے کہو کہ مریضہ کو گاڑی میں بیٹھا کر اسپتال لے آئیں۔“

”آپ اگر......“

”جو میں نے کہا، اُس پر عمل کرو۔ جاؤ اور مریضہ کو یہاں لے آؤ۔“ ڈاکٹر شاہ جی نے نیم برانگیختہ لہجے میں کہا اور منہ پھیر لیا۔ فاطمہ اُلٹے قدموں دوڑتی ہوئی کوٹھی سے نکل گئی۔ ایسے میں پتا چلا کہ اُس کے ساتھ چند عورتیں اور بھی آئی تھیں جو دروازے پر ہی ٹھہر گئی تھیں۔

میں نے شکوہ کناں انداز میں ڈاکٹر شاہ جی سے کہا۔ ”شاہ جی! اگر دو پل کے لیے وریام خان کی حویلی پر چلے

www.Paksociety.com

جاتے تو کچھ بگڑنے والا تو نہ تھا۔"

اُس نے ایک نگاہ عجب مجھ پر ڈالی، کچھ سوچا، پھر استہزائیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ "شہریار! دُنیا ایسی ہی ہے۔ میں اگر اپنے پیروں پر چل کر کسی مریض کے پاس جاؤں گا تو میرا کچھ بگڑ نہیں جائے گا مگر میں صرف اور صرف غریب اور بے کس لوگوں کے لیے اپنی توانائیاں خرچ کرتا ہوں۔ خصوصاً وہ جن کے پاس مریض کو اسپتال لانے کے لیے سواری کا انتظام نہیں ہوتا۔ وریام خان کے پاس کار ہے۔ وہ چاہتا تو مریضہ کو یہاں تک لا سکتا تھا مگر وہ محض اپنی بڑائی کو حیثیت دینے اور نور پور والوں کو یہ سمجھانے کے لیے مجھے بلا رہا ہے کہ وہ مجھے بلانے کی قدرت رکھتا ہے۔"

"شاہ جی! آپ کے نہ جانے سے مریضہ کو نقصان پہنچ رہا ہے، نہ کہ وریام خان کو۔" میں اپنے موقف پر بہ ضد رہا۔

وہ بولا۔ "چھوڑو اس تذکرے کو، کیا تم نے فاطمہ کے رویے پر غور کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں! وہ بے چاری سخت پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس سے بات کرنی بھی مشکل ہو رہی تھی۔"

"ہاں...... مگر وہ پریشان کس کے لیے تھی؟ اُن لوگوں کی اولاد کے لیے جنھوں نے اُس کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر نخوت سے منہ پھیر لیا تھا۔ زخم خراب ہو گیا، بدبو آنے لگی تو اُس پر اپنی حویلی کے دروازے بند کر لیے اور اپنے بچوں کو اُس کے گھر جانے سے منع کر دیا...... اُنہی لوگوں کے لیے وہ ننگے پاؤں، ننگے سر دوڑی چلی آئی...... شہریار! یہی خامی معاشرے کے سدھار میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جھٹلانے اور ٹھکرانے والے کو ٹھکرایا جائے، بے عزت کرنے والے کو بے عزت کیا جائے تو وہ اپنی اوقات میں لوٹ آتا ہے۔ ٹھوکروں کی زد میں رہ کر بھی خوشامدیں کی جائیں، جھوٹی سچی تعریفیں کی جائیں تو وہ انسانی مقام سے پھسل کر فرعونیت کی پستی میں لڑھکنے لگتا ہے۔"

مجھے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کون بیمار ہوا تھا؟ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی بات سنی، کچھ اتفاق ہوا، کچھ اختلاف بھی رہا مگر میں شاید اِس وقت اِس بحث کا متحمل نہیں تھا، بولا۔ "میں میڈیکل کٹ لے آؤں؟"

کٹ اسپتال کی مرکزی عمارت میں، ڈاکٹر شاہ جی کے دفتر میں پڑی رہتی تھی۔ ڈیوٹی کے اوقات کے بعد ضرورت پڑنے پر میں مقفل اسپتال کو کھول کر اُسے اُٹھا لاتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں یہ کام اسپتال کا چوکیدار سرانجام دیتا تھا۔

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دی اور میں چابیاں اُٹھا کر کوٹھی سے نکل آیا۔

میں کٹ نکال کر اسپتال کی سیڑھیاں اُتر ہی رہا تھا کہ کھلا مین گیٹ عبور کر کے وریام خان کی کار اسپتال کے احاطے میں داخل ہوئی۔ میرے قریب پہنچ کر کار کی عقبی کھڑکی سے وریام خان نے جھانک کر دبنگ لہجے میں کہا۔

"اوئے شہرے! ڈاکٹر کتھاں ہے؟"

(اوئے شہرے! ڈاکٹر کہاں ہے؟)

میں نے کوارٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر صاحب اپنی کوٹھی پر ہیں۔"

اُس نے 'ہونہہ' کہہ کر سر اندر کر لیا اور کار بائیں طرف مڑ کر کوٹھی کی طرف تیز رفتاری سے بڑھ گئی۔ مجھے وریام خان کے چہرے پر خفگی کے آثار مترشح دکھائی دیے تھے اِس لیے میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر شاہ جی کی خیر نہیں۔ اُس نے وریام خان کی حکم عدولی کی تھی اور اَب اُسے اپنے اس عاقبت نا اندیش رویے کی سزا بھگتنا تھی۔ میں تقریباً دوڑتے ہوئے کار کے پیچھے پیچھے کوٹھی کے دروازے تک پہنچا۔ وریام خان کار سے اُتر کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اندر ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا وہ اکیلا ہی رہتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی خان جی! آپ اندر آ جائیں۔"

میں دروازہ عبور کر کے کھلے صحن میں آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کو چارپائی پر بہ دستور مطالعے میں غرق پایا۔ میں نے گلا کھنکار کر اُسے متوجہ کیا۔ "شاہ جی! خان جی آئے ہیں، آپ سے ملنے کے لیے۔"

اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں وریام خان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہمارے قریب پہنچ گیا۔ خشمگیں آنکھوں سے ڈاکٹر شاہ جی کو گھورتے ہوئے اکھڑ لہجے میں بولا۔ "فاطمہ قسائین تمھیں بلانے کے لیے آئی تھی۔"

ڈاکٹر شاہ جی نے کتاب بند کر دی، چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، قدرے بے پروائی سے بولا۔ "ہاں! آئی تھی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ مریضہ کو یہاں لے آئے۔ مریضہ کے بجائے آپ تشریف لے آئے۔ خوش آمدید!"

"میں نے تمھیں کسی دعوت پر نہیں، مریضہ کو دیکھنے اور اس کا علاج کرنے کے لیے بلا بھیجا تھا۔ چلو میرے ساتھ اور بچی کو دیکھو...... اُس کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔"

وریام خان کے لہجے کا اشتعال شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

میں نے آہستگی سے کہا۔ "چلیں ڈاکٹر شاہ جی! چند منٹوں کی تو بات ہے۔"

شاہ جی نے ایک نگاہ سرزنش مجھے دیکھا، پھر وریام خان کو مخاطب کر کے بولا۔ "اپنا لہجہ درست کریں۔ میں آپ لوگوں کا ملازم نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کا رعب و دبدبہ برداشت کرتا ہوں۔ آپ جس گاڑی میں آئے ہیں، اُسی گاڑی کی ایک سیٹ پر مریضہ کو بٹھا کر لایا جا سکتا تھا۔ اَب براہِ کرم جائیں اور اُسے یہاں لے آئیں۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ ہاں! کبھی خدانخواستہ ایمرجنسی ہوئی تو آپ کو لینے کے لیے آنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔"

شاہ جی کے لہجے میں غیر معمولی ٹھہراؤ تھا۔

"کیا مطلب؟ کیا تم میرے ساتھ نہیں چل رہے؟"

وریام خان نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"یقیناً نہیں...... وقت ضائع مت کریں اور مریضہ کو یہاں لے آئیں۔ یہ اسپتال ہے، یہاں ضرورت کی تمام دوائیں اور آلات موجود ہیں، وہاں کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔"

وریام خان ایسے جواب کا عادی نہیں تھا۔ اُس کی صورت چند لمحوں میں ہی بگڑ کر رہ گئی۔ قدم بڑھایا، آنکھیں دکھائیں اور دانت پیس کر بولا۔ "تمھیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

"مجھے ایسی کوئی مجبوری لاحق نہیں ہے خان صاحب!"

شاہ جی کا لہجہ بہ دستور بے پروائی سے پُر تھا۔

میں ایسی صورتِ حال میں پہلی مرتبہ اُس کا شخصی استحکام ملاحظہ کر رہا تھا جو میرے لیے باعثِ حیرت تھا۔

عین ممکن تھا کہ وریام خان اپنی سرشت کے مطابق ڈاکٹر شاہ جی پر حملہ آور ہو جاتا مگر خیر گزری کہ کوٹھی کے دروازے میں جھانک کر ڈرائیور نے بہ آوازِ بلند کہا۔

"خان جی! چھوٹا خان بی بی کو اپنی کار میں لے آیا ہے، کیا اُسے اندر بلا لوں؟"

وریام خان مشتعل سانپ کی طرح پھنکار کر پلٹا، چیخا۔

"میں ڈاکٹر کو لے کر حویلی میں آ ہی رہا تھا، تم لوگوں نے کیوں 'مزمان بی بی' کو تکلیف دی۔"

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر شاہ جی کے لبوں پر مخصوص زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر میڈیکل کٹ چارپائی پر رکھ دی۔ ڈھکن کھول کر اُس میں موجود آلات اور ادویات کو دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی معیت نے مجھے ڈسپنسر بنا دیا تھا۔ پٹی کرنا، ٹیکا لگانا اور چھوٹے موٹے امراض کی تشخیص و علاج پر مجھے قدرت حاصل ہو چکی تھی۔ اِس لیے میں نے فوری طور پر مطلوبہ امپیول توڑ کر سرنج میں بھر لیا۔

بہرام خان اور فاطمہ قسائین سہارا دیے 'بی بی' کو اندر لے آئے۔ میں نے بی بی کو دیکھا تو میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ اسما تھی جسے میں نے گزشتہ شب میں بالکل تندرست اور چہکتے کودتے دیکھا تھا۔ اِس وقت اُس کی حالت واقعی بہت زیادہ خراب تھی۔ اُن کے ساتھ آئے ہوئے دوسرے افراد کوٹھی کے باہر رہ گئے جبکہ وریام خان کا ڈرائیور بھی سر جھکائے کوٹھی سے نکل گیا۔ اَب وریام خان، اُس کا بیٹا، فاطمہ قسائین، میں اور ڈاکٹر شاہ جی چارپائی پر لٹائی گئی اسما کے چہار اطراف میں کھڑے تھے۔

وریام خان نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "اوئے شہرے! تم بھی جا کر باہر ٹھہرو۔"

میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سرنج میڈیکل کٹ کے کھلے ڈھکن پر رکھی اور سر جھکا کر جانے لگا۔ ایسے میں ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے روک لیا۔ "تم کہاں جا رہے ہو، اِدھر آؤ، میری مدد کرو۔"

میں رُک گیا۔ چابی بھرے کھلونے کی طرح جس کی اچانک چابی ختم ہو گئی ہو۔ اُس کے ہاتھ کے اشارے پر مریضہ کے قریب ہو گیا۔ وہ اسما سے کیس کی ہسٹری لے رہا تھا۔ کیا کھایا، کب کھایا اور درد کہاں محسوس ہو رہا ہے، وغیرہ۔

میں دانت بھینچ کر کراہتی اور تڑپتی اسما کو دیکھ کر بلاوجہ بے چین ہو رہا تھا۔ مجھے اُس پر ترس آ رہا تھا۔ وریام خان بھی مضطرب تھا۔ بار بار دریافت کر رہا تھا۔ "خطرے کی بات تو نہیں؟"

ڈاکٹر شاہ جی کوئی جواب دیے بغیر اپنے کام میں مشغول رہا۔ پیٹ کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "شہریار!"

"جی شاہ جی!"

"فوربی سی سپاس رڈ...... انجیکٹ ہر آئی وی پلیز۔"

میں نے سرعت سے سرنج اُٹھائی۔ وریام خان کے بیٹے بہرام خان کو مخصوص طریقے سے اسما کا بازو سختی سے پکڑایا اور کپڑا ہٹا کر اُنگلی کی مدد سے ورید کو اُبھارنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری یہ کوشش غیر ارادی اور نافہمیدہ تھی کیونکہ اسما کے بازو کی نیلگوں رگیں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوئی بازو پر رکھی۔ ایسے ہی وقت میں میری نگاہ اُس کے چہرے پر پڑی۔ وہ نیم سراسیمگی کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایک ثانیے کو ہماری نگاہیں چار ہوئیں، پھر میں نے اپنی توجہ انجیکٹ ہونے والی دوا کی طرف مبذول کر لی۔

ایک عجیب طرح کی نامانوس ہیجان خیز کیفیت مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے مزید دوا انجیکشن ملا کر

www.Paksociety.com

ماس میں لگانے کا حکم صادر کیا۔ میں تعمیل میں مشغول ہو گیا مگر میرا ذہن گلاب کے پھول کی طرح نرم و ملائم بازو کے لمس پر اَٹک کر رہ گیا۔ شاہ جی کے حکم پر میں نے اَن گنت لڑکیوں اور عورتوں کے بازوؤں میں ٹیکے لگائے تھے مگر آج تک کسی بھی لمس میں اتنی جاندار گرفت اور خطرناک تندی نہیں دیکھی تھی۔ دوسرے بازو کے اوپر والے حصے میں سوئی چبھوتے ہوئے میرے ہاتھوں میں واضح ارتعاش موجود تھا۔

ٹیکا لگانے کے بعد ارادتاً زیادہ دیر تک شانے کو سہلاتا رہا پھر پیچھے ہٹ گیا۔ دس منٹ کے دورانیے میں اسما شانت ہو گئی۔ اُس کے چہرے کی غیر معمولی سرخی کم ہوتی گئی اور اگلے پانچ دس منٹ میں وہ چارپائی پر اُٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے پوچھا۔ ”جی بیٹا! کیا محسوس کرتی ہو؟“

اُس نے بے ساختہ پیٹ پر ہاتھ پھیرا، ہونٹوں کو زبان سے نم کیا اور بولی۔ ”درد ہے تو سہی مگر بہت کم ہے، چلوں پھروں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تو اللہ کا نام لے کر چلو پھرو اور اپنے ڈاکٹر انکل کے سرکاری گھر کا وزٹ کرو۔“ شاہ جی کے چہرے پر کبھی کبھار دکھائی دینے والی معصوم سی مسکراہٹ دمکنے لگی۔

”انکل! پہلے کبھی اتنی شدت کا درد نہیں ہوا تھا۔“

”پریشانی کی بات نہیں ہے بیٹا! کھانے پینے میں بے پروائی.... اور کھانے کے اوقات میں تبدیلی کی وجہ سے بدہضمی ہو جاتی ہے۔ دیگوں میں تیز مصالحے والا سالن تیار کیا جاتا ہے۔ معدہ ایسے کھانے کا عادی نہیں ہوتا، اِس لیے جسم کی طرف سے شدید نوعیت کی مزاحمت دیکھنے میں آتی ہے۔“ ڈاکٹر شاہ جی نے تفصیل سے بتایا۔

یہ پُرتضاد شخص مجھے قدم بہ قدم حیران کرتا رہتا تھا۔ سمجھنے کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اُسے آج تک سمجھ نہیں پایا تھا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کس بات پر خوش ہوگا، کس پر ناراض اور کس بات پر خاموش رہے گا۔ اُس کے ردِعمل کا قبل از وقت اندازہ کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ وریام خان کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے والا، اُس سے بڑا اور کہیں زیادہ مضبوط دکھائی دینے والا ڈاکٹر منور، اسما کے مقابل، معصوم بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ چہرہ اندرونی آسودگی کے گل رنگ عکس سے مالامال تھا۔

میں اس کے پہلو میں چارپائی کے پائنتی کی جانب بیٹھا چور نگاہوں سے کسی تتلی کے مانند کمرہ کمرہ گھومتی اسما کو دیکھتا رہا۔ وہ پوری کوٹھی کو دیکھ بھال آئی اور فاطمہ کے قریب کھڑے ہو کر بولا۔ ”چلیں؟“

”تم اَب بالکل ٹھیک ہو ناں؟“ وریام خان اَبھی متفکر تھا۔

”جی انکل...... میں فٹ ہوں۔“ وہ بولی۔ وریام خان کھڑا ہو گیا۔

جاتے جاتے رُک کر پلٹا، چبھتی ہوئی نگاہیں ڈاکٹر شاہ جی پر گاڑ کر بولا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا۔ ساگر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنے والا اَوکھ (مشکل) میں پڑ جاتا ہے۔“

شاہ جی نے جواباً مسکرا کر کہا۔ ”مگر مچھ کو بھی محتاط رہنا چاہیے۔ بدہضمی کی صورت میں اُسے اپنے معالج کے پاس ہی آنا پڑتا ہے جو علاج کے بہانے اُس کے نوکیلے دانت بھی کھینچ سکتا ہے۔“

”نوکر، نوکر ہی ہوتا ہے خواہ سرکار کا ہی کیوں نہ ہو۔ سیانے کہتے ہیں کہ نوکری کر کے پیٹ پالنے والے کو اکڑ زیب ہی نہیں دیتی۔“ وریام خان کے لہجے سے عیاں دھمکی کو میں بھی محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

”ہاں...... ٹھیک کہتے ہیں آپ، مگر آپ کو شاید علم نہیں کہ میں نے فاقہ کشی کو پہلے ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ رہی بات نوکری کی، تو آپ لوگوں کے اختیار میں فقط اتنا ہے کہ میل جول کر کے میرا اِس اسپتال سے کسی اور اسپتال میں تبادلہ کروا سکتے ہو۔ جی مانے تو تبادلہ کروا دو۔ میں جہاں بھی جاؤں گا، ایسی ہی کوٹھی اور اسپتال میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اَن گنت غریب اور دو چار فرعون میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔“ شاہ جی کے لہجے میں تلخی آمیز بے پروائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ”ہاں! یہ ممکن ہے کہ یہاں میری جگہ پر آنے والا ڈاکٹر اپنی رہائش شہر میں ہی اختیار رکھے۔ ڈیوٹی کے بعد اسپتال میں آپ لوگوں کو ایک آدھ شیر مار کہ گولی دینے والا بھی نہیں ملے گا۔“

”شاید تمہیں علم نہیں ہے کہ تمہارے پاس لائی جانے والی کون ہے ورنہ تم اتنا اونچا نہ بولتے...... ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”میں واقعتاً نہیں جانتا مگر یقیناً یہ آپ کی عزیزہ ہے۔ یہ نور پور کی رہنے والی نہیں ہے۔“

”یہ سردار حیدر خان کی بیٹی ہے۔ حیدر خان کو تو تم جانتے ہو گے...... ہیں نا؟“ وریام خان کا لہجہ بپھرا ہوا تھا۔

”شاید آپ بلوچ نگر والے سردار حیدر خان کی بات کر رہے ہیں۔“

”ہاں! میں اُسی کی بات کر رہا ہوں۔ اگر اُسے تمہاری ہٹ دھرمی کا پتا چل گیا تو وہ تمہیں کھڑے پیر نوکری سے نکلوا

دے گا۔“ وریام خان کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔

زہرخند مسکراہٹ ڈاکٹر شاہ جی کے لبوں پر تیر گئی۔ اُس نے اپنے تئیں سردار وریام خان کی دھمکی کا مکمل اور مختصر جواب دے دیا تھا جو اپنے مفہوم انگیز متن کے ساتھ وریام خان سمیت ہر شخص پر آشکار ہو گیا تھا۔

وریام خان کا بیٹا اپنے باپ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں صورتِ حال سے آگہی مانگنے لگا۔ باپ نے جوان سال بیٹے کو دیکھا اور پھر دھمکی آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کوٹھی سے نکل گیا۔ اسما نے ڈاکٹر شاہ جی کو سلام کیا، اجازت چاہی اور مسکرا کر کہا۔ ”انکل! ویٹ فار می، آئی شیل کم بیک سون!“

”اوکے مائی سن! آئی کیئر اباؤٹ یو......“ ڈاکٹر نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اسما نے ایک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔ سلام، شکریہ یا کچھ اور...... بہرحال کچھ مفہوم آمیز تاثر اُس کی آنکھوں سے ایک ثانیے کو ہویدا ہوا تھا پھر اُس نے وریام خان کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔ گاڑیوں کے دروازے بند ہونے، گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے اور چلے جانے تک میری نگاہیں کوٹھی کے کھلے دروازے کے خلا پر جمی رہیں۔ اسما کے لہرا کر نکلنے کا آخری منظر کئی ساعتوں تک ٹھہرا رہا، پھر ہولے ہولے تحلیل ہو گیا۔

دُور سے ملنے والی، حسن کی ایک جھلک پر جینے والا کھالا اگر میرے ساتھ ہوتا یا میری جگہ پر ڈاکٹر شاہ جی کو اسسٹ کر رہا ہوتا تو یقیناً اسما کے دروازے سے نکلتے ہی اینٹوں کے بنے فرش پر ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ اُس کے جنوں کو دیکھتے ہوئے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ حسن کے دیدار کی اتنی طویل مہلت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

دن دھندلا گیا۔ شام اُتر آئی۔ میدان صاف ہونے پر شاہ جی نے مجھے بانہہ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، سمجھایا۔ ”شہر یار! پڑھنے سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں بارہا سمجھایا کہ کسی بھی انسان کو فرعون بنانے میں مرکزی کردار اُس کے اردگرد بسنے والے لوگ ہی ادا کرتے ہیں۔ کوئی از خود اتنا بڑا غیر فطری بہروپ اختیار نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مریضہ کون ہے، یہ ضرور جانتا تھا کہ اس کے لیے نور پور کا بپھرا ہوا خانزادہ دیوانگی کی ہر حد عبور کر سکتا ہے مگر یہ ضروری تھا کہ اُسے اسپتال میں لایا جاتا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو نور پور کے غریبوں کے دل پر اس کی مزید دھاک بیٹھ جاتی کہ جو ڈاکٹر کسی کو سیدھے منہ بلانا پسند نہیں کرتا، وہ خان کے ایک ہی بلاوے پر سر کے بل دوڑا چلا آیا۔ میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتا۔ غریب اپنے پیروں پر چل کر میرے پاس آتا ہے تو امیر کو بھی ایسا کرنا ہوگا۔ اُسے یہ رعایت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی کار پر سوار ہو کر میرے پاس آ سکے۔ میں سوائے ناگزیر حالت کے، کسی کے گھر نہیں جاؤں گا۔“

”خان زادی بیمار بھی تو تھی ناں!“ میں نے ہولے سے کہا۔

”بیمار تھی مگر اتنی نہیں کہ وریام خان کی حویلی سے اسپتال تک نہ پہنچ سکتی۔ تم نے دیکھا، یہاں کی دیہاتی غریب عورتیں کس طرح اپنے لاغر اور بیمار بدنوں کو اپنی طاقت سے گھسیٹتے ہوئے مجھ تک پہنچ جاتی ہیں۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ کیا اُن کے بدنوں میں سرایت کرتے ہی بیماری اپنی نوع اور شکل بدل لیتی ہے؟ نہیں شہر یار! ایسا نہیں ہے۔ مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔“

گفتگو میں کچھ توقف آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی خاموش رہا، پھر بولا۔ ”تم نے نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے کہ شہروں میں امیرزادیاں ائرکنڈیشنڈ گاڑی پر شاپنگ مال جاتی ہیں۔ اپنے ملازموں کی مدد سے شاپنگ کرتی ہیں۔ اُن کے انتخاب کو شاپنگ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ملازم سامان اُٹھا کر ڈگی میں ڈالتے ہیں، اُتارتے ہیں اور جب وہ گھر پہنچ کر گاڑی سے قدم زمین پر رکھتی ہیں تو بے ساختہ اُن کے لبوں سے نکلتا ہے کہ 'ہائے گاڈ! آج تو تھکن کے مارے بُرا حال ہو گیا ہے'...... پھول اُٹھاتی ہیں، کلائی میں بل آ جاتا ہے۔ بالوں کا گجرا گردن تھکا دیتا ہے۔ مہنگے جوتے ایڑیاں مسل دیتے ہیں۔ یہاں کیا ہوتا ہے؟ ایک عورت، جس کی فرٹیلٹی عین وہی ہے، منہ اندھیرے مویشیوں کو چارا ڈال کر دودھ دوہتی ہے اور پورے گھر کو ناشتا کرواتی ہے۔ برتنوں کی دھلائی سے فارغ ہوتے ہی کھیتوں میں چلی جاتی ہے۔ سارا دن کپاس چنتی ہے، چارا کاٹتی ہے، گوڈی کرتی ہے اور گھر واپس آ کر شام کا کھانا تیار کرتی ہے۔ رات گئے سونے کے لیے لیٹتی ہے تو اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے کہ 'اللہ سوہنا! سِدھ کریں'...... گھر والا موچھوں کو بل دے کر کہتا ہے کہ 'سارا دن پڑی اینڈتی ہو، ہڈ پیر ہلا لیا کرو تو نیند جلد آ جایا کرے گی'...... یہ فرق وہی ہے جو انسان دشمن قوتوں نے ہر دو انسانوں کے بیچ حائل کر دیا ہے۔ اِسے ختم کرنے کا اَب ایک ہی طریقہ ہے کہ جو تنہا ہونا چاہتا ہے، اُسے تنہا کر دیا جائے۔ بس!“

میں یک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ منہ پھٹ انسان تھا، بدتمیز، لگی لپٹی کے بغیر سیدھی بات کہہ دینے والا، اپنے دل میں غریبوں کے لیے کتنا نرم گوشہ رکھتا تھا۔ شاید کسی فاقہ

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

مست وخاک بسر کا دل امیر زادے کی پسلیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے میڈیکل کٹ میں سامان ترتیب کے ساتھ سمیٹا اور کٹ بغل میں دابے ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی سے نکل آیا۔

کھال کے نکّے پر کھالے کو براجمان پایا۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا اِدھر آن نکلا تھا۔ اُسے شاید اسما کی بیماری کا علم نہیں ہوا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”کل برات چار بجے واپس روانہ ہوئی تھی۔ پانچ بجے تک سبھی مہمان بھی رخصت ہو گئے مگر میں اپنی دکان کے باہر بنچ پر بیٹھا رہا۔ خواہش تھی کہ اُس کی ایک جھلک دیکھ لوں مگر شاید خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر گئی ہی نہیں۔ مایوس ہو کر میں گھر جا کر لیٹ گیا۔ آج بھی سارا دن دکھائی نہیں دی۔“

”تو کیا تم نے آج کام سے چھٹی کی ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یار! گاڑی کو بڑی محنت سے خراب کرنا پڑا تھا۔“

”کیا اسما کو ایک مرتبہ قریب سے دیکھنے کے بعد بھی دیکھنے کی حسرت تمہارے دل میں موجود ہے؟“ میں نے چھیڑا۔ ”تم نے مجھے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر خدا ایک بار اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع دے دے، آئندہ اُس کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔“

”ابھی تو پتا چلا ہے کہ وہ کتنی خوب صورت ہے۔“ وہ شرارت آمیز بے ایمانی سے بولا۔ ”میرے کانوں میں اَبھی تک اُس کی آواز گونج رہی ہے۔ اُس کی آواز اُس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے شہرے!“

”اُس نے گانا گایا تھا؟“

”ہاں تو...... مہندی والی رات اُس نے ڈانس کرنے کے ساتھ ساتھ گانا بھی گایا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے......“

میں نے شرارت سے ٹوکا۔ ”جیسے ساری کی ساری دُنیا یک لخت گنگنانے لگی ہو...... ہے ناں؟“

اُس نے ہرگز برا نہیں مانا، بولا۔ ”ہاں یار! اُس کی آواز بڑی سریلی تھی۔ کسی بھی گلوکارہ کی آواز اُس کے جتنی خوب صورت نہیں ہے۔“

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، پوچھا۔ ”اُس نے کون سا گیت گایا تھا، یاد ہے؟“

”میں تھال مہندی دا چائی کھڑی ہاں...... میں تاں پھلاں والی سیج سجائی کھڑی ہاں......“ اُس نے اپنی بھونڈی آواز میں سر لگانے کی کوشش کی تو میں بہ صد کوشش بھی اپنے حلق سے برآمد ہونے والے قہقہے کو روک نہیں پایا۔

ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں امیر نواز کی آواز گونجی ”ابے کیوں حلق پھاڑ کے ہنس رہے ہو؟ منہ بند کرو وگرنہ میرے سبھی ڈھور ڈنگر (مویشی) پریشان ہو جائیں گے۔“

میرا خون چہرے کی رگوں میں سمٹ آیا۔ میں نے ارد گرد دیکھا مگر امیر نواز دکھائی نہیں دیا۔ گردن موڑ کر عقب میں دیکھا۔ تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر کھال کے خم کے عین اوپر ڈیری فارم کے شیڈ کے غیر معمولی بڑے روشن دان میں سے جھانکتا ہوا امیر نواز کا چہرہ دکھائی دیا۔ عافیت کی سانس حلق سے خارج ہوئی۔ اتنی دور کھڑا ہونے والا ہماری گفتگو یقیناً سن نہیں پایا تھا۔ میں نے کھالے کو دیکھا۔ اُس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ”سردار کی گائیں بھینسیں جنوں بھوتوں سے نہیں ڈرتیں، میری آواز سے کیا پریشان ہوں گی۔ تم بتاؤ! اِس وقت شیڈ میں کیا کر رہے ہو؟“

”ڈاکٹر مہدی ویکسین لگانے کے لیے آیا ہوا ہے۔ اُس کے ساتھ ہوں۔“ امیر نواز نے کہا اور اُس کا جھانکتا ہوا چہرہ غائب ہو گیا۔

”شکر ہے، اُس نے ہماری گفتگو نہیں سنی۔“ کھالے نے کہا۔

”نہ سنتے ہوئے بھی سمجھا گیا ہے کہ آئندہ یہاں بیٹھ کر راز کی باتیں مت کرنا۔ شیڈ میں کھڑا ہونے والا ہماری بات چیت نہیں سن سکتا مگر حویلی کی اِس دیوار کے پار کھڑا ہو کر سننے والا قیامت ڈھا سکتا ہے۔ سچ کہتے ہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

وہ سمجھ گیا، بولا۔ ”آئندہ ہم یہاں بیٹھ کر اِس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ہمیں یہ تذکرہ کہیں بھی چھیڑنا نہیں چاہیے۔“

اُس نے سر جھکا لیا مگر آنے والے دنوں میں یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اُس مہ جبیں کے ذکر سے پہلوتہی پر قادر نہیں تھا۔ جہاں بھی ہم دونوں ملتے، اسما ہماری سماعتوں میں اور بساطِ گویائی پر آن براجمان ہوتی۔ ہاں البتہ یہ ضرور رہا کہ حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے کی عمومی نشستوں میں وہ غیر حاضر ہو گئی اور میری خواہش کے باوصف کبھی بھولے سے بھی ہمارے درمیان نہیں آئی۔

ایک دوپہر میں، جب میں اپنے کھیت کو پانی لگا رہا تھا،

کھالا مست چال چلتا ہوا میرے پاس آن پہنچا۔ بشرے سے برہمی ٹپک رہی تھی جس کی وجہ سے اُس کی سنولائی ہوئی رنگت میں مزید گہرا پن شامل ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے نا؟“

وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ یک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ اُس کا رویہ میرے لیے ناشنا سا تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”مجھے توقع نہیں تھی کہ تم ایسا کرو گے۔“

”کیا مطلب؟ میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو تم یوں منہ پھلا کر بات کرنے لگے ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہیں معلوم ہے ناں کہ میں اسما کو کتنا چاہتا ہوں؟“ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”ہاں...... میں تمہاری بے وقوفیوں سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔“

”یہ بے وقوفی نہیں ہے......“ وہ جز بز ہوا۔

”عقل مندی سہی، آگے بولو!“ میں نے کہا۔

”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ وہ بیمار ہو کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس لائی گئی تھی جہاں تم نے اُسے ٹیکے بھی لگائے، اُس کو غور سے دیکھا بھی اور......“

میرے لبوں سے قہقہہ اُبل پڑا۔ ”کیا اور؟“

”تم نے اُسے چھوا، اُس کا بازو تھاما اور مجھے بتایا تک نہیں۔“ اُس کی شکل دیدنی تھی۔

میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”یار کھالے! مجھ سے واقعی غلطی ہو گئی۔ اصل میں میرے نزدیک یہ کوئی اہم واقعہ نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اسما کے بارے میں جو خیالات اور جذبات تمہارے دل میں جگہ بنائے بیٹھے ہیں، وہ میرے دل میں نہیں ہیں، میں نے تو اِس واقعے کو عام نوعیت کا ہی سمجھا تھا۔ اُس وقت میرے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی پر بلا لوں، مگر اتنی مہلت ہی نہیں تھی۔“

اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر وٹ (پگ ڈنڈی) پر بٹھا دیا۔ خود میرے پہلو سے جڑ کر بیٹھ گیا۔ بڑے اشتیاق سے بولا۔ ”اچھا! چلو یہ بتاؤ کہ وہ کیسی ہے؟“

”وہ پیٹ کے درد کے مارے دہری ہو رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات دہری ہوتی جا رہی ہو......“

وہ میری شرارت کو بھانپ گیا۔ شکایت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یار! سیدھی طرح بتاؤ ناں!“

”میں کیا بتاؤں کہ وہ کیسی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”جس وقت وہ ڈاکٹر جی کے پاس لائی گئی تھی، اُس وقت اُس کا چہرہ تکلیف سے بگڑا ہوا تھا۔ چارپائی پر لیٹی بل پر بل کھا رہی تھی۔“

”تم نے اُسے ٹیکے بھی تو لگائے تھے ناں!“

”ہاں!“ میں نے اُس کے تجسس کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

”پھر؟“

”کیا پھر؟“

”پھر بتاؤ ناں کہ وہ کیسی تھی؟“ وہ زِچ ہو کر بولا۔

”تم نرے جاہل اور گنوار ہو۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیسی تھی۔ جیسی نور پور کی دوسری لڑکیاں ہیں، وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ ناک، کان، آنکھیں، ہاتھ اور پیر...... سب لوگوں کے ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔“ میں اُسے ستانے کے اِس سنہرے موقعے کو گنوانے کے حق میں نہیں تھا۔

وہ مجھ پر شکایت بھری نگاہ ڈال کر خاموش ہو گیا۔ سائڈ والی جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالی۔ اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ سلگائی، لمبا کش پھیپھڑوں میں اُتارا اور دھواں اگلتے ہوئے بولا۔ ”اچھا یار! تیری مرضی۔ ویگن کی خرابی کا بہانہ بنا کر بڑی مشکل سے تم تک پہنچا ہوں۔ مجھے آج ہی اسما کے بیمار ہونے کی کہانی شموں کی پھوپی نے سنائی۔ تم نہیں سمجھ سکتے، مجھے تم پر کتنا غصہ آیا تھا۔ اگر تم اُس وقت میرے سامنے ہوتے تو میں تمہاری درگت بنا دیتا مگر میں کملا ہوں ناں! میں جھلا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تم میرے یار نہیں ہو سکتے کیونکہ تم اُسی خاندان کے پڑھے لکھے فرد ہو۔ میں جاہل ہوں، کمین ہوں اور ویگن کا دیہاڑی دار ڈرائیور ہوں۔ تمہاری یاری ڈاکٹر شاہ جی سے ہو سکتی ہے، امیر نواز سے ہو سکتی ہے یا کسی بھی خانزادے کے ساتھ تمہاری جوڑی بَج سکتی ہے، میرے ساتھ نہیں......“

اُس کے چہرے پر افسردگی اور اضمحلال کے واضح آثار جھلملانے لگے۔ یہ اُس کا پرانا ہتھکنڈا تھا۔ میں اُس کے چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات کو بہ غور دیکھتا رہا، پھر قہقہہ بار ہو گیا۔ اُس کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا ”بکواس بند کرو اور میری طرف منہ کر کے اپنی محبوبہ کے حسن کے قصیدے سنو......“

وہ جھٹ سے میری طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا۔ ”یار شہرے! ٹھیک ٹھیک اور آسان لفظوں میں بتانا۔“

میں نے اُسے فاطمہ قسائین کی اطلاعی آمد سے لے کر وریام خان کی دھمکیوں تک، من وعن بتا دیا۔ وہ بڑے انہماک سے سنتا رہا، پھر میرے خاموش ہونے پر بے۔ اختیار

www.Paksociety.com

بولا۔ ’’دوسروں کو چھوڑو، اسما کے بارے میں بتاؤ۔‘‘

’’تو اَب تک کیا تیرے باپ کا قصہ لیے بیٹھا رہا ہوں؟‘‘ میں نے تپ کر کہا۔

’’میں نے اپنے باپ کو ہمیشہ لوہا کوٹتے ہوئے دیکھا ہے، اُسے چھوڑو، جس کے بارے میں، میں پوچھ رہا ہوں اُس کے بارے میں بتاتے رہو۔‘‘ وہ جلدی سے بولا۔

میں نے اُس کی فرمائش اور ناوقت آمد کی غرض وغایت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسما کے نین ونقوش، چال ڈھال پر حرف بہ حرف گفتگو کی بساط بچھادی۔ ڈاکٹر شاہ جی سے مستعار مانگ کر پڑھی ہوئی کتابوں نے میری قوتِ بیان کو خاصا مہمیز کردیا تھا جس کا میں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ گاہے بہ گاہے مجبور عاشقِ نامدار، خالد محمود عرف کھالے کے ہاتھ میں کسی تھما کر کیاریوں میں پانی بھی بدلوایا۔ اُس نے کسی مزاحمت کے بغیر میرے احکامات کی تعمیل کی کیونکہ میں ہر حکم سے قبل اپنے تعریفی بیان کو پُرتجسس نقطے پر روک دیتا تھا۔ یوں جیسے پی ٹی وی والے ڈرامے کو کسی ایسے موڑ پر روک دیتے تھے جو آئندہ قسط دیکھنے کے شوق اور تجسس کو ہوا دیتا تھا۔

میرا بیان ختم ہوا ہی تھا کہ وہ بے ساختہ بول پڑا۔ ’’کیا اُس نے میرے بارے میں پوچھا تھا؟‘‘

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ جز بز ہو کر بولا۔ ’’ہاں! اُس نے ڈاکٹر شاہ جی سے کہا تھا کہ اُس کے پیٹ میں درد خالد لوہار عرف کھالے کو دیکھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ میرا اماں جایا ہے، اُسے پکڑ کر فوراً میرے روبہ رُوپیش کیا جائے۔‘‘

وہ شرمسار سا ہو گیا اور دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔

میں نے کہا۔ ’’ڈاکٹر شاہ جی نے وریام خان کی پھوں پھاں کے ٹائر میں سے ہوا ایسے نکالی تھی کہ وہ جاتے ہوئے بھی ’شوں شوں‘ کر رہا تھا۔ دھمکی دے کر گیا ہے کہ وہ سردار حیدر خان کو ڈاکٹر کے ناروا رویے کے بارے میں بتا دے گا۔‘‘

کھالے نے کندھے اُچکائے۔ ’’سردار حیدر خان اُسے چٹکی بجانے کی دیر میں نوکری سے نکلوا دے گا۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔‘‘

’’وہ کیوں؟‘‘

’’میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر شاہ جی کے پیچھے بھی کوئی بہت بڑا آدمی موجود ہے۔ دیکھو کھالے! کوئی بھی شخص، جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، وریام خان جیسے وڈیرے کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا۔ اُس نے تو نہ صرف اونچی باتیں کی ہیں بلکہ اُس نے وریام خان کی دھمکیوں اور لال پیلے چہرے کی بھی پروا نہیں کی اور نہ ہی سردار حیدر خان کے نام سے ہراساں ہوا۔ وہ مجھے کہتا رہتا ہے کہ یہ نام نہاد وڈیرے اور خان محض بھوکے چیونٹے ہیں۔ اِنہیں پیروں تلے مسل دینا چاہیے۔ یہ بہ ظاہر بہت مضبوط مگر درحقیقت انتہائی بزدل اور خوف زدہ لوگ ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ ان کے ملبوسات اُجلے اور کلف لگے ہیں مگر اِن کے اندر گناہوں کی دلدلیں، خوف کی سلوٹیں اور بے ایمانیوں کے ان گنت داغ لگے ہوئے ہیں۔‘‘

’’پڑھا لکھا ہے ناں! پڑھے لکھے لوگ تو کتابی باتیں کرتے ہیں۔ کتابیں محض بغلوں میں دَبی رہتی ہیں اور وریام خان جیسے وڈیرے بانہیں کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔‘‘

کھالے نے اپنی دانست میں بڑے پتے کی بات کی تھی۔

انہی لوگوں کی مسلط کردہ لاقانونیت اور غیر اخلاقی اقدار نے واقعتاً کتابیں تھامنے والی بانہیں کاٹ رکھی تھیں اور کتابوں میں لکھے قوانین، ضابطوں، اخلاقی پیرائیوں اور مذہب کے ہر ہر جملے کی تفسیر پر استہزائیہ قدغنیں لگائی تھیں۔ معاشرے کی آسودگی اور بھائی چارے کے بدن پر وہ چرکے لگائے تھے جن سے لحظہ بہ لحظہ ناسور پھوٹتے تھے، خون رستا تھا اور تکلیف کا احساس دنیا و مافیہا سے بے خبر کیے رکھتا تھا۔ سردار حیدر خان کے بارے میں پورا علاقہ جانتا تھا کہ جس پولنگ اسٹیشن میں اُسے شکست کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اُس بستی کے لوگوں کی شامت آجاتی تھی۔ وہاں بجلی کی بندش، پٹواری کا پُرعداوت رویہ، بستی کے سرکاری ملازمین کے آئے روز دُور افتادہ علاقوں میں تبادلے اور تھانہ کلچر کی ہٹ دھرمیاں معمول بن جاتی تھیں۔ وہ بہت منتقم مزاج فطرت کا مالک تھا۔ معمولی نوعیت کی حکم عدولی پر بھی برانگیختہ ہو کر انسانیت کی حدیں عبور کرنے پر تل جاتا تھا۔ کھالا ٹھیک کہتا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی کا علم اور غریب پرور رویہ کسی دِن اُس کے لیے مصیبت کا باعث بن جائے گا۔

’’اسما نے اور کچھ کہا تھا؟‘‘ کھالا پھر عشق پٹڑی پر چڑھ گیا۔

’’ہاں!‘‘ میں نے کہا۔ ’’اُس نے جاتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی سے کہا تھا کہ وہ کبھی اُس سے ملنے کے لیے آئے گی۔‘‘

’’کب؟‘‘

’’جب اُس کا جی چاہا۔‘‘

’’ڈاکٹر شاہ جی نے پھر کیا کہا؟‘‘

’’انگریزی میں کچھ کہا تھا، مجھے سمجھ نہیں آیا۔‘‘

’’یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم مجھے بتانا نہیں چاہتے ہو۔‘‘

’’یہی کہا ہوگا کہ ٹھیک ہے، جب جی چاہے، آجانا۔‘‘ میں نے جان چھڑانا چاہی۔

’’کیا وہ واقعی اسپتال میں آئے گی؟‘‘ کھالا پُر اشتیاق تھا۔

’’میرا خیال ہے کہ ضرور آئے گی۔‘‘

’’تم دھیان رکھنا، جب بھی آئے، مجھے ضرور بتانا۔‘‘

’’اگر اس وقت تمہارا جہاز قریشی موڑ کے اڈے پر لینڈ کرچکا ہوا تو کیسے اطلاع کروں گا؟‘‘ مجھے اُس پر ترس آیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر مصنوعی بے پروائی سے بولا۔ ’’چلو! بعد میں بتا دینا۔‘‘

’’یہی کہ وہ کیسی ہے؟‘‘

’’بکواس مت کرو۔ اَب میں چلتا ہوں، کافی دیر ہو گئی ہے۔‘‘

اسما کا ذکر تمام ہوتے ہی کھالے کو اپنی ویگن اور اڈے پر بیٹھی ہوئی سواریاں یاد آگئیں جو اُسے کوس رہی ہوں گی۔ تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا کام بھی ختم ہونے والا تھا۔ پانی باندھنے کے لیے میرا ’وارہ شریک‘ کالا بزدار کسی کندھے پر رکھے نکے پر کھڑا تھا اور ہاتھوں کے اشاروں کنائیوں سے مجھے میرا وقت ختم ہونے کی اطلاع دینے لگا تھا۔

سردار وریام خان اپنے ذہن میں عداوت کے انگارے بھر کر اسپتال سے نکلا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق اُن انگاروں کی تمام تر سینک سردار حیدر خان تک پہنچ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہفتہ کے دِن شام کو پانچ بجے کے لگ بھگ اسپتال کا چوکیدار خادم حسین بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ ’’ڈاکٹر صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔‘‘

’’خیریت تو ہے؟‘‘ میں نے عام سے انداز میں استفسار کیا کیونکہ چوکیدار عمومی طور پر مجھے بلانے کے لیے میرے گھر آیا کرتا تھا۔ بعض اوقات کسی پیشنٹ کی آمد پر ڈسپنسر یا کوئی بھی معاون ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود نہیں ہوتا تھا تو مجھے بلا لیا جاتا تھا۔

خادم نے کہا۔ ’’ذرا جلدی کرو، بڑے صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔‘‘

میں متعجب ہوا۔ ’’کون بڑے صاحب؟‘‘

’’ڈی ایچ او صاحب!‘‘ اُس نے قدرے تامل سے کہا۔

میں اُس کے ساتھ ہی اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کے باہر پختہ اینٹوں کی روش پر سرکاری جیپ کھڑی دکھائی دی۔ میں سبز نمبر پلیٹ والی اس سفید جیپ کو پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر عرفان حمید کو بھی جانتا تھا جو ضلعی آفیسر تھا اور دو تین مرتبہ اسپتال کا عمومی معائنہ کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔

میں صحن میں براجمان ضلعی افسر کے سامنے رُکا اور سلام گو ہوا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور ضلعی افسر کے علاوہ دو تین اور بھی افراد چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جن سے فرداً فرداً سلام لینے کے بعد میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

شاہ جی نے کہا۔ ’’یہ نوجوان اُس وقت یہاں موجود تھا جب ایم پی اے صاحب کی بیٹی کو یہاں لایا گیا۔ یہ اُس وقت بھی یہیں تھا جب اُس کی بیماری کی اطلاع دینے اور وریام خان کا حکم سنانے کے لیے فاطمہ نامی عورت بھاگتی ہوئی آئی تھی۔‘‘

سبھی لوگ میری طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر عرفان حمید نے اپنی غیر معمولی مونچھوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں بھئی جوان! کیا نام ہے تمہارا؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’شہریار!‘‘

’’کیا کام کرتے ہو؟‘‘ لہجہ حاکمانہ سا تھا۔

’’میں کاشت کاری کرتا ہوں۔‘‘

’’کیا جب ڈاکٹر منور علی شاہ کو وریام خان نے بلوایا تھا تو تم یہیں تھے؟‘‘

’’جی سر! میں اُس وقت یہاں موجود تھا۔‘‘ میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

’’مجھے تفصیل سے پورا واقعہ سناؤ۔‘‘

میں اپنی دانست کو بروئے کار لاتے ہوئے داستان گوئی کرنے لگا۔ میں نے غیر ارادی طور پر یہ احتیاط برتی کہ میرا بیان کسی بھی لحاظ سے ڈاکٹر شاہ جی کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔

میرے خاموش ہونے پر ڈاکٹر عرفان حمید نے کہا۔ ’’کیا مریضہ کی حالت بہت زیادہ خراب تھی؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’نہیں سر! وہ اپنے پیروں پر چل کر آئی تھی۔ لاڈلی ہونے کی وجہ سے اُس نے ماسی فاطمہ کا سہارا لے رکھا تھا۔ معمولی نوعیت کی بدہضمی تھی، ہیضہ نہیں تھا اور نہ ہی حالت خراب تھی۔‘‘

ایسے میں ڈاکٹر شاہ جی نے اپنے مخصوص سنجیدہ، گمبھیر اور بے نیازانہ لہجے میں کسی کو بالخصوص مخاطب کیے بغیر کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ میری پوزیشن واضح ہو چکی ہے۔ میں نے پہلے بھی

www.Paksociety.com

اپنے تحریری بیان میں بجا طور پر لکھا ہے کہ میں ڈیوٹی اوقات کے بعد مریضوں کو دیکھنے اور ان کا علاج معالجہ کرنے کا پابند نہیں ہوں۔ چونکہ میں یہاں رہائش پذیر ہوں اور میں نے کوئی کلینک نہیں بنا رکھا، اس لیے بہ طور انسانی ہمدردی مریضوں کا معائنہ کرتا ہوں اور انہیں ابتدائی طبی امداد دیا کرتا ہوں۔ میں نور پور کے کسی بھی گھر میں خواہ وہ سردار حیات خان کا ہو یا وریام خان کا، جانا پسند نہیں کرتا۔ رہی بات مجھ پر دباؤ ڈالنے کی یا ایم پی اے کے نام پر دھمکانے کی، تو پورے وثوق سے عرض گزار ہوں کہ مجھے اِس کی ہرگز پروا نہیں ہے۔ میرا تبادلہ کیا جائے تو بھی میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں! یہ ضرور کہوں گا کہ اگر مجھے نور پور سے ٹرانسفر کیا جائے تو کسی ایسی جگہ بھیجا جائے جہاں کی متعلقہ کمیونٹی میں سردار اور خان قسم کے فرعون موجود نہ ہوں ورنہ آپ کو پھر انکوائری اور تبادلے کی زحمت سے دوچار ہونا پڑے گا۔''

''شاہ جی! کیا آپ اپنے آپ کو تھوڑا بدل نہیں سکتے؟'' ڈاکٹر عرفان حمید کے لہجے میں منت اور ناگواری کا ملا جلا تاثر موجود تھا۔

''کیا میں نے کچھ غلط کیا؟''

''یہ غلط رویہ ہی تو ہے شاہ جی! آپ اپنی کمیونٹی کے معزز اور معروف لوگوں کو ہمیشہ ناراض رکھتے ہیں۔ سردار حیدر خان نے میرے آفس میں پہنچ کر میری انسلٹ کی ہے۔ دیکھیں ناں! اگر آپ وریام خان کے بلانے پر دو گھڑی کے لیے اُس کی حویلی میں چلے جاتے تو کیا قیامت آ جاتی؟ علاج تو آپ نے یہاں بھی کیا، وریام خان سے منہ ماری الگ ہوئی، کیا فائدہ ہوا؟''

''میں کسی کے گھر میں جانا پسند نہیں کرتا۔'' شاہ جی نے کہا۔

''بہ امرِ مجبوری جانے میں ہرج بھی کیا ہے؟''

''نہ جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اُن کے گیراجوں میں کاریں موجود ہیں، زرخرید ڈرائیور اور ملازم دستیاب ہیں۔ اُنہیں غریبوں کے لیے بنائے گئے اسپتال اور تعینات کیے گئے ڈاکٹر کے پاس آنے یا بلانے کی احتیاج نہیں ہے۔ وہ مظفر گڑھ، ڈی ایچ کیو میں، کسی نجی اسپتال میں یا کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ میں کسی کو روکتا نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے اِن خانزادوں کے ناز نخرے اُٹھانے کی کوئی ضرورت ہے۔ مجھے جو کہنا تھا، کہہ دیا، اب اِس موضوع پر کچھ بھی کہنا پسند نہیں کروں گا۔ آپ کوئی اور بات کیجیے، کوئی اور حکم صادر کیجیے۔'' ڈاکٹر شاہ جی کا لہجہ اٹل تھا۔

ضلعی افسر سر تھام کر رہ گیا۔ دوسرے اشخاص چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ کچھ توقف کے بعد ضلعی افسر نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''چلیں ٹھیک ہے، آپ سفید کاغذ پر معذرت نامہ تحریر کر دیں۔ میں اُنہیں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے بے ساختہ ڈاکٹر شاہ جی کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ میری توقع کے عین مطابق مخصوص زہریلی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر تیر گئی۔ سرخی میں اُبل گیا، لبوں پر شعلہ سا بھڑک گیا، بولا۔ ''آپ میرے آفیسر اِن چارج ہیں اور سرکار کہتی ہے کہ آپ کا حکم بجا لاؤں۔ آپ کے ساتھ ساتھ میں اپنے ضمیر اور ایمان کا بھی تابع فرمان ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی اس لیے مجھے معافی نہیں مانگنی چاہیے۔ میں اُس کے حکم پر سر جھکاتا ہوں اور واشگاف الفاظ میں انکار کرتا ہوں کہ میں کسی ایرے غیرے سے معافی نہیں مانگوں گا اور اُس جرم پر ندامت کا اظہار نہیں کروں گا جو میری دانست میں جرم نہیں، میری شخصیت کا اعزاز ہے۔ انکوائری بھگت چکا، شوکاز نوٹس کا تحریری جواب دے چکا، اب محکمانہ سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ میں فیس (Face) کروں گا۔''

ڈاکٹر شاہ جی کی گفتگو کے آخری جملوں سے اتنی درشتی اور زہرباری مترشح تھی کہ میں دم بخود رہ گیا۔ عمومی طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ عوام الناس کے سامنے بانس پر چڑھنے والا اپنے مجاز افسروں کے پیروں کی زمین میں اُتر جاتا ہے مگر وہ ایسا ثابت نہیں ہوا تھا۔

''شاہ جی! آپ کی ہٹ دھرمی آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔'' ضلعی افسر نے واضح دھمکی دی۔

''پروا نہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں، لوگوں کا علاج کرنا میرے فرائض میں شامل ہے مگر بے ایمان اور جھوٹے لوگوں کی نوکری کرنا اور ناپسندیدہ امور کو انجام دینا مجھ پر واجب نہیں ہے۔ نوکری نہ سہی، کوئی چھوٹا موٹا کلینک بنا کر بیٹھ جاؤں گا، تب دیکھوں گا، مجھے کون روکتا ہے۔'' شاہ جی نے سخت لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر عرفان حمید چند ثانیوں تک اُسے برہم نگاہوں سے گھورتا رہا، پھر یک لخت مفاہمانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''میں آپ کی عزت کرتا ہوں، یہ جانتا ہوں کہ آپ راشی نہیں، بے ایمان نہیں اور نہ ہی کبھی آپ نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔ سردار حیدر خان عوامی نمائندہ ہے۔ اسمبلی میں بیٹھتا ہے۔ جس ڈیسک پر وہ بول سکتا

www.Paksociety.com

ہے، اُس ڈیسک تک ہماری رسائی نہیں ہے۔ اُس کا کہا ہوا ہر الزام فی الفور ہمیں ملزم سے مجرم بنا دے گا۔ آپ تحریری طور پر معذرت نہ کریں، سردار حیدر خان کو مطمئن کر دیں۔"

"واٹ؟" ڈاکٹر شاہ جی کے حلق سے چنگاری سی پھوٹی۔ "میں...... ڈاکٹر منور علی شاہ...... اُس جاہل اور انسان دشمن سے معذرت کروں؟ اُس کے سامنے جا کر ہاتھ باندھوں اور اپنے علم اور فرض شناس رویے کو اَن گنت لوگوں کی موجودگی میں حقیر اور جھوٹا قرار دوں؟...... نہیں ڈاکٹر صاحب! میرے ہاتھ استعفیٰ لکھ سکتے ہیں مگر حیدر خان کے سامنے بندھ نہیں سکتے۔"

ڈاکٹر عرفان اپنے دونوں ہاتھ چارپائی کی بانہہ پر رکھ کر زیرِ لب بڑبڑایا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے سے بے بسی اور نیم برہمی کا امتزاج عیاں تھا۔ اپنے ساتھیوں کو اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! میں کوشش کروں گا کہ آپ کے خلاف کوئی محکمانہ کارروائی عمل میں نہ لائی جائے مگر یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سردار حیدر خان آپ سے سخت ناراض ہے اور وہ ایسا شخص ہے جو اپنے مخالفین کو معاف کرنے کی رواداری نہیں رکھتا۔ آپ کے لیے دعا گو ہوں اور مشورہ دیتا ہوں کہ اپنا دھیان رکھیے گا۔ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ یا غیر متوقع صورتِ حال پیش آ سکتی ہے۔"

ڈاکٹر شاہ جی نے قدرے بے پروائی سے سر جھٹکا اور اُنہیں کوٹھی کے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ واپسی پر اُس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال سا تنا ہوا تھا۔ بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں بولا۔ "اچھا نہیں ہوا مگر خیر سلا...... اچھا ہوا کب ہے کہ اَب قسمت پر گلہ ہو۔"

اُس کے ایک بے ساختہ فقرے نے اُس کی زندگی کی تمام تر تھکاوٹوں اور مزاحمتوں کا احاطہ کر دیا تھا۔

میں نے ماحول کی کبیدگی کو دور کرنے کے لیے اُسے متوجہ کیا۔ "آپ نے کھانا کھا لیا ہے؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

میں اُس کے روکتے رہنے کے باوجود کچن میں گھس گیا۔ کچن میں ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ میں جانتا تھا فریج میں اور کچھ ہو نہ ہو، انڈوں کی خاصی تعداد ضرور موجود رہتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی انڈوں کا سالن تیار کیا، گندھا ہوا آٹا فریج سے نکال کر دو تین روٹیاں پکائیں اور تقریباً نصف گھنٹے کی مشقت کے بعد ڈاکٹر شاہ جی کو کھانا پیش کر دیا۔

وہ بولا۔ "شہریار! تم جب میری خاطر اتنی تکلیف اُٹھاتے ہو تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔"

میں نے تعجب سے کہا۔ "کیوں شاہ جی! آپ اِس طرح کیوں سوچتے ہیں۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں، مسیحا ہیں، آپ کی خدمت کرنا تو پورے نور پور کا فرض ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے لوگوں کی شعوری سطح کم ہے جبکہ میں چار جماعتیں پڑھ چکا ہوں۔ آپ کو قریب سے دیکھتا ہوں، وہ دور سے دیکھتے ہیں، فرق تو ہے ناں۔ ویسے بھی، میں فارغ اوقات میں آپ کے ہاں آتا ہوں۔ تھوڑا ہاتھ پیر ہلا لینے سے میرا کیا بگڑتا ہے؟"

وہ سر جھکائے کھانا کھانے میں مشغول رہا اور میری 'نان اسٹاپ' باتوں کا جواب 'ہوں، ہاں' میں دیتا رہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر بولا۔ "شہریار! میری تمام نوکری کا یہی دورانیہ جو نور پور میں اَب تک گزرا، عافیت اور خاموشی کا ہے۔ مجھے میری تمام سروس کے دوران فرعونوں نے چین سے سانس نہیں لینے دیا۔ کبھی تبادلہ ہوا، کبھی انکوائری تو کبھی مجھے معطل کیا گیا حالانکہ میں نے اپنے فرائض میں کہیں کوتاہی کا ارتکاب نہیں کیا، کسی بھی مریض سے بے پروائی نہیں برتی اور...... اور تو اور...... میری اے سی آر میں کوئی غبن، فراڈ یا رشوت کی شکایت درج نہیں ہے مگر میں اِس معاشرے میں اَن فٹ ہوں۔ میں انسان تو ہوں مگر انسانوں جیسا نہیں ہوں۔"

سانس لے کر بولا۔ "لگتا ہے، یہاں بھی تمہارے ڈاکٹر شاہ جی کا دانہ پانی تمام ہو چکا ہے۔ اِس مسافر کو پھر نئی مسافت درپیش ہے اور یقیناً میں جہاں بھی بھیجا گیا، وہاں میرے انتظار میں غریب اور لاچار لوگ جھولیاں پھیلائے مسیحائی تلاش کرتے پھرتے ہوں گے اور وڈیرے اپنی کینچلیوں سے اپنے زَہر نکال کر گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ آہ! نہ اِس دنیا کو بدلنا منظور ہے اور نہ ہی یہ ڈھیٹ شخص مائل بہ تغیر ہے۔"

"کیا آپ کی مرضی کے بغیر آپ کا یہاں سے ٹرانسفر کیا جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہوں! مجھے پنجاب کے کسی بھی بی ایچ یو میں پھینکا جا سکتا ہے۔ محکمانہ رولز کے مطابق تو مجھے ضلعی حدود سے باہر نہیں بھیجا جا سکتا مگر ایسا محض اُس جگہ پر ہو سکتا ہے جہاں قانون کی بالادستی ہو، جہاں انسانی حقوق کا احترام واجب ہو...... یہاں نہیں۔ یہاں صرف اُس کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے جس کے پاس ووٹ کی طاقت ہو، اثر و رسوخ کا تازیانہ ہو کہ جب جی چاہا، نکال کر مقابل کے منہ پر دے مارا۔"

مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں

استفسار کیا۔ "تو کیا آپ کا تبادلہ کر دیا جائے گا؟"

اُس نے کندھے اُچکائے۔ "ہاں! یہ بھی یار باش لوگوں کی عنایت ہو گی ورنہ ممکن ہے مجھے معطل کروا دیا جائے۔"

"معطل؟ یعنی نوکری سے فارغ؟" میں دم بخود رہ گیا۔

"نہیں! دفتر بلاوا، انکوائری اور پھر تین ماہ کی بے سود خجل خواری کے بعد بہ صد احسان بحالی......" اُس کے لبوں پر مخصوص مسکراہٹ تیر گئی۔

"یہ تو بہت غلط ہوا شاہ جی!" میرے لبوں سے نکلا۔

"ہاں! اگر دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے، سردار حیدر خان کو ڈاکٹر عرفان مطمئن کر لے اور بات یہیں ختم ہو جائے۔"

"اللہ کرے!"

"تم کیوں پریشان ہو گئے ہو؟"

"اگر آپ کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا تو......؟" میرا اندیشہ میرے لبوں پر مچل گیا۔

"تو کیا ہو گا؟ یہاں کوئی اور ڈاکٹر آ جائے گا۔ میں جہاں جاؤں گا، قسمت میں ہو گا تو کوئی اور شہریار مجھے مل جائے گا۔ بس!"

مجھے دُکھ ہوا۔ ڈاکٹر شاہ جی کے سپاٹ اور جذبات سے قطعی عاری لہجے نے مجھے آنِ واحد میں مایوس کر دیا۔ میں اُس کے ٹرانسفر کے اندیشے میں پریشان ہو رہا تھا جبکہ اُسے میری کوئی پروا نہیں تھی۔

اُس نے میرے تاثرات کے تغیر کو بھانپ لیا، میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا اور ازحد نرم لہجے میں بولا۔ "کبھی جانے والے کا دُکھ نہیں کرتے، بس! الوداع کہہ کر آنے والے کا خوش دِلی سے استقبال کرتے ہیں۔ تم اچھے انسان ہو، یقیناً تمہیں اچھے انسان ہی ملیں گے۔"

میں خاموشی سے اُسے یک ٹک دیکھے گیا۔ وہ اَب پوری طرح سنبھل چکا تھا اور اُسے ہرگز کوئی خوف یا پریشانی نہیں رہی تھی۔ میں نے اجازت چاہی اور کوٹھی سے نکل آیا۔

اگلے دن میں نے اِس واقعے کا تذکرہ کھالے سے کیا۔ وہ فکرمند ہو گیا۔ بولا۔ "شہرے! اپنے ڈاکٹر کی خیر مانو۔ سردار وریام خان اور سردار حیدر خان اُس پر وار کریں گے۔ ڈاکٹر شریف آدمی ہے، ان لمبے ہاتھ والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"میں بھی تو دُعا مانگنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا ناں!" میں نے بے بسی سے کہا۔

اُس نے ایک نگاہ عجب مجھ پر ڈالی، مجھے ٹٹولا پھر بولا۔ "بات اگر ڈاکٹر کے ٹرانسفر یا معطلی تک محدود رہی تو خیر ہی گزرے گی۔ اگر محکمۂ صحت نے ڈاکٹر کے خلاف کارروائی نہ کی تو پھر یہ لوگ اپنے کارندوں کے ذریعے ڈاکٹر پر وار کریں گے جو بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

میں حیرت سے بولا۔ "کیا مطلب؟"

"تم بڑے بھولے ہو۔ دیکھتے ہو، سمجھتے نہیں ہو۔ تمہارے خیال میں سردار حیدر خان کو لوگ ووٹ ڈالتے ہیں اور وہ جیت جاتا ہے۔ ہے ناں؟ بھی سادہ اور معصوم لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ جہاں گھی سیدھی انگلیوں سے نکلتا دکھائی نہیں دیتا، سردار حیدر خان وہاں اپنی انگلیاں ٹیڑھی کر لیتا ہے اور اُس کے پالتو غنڈے دندناتے ہوئے اپنے مورچوں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ووٹ بیچ دیتا ہے، کوئی ڈر کر ہامی بھر لیتا ہے اور جو اکڑ جاتا ہے اُس کی گردن میں سے سریے کے ساتھ ساتھ ہڈی بھی نکال لی جاتی ہے۔ الیکشن کے بعد وہی غنڈے کامل توجہ کے ساتھ سرگرم ہو جاتے ہیں۔ اُن لوگوں سے آہنی ہاتھوں کے ساتھ نمٹتے ہیں جنھوں نے سردار حیدر خان کا دِل دکھایا ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ ڈاکٹر شاہ جی نے بھی سردار کا دل دُکھا دیا ہے۔"

مجھے کھالے کی دانش بھری باتوں پر حیرت ہوئی۔ یہ اعتراف تو مجھے تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ دُنیا کے چلن سے آگاہ تھا، یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اِن سرداروں کے ہتھکنڈوں کا بھی ادراک رکھتا تھا۔

میں نے کہا۔ "یعنی تمہارا خیال ہے کہ سردار حیدر خان کے پالتو غنڈے ڈاکٹر شاہ جی کو ماریں پیٹیں گے؟"

"اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی بغیر نمبر پلیٹ والی گاڑی اُس کی موٹر سائیکل کو کچلتی ہوئی گزر جائے۔" کھالے کا لہجہ بڑا ہولناک تھا۔ "رات کے سناٹے میں کوئی دردناک چیخ اُبھرے اور صبح لوگ منہ میں انگلیاں دابے بے رحم ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہونے والے ڈاکٹر شاہ جی کا آخری دیدار کر رہے ہوں......"

مجھے جھرجھری آ گئی۔ کھالے کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "یہ منحوس منہ بند کرو یار! کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ شاہ جی پر کوئی آنچ آئے۔ وہ نور پور کا مسیحا ہے، غریبوں کا سچا ہمدرد ہے اور نہایت بے غرض بندہ ہے۔ اُس نے اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔"

"یہاں خربوزے چوری کرنے والے کو سزائے موت کا حکم نامہ تھمایا جا سکتا ہے میرے جگری یار! کیا بات کرتے ہو۔ ہاں! اگر تمہیں ڈاکٹر کی اتنی ہی فکر لاحق ہے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے مت رہو۔ میری مانو تو اپنا بوریا بستر اُٹھا کر شاہ جی

www.Paksociety.com

کی کوٹھی پر چلے جاؤ۔ کسی وقت، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر شاہ جی کو قائل کرو کہ وہ رات کو تنہا نہ رہے، ہر وقت چوکنا رہے اور اگر ممکن ہو تو رات کو کسی دوست کے ہاں شب گزاری کے لیے چلا جایا کرے۔"

کھالے نے مجھے اور بھی بہت کارآمد باتیں سمجھائیں۔ میں دھڑکتے دل سے اُس کی دل دہلانے والی باتیں سنتا رہا، پھر میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ میں کسی بھی صورت میں ڈاکٹر شاہ جی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا اور اُس کی حفاظت کروں گا۔ دل کے نہاں خانوں میں یہ خدشہ بھی کلبلا رہا تھا کہ میں اپنی کم مائیگی کے باعث سردار حیدر خان جیسے بارسوخ آدمی کے مقابلے میں ڈاکٹر شاہ جی کی مدد نہیں کر پاؤں گا۔ کھالے نے مجھے حوصلہ دیا اور میری تختے درے مدد کا وعدہ بھی کیا۔

چند دِن عافیت میں گزرے۔ ایک صبح جب میں گھر میں بیٹھا چائے کا پیالہ شکم میں اُتار رہا تھا، سردار وریام خان کا پیغام مجھے موصول ہوا۔ فاطمہ قسائین اپنی غیر معمولی باریک اور شوخ آواز میں مجھے بتلا رہی تھی کہ وریام خان نے مجھے اپنی حویلی پر فوراً پہنچنے کا حکم صادر کیا ہے۔ میں اُسے پسند نہیں کرتا تھا مگر اپنی ناپسندیدگی کے اظہار اور اُس کی حکم عدولی کی جرأت بھی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے ماسی فاطمہ کو چلتا کیا اور ناشتا کرنے کے بعد حویلی پہنچ گیا۔

سردار اُبھی تک حویلی کے اندر تھا۔ میں دارے میں رکھے ہوئے بڑے پایوں والے ہماچے پر بیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے وریام خان کے دارے کی بیرونی چہار دیواری کے اوپر، گلی کے پار ایستادہ بخت خان کی خوب صورت حویلی واقع تھی۔ ہلکے پیلے اور سرخ کلر کا نفیس امتزاج بڑا دل کش تھا۔ بخت خان بہت وجیہہ، باذوق اور نفاست پسند انسان تھا مگر اُس کا رویہ بہت ناشائستہ اور جاہلانہ تھا۔ غرور اور نخوت نے اُسے گاؤں بھر میں تنہا کر رکھا تھا۔

سردار وریام خان اُس سے کہیں زیادہ بُرا اور سفاک انسان تھا مگر وہ لوگوں میں گھل مل کر رہتا تھا۔ درپردہ ظلم کرتا تھا، سرعام محبت کا پرچار کرتا تھا۔ وہ اور نور پور کا نمبردار سردار حیات خان مقامی سیاست کے اہم مہرے تھے۔ سردار حیدر خان کی بچھائی ہوئی سیاسی بساط پر پوری دل جمعی سے کھل کھیلتے اور اُسے فتح یابی سے ہم کنار کرتے ہوئے اپنے لیے ظلم اور بربریت کے دروازے کھول لیتے۔ نور پور اور نواح میں ہونے والے ہر تنازعاتی واقعے کے پس منظر میں انہی دونوں بڑوں کی چالاکیاں اور سازشیں موجود ہوتیں اور جب فریقین جذباتی حماقتوں کے زیرِ اثر اپنی پونجی بے دردی سے لٹا بیٹھتے تو پھر انہی کے داروں پر پہنچ کر انصاف کے لیے ملتمس ہوجاتے۔ میں نے اَن گنت پنچائتیں دیکھ رکھی تھیں۔ کبھی سردار حیات خان کے ڈیرے پر تو کبھی سردار وریام خان کے دارے پر۔ ہر پنچایت کا ایک سا انجام ہی دیکھا تھا۔ جو سردار نے چاہا، وہی فیصلہ مسلط کردیا گیا۔ بعض اوقات تو ایسے ایسے فیصلے بھی ڈنکے کی چوٹ پر کردیے گئے جن کی اجازت نہ تو مذہب دیتا تھا اور نہ ہی دُنیا کے کسی معاشرے کی کوئی اخلاق ساز کتاب......

علی بخش عرف ملنگی سردار وریام خان کے ڈیرے پر حقہ پانی بھرنے پر مامور تھا۔ وہ چائے کا پیالہ اُٹھائے میرے پاس آیا۔ مجھے تھماتے ہوئے بولا۔ "شہرے خان! تیرا چاچا کہہ رہا تھا کہ تم نے پڑھائی مکمل کرلی ہے اور اَب نوکری کے چکر میں ہو؟"

میں نے چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ہماچے کے سرِ بالیں رکھے ہوئے حقے کو اپنی جانب کھینچ کر بے سبب چھیڑتے ہوئے بولا۔ "دور جانے کی کیا ضرورت ہے، یہاں کسی خان کے ہاں منشی ٹھہر جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "یہ کام مشکل ہے، مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔"

"واہ جی واہ! یہ منشی گیری بھی کوئی مشکل کام ہے، اچھی خاصی ٹَوہر ہوتی ہے منشی کی، جو چاہے کرے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

"مجھے ایسی ٹَوہر کی ضرورت نہیں ہے۔" میں از حد اختصار سے کام لے رہا تھا کیونکہ میں ادھیڑ عمر ملنگی کی چرب زبانی اور قوتِ گویائی سے بہ خوبی واقف تھا۔ بات سے بات نکالنے کا ہنر اُسے وراثت میں ملا تھا۔ گاؤں کے بڑے کہتے تھے کہ اُس کا باپ اُس سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ خود ملنگی اپنے باپ کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے بتایا کرتا تھا کہ کیسے اُس کے باپ نے پنچایت میں کسی جھوٹے کو سچا... ثابت کیا اور سچے کو جھوٹا ثابت کیا تھا۔ وہ اپنے مرحوم باپ کی قوتِ بیان پر استدلال لاتے ہوئے یہ بھول بیٹھتا تھا کہ وہ اپنے منہ سے اپنے باپ کو بے ایمان اور مکار ثابت کرتا تھا۔

"تجھے خان نے کیوں بلایا ہے؟" وہ ایک تنکے کو چلم کے نچلے حصے میں ڈال کر گھماتے ہوئے بولا۔

"یہ تو خان کو ہی پتا ہوگا۔"

"اگر وہ تجھے اپنے ہاں منشی ٹھہرانے کی بات کرے تو اُس کی بات مان لینا۔ میری مانو، سراسر فائدے کا کام ہے۔

www.Paksociety.com

موج ہی موج ہے۔" اُس نے پھر اپنے اندازے کی بنیاد پر کھڑی کی جانے والی عمارت کو چونا چاٹی کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکا کر دارے اور زنان خانے کی درمیانی دیوار کے دیدار بخش روزن کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے سامنے بیٹھ کر کھالے نے اسما کو دیکھا تھا اور مجھے بھی دیدار کی خیرات میں سے حصہ دیا تھا۔ روزن دکھائی نہیں دیا۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ سنتھے کی گنجان باڑھ کی وجہ سے دیوار کا وہ حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"پریشان دکھائی دیتے ہو، کیا بات ہے؟" ملنگی نے مجھے کریدنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

ایسے ہی وقت میں سردار وریام خان بوسکی کے بے داغ سوٹ میں، پیروں میں تلے دار کھسا پہنے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے دارے میں قدم رنجہ ہوا۔ ماحول میں بڑی خوش گوار اور بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ یہ کسی قیمتی اور غیر ملکی پرفیوم کا اعجاز تھا جس کی غالباً پوری کی پوری شیشی اُس نے اپنے اوپر انڈیل رکھی تھی۔ میں نے روایتی انداز میں ادب سے کھڑے ہوکر سلام کیا، اُس کے براجمان ہونے کے بعد ہماچے پر بیٹھ گیا، بولا۔ "جی خان جی! آپ نے مجھے یاد کیا تھا۔"

"اوچھڈ پڑھو کیا! سوکھیاں گلاں کیتیاں کر، وَخت وِچ نہ پایا کر سانوں بڈھیاں ٹھیریاں توں......" وریام خان نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ وہ بڑی ٹھیٹ سرائیکی بولتا تھا۔ سر پر کلف دار طرہ درست کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے ایک خاص بات کے لیے تمہیں بلایا ہے۔ تم نور پور کے باسی ہو، پڑھے لکھے ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نقصان ہو۔ رب سوہنا کرم کرے، وہ حکم دیتا ہے کہ غریبوں مسکینوں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنا چاہیے۔ اس لیے تمہارے ساتھ میں نے کبھی اَوکھے مونہہ بات نہیں کی۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو اپنا سوتر، ہائے کیا دلیر بندہ تھا، جنتی امام بخش خان یاد آجاتا ہے۔ بڑا ببیا اور سنگت باش انسان تھا پَر بے چارہ تھوڑی حیاتی مانگ لایا تھا۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اُس کے بولنے کا انتظار کیا۔ میں اُبھی تک اپنے طلب کیے جانے کا سبب بھانپ نہیں سکا تھا۔

ملنگی نے حقے کی نَے جیبی رومال سے صاف کی اور گھما کر خان کے سامنے کردی۔ اُس نے ایک دو گڑگڑاہٹیں کشید کیں، مجھے نظروں ہی نظروں میں ٹٹولا اور بولا۔ "شہرے پتر! میں نے تمہیں اُس دن ڈاکٹر کی کوٹھی پر دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تمہارے جیسا سمجھ دار انسان اُس خبیث اور بے ایمان ڈاکٹر کے پاس کیا کررہا ہے۔ کیا تم اُس کی شاگردی میں ہو؟"

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "جی خان جی! میں نے اُس سے ڈسپنسنگ سیکھ لی ہے۔ اَب میں چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج معالجہ کرلیتا ہوں۔"

"جب میں نے فاطمہ قسائین کو اُس کے ہاں بھیجا تھا، تم وہیں تھے؟" اُس کی کریدتی نگاہیں مجھ پر مرتکز تھیں۔

"جی!"

"وہ خبیث میرے بلانے پر آیا کیوں نہیں تھا؟"

"وہ کہیں بھی نہیں جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے چوبیس گھنٹے اسپتال میں رہنا چاہیے، کب کیا ہوجائے، خبر نہیں ہوتی۔" میں نے اپنی دانست میں بڑی معقول بات کی۔

"ماسٹر ولی محمد کی بیٹی جب سیڑھیوں سے گری تھی تو وہ بھاگا چلا آیا تھا۔ کہیں زیناں کے ساتھ اُس کے......"

"ناں خان جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے غیر ارادی طور پر اُس کی بات کاٹ دی۔

ماسٹر ولی محمد ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھا۔ میں اُس سے دو سال تک ٹیوشن پڑھتا رہا تھا۔ وہ بہت مخلص اور دین دار آدمی تھا۔ اُس نے کبھی میرے سمیت کسی بھی پڑھنے والے سے ٹیوشن فیس وصول نہیں کی تھی۔ اُس کے ہاں بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔ اوپر تلے چار بیٹیاں خدا نے دے رکھی تھیں مگر اُسے کبھی قسمت پر یا قسمت بنانے والے پر میں نے شاکی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اِنہی بیٹیوں کی مناسب تربیت کا صلہ اُسے خدا جنت میں شاندار محل کی صورت میں دے گا۔ اُس کی بیٹی 'زیناں' دو ماہ قبل چوبی سیڑھی سے گر پڑی تھی۔ سیڑھی کا نچلا ڈنڈا اُس کی کمر میں اِس شدت سے لگا تھا کہ اُس کا نچلا دھڑ ایک دم ساکت ہوگیا تھا۔ ولی محمد ننگے پیر دوڑتا ہوا اسپتال پہنچا تھا اور ڈاکٹر کو گھر لے آیا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے زیناں کا معائنہ کیا، ابتدائی طبی امداد دی، اپنے ڈسپنسر کو بھیج کر ڈی ایچ کیو اسپتال سے ایمبولینس منگوائی اور زیناں، اُس کی ماں اور باپ کو اسپتال روانہ کردیا تھا۔ چند دِنوں میں وہ ٹھیک ہوگئی تو پھر لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسپتال آجایا کرتی تھی۔ وہ اَب بھی ڈاکٹر شاہ جی کے زیرِ علاج تھی۔

مجھے وریام خان کی سوچ پر گھن آئی۔ نگاہِ شکایت اُس

پڑ ڈالی اور کہا۔ ”خان جی! ڈاکٹر شاہ جی ایسا شخص نہیں ہے۔ چونکہ زیناں کا نچلا دھڑ سُن ہوگیا تھا، اُسے کسی بھی طرح اسپتال نہیں لایا جاسکتا تھا، اِس لیے ڈاکٹر اپنے آلات سمیت ماسٹر جی کے گھر تک چلا آیا تھا۔“

”مگر میں نے سنا ہے کہ زیناں اَب بھی ہر دو جے چوتھے روز اسپتال جاتی رہتی ہے اور بہت دیر تک ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھی رہتی ہے۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟“

”نہیں! یہ سچ ہے۔ وہ آتی ہے، اپنا معائنہ کراتی ہے اور دوائیں لے کر گھر چلی جاتی ہے۔ اُس کے ہمراہ کبھی ماسی فاطمہ ہوتی ہے، کبھی اُس کی ماں اور کبھی غفوراں؛ وہ کبھی اکیلی نہیں آئی۔“ میں نے وضاحت کی۔

”غفوراں؟ علم دین پٹواری کی دِھی؟“

”نہیں۔ استاد کھالے کی چھوٹی بہن غفوراں۔“ میں نے کہا۔ ”کئی مرتبہ زیناں میری موجودگی میں وہاں آچکی ہے۔ ڈاکٹر اُسے 'بیٹی' کہہ کر بلاتا ہے۔ وہ ہر لڑکی کو بیٹی یا دِھی کہہ کر پکارتا ہے۔“

”تم ڈاکٹر کی اتنی طرف داری کیوں کرتے ہو؟“ خان کا لہجہ خاصا سرد ہوگیا۔ اُسے شاید میرے تسلی بخش جوابات نے مضطرب کردیا تھا۔

”خان جی! مجھے اُس کی طرف داری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نور پور کا رہنے والا ہوں، وہ پتا نہیں کہاں کا وسنیک ہے، مجھے اُس سے سوائے ہنر کے کیا لینا ہے۔ سچ بات کرتا ہوں کہ وہ بہت نیک اور 'اللہ لوک' آدمی ہے۔ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ کسی کو برا نہیں کہتا اور نہ ہی کسی سے ڈرتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُس کے علاوہ کوئی بھی ڈاکٹر اِس اسپتال میں آج تک رہائش پذیر نہیں ہوا۔ جو بھی تعینات ہوتا تھا، ہفتوں شکل نہیں دکھاتا تھا جبکہ یہ چوبیس گھنٹے موجود رہتا ہے۔ اتوار کے دن بھی اگر کوئی آجائے تو اُس کا معائنہ کرتا ہے اور اسپتال کھول کر دوائیں دیتا ہے۔ کیا یہ نور پور کی خوش بختی نہیں ہے؟“ میں نے پہلی مرتبہ ہمت پکڑتے ہوئے پوری فصاحت سے اپنا مدعا بیان کیا۔

اُسے میری تقریر اچھی نہیں لگی۔ پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ”بس گودا! میں نے تمہاری بہت ساری بکواس سن لی۔ مزید سننا نہیں چاہتا اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم آئندہ اسپتال نہیں جاؤ گے۔ ڈاکٹر کی چاپلوسی نہیں کرو گے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم اُسے کھانا بنا کر دیتے ہو، کوارٹر کی صفائی ستھرائی کرتے ہو اور کپڑے لتے بھی دھوتے ہو۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میری برادری کا خان زادہ، خواہ غریب ہو یا مسکین، کسی کمین اور خبیث بندے کی خدمت خاطر کرے۔ کیا وہ تمہیں تنخواہ وغیرہ بھی دیتا ہے؟“

میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ دونوں ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”خان جی! آپ میرے بڑے ہیں، مائی باپ ہیں۔ مجھے بہ خوبی احساس ہے کہ میں آپ کا رشتہ دار اور برادری وال ہوں مگر آپ سے بہت کم تر اور غریب ہوں۔ اگر میں اُس کی خدمت کرتا ہوں تو یہ میرا معاملہ ہے۔ میں اُس کی نہیں، اُس کے سینے میں بھرے ہوئے علم اور انسان دوستی کے جذبے کو سلام کرنے جاتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں کہ وہ اِس دور کا ولی ہے، اللہ کا بہت پیارا انسان ہے۔ آپ نہیں مانیں گے اور میں منوانا بھی نہیں چاہتا مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ اُس کے اور میرے بیچ کوئی دیوار کھڑی نہ کریں۔ جیسے کام چل رہا ہے، چلنے دیں اور ڈاکٹر کی حکم عدولی کو انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ رہی بات تنخواہ کی، تو مجھے تنخواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُس کے کام کاج کرتا ہوں۔ میں تو سردار حیات خان کے کھاتوں کو بھی مفت میں سنبھالا کرتا ہوں۔ امیر نواز کے کام کاج بھی کردیتا ہوں۔ وہ مجھے کچھ بھی نہیں دیتے۔ ڈاکٹر خدمت کے بدلے میں مجھے پڑھاتا ہے۔ مجھے سبق دیتا ہے۔ میں پرائیویٹ طور پر ماسٹرز کرنا چاہتا ہوں اِس لیے مجھ پر کوئی پابندی عائد نہ کریں ورنہ میں حکم عدولی پر مجبور ہوں گا۔“

اُسے میرے واضح انکار کی توقع نہیں تھی۔ چند لمحوں تک مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورتا رہا، پھر پھٹ پڑا۔ غیظ و غضب نے اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کرلیا تھا۔ اُس نے مجھے نہ صرف کمین، غریب اور بے غیرت کے القابات سے نوازا بلکہ اپنی سرشت کے مطابق غلیظ گالیاں بھی دیں۔

اچانک ملنگی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اوئے ملنگی! اِس احسان فراموش کیڑے کو دھکے دے کر حویلی سے نکال دے اور اِس کے چاچے کو پکڑ لا۔ اُس سے پوچھوں کہ ایسے احسان فراموش اور کمینے بندے کو اُس نے اپنے گھر میں کیوں ڈال رکھا ہے۔ چل اوئے خبیث! میری آنکھوں سے اوجھل ہوجاؤ۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے اُس ملعون کے پاس جاتے ہو۔ واہ! میں ماسٹرز کرنا چاہتا ہوں...... ہاہ!“

احساسِ تضحیک سے میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ غلطی میری ہی تو تھی۔ جانتا تھا کہ وہ بہ ظاہر انسان مگر بہ باطن بھیڑیا ہے۔ مجھے اُس کے منہ لگنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے

معاملے کو سلجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔ ”خان جی! آپ تو بلاوجہ ناراض......“

”کہا ناں! دفعان ہوجاؤ اور دوبارہ اپنی منحوس شکل مجھے نہ دکھانا۔“ اُس نے پھاڑ کھانے کے سے انداز میں کہا۔

میں نڈھال اور پژمردہ قدموں سے اپنے وجود کو رگیدتا ہوا حویلی سے نکل آیا۔ میں نے ملنگی کو دھکے دینے کی زحمت سے بچالیا تھا۔ حویلی سے نکل کر گھر تک پہنچنا محال ہوگیا۔ اُس فرعون صفت وڈیرے نے چاچا چراغ کو بلا کر ڈانٹنے اور برا بھلا کہنے کا ارادہ کر رکھا تھا اور طلب کیے جانے پر چاچے کو نہ جانے دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے چاچی اور بہنوں کو وریام خان کی دھمکیوں اور گالی گلوچ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی گھبرا گئیں۔ نور پور میں رہتے ہوئے وریام خان کو ناراض کرنا بڑا کٹھن اور ہلاکت خیز کام تھا جو میں نادانی کی بدولت سرانجام دے آیا تھا۔ سبھی نے اپنے اپنے انداز میں مجھے کوسا کہ مجھے خان کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ وہ بڑا تھا اور مجھے اپنی اوقات میں رہ کر محض 'جی خان جی' ہی کہنا زیب دیتا تھا۔

ملنگی نے دوپہر سے پہلے ہی چاچا چراغ کو کھیتوں میں جا پکڑا اور خان جی کی عدالت میں پیش کردیا۔ جب دوپہر کو چاچا چراغ گھر میں داخل ہوا تو اُس کی حالت خاصی غیر تھی۔ میں نے چور نگاہوں سے اُسے دیکھا تو کٹ کر رہ گیا۔ اُس کا چہرہ بھی فرطِ تضحیک سے سرخ تھا۔ کافی دیر تک چارپائی پر سر نیہوڑائے بیٹھا رہا۔ چاچی اُس کی پائنتی کی جانب بیٹھی اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی، جب وہ قدرے سنبھل گیا تو بولی۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ زیادہ ہی پریشان دکھائی دیتے ہو۔“

اُس نے میری طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ”پوچھ لو اپنے اُس...... سے، بھرے دارے میں میری پگڑی اچھالی گئی، مجھے برا بھلا کہا گیا......“

وہ فرطِ اشتعال و بے بسی سے اپنا جملہ بھی مکمل نہ کرپایا۔ چاچی نے دِلاسا دیا۔ ”نادان ہے، برے بھلے کی تمیز نہیں رکھتا۔ تم نے خان جی کو سمجھانا تھا ناں کہ......“

”خاک سمجھاتا؟“ چاچے کا لہجہ بھرا گیا۔ ”اُس نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں، بس ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا اور بار بار کہتا رہا کہ میں دیکھوں گا، اَب کیسے وہ اسپتال میں قدم رکھتا ہے۔ میں نے اِسے کئی بار کہا کہ اسپتال جانا چھوڑ دے، یہ نہیں مانا۔ آج اِس کی ضد کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا۔“

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ندامت اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت مجھ پر حاوی تھی۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ کافی دیر بعد میرے لبوں سے پھوٹا۔ ”چاچا! میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ میں نے اُسے یہی بتایا تھا کہ میں ڈاکٹر کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا ہوں۔ اُس نے ڈاکٹر اور ماسٹر جی کی بیٹی زیناں پر تہمت لگائی تھی جس پر میں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ایسا آدمی نہیں ہے۔ بس وہ میری بات سنتے ہی تھے سے اکھڑ گیا۔ ٹھیک ہے، اُس نے اپنے گھر بلا کر میری اور تمہاری بے عزتی کی ہے، خدا ہمیں بھی کوئی موقع دے گا کہ اُس کی پگڑی ہمارے پیروں تلے رُلے گی۔“

چاچا میری بات سن کر بھڑک اُٹھا۔ اُس کے منہ میں جو الم غلم آیا، اُس نے مجھے کہہ سنایا۔ اُس نے بھی میرے اسپتال جانے پر پابندی عائد کردی اور مجھے وریام خان کی حویلی پر جا کر معافی مانگنے کا حکم صادر کردیا۔

میری آنکھوں کے سامنے مقابل چٹانوں کی طرح ایستادہ ڈاکٹر شاہ جی کا چہرہ لہرا گیا۔ اُس نے معافی نہیں مانگی تھی۔ معزول ہونے پر خود کو آمادہ کرلیا تھا۔ میں نے بھی آن کی آن میں فیصلہ کرلیا۔ مجھے نور پور سے نکالا جاسکتا تھا، مجھے پنچایت میں مجرم بنا کر کھڑا کیا جاسکتا تھا اور بس!...... شاہ جی کو اگر ہزاروں روپے کی نوکری کی فکر نہیں تھی تو اُس کے 'مرید' کو کیا فکر لاحق ہوسکتی تھی۔ تبھی میں نے کہا۔ ”چاچا! میں زندگی میں کبھی خان کی حویلی پر معافی مانگنے کے لیے نہیں جاؤں گا۔“

”تمہیں جانا ہوگا...... دیکھ سرور مائی! اپنے پتر کو سمجھا لے، اِسے حویلی پر بھیج دے ورنہ ہم سب کے لیے بہت بُرا ہوگا۔“ چاچا چراغ خاصا برانگیختہ ہوگیا تھا۔

میں نے پھر انکار کیا۔ ایسے میں پروین میرے قریب ہوگئی۔ میرے گالوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”بھائی! ضد نہ کر۔ دیکھ! سب لوگ پریشان ہیں۔ میرا تیرے سوا اور ہے بھی کون؟ تجھے کچھ ہوگیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ اللہ کا نام مان...... دیکھ شہرے! میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

میں ٹھٹک گیا۔ پروین کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے وہ لجائی اور سماجت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں مجھ پر جہانِ ادراک کھلا۔ شاہ جی اور اپنی حیثیت کا فرق معلوم ہوا۔ اُس کا دُنیا میں کوئی نہیں تھا جس کے آنسو اُسے شکست سے دوچار کرتے۔ جس کا دُکھ اُسے رُلاتا۔ جبکہ میری ایک بہن تھی جس کا اُترا ہوا چہرہ مجھ سے ہر بات منوا سکتا تھا۔

مخمصہ پھیل کر دل و دماغ کو اپنے حصار میں لینے لگا۔ میں نے پروین کے آنسو پونچھے، دِلاسا دیا اور خاموشی سے سر

www.Paksociety.com

کھالیا۔ چاچی کی بیٹیوں نے بھی مجھے بٹھانے کی کوشش کی۔ میں اُٹھا یا کھانا کھائے بغیر گھر سے نکل آیا۔ میرا رُخ نور پور کے ویگن اسٹینڈ کی طرف تھا۔ میری توقع کے مطابق کھالے کی ویگن اسٹینڈ پر موجود تھی اور شیدو بڑی سی ٹاکی سے ویگن کا نہ چمکنے والا بونٹ چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بخشو لوہار کو سلام کیا، دکان کا عقبی دروازہ عبور کیا اور کھالے کے گھر میں داخل ہو گیا۔ ماسی صفو پہلو میں پانی کا بھرا ہوا گھڑا دبائے دیوار کے ساتھ پڑی چوبی گھڑونچی کی طرف جا رہی تھی۔ کھالے کی بہن خالدہ صحن میں تنی ہوئی تار پر دھلے ہوئے گیلے کپڑے پھیلانے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”سلام صاحب جی! بڑے دنوں کے بعد راستہ بھولے ہیں آپ!“

وہ بہت شریر اور کھلنڈری لڑکی تھی۔ کھالے سے محض دو سال چھوٹی تھی۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود ایسی باتیں کر جاتی کہ سننے والا دم بخود رہ جاتا تھا۔ عمومی طور مجھے ’بھائی‘ جبکہ چھیڑنے کی غرض سے ’صاحب جی‘ کہا کرتی تھی۔ میں نے نیم دلی سے سلام کا جواب دیا اور کھالے کے کمرے میں گھس گیا۔ کھالے کو بستر پر نیم دراز پایا۔

وہ مجھے دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ بولا۔ ”خیر نہیں لگتی سجن جی!“

میں ٹوٹی بانہہ والی کرسی گھسیٹ کر اُس کی چارپائی کے قریب ہو بیٹھا۔ اُس نے بلند آواز میں ہانک لگائی۔ ”بلو! اب تو چائے بنا لا، دیکھ، تیرا دوجا ویر بھی آ گیا ہے۔“

گھر میں خالدہ کو پیار سے بلو کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

وہ جواباً چلائی۔ ”صاحب جی کو تو چائے پینے کے سوا اور کوئی کام ہے ہی نہیں۔ جب کہیں سے نہیں ملتی تو یہاں بھاگا چلا آتا ہے اور کہتا ہے ’میں ملنے کے لیے آیا ہوں‘...... تھوڑے سے کپڑے رہ گئے ہیں، تار پر ڈال لوں، پھر چائے بنا لاؤں گی۔“

کھالا زیر لب مسکرایا۔ ”بڑی جھلی کڑی ہے۔ ذرا خیال نہیں کرتی، کیا کہنا، کیا نہیں کہنا ہے۔ چلو چھوڑو! صفر پر آؤٹ ہونے والے بے سوریا جیسا منہ کیوں بنا رکھا ہے؟“

میں نے طویل سانس لی اور اُسے ’الف‘ سے ’یے‘ تک تمام روداد کہہ سنائی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی توجہ اور انہماک سے سنتا رہا۔

میرے خاموش ہونے پر بولا۔ ”تم نے بڑی غلطی کی شہرے! تمہیں کیا ضرورت تھی خان کے سامنے شاہ جی کی وکالت کرنے کی، کہہ دیتے، آئندہ نہیں جاؤں گا، مگر دیکھ بھال کر جاتے رہتے۔ خیر! اب بھی ایک راستہ ہے۔“

”وہ کون سا؟“ میں جلدی سے بولا۔

”تم جا کر امیر نواز سے بات کرو۔ وہ تمہیں لے کر حیات خان کے پاس چلا جائے گا۔ تم اُسے قائل کرنا۔ اُمید ہے وہ تمہاری بات سمجھ جائے گا اور وریام خان کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دے گا۔“ کھالے نے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ کھالے نے کیسے چٹکی بجاتے ہی میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ وہ بولا۔ ”مجھے یہ خان لوگ ’کھالا‘ کہتے ہیں، تم بھی کہتے ہو مگر تم پیار سے کہتے ہو، وہ نفرت سے کہتے ہیں۔ کبھی مجھے ’خالد محمود‘ نہیں کہیں گے۔ تمہیں کبھی کبھار ’شہر یار‘ کہہ لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک ان لوگوں نے تمہیں اور تمہارے گھرانے کو اپنے قبیلے سے نہیں نکالا۔ اگر تم ایسے ہی ان کے سامنے آتے رہو گے تو وہ دن دور نہیں جب تمہارا خاندان اِن لوگوں کی برداشت سے باہر ہو جائے گا اور تم لوگوں کو نور پور سے دیس نکالا دے دیا جائے گا۔ میں نے کئی مرتبہ تمہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تم پڑھ لکھ کر کوئی افسر شفسر لگ جاؤ اور اپنی بہن کو لے کر کسی شہر میں، کسی اور گاؤں میں، جہاں ایسے وڈیرے اور خان زادے نہ ہوں، نکل جاؤ۔ تم میری بات مانتے نہیں ہو۔ ہل چلاتے رہو گے، کھیتوں کو پانی دیتے رہو گے تو یہ لوگ تمہارا خون نچوڑ کر تمہیں کھوکھلا کر دیں گے پھر یہ گالیاں دیں گے، تم سر نہیں اُٹھاؤ گے۔ یہ جوتے ماریں گے، تم جوتے اُٹھا کر انہیں تھماؤ گے...... جیسے میرا باپ اور میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں ان کے دربار میں، ایسے ہی تم اور تمہاری آنے والی نسل دست بستہ ہو گی۔ پھر تم بلوچ نہیں رہو گے، کمین گنے جاؤ گے۔ جیسے میرا خاندان!“

وہ بہت گہری بات کر گیا تھا۔ میں نے تعجب سے دیکھا۔ میٹرک پاس ڈرائیور کے منہ سے ایسی باتوں کا جھڑنا حیران کن دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں؟ یہی باتیں تو ڈاکٹر شاہ جی کرتا ہے۔“

وہ بولا۔ ”وہ سنی سنائی اور کتابی باتیں کرتا ہے۔ میں تن پر بیتتے ہوئے واقعات کے نتیجے بیان کرتا ہوں۔“

ایسے میں خالدہ چائے کے دو پیالے نسبتاً میلی سی ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ چارپائی پر ٹکا کر رکھتے ہوئے بولی۔ ”لے صاحب جی! خالص دودھ میں پتی ڈال کر لائی ہوں۔ پیو گے تو اش اش کر اُٹھو گے۔“

کھالے نے آنکھیں دکھائیں۔ ”ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ گھر میں دودھ نہیں ہے، اب دودھ پتی بنا لائی ہو۔ چکر دیتی ہو؟“

”نہیں بھائی! تم خاموش رہو۔ یہ میرا اور صاحب جی کا مسئلہ ہے۔“ وہ شرارت بھری مسکراہٹ میری طرف اُچھال کر بولی۔ ”پروین کیا کر رہی تھی؟“

میں نے جھوٹ بولا۔ ”کڑھائی کر رہی تھی۔“

”ابھی سے ہی؟“ اُس کی آنکھیں شرارت سے جلنے بجھنے لگیں۔

”کیا مطلب؟“ میں نے گھورا۔

”اپنی غزالہ سے جا کر پوچھ لو، تفصیل سے بتا دے گی۔“

”اس سے کیا پوچھوں؟“

”یہی کہ لڑکیاں کڑھائی کب کرتی ہیں؟“ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ’کھی کھی‘ کرنے لگی۔

کھالے نے ڈانٹا۔ ”چل دفع ہو، جا کر کپڑے دھو۔ دماغ ہے یا شیطان کا گھر ہے۔“

اُس پر ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کھلکھلا کر ہنسی اور پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں کھسیا گیا۔

کھالا بولا۔ ”اُس کی بات سمجھے ہو؟“

میں سمجھ گیا تھا مگر دانستہ نفی میں سر ہلا یا۔

وہ بولا۔ ”جب لڑکیوں کی منگنی ہوتی ہے یا شادی طے پا جاتی ہے تو وہ اپنے جہیز کا سامان تیار کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔ چادریں کاڑھتی ہیں، سرہانے بناتی ہیں اور کپڑوں پر موتی ٹانکنے بیٹھ جاتی ہیں۔“

میں پھیکے رُو مسکرا دیا۔ مجھے یہ موضوع مضطرب کرتا تھا۔

چائے پینے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں کھالے کے گھر سے نکل آیا۔ حیات خان کے دارے پر پہنچا۔ امیر نواز کا پتا کیا۔ پتا چلا کہ وہ جیت شاہ کے مزار کی طرف گیا ہے۔ جیت شاہ کا مزار میرے گھر کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ مزار کے بیرونی احاطے میں اُسے نہ پا کر میں مقبرے میں داخل ہو گیا۔ اُسے جیت شاہ کی سبز منقش چادر میں لپٹی بڑی سی قبر کے پہلو میں دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑے دیکھا۔

میں جوتے اُتار کر اُس کے پہلو میں کھڑا ہو کر اُس کے فارغ ہونے انتظار کرنے لگا۔ کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ تعجب ہوا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں، آنکھوں کے گوشوں سے نم پانی کی دو لکیریں پھوٹ کر رخساروں تک آ گئی تھیں اور ہونٹ بالکل ساکت تھے۔ ساکت ہونٹوں پر دل کی لرزش مچلا کرتی ہے۔ وہ بھی دل ہی دل میں کچھ مانگ رہا تھا، کچھ طلب کر رہا تھا۔ مجھے یہ امیر نواز بڑا عجیب لگا۔ کہاں وہ جو شراب کے نشے میں دھت اول فول بکتا ہوا، لڑکیوں کے جذبات خیز تذکرے کرتا ہوا بے پروا امیر زادہ اور کہاں مزار پر اشکوں سے تر چہرہ لیے لب بستہ کھڑا مایوس، طلب گار، امیر نواز!

کافی دیر گزر گئی۔ اُس پر طاری کیفیت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تو میں نے کھنکار کر اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے، لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور آنکھیں کھول دیں۔ اُسے شاید اپنے رونے کا احساس نہیں ہوا تھا، قدرے میٹھی بیٹھی آواز میں بولا۔ ”ہاں بھئی شہرے! کیسے آنا ہوا؟“

میں نے کہا، ”یہ کیا ماجرا ہے؟“

”کیا؟“

میں نے اُس کی نم آنکھوں میں اشارتاً جھانکا۔

”بس ویسے ہی دل بھر آیا تھا یار، وگرنہ رونے کی بات تو کوئی نہیں تھی۔“ اُس نے نیم آزردگی سے کہا۔

ہم دونوں مقبرے سے نکل کر ٹہلتے ہوئے پختہ احاطے کے شمالی گوشے کی طرف آ گئے۔ میں نے اُسے ماسی فاطمہ کے ڈاکٹر شاہ جی کے پاس آنے، اطلاع دینے اور بعد ازاں وریام خان کے پُر اشتعال رویے تک سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میرے خاموش ہونے پر وہ بولا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”وریام خان مجھ سے ناراض ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ ناراض نہ رہے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔“

”مشکل ہے!“ وہ نیم مایوسی سے بولا۔

”اگر بڑا خان اُسے سمجھائے تو وہ......“ میرا اشارہ حیات خان کی طرف تھا۔

”خیر! تم فکر نہ کرو، میں ابا جی سے بات کر لوں گا۔ ڈاکٹر شاہ جی والا کیا قصہ ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”یہ زیناں والا کیا چکر ہے؟“

میں نے زیناں اور ڈاکٹر کے باہمی تعلق کی نوعیت پر دو ٹوک موقف اختیار کیا۔ جو سچ تھا، بیان کر دیا۔

وہ بولا۔ ”کہیں یہ نہ ہو کہ چاچا خان اِس کہانی کو نمک مرچ لگا کر نور پور کے گھر گھر میں پہنچا دے۔ تم یہاں کے لوگوں کو تو جانتے ہی ہو، بات کا بتنگڑ بنانے میں دیر نہیں کرتے۔ زیناں پر انگلیاں اُٹھنے لگیں گی اور ڈاکٹر شاہ جی کا یہاں رہنا دشوار ہو جائے گا۔“

میں نے کندھے اُچکائے۔ ”اس کا حل بھی تمہی کو ڈھونڈنا ہو گا۔“

www.Paksociety.com

"شاہ جی نے بڑی غلطی کی۔ کیا تھا، دو گھڑی کو چلا جاتا اور مریضہ کو دیکھ آتا۔ اب چاچے وریام کو یہ ایڈوانٹیج بھی حاصل ہے کہ مریضہ، اسما سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ بیٹی بھی وہ جس پر اُس کا باپ اور بھائی جان وارتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، ابھی چاچے وریام خان نے سردار حیدر خان تک یہ ماجرا اپنے مخصوص اشتعال انگیز انداز میں نہیں پہنچایا وگرنہ اب تک ڈاکٹر شاہ جی کو نور پور کی گلیوں میں مردہ جانور کی طرح گھسیٹا جا چکا ہوتا، اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دی گئی ہوتی۔" امیر نواز کے لہجے میں گمبھیرتا تھی۔

ایک سرد نامانوس سی لہر میرے تن بدن میں اُتر گئی۔ میں نے اُسے بڑے رسان سے باور کرایا کہ ڈاکٹر شاہ جی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ نور پور صحت کی غیر معمولی سہولتوں سے محروم ہو جائے گا۔ وہ خود بھی ڈاکٹر شاہ جی کا فین تھا۔ اُس کی دل سے عزت کرتا تھا۔ اُس نے مجھے دلاسا دیا۔ چونکہ وہ ابھی کچھ دیر مزار میں ہی رہنا چاہتا تھا اس لیے میں اجازت لے کر جیت شاہ کے احاطے سے نکل آیا۔ میرے دل پر پڑے ہوئے بوجھ میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ امیر نواز بہت کم وقت میں اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھا کر ڈاکٹر شاہ جی کو محفوظ کر دے گا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہوتے ہی چاچا چراغ مجھے ایک بار پھر سمجھانے بیٹھ گیا۔ زمانے کی اونچ نیچ، جمع تفریق اور حیثیتوں کے تفاوت کا فلسفہ میرے ذہن میں اُتارنے لگا۔ میں سر جھکائے سنتا رہا۔ چاچا اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کر رہا تھا جبکہ میں غیر محسوس انداز میں کھالے کی باتوں کو دل ہی دل میں دُہرا رہا تھا۔ دونوں کی باتوں میں تضاد تھا۔

کھالا کہتا تھا، ایک بار جھکنے والا زندگی میں کبھی سر اُٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں ہو پاتا۔

چاچا سمجھا رہا تھا کہ پھل سے لدی ٹہنی ہی جھکتی ہے۔ جس شاخ پر پھل نہیں لگتا، وہ جھکتی نہیں بلکہ ہواؤں کے دوش پر تڑپتی مچلتی رہتی ہے۔ کھالے کی باتیں دل کو لگتی تھیں، چاچے کی باتیں کھوکھلی اور اجنبی سی محسوس ہوتی تھیں۔ یک طرفہ گفتگو کی اس نشست میں چاچی اور پروین نے بھی حصہ ڈالا۔ میں نادان نہیں تھا مگر اُس گھڑی نادان بنا بیٹھا، سن رہا تھا، اثبات میں سر دھن رہا تھا۔ وقتی طور پر اسی خاموشی میں ہی عافیت تھی۔

رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ذہن بار بار ڈاکٹر شاہ جی کی طرف چلا جاتا۔ وہ مجھے بہت پیارا تھا۔ اُسے پہنچنے والے نقصان کے اندیشے نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ مبادا کچھ ہو جائے۔ باوصف اس کے کہ امیر نواز نے مجھے مضبوط تسلی دی تھی، میرے دل میں ان گنت واہمے سرسرانے لگے تھے۔ کئی مرتبہ جی چاہا کہ خاموشی سے اُٹھ کر اسپتال چلا جاؤں اور اپنی آنکھوں سے اُسے صحن کے وسط میں چارپائی پر لیٹے دیکھ آؤں مگر مصلحت آڑے آئی۔

علی الصباح کھال کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں اسپتال پہنچ گیا۔ کھال چونکہ سطح زمین سے تین چار فٹ بلند تھا، اس لیے کھال پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے اسپتال کا مکمل اندرونی منظر دکھائی دیتا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہی دکھائی دیتا تھا۔ میں اردگرد دیکھتا ہوا چہار دیواری کا ٹوٹا ہوا حصہ عبور کر کے اینٹوں کی روش پر آ گیا۔ صبح کے ملگجے ماحول میں پہلے بھی بارہا ڈاکٹر شاہ جی کے گھر میں آ چکا تھا۔ ڈاکٹر منہ اندھیرے جاگ جانے کا عادی تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد کھیتوں میں چہل قدمی کرنا اُس کا معمول تھا مگر آج یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی تک نہیں جاگا یا اگر جاگ بھی گیا ہے تو کوٹھی سے باہر نہیں آیا۔

چھوٹے کوارٹروں میں زندگی ہڑ بڑا کر بیدار ہو چکی تھی۔ برتنوں کی کھنک اور جھاڑو کی مخصوص آواز ہر آباد کوارٹر سے برآمد ہو رہی تھی۔ میں آہستہ روی سے چلتے ہوئے ڈاکٹر کی کوٹھی کے سامنے آیا۔ دروازہ حسب معمول چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں بیرونی دروازہ عبور کر کے کوٹھی میں داخل ہوا، ادھر اُدھر دیکھا مگر صحن میں کہیں بھی ڈاکٹر شاہ جی دکھائی نہیں دیا۔

میرا دل یکبارگی ہول کھانے لگا۔ اس وقت تک بیڈ روم میں رہنا اُس کے معمول کا حصہ نہیں تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں بھی نہیں تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے کوٹھی کے بقیہ دونوں کمرے اور کچن بھی دیکھ ڈالا۔ وہ دکھائی نہیں دیا تو میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ خالی الذہنی کی کیفیت سے دوچار برآمدے میں، اپنے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے ڈاکٹر شاہ جی کو دو تین مرتبہ پکارا۔ آواز نہیں آئی۔ پھر میری آواز خاصی بلند ہو گئی مگر بے سود۔ ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں ایک نامانوس اور سماعت شکن آواز گونجی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ غیر ارادی طور پر میں ایڑیوں کے بل گھوما۔ ایک عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والا منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

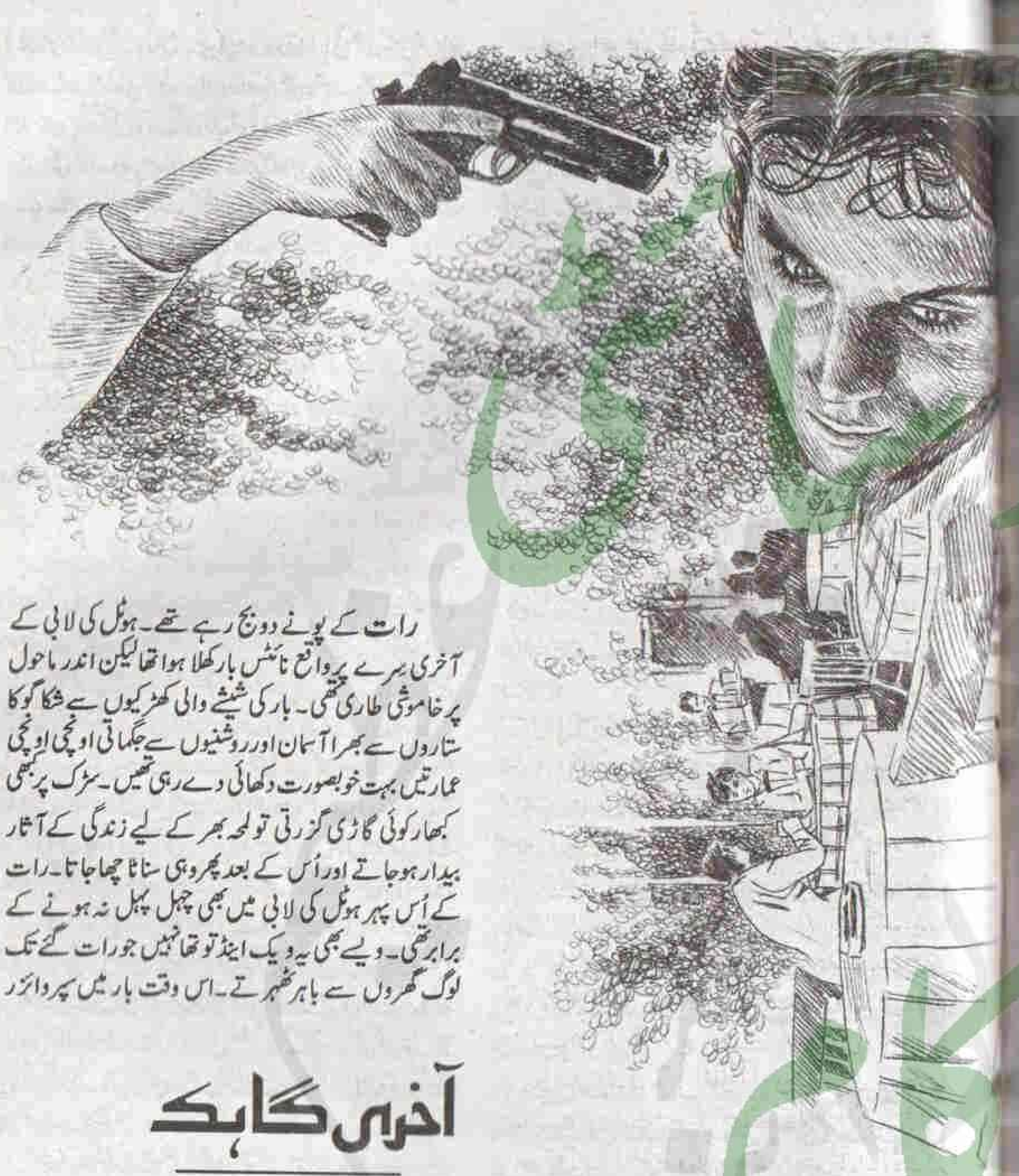

آخری گاہک

محمد عفان

بعض مناظر انسان کے حافظے میں کچھ اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ ان سے صرفِ نظر ممکن ہی نہیں ہوتا... اس نے بھی نظر چرانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی گہری نظروں سے بچ نہ سکا۔ وہ جو ماہر نشانہ باز تھا، اگر کسی کی نظروں کا شکار ہو جاتا تو تمام عمر اسے اسی حصار میں رہنا پڑتا اور یہ اسے ہرگز منظور نہ تھا۔

پل پل لہو کی گردش تیز کرتی ...... ایک سنسنی خیز کہانی

رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ ہوٹل کی لابی کے آخری سرے پر واقع نائٹس بار کھلا ہوا تھا لیکن اندر ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ بار کی شیشے والی کھڑکیوں سے شکا گو کا ستاروں سے بھرا آسمان اور روشنیوں سے جگمگاتی اونچی اونچی عمارتیں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ سڑک پر کبھی کبھار کوئی گاڑی گزرتی تو لمحہ بھر کے لیے زندگی کے آثار بیدار ہو جاتے اور اُس کے بعد پھر وہی سناٹا چھا جاتا۔ رات کے اُس پہر ہوٹل کی لابی میں بھی چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔ ویسے بھی یہ ویک اینڈ تو تھا نہیں جو رات گئے تک لوگ گھروں سے باہر ٹھہرتے۔ اس وقت بار میں سپروائزر

www.Paksociety.com

ڈیلروس اور ایک بارٹینڈر جیری موجود تھا۔ باقی عملہ چھٹی کر چکا تھا۔ ویسے کچھ دیر پہلے یہاں خاصا ہنگامہ تھا۔ بینک کے دس ملازمین پر مشتمل ایک گروپ ترقی کا جشن منانے کے لیے یہاں جمع تھا۔ وہ پینے پلانے کے ساتھ اونچی آواز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ پندرہ منٹ پہلے ہی وہ اٹھ کر گئے تھے، جس کے بعد سے بار میں خاموشی کا راج تھا۔

”تم چاہو تو گھر چلے جاؤ، میں کام نمٹا کر بار بند کر دوں گا۔“ جیری نے سپروائزر ڈیلروس کو پیشکش کی۔ اسے یقین تھا کہ اب کوئی یہاں نہیں آئے گا۔ اس وقت وہ ایک، ایک کر کے سارے گلاس دھو کر قرینے سے ریک میں لگا رہا تھا۔

”تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی نا؟“ یہ پیشکش سن کر ڈیلروس جھوم اٹھا تھا۔ مگر جاتے جاتے پھر بھی اُس نے اخلاقاً پوچھ لیا۔

”ارے نہیں دوست...... جلدی سے گھر جاؤ، بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔“ جیری نے اسے یقین دلایا اور گلاس دھوتا رہا۔

شکاگو کے مقامی قوانین کے تحت ویک اینڈ پر صبح پانچ بجے جبکہ عام دنوں میں چار بجے تک بار بند کر دینا لازم تھا مگر عام دنوں میں رات بارہ بجے ہی بار میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ کبھی کبھار ہوٹل میں ٹھہرنے والا کوئی گاہک آجاتا ورنہ تو خاموشی ہی چھائی رہتی تھی۔ اُس وقت بھی ہال میں صرف ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا پی رہا تھا۔ ڈیلروس کے جاتے ہی وہ آخری شخص بھی اٹھ گیا۔ جتنی خاموشی سے وہ پچھلے گھنٹا بھر سے بیٹھا تھا، اُتنی ہی خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی بار گاہکوں سے مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ جیری سوچ رہا تھا کہ بس جلد از جلد صفائی ستھرائی مکمل کر لے تو وہ بھی گھر جائے اور سو جائے۔ ویسے بھی وہ آج شام یہ سوچ کر آیا تھا کہ رات جلد ہی سوئے گا۔

جیری کام نمٹانے میں لگا ہوا تھا کہ اسی دوران میں ایک دراز قامت شخص اندر داخل ہوا اور بار کو خالی دیکھ کر ٹھٹک کر دروازے میں ہی ٹھہر گیا۔ ”آجاؤ۔“ جیری نے اسے رکتے دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کمبخت کہیں رات کالی نہ کر دے۔ لگتا ہے آج بھی جلدی سونا نصیب میں نہیں ہے۔“ غیر متوقع گاہک کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں اُس پر لعن طعن کرنے لگا۔ نووارد گاہک عمدہ تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے مہرے اور لباس سے وہ مہذب اور دولت مند لگ رہا تھا۔ جیری کا اشارہ دیکھ کر وہ اطمینان سے آگے بڑھا اور کاؤنٹر کے ساتھ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

جیری ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ریک میں رکھ کر تولیا سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا۔ اس کے لبوں پر کاروباری مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ ”کہیے...... کیا لینا پسند کریں گے آپ؟“ اس نے نووارد کے بالکل قریب ہو کر شائستہ لہجے میں پوچھا۔

”پنیر میں تلے ہوئے زیتون کے ساتھ......“ یہ کہتے ہوئے نووارد اُسے اپنا آرڈر لکھوانے لگا۔

”ابھی لاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کو مڑا۔

”سنو......“ گاہک نے پیچھے سے آواز دی۔

”کہیے؟“ جیری نے پلٹ کر پوچھا۔ ویسے بھی رات کے اس پہر جب وہ گھر جانے کا سوچ رہا تھا، یہ گاہک اسے عذاب سے کم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے زیتون بہت پسند ہیں۔ دو چار زیادہ ڈال دینا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ”تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی نا؟“ اس نے اس انداز سے یہ بات کہی، جیسے اُسے آرڈر دینے پر ندامت ہو رہی ہو۔

”بالکل بھی نہیں۔“ جیری نے ایک بار پھر مصنوعی کاروباری مسکراہٹ لبوں پر سجالی تھی۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ گاہک خاصا مالدار ہے۔ رات کے آخری پہر کے آخری گاہک سے اُسے بھاری ٹپ مل سکتی تھی۔

”لیجیے۔“ کچھ دیر بعد جیری اس کے سامنے گلاس رکھ رہا تھا۔

”بہت عمدہ۔“ گاہک نے چسکی بھری اور پھر زیتون کا ایک دانہ منہ میں ڈال کر کہنے لگا۔ ”ہمیشہ کی طرح شاندار اور لذیذ۔“

جیری نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آگے بڑھ کر اپنے کام نمٹانے میں لگ گیا۔ آخری گاہک اپنے شغل میں مصروف تھا۔

”بڑی خاموشی ہے یہاں پر۔“ جیری کھڑکی کے پردے برابر کر رہا تھا، تب اُس نے کہا۔

”جی ہاں......“ یہ کہنے کے لیے جیری کو ایک بار پھر مسکرانا پڑا تھا۔ ”رات کے تقریباً دو بجنے والے ہیں اور یہ منگل کی رات ہے۔“ وہ یہ باور کروانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ویک اینڈ نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے گاہک کا اتنا زیادہ احترام کرتے ہیں کہ اپنی نیند تک قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

”منگل کی رات نہیں، بدھ کی علی الصباح......“ گاہک نے مسکرا کر کہا۔

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ جیری ایک بار پھر مسکرایا۔ ”ہمارے لیے گھڑی سے زیادہ گاہک قابلِ احترام ہیں۔ ورنہ تو عام دنوں میں، اس وقت میں بستر میں ہوتا ہوں۔“ جیری کا خیال تھا کہ اسے یہ بات اجنبی کو ضرور باور کرانی چاہیے کہ اتنی رات میں وہ بار بند کر کے جانے کے بجائے صرف اُس کے خیال سے رکا ہوا ہے۔ اس طرح گاہک خوش ہوگا اور اس کی خوشی کا مطلب ہے بھاری ٹپ۔

”بہت خوب!“ وہ مسکرایا اور لہکتے لہجے میں کہنے لگا۔ ”تم اور تمہاری سروس، دونوں بہت عمدہ ہیں۔“

”شکریہ......“

”میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہونا چاہیے؟“ اس نے گلاس کو خالی ہوتا دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اور کیا لینا پسند کریں گے آپ؟“ جیری نے دونوں کہنیاں بار کاؤنٹر پر ٹکائیں اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ارے سنو...... تمہارا نام کیا ہے؟“ اچانک اس نے موضوع بدل دیا اور اٹھ کر کاؤنٹر پر آکر پوچھنے لگا۔

”جیری تھامس......“

میں ہوں میک۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا داہنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا اور نہایت گرم جوشی سے جیری کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ویسے تو جیری کم باتونی نہیں تھا مگر رات کے اس پہر وہ خاصا تھک چکا تھا۔ اس وقت اسے کسی اجنبی گاہک سے باتیں کر کے وقت گزاری کی قطعی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو بس جلد سے جلد بستر میں لیٹ کر نیند کی وادی میں کھو جانا چاہتا تھا مگر میک کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اسے نیند کے بجائے وقت گزاری کا بہانہ چاہیے تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر بار میں آبیٹھا تھا۔

”لگتا ہے تمہارا کام ختم ہو چکا؟“ میک نے گہری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کام تو ختم ہو چکا۔“ جیری نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تو گھر جانے کی تیاری ہے۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

”کیا سب جا چکے؟“

”ہاں...... اب میں ہی یہاں ہوں اور وہ بھی آپ کی خدمت کے لیے۔“ کہیں گاہک کو یہ بات بُری نہ لگے۔ اس لیے وہ یہ کہہ کر مسکرانے لگا۔

”بہت شکریہ تمہارا۔“ یہ سن کر اس نے کہا۔ ”تو چلو، اسی بات پر میری طرف سے ایک بہت شاندار ڈرنک بناؤ اپنے لیے۔“ اس نے جیری کو پیشکش کی۔ ”فکر مت کرو، بل میں دوں گا اور ہاں میرے ساتھ بیٹھ کر پیو۔ اکیلے پیتے ہوئے مزہ نہیں آرہا۔“

جیری دوسرے بارٹینڈروں کی طرح فطری طور پر بہت باتونی تھا اور اس وقت باتیں بنانے کے موڈ میں قطعی نہیں تھا مگر اس نے میک کی دعوت یہ سوچ کر قبول کر لی کہ چلو کون سا جیب سے کچھ جا رہا ہے۔ ویسے بھی جب تک وہ بیٹھا ہے، اسے یہاں ہونا ہی ہے تو کیوں نہ چسکیاں بھرتے ہوئے وقت گزارا جائے۔ یہ بار ہوٹل کی ملکیت تھا اور عموماً رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔

”اور سناؤ، کیا حال ہیں؟“ وہ گلاس لے کر کاؤنٹر کی دوسری طرف بیٹھے میک کے سامنے والے اسٹول پر بیٹھ گیا تو اُس نے رسماً پوچھا۔ وہ بات سے بات نکال کر وقت گزاری کا ماہر تھا۔ یہ سن کر جیری زبان سے تو کچھ نہ بولا البتہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

”میں نے سنا ہے یہاں پچھلے ہفتے کچھ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی؟“ اسے خاموش دیکھ کر میک نے سوال کیا۔

”ہاں، وہ کچھ ایسا ہی ہے۔“ جیری نے گول مول جواب دیا۔

”کیا ہوا تھا؟ کچھ بتا سکتے ہو اُس واقعے کے بارے میں۔“

میک کی فرمائش سن کر وہ دل ہی دل میں جھلا کر رہ گیا۔ پچھلے ایک ہفتے کے دوران وہ سیکڑوں بار لوگوں کو یہ قصہ سنا چکا تھا۔ آج بھی دو چار لوگوں نے اس واقعے کا سرسری تذکرہ کیا تھا لیکن میک ان سب سے الگ تھا۔ وہ ڈرنک کی قیمت پر اس کا دماغ کھانے کو تلا ہوا تھا۔ ”گولی چلی تھی یہاں پچھلے ہفتے۔“ جیری نے چسکی بھری اور بے تاثر لہجے میں کہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ واقعہ سُنے بغیر پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ”ایک آدمی مارا گیا اور بس!“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور دیکھنے لگا کہ یہ سن کر میک کے تاثرات کیا ہیں۔

”ارے چھوڑو یار...... کیا بات کرتے ہو۔“ میک نے لہکتے ہوئے کہا۔ ”آدمی کو گولی مار کر قتل کر دیا، یہاں اس پُرہجوم بار میں۔“ اس نے گلاس والے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر تھوڑا سا لہراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ یہ قصہ سچا ہے۔“

”وہ یہاں مرا تھا، اِس جگہ پر۔“ یہ سن کر جیری نے میک کے دائیں ہاتھ پر رکھے اِسٹول کی طرف اشارہ کرتے

www.Paksociety.com

ہوئے کہا۔

"کیا......؟" یہ کہہ کر وہ نہایت غور سے اِسٹول کو ایسے گھورنے لگا جیسے اُس پر خون کے نشانات دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اسے اچھی طرح صاف کر دیا گیا ہے۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔" جیری نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔ "جب اُس پر گولی چلی تو وہ اٹھ کر نہیں بھاگا بلکہ اِسٹول پر ہی جما بیٹھا رہا تھا۔" جیری نے وضاحت کی۔ "یہ بھی خون میں نہا گیا تھا مگر ہم نے بعد میں اسے اچھی طرح دھو کر پالش کر دیا ہے۔"

"اوہ......" میک نے یہ سُن کر ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "جب گولی چلی اُس وقت تم یہیں پر تھے؟" اس نے جیری کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یہ قصہ سن کر وہ تھوڑا سا حیرت زدہ بھی نظر آ رہا تھا۔

"ہاں، میں یہاں کھڑا تھا۔" اس نے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کیا۔

"نہیں نہیں...... تم مذاق کر رہے ہو۔" یہ سن کر اس نے بھکے بھکے انداز کہا۔

"بڑی عجیب بات تھی۔ اسے پانچ گولیاں لگیں مگر وہ گولیاں کھاتے ہوئے بھی اِسٹول پر بیٹھا رہا۔" جیری نے لہجے کو پُرتاثر بناتے ہوئے کہا۔

"پانچ گولیاں...... حیرت کی بات ہے۔" میک کے لہجے سے حیرانی عیاں تھی۔

"ویسے یہ اِسٹول بھی بہت آرام دہ ہے، ممکن ہے کہ اسی وجہ سے وہ نہیں گرا ہو۔" جیری نے ذرا طنزیہ مگر شگفتہ لہجے میں کہا۔ بارٹینڈر ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ گاہک کو خوش رکھنے میں ہی اچھی ٹپ ملنے کا راز پوشیدہ ہے۔

"بات جو بھی ہو مگر یہ حیرت انگیز ہے کہ کسی کو اِسٹول پر بیٹھے بیٹھے پانچ گولیاں ماری جائیں اور وہ نیچے گرنے کے بجائے ویسے کا ویسا ہی بیٹھا رہے۔" میک نے اس انداز میں یہ بات کہی جیسے وہ اب بھی جیری کی کہی ہوئی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ ہو۔

"وہ خاصا تنومند شخص تھا۔" جیری نے قصے کو آگے بڑھایا۔ "سراغرساں بھی اس بات پر حیران تھے کہ اتنی گولیاں سینے پر لگنے کے باوجود وہ ذرا بھی نہیں ڈگمگایا تھا۔ جب وہ پہنچے اُس وقت بھی وہ مردہ حالت میں اِسٹول پر ہی جما ہوا تھا۔" پچھلے ایک ہفتے کے دوران میں وہ کئی بار لوگوں کو یہ کہانی سنا چکا تھا۔ اب تو اس کو یہ واقعہ تمام تر جزئیات کے ساتھ ازبر ہو چکا تھا۔ "سراغرسانوں کا خیال تھا کہ یہ اپنی نوعیت کا بڑا منفرد واقعہ ہے۔"

"نہیں...... میرا خیال ہے کہ اب یہ ایسی بھی منفرد بات نہیں۔" میک نے جیری کے آخری جملے پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر غیر معمولی تو ہے۔" جیری نے وضاحت کی۔

"وہ نشانہ باز کہاں تھا؟" میک نے بڑا سا گھونٹ بھر کر گلاس خالی کیا اور لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے جیری کو استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔

اس سوال نے جیری کے دماغ میں ہیجان تو برپا نہیں کیا مگر وہ یہ سن کر چونکا ضرور تھا۔ اسے حیرت تھی کہ میک نے قاتل کے بجائے لفظ 'نشانہ باز' کا استعمال کیوں کیا۔ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"جب نشانہ باز نے گولی چلائی، اُس وقت تم کہاں پر تھے؟" جیری کو خاموش دیکھ کر اس نے اپنے سوال کو نئے انداز سے دُہرایا۔ میک نے ایک بار پھر قاتل کو نشانہ باز کہا تھا۔

"عین اس اِسٹول کے برابر میں، جہاں تم بیٹھے ہو۔" جیری نے ذہن میں دَر آنے والی مختلف سوچوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو یار۔" میک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پانچ گولیاں چلیں اور تم نشانے کے بالکل برابر کھڑے رہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اسی اِسٹول کے برابر کھڑا تھا۔" اس نے ایک بار پھر اُس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ویسے اب اسے میک کی باتوں میں مزہ آنے لگا تھا۔ پہلی بار کوئی اتنی دلچسپی سے اس کا قصہ سن رہا تھا ورنہ اب تک تو لوگ سنتے اور چُپ چاپ چل دیتے تھے۔ یہ پہلا شخص تھا جو صرف قصہ سن ہی نہیں رہا تھا بلکہ سوال پہ سوال بھی کیے جا رہا تھا۔

"اوکے۔" کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ جیری کی بات پر یقین کر چکا ہے۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پہلے میں سمجھا کہ تم نے یہ قصہ سنا اور خود عینی شاہد بن بیٹھے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے بھی جب اس طرح کا واقعہ ہو تو سنی سنائی باتوں کا سلسلہ اتنا پھیل جاتا ہے کہ سننے والا بھی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ سب کچھ گویا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی ہوا تھا۔"

"ایسا نہیں ہے۔" جیری نے آہستہ سے کہا۔

"میں تو یونہی ایک بات کر رہا تھا۔" میک نے جلدی

سے کہا۔ وہ جیری کے لہجے میں پوشیدہ ناراضی کو بھانپ گیا تھا۔ اس لیے دل رکھنے کے لیے اس نے کہا۔ "اب دیکھو نا، کوئی بات ہو جائے لوگوں کے سامنے۔ پھر دیکھو، ہر شخص اپنے انداز سے اُسے بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔"

"ویسے تمہاری یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ ایسا ہوتا ہے اور معاملہ قتل کا ہو تو افواہیں زیادہ پھیلتی ہیں۔" جیری نے میک کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اگرچہ قتل کے واقعے کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا لیکن اس نے جیری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ جس وقت ڈرنک کرتے ہوئے اُس شخص پر گولیاں چلیں، تب وہ ایک گاہک کو ڈرنک دے کر پلٹا تھا۔ اگر گولیاں چلانے والا کوئی اناڑی ہوتا تو شاید آج جیری بھی یہ قصہ سنانے کے لیے یہاں موجود نہ ہوتا مگر وہ ایک ماہر نشانہ باز تھا۔ اُس نے اس مہارت سے گولیاں چلائیں کہ ساری کی ساری مقتول کے سینے پر لگیں۔ اگر کوئی گولی ایک دو ڈگری بھی اپنی جگہ سے چُوک جاتی تو جیری کا مرنا نہیں تو کم از کم زخمی ہونا یقینی تھا۔ اب بھی وہ اکثر تنہائی میں یہ سوچ کر لرز جاتا کہ اگر اُس روز وہ اپنی جگہ پر جم کر کھڑا نہ ہو جاتا یا قاتل ذرا سا بھی گھبرا کر اندھا دھند گولیاں چلاتا تو اُس کا کیا ہوتا۔ ویسے بھی موت اُسے چھو کر گزر گئی تھی۔ اسی لیے اُس رات جو کچھ ہوا، اُس کا اثر اس کے اعصاب پر اب تک تھا۔

"ویسے جن دنوں یہ واقعہ ہوا، میں یہاں نہیں تھا۔" میک نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "میں نے تو سارا قصہ اخبار میں پڑھا تھا۔"

"کہاں تھے؟"

"کنساس سٹی میں۔" جیری کا سوال سن کر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ واقعہ وہاں کے اخباروں میں بھی چھپا تھا؟" جیری نے حیرت سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں......"

"تو تم شکاگو کے رہنے والے نہیں ہو؟" جیری نے پھر سوال کیا۔

"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "میں کنساس سٹی کا رہنے والا ہوں۔"

"کنساس سٹی۔" جیری نے زیرِ لب کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ جیری سمجھتا تھا کہ یہ قصہ صرف شکاگو کے اخبارات کی زینت بنا ہوگا لیکن اسے حیرت تھی کہ دوسری ریاستوں میں بھی اُس قتل کا چرچا ہوا تھا۔ جیری شکاگو کا ہی رہنے والا تھا، اس نے کنساس سٹی کے بارے میں سنا تو بہت تھا لیکن کبھی وہاں جانے کا اسے موقع نہیں ملا تھا۔ یہ اور بات کہ اُسے کنساس جانے کا بہت شوق تھا۔

"کنساس سٹی تو کافی بڑا ہوگا نا؟" جیری نے اشتیاق بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، کافی بڑا شہر ہے اور خوبصورت بھی۔"

"تو پھر یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

"بزنس کے سلسلے میں آیا ہوں۔" میک نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر گول مول جواب دیا۔

"اب سمجھا۔" جیری نے سر ہلا دیا۔ "شاید اسی لیے اتنی دلچسپی ہے اس قصے میں۔ ورنہ یہاں والوں کے لیے تو یہ واقعہ اب قدرے غیر اہم ہو چکا ہے۔"

"گولیاں چلیں، قتل ہوا...... یہاں پر تو بہت گند ہو گیا ہوگا؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میک نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں......" جیری نے فوراً جواب دیا۔ "گولی چلتے ہی لوگ گھبرا کر بھاگے تھے۔ ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ سب کچھ اُلٹ پلٹ گیا تھا یہاں پر۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور فرش کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ نیا قالین بچھایا ہے۔ وہ تو خون میں بری طرح لتھڑ چکا تھا۔ صرف دھونے سے وہ قابلِ استعمال نہیں ہو سکتا تھا، اسی لیے نیا قالین بچھانا پڑا۔ صرف یہی نہیں، سارے اسٹول پالش کروانے پڑے تھے۔ کافی پیسا لگ گیا ان کاموں پر۔"

یہ سن کر میک نے اسٹیل کے چمچماتے اِسٹولوں کی طرف دیکھا اور پھر فرش پر نظر ڈالی۔ "یہ سب تو اب بالکل نئے لگ رہے ہیں۔"

"صرف قالین ہی تو نیا ہے۔ باقی تو سب کچھ وہی ہے۔" جیری نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ابھی تک نئے قالین کی مہک باقی ہے۔" میک نے گہری سانس لینے کے بعد کہا۔ "صفائی ستھرائی میں اچھا خاصا وقت لگ گیا ہوگا۔ اِرد گرد چیزیں بکھری ہوں گی۔" گویا میک اب وہ واقعے کے بعد کی تفصیل جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

"کیوں نہیں۔" اب جیری کو بھی اس کے ساتھ باتوں میں مزا آنے لگا تھا۔ "پوری رات صفائی میں گزر گئی تھی۔"

"پولیس نے اتنی جلدی تمہیں جائے وقوع صاف کرنے کی اجازت دے دی تھی؟" اس کے لہجے سے حیرت ٹپک رہی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

”کوئی دو گھنٹے بعد۔“ جیری نے گلاس سے چسکی بھرتے ہوئے کہا۔ میک نے ایک گلاس کی آفر کی تھی اور اب وہ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مہنگے مشروب کا دوسرا گلاس بھر کر بیٹھا ہوا تھا۔ ”ویسے پولیس نے یہ کہہ کر اس جگہ کو کلیر کردیا تھا کہ یہاں ایسی کوئی شے نہیں ملی، جس سے تفتیش میں مدد مل سکتی ہے۔“ یہ کہہ کر جیری نے اُس کی طرف دیکھا۔ ”ویسے بھی گولیاں مقتول کے جسم میں پیوست تھیں۔ پوسٹ مارٹم میں وہ خود ہی نکل آتیں، یہاں ایسا کیا رکھا تھا کہ جس سے پولیس کو کچھ پتا چل سکتا۔“ اس نے ایک بار پھر قالین پر نظر ڈالی۔ ”یہاں تو صرف خون، اُلٹی میزیں اور ٹوٹے گلاس تھے۔“

”ہوں......ں......ں۔“ میک نے یہ سُن کر ہنکارا بھرا۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ اُس وقت یہاں کیا حالت ہوگی۔“

”سب کچھ تہس نہس ہوا تھا۔“ جیری نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو باہم رگڑتے ہوئے کہا۔ موسم بہار کے باوجود رات کا یہ پہر خاصا ٹھنڈا تھا۔ ”سنو......“ جیری نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے اتنے آہستہ سے کہا کہ کہیں کوئی سُن نہ لے، حالانکہ اس وقت بار بالکل خالی تھا۔

”کہو......“ میک نے اس کا رازدارانہ انداز محسوس کرلیا تھا۔ اُس نے بھی آگے جھک کر سرگوشی کی۔

”جس رات یہ واقعہ ہوا، اُس سے اگلی رات صفائی کے دوران میں مجھے یہاں سے ایک شے ملی تھی۔“ اس نے ہاتھ سے میک کی عقبی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ اُس دیوار کے ساتھ بار کاؤنٹر جڑا ہوا تھا۔

”وہ کیا چیز تھی؟“ میک نے تجسس سے پوچھا۔ جیری کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جیری اسے ایسی بات بتانے والا ہے جس کا ذکر اُس نے کسی اور سے اب تک نہیں کیا ہوگا، تبھی تو اس کا انداز رازدارانہ تھا۔

”وہ میرے خیال میں......“ جیری نے بات ادھوری چھوڑ دی اور کچھ سوچنے لگا۔ وہ جس شے کا تذکرہ کرنے جارہا تھا، اُس کے لیے مناسب الفاظ اسے نہیں مل رہے تھے۔

”کیا ہے وہ؟“ جب چند لمحوں تک وہ کچھ نہ بولا تو میک نے بے تابی سے سوال دہرایا۔

”وہ کوئی گلوب جیسی شے تھی۔“ جیری نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

”گلوب جیسی......“ یہ سن کر میک نے حیرت سے کہا۔

”وہ جیسے ٹشو رول ہوتا ہے نا۔“ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب بھی وہ اس شے کو بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں ہے۔

”واہ......!“

”ویسے وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ بیس فٹ تو ہوگا نا۔“ اچانک جیری نے موضوع بدل دیا اور ہاتھ سے سمت کا تعین کرتے ہوئے پوچھا۔

”تقریباً۔“ میک نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بات اس نے محسوس کرلی تھی کہ جیری نے اچانک بات پلٹ دی ہے مگر کیوں؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا لیکن اس کو بیچ میں ٹوکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جیری نے یہ سن کر منہ سے تو کچھ نہیں کہا، صرف کندھے اُچکا دیے۔

”جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو تم یہیں کھڑے تھے؟“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جیری یہ بات پہلے بھی اسے بتا چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں میک نے ایک بار پھر اس سے تصدیق کے انداز میں پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔“ اس نے میک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اتنا قریب تھا جتنا کہ اس وقت تم اور میں ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔“

”تم کہہ رہے تھے کہ جسے گولیاں لگیں وہ تو بیٹھے بیٹھے ہی مرگیا مگر وہ نشانہ باز اُس وقت کہاں تھا؟“ میک نے پھر ایک عجیب سا سوال کیا۔ یہ سن کر جیری کے دماغ میں ایک بار پھر ہلکا سا جھماکا ہوا۔ تیسری بار اس نے قاتل کو نشانہ باز کہا تھا مگر کیوں؟ یہ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وجہ پوچھ لوں مگر یہ سوچ کر چپ رہا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہوجائے۔ اس کی ناراضی کا مطلب ٹپ سے محرومی اور اب تک باتوں میں صَرف ہونے والے وقت کا ضائع ہونا تھا۔ جیری کو بھاری ٹپ کی امید تھی اور اب وہ اپنے وقت کی سرمایہ کاری ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”کیا وہ وہاں تھا؟“ جیری کو خاموش دیکھ کر اس نے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اچانک جیری کے دماغ میں ایک اور جھماکا ہوا۔ اس نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی وہ بالکل پولیس والوں جیسا تھا۔ ”میک......تم کرتے کیا ہو؟“ جیری نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کردیا۔ اسے اب اُس پر کچھ شک ہونے لگا تھا۔ جس انداز میں وہ باتیں کرید رہا تھا، اس ایک ہفتے کے دوران میں کسی نے بھی اس انداز میں اُس قتل کی رُوداد جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”ایڈورٹائزنگ مارکیٹنگ۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ”ہاں تو یہ بتاؤ کہ جس نے پستول سے فائر کیے تھے، اُس کا کیا بنا؟“ اس نے جیری کے سوال کا مناسب جواب دینے سے گریز کیا اور ایک بار پھر اپنی بات پر واپس آگیا۔

”گولیاں چلانے کے بعد وہ نہایت آرام سے آگے بڑھا اور یہاں کاؤنٹر پر پستول رکھ کر واپس چلا گیا۔“ جیری نے جھلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ میک کے بارے میں اس کا شک یقین میں بدلتا جارہا تھا۔

”تم سنجیدہ نہیں ہوسکتے؟“ اس کے بہ ظاہر احمقانہ جواب سے میک نے بھانپ لیا تھا کہ اب وہ زچ ہونے لگا ہے۔ اس لیے اس نے استفساریہ نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سرسری طور پر اس قصے کو جاننے کے بجائے کسی خاص مقصد کے تحت اسے کرید رہا ہے۔

”میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ وہ پستول کاؤنٹر پر رکھ کر ٹہلتا ہوا چلا گیا تھا؟“ جیری نے اس بار قدرے متانت سے جواب دیا۔

”اوکے۔“ اس بار میک اس کا جواب سن کر مطمئن نظر آیا۔ ”اس نے پستول کس جگہ پر رکھی تھی؟“

”وہاں، تم جہاں بیٹھے ہو؟ اس کے داہنی جانب۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس جگہ کی نشاندہی کی۔

”لوگوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی؟“

”ایک تو اُس وقت بار میں لوگ کم تھے، دوسرا یہ کہ پہلی گولی چلتے ہی سب بھاگ کھڑے ہوئے تھے اپنی اپنی جان بچانے کے لیے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ طاری تھی۔ ”ویسے بھی پستول ہاتھ میں ہو تو کون قریب آتا ہے۔“

”اُس نے پستول یہاں کیوں چھوڑ دی، وہ اسے ساتھ بھی لے جاسکتا تھا؟“ میک نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا جواب تو وہی بتا سکتا ہے۔“ جیری نے کندھے اُچکا کر جواب دیا۔

”پستول سے کچھ پتا چلا؟“

”نہیں......“ جیری نے جواب دیا۔ ”پولیس سراغرساں بتا رہا تھا کہ گولیاں چلاتے وقت اس نے ہاتھوں پر دستانے پہنے ہوئے تھے۔ پستول پر انگلیوں کے نشانات بھی نہیں تھے اور سیریل نمبر بھی مٹا دیا گیا تھا۔“

”ویسے عجیب بات ہے کہ وہ اپنی پستول چھوڑ گیا۔ جب وہ پستول چھوڑ کر، تمہارے کہنے کے مطابق غیر مسلح ہوکر واپس جارہا تھا، تب تو لوگ اسے پکڑنے کی کوشش کرسکتے تھے؟“

”میں نے کہا نا کہ لوگ خوف زدہ ہوکر بھاگ گئے تھے۔“

”مگر تم تو یہیں پر تھے؟“ میک نے قطع کلامی کی۔

”میں تو اُس وقت یہ سب دیکھ کر اپنے اوسان کھو بیٹھا تھا۔“ جیری نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے تو لگ رہا تھا کہ بس! اب میں بھی گیا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جھرجھری لی اور بات مکمل کرکے سر کو جھٹکا دیا جیسے وہ اُس لمحے کی خوف زدہ کرنے والی بھیانک یادوں کو ذہن سے جھٹک کر دور پھینک دینا چاہتا ہے۔ ”ویسے تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو اُسے پکڑنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”خیر......جو ہوا، سو ہوا، اب کیا کرسکتے ہیں۔“

”تم جانتے ہو جب گاڈ فادر کے مائیکل نے پولیس مین۔ اور ایک شخص کو گولیاں مار کر ہلاک کیا تھا......“

بے چین روح

منٹو ایک بہت بڑی گالی تھا۔

اس کا کوئی دوست ایسا نہیں تھا جسے اس نے گالی نہ دی ہو، کوئی پبلشر ایسا نہ تھا جس سے اس نے لڑائی مول نہ لی ہو۔ کوئی مالک ایسا نہ تھا جس کی اس نے بے عزتی نہ کی ہو۔ بظاہر وہ ترقی پسندوں سے خوش نہیں تھا نہ غیر ترقی پسندوں سے۔ نہ پاکستان سے، نہ ہندوستان سے، نہ انکل سام سے، نہ روس سے۔

جانے اس کی مضطرب، بے قرار و بے چین روح کیا چاہتی تھی؟ اس کی زبان بے حد تلخ تھی، انداز بیان تھا تو کڑوا، کسیلا اور خاردار، نشتر کی طرح تیز اور بے رحم...... لیکن آپ اس کی گالی کو، اس کی تلخ کلامی کو، اس کے تیز نوکیلے خاردار الفاظ کو ذرا سا کھرچ کر تو دیکھیے۔ اندر سے زندگی کا میٹھا میٹھا رس ٹپکنے لگے گا۔ اس کی نفرت میں محبت تھی، عریانی میں ستر پوشی۔ آبرو باختہ عورتوں کی داستانوں میں اس کے ادب کی عفت پنہاں تھی۔ زندگی نے منٹو سے انصاف نہیں کیا لیکن تاریخ ضرور اس سے انصاف کرے گی۔

(کرشن چندر)

مرسلہ: عون عباس بابر، اوکاڑہ

www.Paksociety.com

"کون مائیکل۔" جیری نے یہ نام سنتے ہی میک کی قطع کلامی کی۔ اُس کی آنکھوں سے حیرت جھلک رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے قصے میں میک کا یہ مائیکل کہاں سے آٹپکا۔

"گاڈ فادر......" میک نے سرد لہجے میں کہا اور جیری کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اب بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ "میں فلم گاڈ فادر کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہو......تو یہ بات ہے۔" یہ سن کر جیری نے گہری سانس لی۔ "میں تو حیران تھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟"

"جب گاڈ فادر میں مائیکل ریستوران میں پولیس کیپٹن اور وہاں موجود دوسرے شخص کو گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے، تب وہ بھی اسی طرح اطمینان سے آگے بڑھ کر میز پر پستول رکھتا ہے اور سکون سے چلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔"

"ہاں یاد آگیا۔" جیری نے مداخلت کی۔ "میں نے یہ فلم کافی عرصے پہلے دیکھی تھی۔"

"یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔"

"مگر فلم میں تو مائیکل اندر داخل ہو کر گولیاں چلاتا ہے مگر وہ تو یہاں بیٹھا ہوا تھا۔" جیری نے مڑ کر ایک طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ڈرنک بھی لیا تھا۔"

"تو گلاس......"

"اُس پر سے بھی انگلیوں کے نشانات غائب تھے۔" جیری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے وضاحت کی۔ اچانک اسے خفت محسوس ہوئی۔ وہ قصے کو بیان کرتے ہوئے میک کے سوالوں کے جوابات میں بہت کچھ بھول گیا تھا۔ اسے لگا کہ میک اسے بزدل سمجھے گا کہ خالی ہاتھ قاتل کو پکڑنے کے لیے بھی آگے نہیں بڑھا۔ اس لیے اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک اور خوف زدہ کر دینے والا تھا کہ پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کروں۔ جیسے ہی میرے حواس ذرا بحال ہوئے، میں نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ انہیں آنے میں پندرہ منٹ لگے۔ میرے لیے یہ پندرہ منٹ پندرہ سال جتنے طویل تھے۔" وہ یہ باور کروانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بزدل نہیں ہے مگر اچانک ہونے والی واردات سے وہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ جیری کی آنکھوں کے سامنے زندگی میں پہلی بار کوئی قتل ہوا تھا۔ "میں مقتول کے عین برابر میں کھڑا تھا۔ میں تو اُس وقت یہی سمجھا کہ قاتل شاید میری بھی جان لے لے گا، مگر اسے اپنے نشانے کا اچھی طرح پتا تھا، تبھی تو وہ اپنا کام پورا کر کے فوراً چل دیا۔"

یہ سن کر میک کچھ نہ بولا، صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اُس نے ڈرنک کے بعد گولی چلائی۔ اس کا مطلب ہے کہ پینے کے بعد گلاس کاؤنٹر پر رکھا تھا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

"ہاں......مگر اس پر انگلیوں کے نشانات نہیں تھے؟"

"جیری......!" یہ سن کر میک نے اُسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

"وہ......وہ......" جیری اٹکتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ "جب میں نے پولیس کو فون کیا تو اُس کے بعد بے دھیانی میں وہ گلاس دھو کر بھی ریک پر لگا دیا تھا۔" اس نے بات بنائی۔ وہ یہ کہتے ہوئے خاصا گڑبڑا گیا تھا۔

"اچھا......" میک نے اسے گھورا۔ "قتل کا اہم ثبوت اور تم نے صاف کر دیا۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ "تم نے یہ بات پولیس کو بھی بتائی تھی؟"

"ہاں......شاید نہیں۔" میک کے غیر متوقع سوالات نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ "اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بات مکمل کی۔ خنکی کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔

میک نے کچھ نہیں کہا البتہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بہ دستور معنی خیز انداز میں مسکراتا رہا۔ یہ دیکھ کر جیری کچھ اور پریشان ہو گیا تھا۔ "کیا کروں، عادت سی ہو گئی ہے۔ جونہی کوئی گندا گلاس دیکھا، جھٹ سے اٹھا کر دھویا اور ریک میں لگا دیا۔ اُس دن بھی کچھ ایسا ہوا تھا۔ گھبراہٹ میں خیال ہی نہیں رہا۔" جیری کو کچھ خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس لیے اب وہ قتل کا دلچسپ قصہ سنانے کے بجائے اپنے دفاع پر اتر آیا تھا۔ رات ڈھل رہی تھی لیکن اب جلدی گھر جانے کا خیال بھی اس کے دماغ سے نکل گیا تھا۔ پہلے اسے اجنبی گاہک سے بھاری ٹپ کی امید تھی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس بلا سے کیسے جان چھڑائی جائے۔

"خیر جو چاہے کہہ لو۔ یہ تمہاری عادت بن چکی ہے۔" میک نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "عادت پڑ جائے تو آدمی کہاں رکتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی اُس دن ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اُس نے گلاس رکھا اور گولی چلا دی۔ پولیس جب تک پہنچتی تم نے گندا گلاس دیکھا اور دھو کر رکھ دیا۔ ویسے بھی گھبراہٹ میں غلطی تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"بالکل۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" میک نے مسکرا کر اُس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کے بیان پر سو فیصد یقین کر چکا ہو۔

"اب برسوں سے بارٹینڈر ہوں، عادت سی پڑ گئی ہے گلاس دھونے کی۔" اسے مطمئن ہوتے دیکھ کر جیری نے لقمہ دیا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" میک نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور خالی گلاس کی طرف دیکھنے لگا۔ "میرا خیال ہے ہمیں ایک، ایک ڈرنک اور لینا چاہیے۔"

"اور......؟" جیری نے یہ سن کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"فکر نہ کرو، بل تو میں ہی دوں گا۔ اپنا بھی اور تمہارا بھی۔"

جیری نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور کاؤنٹر کے پیچھے جا کر ریک سے دھلے ہوئے گلاس نکالنے لگا۔ میک گہری نظروں سے ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے اور ہال میں ہلکی روشنی نے ماحول کو پُراسرار بنا دیا تھا۔ سامنے ہوٹل کی لابی بھی سنسان تھی اور وہاں بھی روشنیاں مدھم تھیں۔

تقریباً پانچ منٹ بعد دونوں ایک بار پھر، ایک دوسرے کے سامنے گلاس تھامے خاموش بیٹھے تھے۔

"ویسے اُن دونوں کے درمیان کچھ بات چیت ہوئی تھی؟" کافی دیر بعد میک نے گلاس سے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔ بس! وہ آیا، ڈرنک لیا اور پھر گلاس خالی کرنے کے بعد اُس نے جیب سے پستول نکال کر گولیاں چلا دیں۔ ممکن ہے کہ اُن کے درمیان پہلے کچھ ہوا ہو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"ورنہ کوئی کسی دوسرے شخص کی جان کیوں لے گا۔" جیری ایک بار پھر پُراعتماد نظر آ رہا تھا۔

"اگر وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے تو اُن کے درمیان کم از کم ہیلو ہائے تو ہونی چاہیے تھی۔" میک نے جیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اتنی سی بات کے لیے ڈرنک کرتے وقت اُن کے پاس اتنا تو وقت ہوگا ہی۔"

"اُن کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی؟" جیری نے بے زاری سے کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس جرح سے تنگ آگیا ہے۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میں ان پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔"

"کیا مطلب؟" میک نے حیرانی سے کہا۔ "تم اُن پر کیوں نظریں رکھے ہوئے تھے۔ کیا وہ مشکوک نظر آ رہے تھے؟"

"میں یہاں کا انچارج بارٹینڈر ہوں۔" جیری نے اسے باور کرایا۔ "یہ میرا فرض بنتا ہے کہ یہاں آنے والوں پر نظر بھی رکھوں۔"

"ہُوں۔" میک نے یہ سن کر دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو اُس وقت بار میں کتنے گاہک موجود تھے؟"

"اب صحیح تعداد تو یاد نہیں۔" جیری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "چھ سات گاہک تو ہوں گے۔"

"تو جب پہلی گولی چلی تو اُن لوگوں کا ری ایکشن کیا تھا؟"

"جان بچانے کے لیے کوئی زمین پر جھکا تو کوئی دروازے کی طرف بھاگا۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "افراتفری پھیل گئی تھی ہر طرف۔"

"ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے ایسے موقعے پر۔" میک نے تائیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پھر تو کسی نے بھی گولیاں چلانے والے کو اتنی غور سے نہیں دیکھا ہوگا کہ اُس کا چہرہ یاد رہ جائے۔ ویسے بھی کسی کو کیا پتا ہوگا کہ یہ شخص ابھی گلاس رکھ کر گولیاں چلانا شروع کر دے گا۔ بار میں تو گاہک آتے جاتے رہتے ہی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور جیری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"بالکل ٹھیک۔" جیری نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ حیران تھا کہ اتنی رات ہو رہی ہے۔ گھڑی تین کے ہندسے

کے قریب پہنچ چکی ہے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے اور اپنا نام میک بتانے والا واپس جا کر سونے کے بجائے اُس فضول قصے میں اُلجھا ہوا ہے، جس کو دو منٹ میں سننے والے دو سیکنڈ سر ہلا کر افسوس کرتے ہیں اور پھر اپنے کاموں میں مگن ہو جاتے ہیں مگر یہ تو بال کی کھال اُتارنے میں لگا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ اُسے جا کر سونے اور صبح اٹھ کر اپنے کام نمٹانے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ خود جیری کی آنکھوں میں بھی نیند کا خمار چھانے لگا تھا۔

”کتنی عجیب بات ہے کہ چھ سات لوگوں کی موجودگی میں ایک شخص آرام سے پستول نکال کر پانچ گولیاں چلائے اور کسی کے ذہن میں اس کا چہرہ بھی نہ ہو۔“ وہ زیرِ لب خود کلامی کر رہا تھا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم وہ واحد عینی شاہد ہو جس کے ذہن میں اُس کا چہرہ نقش ہو گیا ہوگا۔“

”کہہ سکتے ہو۔“

”تم نے یہ بات پولیس کو بتائی تھی؟“

”ہاں۔“ جیری نے کہا۔

”تم اچھے شہری ہو۔“ میک نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”ویسے تمہیں کبھی خوف محسوس ہوا کہ تم قتل کے عینی شاہد ہو اور قاتل کو پہچان بھی سکتے ہو۔“

”خوف ہوتا تو ہے۔“ جیری نے آہستہ سے اعتراف کیا۔

”ہونا بھی چاہیے، یہ فطری بات ہے۔ تم عینی شاہد جو ہو۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ اس کے سوالوں کے جوابات دے دے کر عاجز آ گیا تھا مگر اس کے سوال ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ ”ویسے اس معاملے میں میرا قصور کیا ہے۔ کیا میں اُن دونوں کو اپنے ساتھ یہاں لے کر آیا تھا۔“ پہلی بار جیری کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔ وہ اسے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی ہو سکتا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ ڈیوٹی پر تھا اور اُس وقت ایک گلاس دے کر پلٹ رہا تھا کہ گولی چل گئی۔ ”قتل کے وقت میں یہاں تنہا تو نہیں تھا، کئی اور لوگ بھی تھے۔ اب اگر کوئی کہے کہ اسے گولیاں چلانے والے کا چہرہ یاد نہیں تو اس میں اُس بے چارے کا کیا قصور ہوگا۔ مجھے یاد تھا، اس لیے میں نے پولیس کو بتا دیا۔ اب مجھے تو تمہارے ان سوالوں کا کوئی مقصد معلوم نہیں ہو رہا ہے۔“ بے ترتیب انداز میں اپنی ناراضی کا اظہار کر کے وہ منہ پھیر کر دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ میک نے نہایت سکون سے اُس کی بات سنی اور اس کے چپ ہو جانے کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا۔

”میرے کہنے کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ایک شخص اندر آتا ہے اور گولیاں چلا کر ایک جان لے لیتا ہے اور پھر نہایت اطمینان سے یہ سوچتا ہوا چل دیتا ہے کہ اسے کسی نے شناخت نہیں کیا ہوگا۔“ یہ کہہ کر میک رکا۔ ”ظاہر ہے کہ اسے اس بات کا پہلے سے یقین ہوگا کہ بار میں متعدد گاہک ہونے کے باوجود کوئی اسے پہچانے گا نہیں۔ اب اگر ایسے میں کوئی حملہ آور کو پہچاننے کا دعویٰ کر دے تو......“ یہ کہہ کر اس نے سر جھٹکا۔ ”تم خوامخواہ ناراض ہو گئے۔ میں نے تو ایک خیال ظاہر کیا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور گھونٹ بھرنے لگا۔

اُس کی بات سن کر کچھ دیر تک جیری سوچتا رہا۔ ”تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

”ویسے ایک بات ہے۔“ میک نے یہ سن کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”اگر وہ دوبارہ یہاں آئے تو......“ اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میرا خیال ہے کہ وہ اب یہاں پھر کبھی نہیں آئے گا۔“

”شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ یہ سن کر میک نے کہا۔ ”مجھے تو یقین ہے کہ اب وہ یہاں نہیں تمہارے گھر پر ہی آئے گا۔“ اس نے سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی اور پھر زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ دیکھ کر جیری بھی کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔

”اُسے کیا پتا کہ میرا گھر کہاں ہے؟“ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد جیری نے کہا۔

”تم نے پولیس کو بیان دیا ہے۔ یہ بات وہ جان چکا ہوگا۔“ میک نے کہنا شروع کیا۔ جیری پورے دھیان سے سن رہا تھا۔ ”تم شاید جانتے نہیں، ایسے لوگ لاپتا کا پتا بھی بڑی آسانی سے لگا لیتے ہیں اور تم تو پھر بھی ایک بڑے شہر کے بڑے ہوٹل میں ایک بار کے ملازم ہو۔“

”پولیس نے مجھے پورے تحفظ کا یقین دلایا ہے۔“ جیری نے کہنا شروع کیا۔ ”میری گلی میں پولیس کار چکر لگاتی رہتی ہے۔ میرے بیڈ روم میں ایک ایمرجنسی فون لگا دیا گیا ہے جسے اٹھاتے ہی میرا فوری رابطہ ڈیوٹی سارجنٹ سے ہو سکتا ہے۔“

”ایسا کچھ ہے تو پھر میرے خیال میں تشویش کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔“ میک کی بات سن کر جیری کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

”مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کاؤنٹر کے پیچھے رکھی جیکٹ نکال کر پہنی اور پھر واپس آ کر میک کے قریب بیٹھ گیا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“ اسے خاموش دیکھ کر

جیری نے پوچھ لیا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ اس نے آہستہ سے سر اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا اور گلاس منہ سے لگا کر چسکیاں بھرنے لگا۔ ”ویسے یہ سوچو کہ رات کے کسی پہر تم تنہا بار بند کر رہے ہو اور وہ آ جائے تو پھر کیا کرو گے؟ ایمرجنسی فون، پولیس کا اضافی گشت...... سب دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔“ نہ جانے کیوں میک اُسے یہ باور کروانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔

”تو پھر میں خود ہی اُس سے نمٹ لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے جھکا اور رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”میرے پاس اس کا انتظام بھی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ کا بایاں حصہ تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ وہاں پستول تھا۔ ”اعشاریہ اڑتیس بور کا ہے۔ ضرورت پڑنے پر اسے استعمال بھی کر سکتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

”تو جب وہ آئے گا تو اسے یوں کھینچ کر نکالو گے اور پھر اُس پر گولی چلا دو گے۔“ میک نے طنزیہ انداز میں پستول نکالنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”اے......“ جیری نے چڑ کر کہا۔ ”میں کیا کرتا ہوں اور کیا نہیں، یہ میرا دردِ سر ہے۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ یوں میرا مذاق اڑاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رکا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ ”میں دو سال فوج میں ٹائپسٹ اور ڈیسک کلرک رہا ہوں۔ تین مہینے کی تربیت حاصل کی تھی۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اسلحہ کیسے استعمال کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا اور پھر میک کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”خیر چھوڑو...... میں تمہیں یہ سب کچھ کس لیے بتا رہا ہوں۔“

”تم ڈرنک بہت اچھا بناتے ہو۔“ میک نے اس کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے گلاس سے گھونٹ بھرا اور تعریفی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ......“ اپنی تعریف سن کر جیری کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اس نے تعریف کا جواب مسکراتے ہوئے دیا۔

”ویسے اگر......“

”ویسے اگر کیا؟“ جیری نے یہ سنتے ہی قطع کلامی کی۔ وہ سمجھ گیا کہ ایک بار پھر وہ اسے چڑانے کی کوشش کرے گا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ خود یہاں...... میرا مطلب ہے کہ تمہارے پاس نہیں آتا بلکہ کسی دوسرے شخص کو بھیجتا ہے تو پھر......“

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ اپنے خلاف عینی شاہد کو مارنے کے لیے خود آنے کے بجائے کسی اور کو بھیجے گا۔“ جیری نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”بھیجے گا نہیں......“ میک نے لمحہ بھر کے لیے رک کر اسے دیکھا اور پھر تصحیح کے انداز میں کہنے لگا۔ ”میں کہہ رہا ہوں کہ اگر بھیجے تو؟“

”مگر کیوں......؟“

”ضروری نہیں ہے کہ وہ مارنا چاہے بلکہ وہ چاہتا ہو کہ تم پولیس کو دیے گئے بیان سے پھر جاؤ، اگر وہ پکڑا جائے تو اسے پہچاننے سے انکار کر دو، وغیرہ وغیرہ۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رک کر اُس کے چہرے کے تاثرات بھانپنے لگا۔ ”اس کے عوض وہ تمہیں رقم دے سکتا ہے...... کوئی ڈیل کر سکتا ہے...... متعدد امکانات ہیں۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔“ جیری نے اپنے کندھے اُچکا کر جواب دیا۔

”کیوں نہیں سمجھتے؟“ میک نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم عینی شاہد ہو جو اسے پہچان سکتا ہے۔“

”یہ بات وہ نہیں جانتا۔“ جیری نے اعتماد سے کہا۔ ”جس وقت اُس نے قتل کیا تب چھ سات لوگ موجود تھے۔“

- ☐ بوس ایک بٹے چار۔ خوشی تین بٹے چار۔
- ☐ دنیا نے جہنم سے ٹھیکہ لے لیا ہے ہر سال ایک کروڑ گاہک سپلائی کرنے کا۔
- ☐ ترقی پسند اپنی ذات سے آگے نہیں دیکھتا۔ اُسے نہ عوام کی ترقی پسند ہے، نہ اُردو کی، نہ اسلام کی، نہ اخلاق و کردار کی۔
- ☐ پولیس — ایک بلی جو قومی پنیر کی حفاظت کر رہی ہے ایسا نہ ہو چوہے کھا جائیں۔
- ☐ ہر آمریت کے پیچھے انقلاب ہے۔ ہر انقلاب کے پیچھے آمریت۔
- ☐ اصلی مجرم وہ ہے جس نے انصاف میں دیر لگا دی، جو غلط قوانین بدل سکتا ہے لیکن نہیں بدلتا، جو پولیس کی اصلاح کر سکتا ہے لیکن نہیں کرتا۔
- ☐ کیا تمہاری زندگی کے نقشے میں کارنامے کا خانہ خالی ہے؟
- ☐ کون بڑا ہے؟ تم یا حادثہ؟

www.Paksociety.com

"لیکن تم اُسے پہچانتے ہو۔" میک نے اُسے پوری بات کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ وہ نہیں جانتا کہ کتنے لوگ اُسے پہچان سکتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ بات صرف پولیس جانتی ہے کہ میں نے اُسے دیکھا ہے اور وہ چہرہ مجھے یاد ہے۔" جیری نے اُس کے قریب ہوتے ہوئے ہلکی آواز میں کہنا شروع کیا، میک کی بہ ظاہر پوری توجہ اُس کی طرف تھی۔ "اگر وہ سامنے آئے تو اُسے پہچان بھی سکتا ہوں مگر یہ بات پولیس نے اخبار والوں کو نہیں بتائی۔ اسی لیے وہ نہیں جان سکتا کہ صرف ایک آدمی ہی اُسے شناخت کر سکتا ہے اور وہ میں ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ "اُس نے یہاں خود اپنی آنکھوں سے کئی لوگوں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اُسے یقین ہوگا کہ ایک سے زیادہ لوگ اُسے پہچان سکتے ہیں۔ اس لیے وہ صرف مجھ سے نہ تو رابطہ کرے گا اور نہ ہی مارنے کی کوشش...... سمجھ گئے نا۔"

"ٹھیک کہتے ہو مگر پولیس کے بعد، میں تمہارا یہ راز جان گیا ہوں۔" میک نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ سن کر جیری لمحہ بھر کے لیے خوف زدہ ہوگیا۔ اس کے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر وہ زور سے ہنسا اور دوستانہ انداز میں کہا۔ "میں کیوں تمہیں ماروں گا۔ یہ لو مجھے پہچان لو۔ کیا میں وہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے چہرہ آگے بڑھا دیا۔ اس نے ایک بار پھر زوردار قہقہہ لگایا اور گھونٹ بھرنے لگا۔ اُس کی پوری توجہ گلاس پر مرکوز تھی۔ کچھ دیر پہلے جیری پر میک کی وجہ سے جو اعصابی تناؤ طاری تھا، وہ اُس کے قہقہے کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا۔ جیری کو یقین ہو چلا تھا کہ یہ خوش باش گاہک وقت گزاری کر رہا ہے۔ اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ سوچ کر وہ خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ میک نے خالی گلاس ہاتھ بڑھا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر جیری نے دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ اب مزید فرمائش نہ کرے۔ وہ تھک چکا تھا اور گھر جا کر لمبی تان کر سونا چاہتا تھا۔

"بڑا شان دار تجربہ رہا تم سے مل کر۔" میک نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا وقت گزرا ہے۔"

"مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" جیری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اُسے یقین ہوگیا تھا کہ اب یہ اٹھ کر جانے ہی والا ہے۔ اس لیے اس کے اندر کی خوشی لہجے میں مٹھاس بن کر آ گئی تھی۔

"ارے واہ......" وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر کاؤنٹر کی عقبی دیوار پر شوپیس کے طور پر لگی رائفل پر پڑ گئی۔ "بڑی شان دار چیز ہے یہ اپنے زمانے کی۔ کیا بات ہے اس رائفل کی۔" یہ کہہ کر اس نے چہرہ جیری کی طرف گھمایا۔ "چلتی بھی ہے؟"

"نہیں۔"

"اگر اس وقت اس رائفل سے ہال میں ایک گولی چل جائے تو سمجھ لو کہ جیسے توپ چل گئی ہے۔ بڑی آواز ہوتی ہے اس سے گولی چلنے کی۔" میک ایک بار پھر اُس رائفل کو تک رہا تھا۔

"سر! آپ کے ساتھ باتیں کر کے بہت مزہ آیا......"

"اور مجھے بھی۔" میک نے اسے بات پوری کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"صبح کے چار بجنے والے ہیں۔" جیری نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف نظر ڈالتے ہوئے اُس سے کہا۔ "مجھے خوشی ہوتی اگر آپ مزید کچھ دیر یہاں رکتے مگر سٹی آرڈیننس اور دیگر رولز کے مطابق اب مجھے بار بند کرنا ہے ورنہ جرمانہ بھی لگ سکتا ہے۔"

"اوہ......" اس نے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "باتوں باتوں میں وقت کا دھیان ہی نہ رہا۔" اس کا ہاتھ کوٹ کے اندر تھا۔ "کتنا بل ہوا؟" اُس نے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔ یہ سن کر میک دل ہی دل میں اُس کا حساب کرنے لگا۔

"یہ لو......" یہ سنتے ہی جیری نے سر اوپر کر کے اُس کے ہاتھ کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں بٹوے کے بجائے اعشاریہ بائیس کا سائلنسر لگا پستول تھا۔ اس سے پہلے کہ جیری اپنا پستول نکالتا یا اٹھ کر بھاگتا، میک نے نہایت ماہرانہ انداز میں، مشاق نشانہ باز کی طرح دو گولیاں اُس کی پیشانی کے اندر اُتار دیں۔ میک اسٹول پر بیٹھے بیٹھے، بنا کوئی آواز منہ سے نکالے، لمحہ بھر میں موت کی نیند سو گیا۔ میک جلدی سے اٹھا اور کاؤنٹر کے قریب ٹنگی ہوئی تولیا اتار کر اسٹول اور گلاس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے پستول کو اچھی طرح صاف کیا اور کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ پستول کا سیریل نمبر مٹا ہوا تھا۔ دو منٹ کے اندر اندر وہ اپنا کام پورا کر چکا تھا۔

"بہت خوب، اب چلتے ہیں۔" اس نے جیری کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔ "بڑا ناز تھا مجھے پہچاننے کا۔ میک اپ تو اچھے اچھوں کو بے وقوف بنا سکتا ہے تو پھر تیری کیا اوقات تھی مسٹر بارٹینڈر۔" یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔ "اس بار میرے نشانے کا کوئی عینی گواہ نہیں۔"

حضرت داؤد علیہ السلام

رضوان ساجد

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اللہ کی اپنے بندوں سے محبت دنیاوی ممتا سے ستّر گنا زیادہ ہے تب ہی وہ ان کی رہنمائی کے لیے گاہے بگاہے نبیوں کو مبعوث کرتا رہا ہے... جب جب انسان نے اندھیروں کی طرف سفر شروع کیا تب تب اپنا نور اس نے دنیا میں بھیجا۔ بنی اسرائیل... ایک ایسی قوم جس پر اللہ نے اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش کر دی مگر... افسوس کہ یہ قوم لالچ، طمع اور گمراہی سے خود کو نہ بچا سکی۔ ایسے میں ہی حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا اور یہ وہ نبی ہیں جنہیں اللہ نے بادشاہت اور نبوت ایک ساتھ عطا کی... نہ صرف یہ بلکہ ان پر پرندوں کی زبان کو بھی آسان کر دیا اور آپ علیہ السلام کے سامنے پتھروں کو بھی زبان عطا کر دی۔ سبحان اللہ... تو کون ہے جو سبق حاصل کرے۔

طالوت اور جالوت سے مقابلہ کرنے والے نبی کا احوال

گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر ایسی چمکیلی دھوپ نکلی رہی تھی کہ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ہوا کے گرم جھکڑ اس طرح چل رہے تھے جیسے دوزخ کا دروازہ کھل گیا ہو۔ بیت لحم کے رہنے والوں نے ایسی گرمی اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی لیکن یہ بھی عجیب ماجرا ہوا کہ جیسے ہی دوپہر ڈھلی اور شام کی آمد آمد ہوئی، ہوا میں ایسی خنکی آ گئی جیسے سردیوں کا موسم آ گیا ہو۔ دھوپ ابھی پوری طرح ڈھلی نہیں تھی لیکن حدت غائب ہو گئی تھی۔ ہوا اتنی نرمی سے چل رہی تھی جیسے صحرا، باغ بن گیا ہو۔

حضرت ایشا (یشی) نے بڑھاپے کی وجہ سے گھر سے نکلنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا لیکن اس وقت موسم نے ایسا پلٹا کھایا تھا

www.Paksociety.com

کہ گھر میں دل گھبرانے لگا۔ ایسی ترنگ آئی کہ باہر نکل آئے۔ اردگرد کے گھروں سے دوسرے لوگ بھی موسم سے لطف اندوز ہونے باہر آگئے تھے۔ کچھ لوگ انہیں دیکھ کران کے پاس چلے آئے۔ اس وقت موسم کی تبدیلی کے سوا کسی کے پاس کوئی موضوع ہی نہیں تھا۔ سبب کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، تعجب سب کررہے تھے۔

”ایشا، تم نے تو بیت لحم میں طویل عرصہ گزارا ہے، تمہیں یاد ہے کبھی ایسا ہوا ہو؟“

”ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ موسم تو اپنے وقت پر بدلتے ہیں۔ ہاں ایک مرتبہ یاد ہے۔ وہ بھی میں نے دیکھا نہیں صرف سنا تھا۔ شموئل نبی پہلی مرتبہ یروشلم میں داخل ہوئے تھے تو ان کے استقبال کے لیے گرمیوں میں سرد ہوائیں چلی تھیں۔“

”اب تو سنا ہے وہ بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اپنے شہر ”رامہ“ سے کم ہی نکلتے ہیں۔“

”ہاں سنا تو یہی ہے۔ کیا خبر اسرائیلیوں میں کوئی اور نبی پیدا ہوا ہو۔ یہ ہوائیں اس کا استقبال کررہی ہوں۔ یا خدا بہتر جانتا ہے کوئی اور بات ہو۔“

چند لوگ اور جمع ہوگئے تھے۔ ان کے سوالات سے حضرت ایشا کا دم الجھنے لگا تھا۔ مسلسل گوشہ نشینی نے انہیں مردم بےزار بنا دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ چاہتے تھے تنہا ہوجائیں۔ پہلے انہوں نے سوچا گھر چلے جائیں لیکن موسم انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا یا کوئی اور بات ظہور میں آنے والی تھی۔ وہ ان لوگوں سے پیچھا چھڑا کر کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ کھیتوں سے ذرا ہٹ کر زیتون اور انجیر کے درخت ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ وہ کھیتوں کے اندر سے ہوتے ہوئے ان درختوں کی طرف چلنے لگے۔ درختوں کے قریب پہنچ کر انہوں نے کھیتوں کی طرف مڑ کر دیکھا۔ انہوں نے دیکھا، بستی کی طرف سے کوئی گدھے پر سوار چلا آرہا ہے۔ آج دن میں گرمی اتنی تھی کہ کوئی بھی کھیتوں میں کام کرنے نہیں آیا تھا۔ انہیں تعجب ہوا کہ یہ کون ہے جو اس طرف چلا آرہا ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن بھی ہوگئے کہ ان کی طرح کوئی اور بھی سیر کے لیے نکلا ہوگا۔ وہ پھر چلنے لگے۔ غیر شعوری طور پر انہوں نے پھر مڑ کر دیکھا۔ اس مرتبہ انہوں نے اس گدھے سوار کو پہچاننے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ ان کا بڑا بیٹا الباب تھا جو ہاتھ کے اشارے سے انہیں بلا رہا تھا۔ وہ رک گئے اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ قریب آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔

”ابا جان، آپ نے کچھ سنا۔ برکتوں کا نزول ہوا ہے۔ شموئل نبی بیت لحم آئے ہیں اور ہمارے گھر اترے ہیں۔“

”کیا کہا تم نے...... ہمارے گھر اترے ہیں؟“

”ہاں، اور مجھے بھیجا بھی انہوں نے ہے کہ میں آپ کو بلا کر لاؤں۔ پوری بستی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ ہر شخص کو تعجب ہورہا ہے کہ وہ کیوں آئے ہیں اور ہمارے گھر کیوں اترے ہیں۔“

”الباب، بات تو فکر کی ہے، وہ رامہ سے یہاں تک سفر کرکے آئے ہیں۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔“ پھر وہ کچھ سوچنے لگے۔ ”الباب، وہ قاضی بھی تو ہیں، کوئی مقدمہ پیش ہوا ہوگا۔ اس کی تحقیق کے لیے آئے ہوں گے۔ بستی میں بہت سے لوگ لین دین میں گھپلے کرتے رہتے ہیں۔ ان کی شکایت پہنچی ہوگی۔ بہرحال چل کر دیکھتے ہیں۔“

وہ بیٹے کے ساتھ گدھے پر سوار ہوگئے۔ گھر کے قریب پہنچے تو بزرگوں کو جمع دیکھا لیکن اس حال میں کہ سب کے سب تھر تھر کانپ رہے تھے۔ شموئل نبی کا آنا کوئی عام بات نہیں تھی۔ سب ڈر رہے تھے کہ ان کے گناہوں پر سزا ملنے کا وقت آگیا ہے۔ شموئل نبی اسی لیے یہاں آئے ہیں۔ حضرت ایشا کو دیکھا تو سب کی ہمت بندھی۔ چند بزرگ حضرت ایشا کے ساتھ شموئل نبی کے پاس پہنچے۔

”حضرت، ہم بہت گناہ گار لوگ ہیں۔ اگر خداوند ہم سے ناراض ہے اور ہمیں سزا دینے کا ارادہ کرچکا ہے تو ہم آپ سے پناہ کے طالب ہیں، آپ خدا سے ہماری سفارش کریں۔“

”مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو یہاں خداوند کے لیے قربانی چڑھانے آیا ہوں۔ دیکھتے نہیں کہ میرے ساتھ ایک بچھیا بھی ہے۔ میں کھلی جگہ میں اس کی قربانی کروں گا۔ تم لوگوں پر خدا کی خاص برکت ہے کہ تم سب اس قربانی کی دعوت میں شریک ہوگے۔ اب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ اور پاک صاف ہوکر دعوت میں شریک ہوجانا۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

لوگ خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ شموئل نبی نے حضرت ایشا سے کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کرلیں۔ انہوں نے تعمیل کی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا اب کوئی نہیں رہ گیا تھا۔

”ایشا، میری بات غور سے سننا۔“

”آپ سے خدا باتیں کرتا ہے، میں آپ کی باتیں کیوں نہ سنوں۔“

www.Paksociety.com

”میں یہاں خود نہیں آیا ہوں۔ میں خدا کے حکم پر آیا ہوں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تجھے بیت لحم ایشا کے پاس بھیجتا ہوں۔“

”میرے لیے شکر کا مقام ہے۔“

”یہ نہیں پوچھو گے کیوں بھیجا ہے؟“

”میری کیا مجال کہ میں خدا سے سوال جواب کروں۔“

”اسرائیل کے بادشاہ طالوت کی بادشاہت چاک کردی گئی ہے۔ خدا مجھ سے یوں ہم کلام ہوا کہ اس نے تیرے بیٹوں میں سے ایک کو بادشاہت کے لیے چنا ہے۔ اب تو اپنے بیٹوں کو میرے سامنے لے آتا کہ میں اس ہونے والے بادشاہ کا مسح کروں لیکن خبردار، جب تک طالوت تخت پر ہے کسی کے سامنے اس کا چرچا مت کرنا۔ بس یہی کہنا کہ شموئل نبی یہاں قربانی کرنے آئے تھے۔“

”اے پاک نبی۔ میرے تو کئی لڑکے ہیں۔ بادشاہت کس کے حصے میں آئے گی؟“

”خداوند مجھے خود آگاہ کردے گا۔ بس تو اپنے لڑکوں کو ایک ایک کرکے میرے سامنے لا۔“

سب سے پہلے الباب سامنے آیا۔ حضرت شموئلؑ نے اسے دیکھ کر سوچا، خدا کا ممسوح اس کے سامنے ہے لیکن خدا کی رضا لینی ضروری تھی۔

خدا ہم کلام ہوا۔ ”تو اس کے چہرے اور اس کے قد کی بلندی کو مت دیکھ۔ اس لیے کہ میں نے اسے ناپسند کیا ہے کیونکہ خدا انسان کے مانند نظر نہیں کرتا۔ اس لیے کہ انسان ظاہری صورت کو دیکھتا ہے اور خداوند دل پر نظر رکھتا ہے۔“

حضرت ایشا نے دوسرے بیٹے ابنیداب کو بلایا اور اسے حضرت شموئل کے سامنے سے نکالا۔ خداوند نے اسے بھی نہیں چنا۔ پھر سمہ سامنے آیا۔ خدا نے اس کو بھی رد کردیا۔ ایک ایک کرکے سات بیٹے سامنے آگئے۔

حضرت شموئل سخت ہراساں تھے۔ خدا کی جانب سے آنے والی وحی غلط نہیں ہوسکتی تھی لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ سب کو رد کردیا گیا ہے۔

”کیا تیرے سب لڑکے یہی ہیں؟“ حضرت شموئل نے پوچھا۔

”گھر میں یہ سات ہی تھے۔ میرے آٹھ بیٹے ہیں۔ سب سے چھوٹا ابھی باہر ہے۔ وہ بھیڑ بکریاں چرانے جاتا ہے اور اکثر اندھیرا ہونے پر ہی لوٹتا ہے۔“

”تو نے یہ بات کیوں چھپائی؟“

”وہ ابھی چھوٹا ہے بزرگی کی باتوں سے اسے کیا سروکار۔“

”جو خدا دیکھتا ہے ہماری نظروں سے اکثر اوجھل رہتا ہے۔ اسے جلد بلا بھیج۔ جب تک وہ نہیں آجاتا ہم میں سے کوئی کھانے پر نہیں بیٹھے گا۔“

انہیں لگا کہ حضرت شموئل اس بات پر خفا ہیں کہ انہوں نے آٹھ بیٹوں کی جگہ سات بیٹے کیوں ظاہر کیے۔ انہوں نے اپنے نواسے یوآب کو حضرت داؤد علیہ السلام کو بلانے کے لیے دوڑا دیا۔ یوآب ابھی چھوٹا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اندر کیا باتیں ہورہی ہیں۔ وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ اسے اپنے ماموں کو بلا کر لانا ہے۔ وہ اس طرف بھاگے جا رہا تھا جس راستے پر اسے امید تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام واپس آرہے ہوں گے۔

ابھی حضرت داؤدؑ اسے نظر نہیں آئے تھے کہ ان کے بربط سے پھوٹنے والے نغمے اسے سنائی دیے۔

خداوند میرا چوپان ہے مجھے کمی نہ ہوگی
وہ مجھے ہری ہری چراگاہ میں ٹھہراتا ہے
وہ مجھے راحت کے چشموں کے پاس بٹھاتا ہے
وہ میری جان کو بحال کرتا ہے۔

یوآب جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اس نغمے کا مطلب ہی یہ تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام گھر کی طرف واپس آرہے ہیں وہ جب بھی گھر کی طرف لوٹتے تھے یہی نغمہ گاتے تھے، ان کا بربط اس آواز کا ساتھ دیتا تھا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ہلکے ہلکے اندھیرے میں اسے بھیڑوں کا ریوڑ نظر آگیا۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام بھی نظر آگئے جو بربط بجاتے ہوئے ریوڑ کے پیچھے پیچھے

چل رہے تھے۔ ان کی غلیل ان کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی، کاندھے پر تھیلا تھا جس میں یقیناً وہ پتھر تھے جو وہ غلیل میں رکھ کر چلاتے تھے۔

یوآب دوڑتا ہوا آگیا اور ان کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ ''ماموں کیا یہ خبر تمہیں حیران نہیں کرے گی کہ بزرگ شموئل نبی بیت لحم آئے ہوئے ہیں؟''

''وہ خدا کے نبی ہیں جہاں چاہیں جائیں۔ یہ خبر تم مجھے کیوں سنانے اتنی دور آگئے۔ میں جب آتا تو میں خود دیکھ لیتا۔''

''میں خود نہیں آیا ہوں، نانا جان نے مجھے بھیجا ہے۔ بزرگ نبی کہتے ہیں جب تک تم نہیں آؤ گے وہ کھانے پر نہیں بیٹھیں گے۔''

''میرے بغیر کھانے پر نہیں بیٹھیں گے؟ کیا وہ کھانا بھی کھائیں گے؟''

''نانا جان کہہ رہے تھے وہ خدا کے نام کی قربانی دینے بیت لحم آئے ہیں۔ ذرا چل کر تو دیکھو پوری بستی کو دعوت دی گئی ہے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے اس سے زیادہ فخر کی بات نہیں ہوسکتی تھی کہ بزرگ نبی اس کے بغیر کھانے پر بیٹھنے سے انکار کر رہے ہیں لیکن وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ان میں آخر ایسی کون سی بات ہے جو ان کا اس شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ وہ ریوڑ کو جلدی جلدی ہانکنے لگے۔ اب انہیں گھر پہنچنے کی خود جلدی ہو رہی تھی۔

وہ گھر پہنچے تو حضرت ایشا ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ انہیں لے کر فوراً حضرت شموئل کی خدمت میں پہنچ گئے۔

''جناب یہ ہے میرا چھوٹا بیٹا داؤد۔''

حضرت شموئل نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سرخ رنگ اور نیلی آنکھوں والا حسین خوبصورت لڑکا ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی مردم شناس نظروں سے گواہی دی کہ یہی ان کا مقصود نظر ہے لیکن انہیں ''وحی'' کا انتظار تھا جس میں دیر لگ رہی تھی۔ پھر ان کے کانوں میں آواز آئی۔ ''اٹھ اور اسے مسح کر کیونکہ وہ یہی ہے۔''

حضرت شموئل نے داؤدؑ سے کہا کہ وہ غسل کریں اور یہ لباس پہن لیں۔ وہ ایک لباس اپنے ساتھ لائے تھے جو انہوں نے حضرت داؤدؑ کو دے دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام لباس پہن کر آئے تو ایسا موزوں تھا جیسے یہ انہی کے لیے سلوایا گیا ہو۔ اس کے بعد حضرت شموئل نبی نے اپنے جبے سے بیل کا سینگ نکالا جس میں تیل بھرا ہوا تھا۔ وہ تیل انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے سر پر انڈیل دیا۔ اسی کو مسح کرنا کہتے تھے۔

''نوجوان، اب تم خدا کے ممسوح ہو، اب تم طالوت کی طرح اس ملک اسرائیل کے بادشاہ بنو گے اور وقتِ مقررہ پر تمہیں نبوت کا منصب بھی عطا کر دیا جائے گا لیکن خبردار! جب تک یہ دونوں نعمتیں تمہیں مل نہ جائیں کسی کے سامنے اس کا چرچا مت کرنا۔ یہ بھی مت بتانا کہ تمہیں مسح کیا گیا ہے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط (خاندان) سے وابستہ تھی اور نبوت ورسالت دوسرے سبط سے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کے اندر خدا تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں جمع کر دی تھیں۔ اس کی نوید حضرت شموئل علیہ السلام بھی دے رہے تھے اور قرآن حکیم نے بھی ذکر کیا۔

''اللہ نے ان کو حکومت بھی عطا کی اور حکمت بھی اور اپنی مرضی سے جو چاہا سکھایا۔''

حضرت داؤد علیہ السلام بچپن ہی سے خدا پر کامل بھروسا کرنے کے عادی تھے۔ وہ پورا یقین رکھتے تھے کہ خدا ان کا رکھوالا ہے۔ وہ سوچتے تھے جس طرح میں اپنے ریوڑ کو پیار کرتا ہوں اور اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں اسی طرح خدا مجھے پیار کرتا ہے اور میری پوری حفاظت کرتا ہے۔ اس دن تو انہیں پورا یقین آگیا تھا جب ایک ریچھ ان کے ریوڑ کی طرف آنکلا تھا اور انہوں نے غلیل میں پتھر رکھ کر ایسا تاک کر نشانہ لیا کہ ریچھ اسی وقت لوٹ پوٹ ہوگیا۔ ایک پتھر سے میں نے ریچھ جیسے موذی جانور کو ڈھیر کر دیا۔ یہ یقیناً خدا کی مجھ پر خاص مہربانی ہے۔ وہ اپنے بربط پر ہمیشہ تعریف سے بھرے نغمے گاتے رہتے تھے۔ ان نغموں میں ایسی تاثیر تھی کہ پرندے ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ ان کی بھیڑیں ان کی طرف گردنیں اٹھا کر تکتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی تو انہیں یوں لگتا جیسے جنگل میں موجود پرندے جو کچھ بول رہے ہیں، ان کی سمجھ میں آرہا ہے اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، پرندے اسے سمجھ رہے ہیں۔ خدا نے پرندوں کی بولیوں کو ان پر آسان کر دیا تھا۔ ان کے اس علم میں ابھی اور

اضافہ ہونے والا تھا۔

خدا کے لیے اسی محبت اور خدا کی رحمت کا یہی یقین تھا جس نے انہیں خدا کی نظروں میں پسندیدہ بنا دیا۔ انہیں دو نعمتیں ایک ساتھ عطا کیں یعنی بادشاہت اور نبوت کی بشارت دی۔ انہیں ایسا معتبر کیا کہ حضرت شموئل علیہ السلام نے انہیں مسح کیا۔

مسح کے بعد حضرت شموئل نے کھلے میدان میں جا کر قربانی دی تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ وہ قربانی دینے یہاں آئے تھے۔ لوگ ڈھول پیٹتے، طاشے بجاتے، ناچتے گاتے، خوشی مناتے میدان کی طرف چلے اور قربانی کی دعوت میں شریک ہوئے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ حضرت ایشا کے گھر میں کیسا انقلاب آگیا ہے۔ کتنی تبدیلیاں ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام کی شخصیت میں رونما ہو چکی ہیں۔

+++

طالوت سے پہلے بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لیے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ کبھی ان پر عمالیقی چڑھ آتے تھے، کبھی فلسطینی حملے کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کو لوہے کے ہتھیار تک بنانے کی اجازت نہیں تھی جن سے وہ اپنا دفاع کر سکتے۔ دوسری قوموں کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کا متبرک صندوق (تابوتِ سکینہ) جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے ان کے پاس تھا، فلسطینی ان سے چھین کر لے گئے۔

یہ حملے حضرت شموئل علیہ السلام کے عہد میں بھی جاری رہے تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہم پر ایک بادشاہ مقرر کر دیں جس کی قیادت میں ہم ظالموں کا مقابلہ کریں۔

یہ مطالبہ اس لیے بھی کیا جا رہا تھا کہ حضرت شموئل بڑھاپے کی طرف گامزن تھے۔ لوگوں کو یہ فکر ہونے لگی تھی کہ اگر وہ بھی نہ رہے تو بنی اسرائیل بالکل ہی منتشر ہو جائیں گے۔ انہیں متحد کرنے والا کوئی حکمران ہونا چاہیے۔

حضرت شموئل علیہ السلام کو ان کا یہ مطالبہ ناگوار گزرا۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر تم پر بادشاہ مقرر ہوگیا تو وہ تم سب کو اپنا خادم اور غلام بنا لے گا لیکن بنی اسرائیل کا اصرار بڑھتا رہا اور آخر حضرت شموئل علیہ السلام نے خدا سے دعا مانگ کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے بن یامین کی نسل میں سے ساؤل (طالوت) نامی شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا جو نہایت وجیہہ اور قوی ہیکل تھا۔ بہادری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

بنی اسرائیل نے جب یہ سنا کہ بن یامین کی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک شخص طالوت کو ہمارا بادشاہ مقرر کیا گیا ہے تو خوش ہونے کے بجائے منہ بنانے لگے۔

مورخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصے سے کہانت اور نبوت کا سلسلہ سبط لادی میں اور حکومت وسرداری کا سلسلہ سبط یہودا میں چلا آرہا تھا۔ اب جبکہ یہ شرف بن یامین کی نسل میں منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے سرداروں کو حسد پیدا ہوا۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ ہم میں سے کوئی ہوگا۔

حضرت شموئل علیہ السلام نے فرمایا۔ ''میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری پستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولے کو کبھی بیدار نہیں ہونے دے گی۔''

حضرت شموئل علیہ السلام نے لاکھ سمجھایا کہ طالوت کا چناؤ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا گیا ہے۔ طالوت کے پاس قوت علم بھی ہے اور طاقت جسم بھی، جو حکمرانی کے لیے ضروری چیزیں ہیں لیکن ردوکد بڑھتی گئی۔

''اگر طالوت کا انتخاب من جانب اللہ ہے تو اس کے لیے خدا کا کوئی نشان دکھایے۔'' بنی اسرائیل نے مطالبہ پیش کر دیا۔

حضرت شموئل علیہ السلام نے فرمایا۔ ''اگر تم خدا کے فیصلے کی تصدیق چاہتے ہو تو وہ بھی دیکھ لینا۔ وہ متبرک صندوق (تابوتِ سکینہ) جس میں تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام کے تبرکات ہیں اور جو تم سے فلسطینی چھین کر لے گئے ہیں وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس واپس پہنچ جائے گا۔''

حضرت شموئل علیہ السلام کی یہ بشارت آخر بروئے کار آئی اور بنی اسرائیل کے سامنے ملائکۃ اللہ نے تابوت سکینہ طالوت کو پیش کر دیا اور اس طرح ان پر یہ ظاہر ہوگیا کہ اگر وہ حضرت شموئل علیہ السلام کے اس الہامی فیصلے کو قبول کر لیں تو کامیابی یقینی ہے۔

اس تمام ردوکد کے بعد بنی اسرائیل کو انکار کرنے کے لیے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا اور الہامی فیصلے پر طالوت کو بنی

www.Paksociety.com

اسرائیل کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ یہ بنی اسرائیل کا پہلا بادشاہ تھا۔

بنی اسرائیل بڑے جوش و خروش سے اپنے بادشاہ کی حمایت کر رہے تھے کیونکہ وہ ان کے دشمنوں پر فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ تمام پڑوسی اقوام کو مطیع کر لیا۔ بنی اسرائیل اسی دن کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس نے عمونیوں پر زبردست فتح حاصل کی۔ فلسطینیوں کے خلاف جنگ کی اور انہیں شکست سے دوچار کیا لیکن بہت جلد طالوت دانستہ نافرمان ہو گیا اور اپنی ترقی اور کامیابی کے تمام مواقع کھو بیٹھا۔ نبی اور خدا کی نظروں سے بھی اترتا چلا گیا۔ کم از کم دو مرتبہ اس نے سخت نافرمانی کا مظاہرہ کیا۔ اسے جلجال میں حضرت شموئیل علیہ السلام کی آمد کا انتظار کرنا تھا مگر وہ صبر نہ کر سکا اور خود ہی قربانی چڑھانے لگا۔ اسی طرح عمالیقیوں سے جنگ کرتے ہوئے اس نے حضرت شموئیل علیہ السلام کی ہدایات کا خیال نہیں رکھا جبکہ اسے معلوم تھا کہ حضرت شموئیل علیہ السلام کوئی ہدایت اپنی جانب سے نہیں دیتے۔ اس نے نبی کی نافرمانی بھی کی اور خدا سے بھی لڑائی مول لی۔

حضرت شموئیل علیہ السلام نے طالوت کو خدا کا حکم پہنچایا۔ ”رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ مجھے اس کا خیال ہے کہ عمالیق نے اسرائیل کے ساتھ کیا کیا اور جب یہ مصر سے نکل آئے تو وہ راہ میں ان کے مخالف ہو کر نکل آئے لہٰذا اے طالوت، اب تو جا اور عمالیق کو مار اور جو کچھ ان کا ہے سب کو بالکل نابود کر دے اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچے اور شیر خوار گائے بیل اور بھیڑ بکریاں، اونٹ اور گدھے سب قتل کر ڈال۔“

طالوت نے اس ہدایت کو گرہ میں باندھ لیا۔ طلائم کی وادی میں طالوت نے اپنے آدمیوں کی گنتی کی۔ وہ دو لاکھ پیادے اور یہوداہ کے دس ہزار مرد تھے۔ یہ تعداد ایسی تھی کہ طالوت کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا، وہ اس عظیم لشکر کو لے کر چلا اور عمالیق جہاں آباد تھے وہاں وادی کے بیچ گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ عمالیقیوں کے علاوہ وہاں جو دوسری آبادی تھی طالوت نے ان سے کہا کہ وہ وہاں سے نکل جائیں۔ ”تم سے ہماری کوئی جنگ نہیں کیونکہ جب ہم مصر سے آئے تھے، تم ہمارے ساتھ مہربانی سے پیش آئے تھے۔“ چنانچہ تمام لوگ عمالیقیوں میں سے نکل گئے۔

عمالیق ایک قدیم اور خانہ بدوش قوم تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی تندی کا تجربہ ان کے افیدم کے مقام پر بنی اسرائیل پر بلاوجہ حملے کے دوران کیا جس کے نتیجے کے طور پر خدا نے ان سے ہمیشہ جنگ کرتے رہنے کو کہا۔

جب عمالیقیوں کے علاوہ جتنے لوگ تھے، درمیان سے ہٹ گئے تو طالوت نے ان پر حملہ کر دیا۔ یہ لوگ نہایت ظالم اور لڑنے والے تھے لیکن طالوت خدا کی تائید سے یہاں آیا تھا اس لیے خوفناک معرکے کے بعد فتح اسی کو ملی۔ اس نے حاکم اجاج کو زندہ گرفتار کر لیا۔ عورتوں اور بچوں کو اور مردوں کو قتل کر ڈالا لیکن فربہ جانوروں کو دیکھ کر اس کے لشکر کی نیت خراب ہو گئی۔ انہوں نے طالوت سے کہا، ان جانوروں کو مارنے سے کیا فائدہ۔ انہیں ہم اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔ ان کی بھیڑ بکریوں سے ہمارے ریوڑوں میں اضافہ ہوگا۔ ہم دولت مند ہو جائیں گے۔ ان کے بیل اور اونٹ ہماری بار برداری کی ضرورتوں کو پورا کریں گے۔ طالوت نے انہیں حضرت شموئیل علیہ السلام کی ہدایت یاد دلائی لیکن وہ نہ مانے۔ طالوت بھی ان جانوروں کو دیکھ کر للچانے لگا تھا لہٰذا اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا بلکہ دوسروں سے بڑھ کر اچھے اچھے جانور خود اپنے لیے رکھ لیے۔

یہ جانور لے کر وہ اپنے محل میں آ گیا۔ اجاج بھی اس کے ساتھ تھا جسے اس نے اس امید پر قید خانے میں ڈال دیا کہ یہ خود یا اس کے لوگ جو بچ گئے ہوں گے اس کی رہائی کے لیے مال و دولت دیں گے۔

یہ کارروائیاں اتنے خفیہ طریقے سے ہوئی تھیں کہ حضرت شموئیل علیہ السلام کو معلوم بھی نہ ہوتا لیکن خدا نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

کلام الٰہی نازل ہوا۔ ”میں نے طالوت کو بادشاہ ہونے کے لیے مقرر کیا تھا لیکن وہ میری پیروی سے پھر گیا ہے۔ اس کی خبر لے اور اسے خبر دے کہ اس کی بادشاہت اس سے چھین لی گئی۔“

حضرت شموئیل علیہ السلام کو اس کی اس نافرمانی پر سخت طیش تھا۔ اسی غصے کے عالم میں انہوں نے سفر کیا اور طالوت بادشاہ سے ملے۔ طالوت انہیں دیکھ کر یہی سمجھا کہ وہ جنگ کے حالات معلوم کرنے آئے ہیں۔ وہ انہیں خوش کرنے کے لیے بڑی بڑی باتیں کرنے لگا۔

”آپ کو مبارک ہو، میں نے خداوند کے حکم پر عمل کیا۔ عمالیقیوں کا قلع قمع کر دیا۔ عورتیں، بچے سب قتل کر دیے گئے۔“

”اجاج کو قتل کر کے تم نے کہاں پھینکا؟“

”اس کو میں زندہ گرفتار کر کے لایا ہوں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ اب ہمارے قبضے میں ہے۔“

www.Paksociety.com

”کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ سب کو قتل کر دینا۔“

”آپ اب فرمائیں، میں اب قتل کرا دوں گا۔“

”اجاج کو میرے حضور لے آ۔“

طالوت نے اجاج کے قید سے نکالا اور حضرت شموئیل علیہ السلام کو سامنے پیش کر دیا۔

اجاج کو طالوت کے نرم رویے کی وجہ سے امید تھی کہ اسے معاف کر دیا جائے گا۔ وہ خوشی خوشی چلا آیا۔ حضرت شموئیل علیہ السلام نے اس سے پوچھا۔ ”تیرے اور طالوت کے درمیان کیا بات ہوئی ہے؟“ اجاج نے بتایا کہ طالوت نے اس سے بھاری رقم کا مطالبہ کیا تھا جبکہ میرے مویشی اس نے پہلے ہی قبضہ میں لے لیے ہیں۔ اب میں رقم کا مطالبہ کیسے پورا کروں؟“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عمالیق سے چھینے ہوئے جانوروں نے بولنا شروع کر دیا۔ ان کی آوازیں چاروں طرف گونجنے لگیں جبکہ طالوت کہہ چکا تھا کہ اس نے جانوروں تک کو قتل کر دیا ہے۔

”اگر تو نے تمام جانوروں کو ہلاک کر دیا تھا تو یہ آوازیں کیسی ہیں۔ کیا تو نے مجھے دھوکا نہیں دیا؟“

طالوت گھبرا گیا اور بہانہ بنانے کو کہنے لگا۔ ”یہ تو وہ اچھے اچھے جانور ہیں جنہیں میں نے چھپا رکھا کہ ان کو خداوند تیرے خدا کے لیے ذبح کریں۔ باقی کو تو میں نیست و نابود کر چکا۔“

”کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ سب کو قتل کر دینا۔“

طالوت کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تب حضرت شموئیل علیہ السلام نے اسے ڈرایا۔ ”تو نے خداوند کی بات کیوں نہ مانی بلکہ لوٹ پر لوٹ کر وہ کام کر گزرا جو خداوند کی نظر میں برا ہے۔“

طالوت اب بھی ضد پر قائم تھا۔ ”میں نے تو خداوند کا حکم مانا۔ جس راہ خداوند نے مجھے بھیجا میں چلا۔ اجاج کو لے آیا۔ بھیڑ بکریاں اور گائیں لے آیا کہ خدا کی راہ میں قربان کروں۔“

”خدا کی نظروں میں فرماں برداری، قربانی سے بہتر ہے اور تو نے نافرمانی کی۔ اب قربانی کرے بھی تو کیا۔“

”میں اپنے لوگوں سے ڈر گیا تھا سو یہ عظیم گناہ کر بیٹھا۔“

”تو لوگوں سے ڈر گیا، خدا سے نہیں ڈرا۔“

”میں تیری منت کرتا ہوں، مجھے بخش دے۔“

”تو نے خدا کے فرمان کو رد کیا خدا نے تجھے رد کر دیا کہ تو اسرائیل کا بادشاہ نہ رہے۔“ یہ کہہ کر حضرت شموئیل علیہ السلام نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور اٹھ کر جانے لگے۔

وہ جیسے ہی مڑ کر جانے لگے طالوت نے ان .... کے کرتے کا دامن پکڑا اور اس زور سے گھسیٹا کہ دامن چاک ہو گیا۔ حضرت شموئیل علیہ السلام جاتے جاتے رکے اور کہا۔ ”خداوند نے اسرائیل کی بادشاہی تجھ سے آج ہی چاک کر کے چھین لی اور تیرے ایک پڑوسی کو جو تجھ سے بہتر ہے، دے دی۔“

+++

حضرت ایشا اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ طالوت بادشاہ کے چند قاصد ان سے ملنے بیت لحم آئے ہیں۔

ان کی آمد کا سن کر حضرت ایشا پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ ابھی کچھ دن پہلے حضرت شموئیل علیہ السلام یہ خوش خبری سنا کر گئے تھے کہ ان کا بیٹا داؤدؑ طالوت کی جگہ بادشاہ بننے والا ہے۔ ان کے دل میں یہ بات آئی کہ طالوت کو اس واقعے کا علم ہو گیا ہوگا۔ یہ قاصد اسی کی باز پرس کرنے آئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ داؤدؑ کو گرفتار کر کے لے جائیں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ داؤدؑ کو کہلوا بھیجیں کہ وہ بیت لحم سے کہیں دور چلا جائے لیکن اتنی دیر میں قاصد دروازے پر آ گئے۔ حضرت ایشا گھبرا رہے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ خداوند داؤدؑ کو اسی راہ پر لے جا رہا ہے جس کی خوش خبری سنائی گئی تھی۔ اس کا احساس انہیں اس وقت ہوا جب ان قاصدوں میں سے ایک نے زبان کھولی۔

یہ خدا کی نافرمانی کا نتیجہ تھا کہ طالوت ایک عجیب و غریب مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اس پر وحشت اور دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ بادشاہ تھا۔ طبیبوں کی اس کے لیے کمی نہیں تھی۔ فوراً علاج شروع ہو گیا لیکن مرض تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ بے قراری حد سے بڑھ گئی۔ راتیں ٹہل ٹہل کر گزارنے لگا۔ طبیبوں سے مایوس ہو کر کاہنوں کو بلایا گیا۔ طالوت کی یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہوش میں تھا جب ایک کاہن اس کے پاس حاضر ہوا۔

کاہن اس سے اس کا احوال دریافت کرنے لگا۔ کاہن کی اتنی ہمت تو نہیں ہوئی کہ بادشاہ سے کچھ کہتا۔ اس نے طالوت کے بیٹے جوناتھن کو اپنے پاس بلایا۔

''خداوند کی روح بادشاہ سے جدا ہو گئی ہے اور خداوند کی طرف سے ایک بری روح اسے ستانے لگی ہے۔ یہ دورے اسی وجہ سے پڑتے ہیں۔''

''کوئی علاج بھی تو ہوگا۔''

''ایک ایسا شخص تلاش کیا جائے جو بربط بجانے میں استاد ہو۔ جب جب یہ بری روح بادشاہ پر چڑھے وہ بربط بجائے۔ رفتہ رفتہ اس بری روح کا آنا بند ہو جائے گا۔''

اس کے خادم پورے ملک میں پھیل گئے لیکن کوئی ایسا بربط نواز نہیں ملا جس سے ان ملازموں کی تشفی ہوتی آخر ایک ملازم نے بادشاہ کے سامنے داؤد کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

''میں نے بیت لحم جاتے ہوئے جنگل میں ایک لڑکے کو بربط بجاتے ہوئے دیکھا ہے۔ جنگل کے خونخوار درندے اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کا بربط سنتے ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی اس کے قریب سے گزرے اور اس کے قدم رک نہ جائیں۔ آواز بھی ایسی سریلی ہے کہ پتھر بھی پگھل جائے۔ آپ اس لڑکے کو بلا کر دیکھیں۔ وہ وہاں کے رہنے والے ایک شخص ایشا کا لڑکا ہے۔''

بادشاہ نے قاصد روانہ کر دیے جو اس وقت ایشا کے گھر میں بیٹھے تھے۔ سرگوشیوں میں وہ اسے بادشاہ کی حالت سے باخبر کر رہے تھے۔ حضرت ایشا اس وقت تک کچھ نہیں سمجھے تھے کہ وہ انہیں بادشاہ کی بیماری کے بارے میں کیوں بتا رہے ہیں لیکن اچانک یہ بھید بھی کھل گیا۔

''کاہنوں نے بتایا ہے کہ کوئی ماہر بربط نواز بادشاہ کا علاج کر سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کا بیٹا ماہر بربط نواز ہے۔ آپ اسے ہمارے ساتھ روانہ کر دیں کہ وہ دربار میں رہ کر بادشاہ کے سامنے بربط بجائے۔''

حضرت ایشا کی آنکھیں کسی انجانے خیال سے چمک اٹھیں۔ اس کا مطلب ہے حضرت شموئل علیہ السلام کی خوش خبری پوری ہونے والی ہے۔ خدا انہیں دربار میں لے جا رہا ہے۔ یہیں سے کوئی راستہ نکلے گا۔ انہیں یہ بھی خوشی تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام اگر بادشاہ کے قریب چلے گئے تو ان کے باقی بیٹے بھی فوج میں چلے جائیں گے۔ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بلانے کے لیے آدمی بھیج دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے سنا تو انہیں بھی حضرت شموئل علیہ السلام یاد آ گئے۔ اس کا مطلب ہے خدا مجھے دربار میں بھیج رہا ہے، وہ راستہ کھلتا جا رہا ہے جب مجھے بادشاہت ملے گی۔

حضرت داؤد علیہ السلام گدھے پر سوار ہوئے۔ بادشاہ کے لیے کچھ تحائف بھی ساتھ لیے اور قاصدوں کے ہمراہ طالوت کی طرف روانہ ہو گئے۔

جس وقت حضرت داؤد علیہ السلام دربار میں پہنچے۔ اتفاق سے بری روح بادشاہ پر چڑھی ہوئی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فوراً اپنی بربط سنبھالی اور ان کی مشاق انگلیاں تاروں کے ساتھ کھیلنے لگیں۔ پھر ان کی آواز موسیقی کے مدھر سروں کا ساتھ دینے لگی۔ خدا کی عظمت کا گیت ان کے ہونٹوں پر تھا۔

اے خداوند ہمارے رب
تیرا نام تمام، زمین پر کیسا بزرگ ہے
جب میں تیرے آسمان پر جو تیری دستکاری ہے
اور چاند ستاروں پر جن کو تو نے مقرر کیا غور کرتا ہوں
تو پھر انسان کیا ہے کہ تو اسے یاد رکھے
کیونکہ تو نے اسے خدا سے کچھ ہی کم تر بنایا ہے
اور جلال اور شوکت سے اسے تاج دار کرتا ہے
تو نے اسے اپنی دستکاری پر تسلط بخشا
تو نے سب کچھ اس کے قدموں کے نیچے کر دیا ہے۔

www.Paksociety.com

اس نغمے کی تاثیر ہی ایسی تھی کہ بادشاہ تو بادشاہ، سامعین دربار بھی جھوم رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دیواریں بھی رقص میں آ گئی ہوں۔ اس نغمے کے آگے بری روح کیا ٹھہرتی۔ بادشاہ ہوش میں آیا تو اس کے ہونٹوں پر گیت کے یہ الفاظ مچل رہے تھے۔

اے خداوند ہمارے رب
تیرا نام تمام زمین پر کیسا بزرگ ہے

بادشاہ نے تحسین بھری نظروں سے بربط نواز کو دیکھا۔ اس کی تعریف کے الفاظ فراہم کرنے لگا اور بے اختیار کہہ اٹھا۔

''تو میرا منظور نظر ہوا۔ میں تجھے خود سے جدا نہ ہونے دوں گا۔'' حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنے ریوڑ یاد آئے۔ باپ کے بڑھاپے پر نظر گئی۔ دربار کی گھٹن اور جنگل کی کھلی فضا کا موازنہ کیا۔

''میں گھر نہ گیا تو میرے ریوڑ کون چرائے گا؟''

''اس کی تو فکر مت کر۔ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ میرے نوکر تیری بکریاں چرائیں گے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام محل میں رہنے لگے۔ جب بادشاہ کو بدروح ستانے لگتی، حضرت داؤد علیہ السلام اپنا بربط سنبھال لیتے اور بادشاہ کو اذیت سے نجات مل جاتی۔

اس عرصے میں بادشاہ کے بیٹے جوناتھن سے ان کی دوستی ہو گئی۔ جوناتھن جلد ہی ان کا عقیدت مند بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح اس کے باپ پر بدروح آتی ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کو نیک روح اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور اسے نغمے سکھاتی ہے۔

بادشاہ تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ اب ہفتوں گزر جاتے اور اسے بربط سننے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بادشاہ کو اب ان کی خدمت کی ضرورت نہیں رہی تو انہوں نے بادشاہ سے بیت لحم واپس جانے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ کو ان کی فرقت اب بھی گوارا نہیں تھی۔ اس نے ان سے کہا کہ اب وہ اس کے محل کے محافظوں میں شامل ہو جائیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام یہ سن کر ہنسنے لگے۔

''میں نے ہتھیار چلانے کا ہنر سیکھا ہی نہیں تو محافظ کیسے بن جاؤں۔ بربط سے تو دشمن نہیں بھگائے جاتے۔ ہاں البتہ میرے تین بھائی آپ کی فوج میں ہیں۔ باقی چار کو بھی لڑائی بھڑائی کا بہت شوق ہے، آپ چاہیں تو ان چاروں کو بھی اپنے پاس بلا لیں اور مجھے اجازت دیں۔ جب آپ یاد کریں گے میں حاضر ہو جایا کروں گا۔''

طالوت نے سوچا، اس کے تمام بھائی میرے پاس چلے آئیں گے تو اس کا بھی آنا جانا لگا رہے گا۔ خدا راستے بناتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ان کی سفارش قبول کی اور ان کے باقی چار بھائی بھی اس کی فوج میں آ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام بیت لحم واپس آ گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اس عرصے میں لڑکپن کو خیر باد کہہ کر عہد شباب میں قدم رکھ چکے تھے۔ وہ زیادہ قد آور نہیں تھے لیکن جوانی نے ان کے اعضا کو مضبوط بنا دیا تھا۔ حسن و جمال میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کے دن ایک مرتبہ پھر وادیوں کی چراگاہوں اور کھلی فضاؤں میں گزرنے لگے۔ وہ خوش تھے کہ خدا نے انہیں دوبارہ قدرتی مناظر کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا موقع عطا کیا ہے۔ کبھی کبھی سوچتے ضرور تھے کہ محل میں رہ کر آ گئے لیکن تخت تو ملا نہیں۔ پھر خدائی فیصلے کے انتظار میں صبر کر لیتے تھے۔ ابھی شاید وقت نہیں آیا۔ جب وقت آیا تو خدا خود کوئی بندوبست کر دے گا۔

طالوت کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ اسے بھی کبھی حضرت شموئل علیہ السلام کا خیال آ جاتا تھا جو یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ اس کی بادشاہت چھین کر کسی اور کو دے دی جائے گی۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ وہ شخص اب تک تو آیا نہیں۔ اس نادان کو کیا خبر تھی کہ وہ شخص آیا بھی اور جائزہ لے کر چلا بھی گیا۔ پھر ایک خبر ایسی آئی کہ ہر خیال دل سے نکل گیا۔ اس کے جاسوسوں نے اسے خبر دی کہ فلسطینی دوسری کئی قوموں کے ساتھ مل کر اسرائیل پر حملہ کرنے والے ہیں۔

شاید وہ اسباب مہیا ہونے والے تھے جو حضرت شموئل علیہ السلام کی پیش گوئی کو حتمی نتیجے تک لے جانے والے تھے۔ دشمن کی تیاریوں اور تعداد کو دیکھ کر طالوت نے بھی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ طالوت نے بنی اسرائیل کو پیغام عام دیا کہ دشمن سے مقابلے کے لیے نکلیں۔ قومی معاملہ تھا۔ فلسطینی ہر اسرائیلی کے دشمن تھے۔ فوج کے علاوہ ایک بڑی تعداد عام لوگوں کی جمع ہو گئی اور سب مل کر مقابلے کے لیے نکلے۔ اتنی بڑی تعداد دیکھ کر طالوت خوش ہو گیا کہ وہ یہ جنگ ضرور جیت لے گا لیکن خدا کو اسے نیچا

دکھانا تھا۔ اسی لیے اس کے دل میں یہ بات آئی کہ مقابلے سے پہلے اپنے آدمیوں کو آزما لیا جائے چنانچہ جب یہ گروہ ایک ندی کے کنارے پہنچا تو طالوت نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ اس نہر کے ذریعے تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ کوئی شخص اس سے جی بھر کے پانی نہ پیے۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ خدا کی جماعت سے نکال دیا جائے گا البتہ سخت پیاس کی حالت میں گھونٹ بھر پانی پی کر حلق تر کرنے کی اجازت ہے۔

مفسرین کہتے ہیں، یہ واقعہ نہر اردن پر پیش آیا۔

جب لشکر ندی کے پار ہو گیا تو جن لوگوں نے پانی پی لیا تھا وہ کہنے لگے ہم میں فلسطینیوں سے مقابلے کی طاقت نہیں۔ یہ لوگ طالوت کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے۔ ہزاروں کی تعداد سیکڑوں میں رہ گئی۔

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ براء ابن عازبؓ فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد اصحاب طالوت کے برابر ہے۔

طالوت کی بہادری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ واپس جائے۔ وہ کم تعداد کے باوجود آگے بڑھتا رہا اور ایلہ کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ فلسطینی ایک مقام شوکہ کے قریب جمع تھے۔ یہ دونوں جگہیں کوہستانی تھیں۔ ایک طرف کے پہاڑ پر فلسطینی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، دوسری طرف کے پہاڑ پر اسرائیلی مقابلے کے لیے تیار تھے۔ درمیان میں وادی تھی۔

دونوں فریق انتظار کر رہے تھے کہ پہل کون کرتا ہے۔

فلسطینیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ طالوت وادی میں اترنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، کمال تو یہ تھا کہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود فلسطینی بھی حملے میں پہل کرنے سے کترا رہے تھے۔ اس تذبذب میں ایک مہینا گزر گیا۔

افسران کو یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا کہ طالوت میں وہ جوش و خروش نہیں جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ لگتا تھا اسے جنگ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ایک مہینے میں خوراک بھی ختم ہونے لگی تھی۔ طالوت اس کا بھی کوئی انتظام نہیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھی فوجیوں کے عزیز واقارب کھانا پہنچا دیتے تھے۔ طالوت کے افسروں نے کئی مرتبہ اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی لیکن اس پر ایسی افسردگی طاری تھی کہ سننے کے باوجود کوئی قدم نہیں اٹھا رہا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا کہ ایک روز ایک دیو قامت انسان فلسطینیوں کے لشکر سے نکلا۔ اس کا قد چھ ہاتھ اور ایک بالشت تھا۔ اس کے سر پر پیتل کا خود تھا اور پیتل ہی کی زرہ پہنے ہوئے تھا جو تول میں پانچ ہزار مثقال کے برابر تھی۔ اس کی ٹانگوں پر پیتل کے دو ساق پوش تھے اور اس کے دونوں شانوں کے درمیان پیتل کی برچھی تھی۔ ایک شخص سپر لیے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی طالوت کے لشکر پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ ابھی اس کی طرف خوف زدہ آنکھوں سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اس کی آواز گونجی۔ آواز ایسی تھی کہ وادی سے پہاڑ تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اسرائیلیوں کو للکار رہا تھا۔ اس کا نام جالوت تھا۔

”اے بے غیرت اسرائیلیو! کیوں دیر کرتے ہو۔ اگر تم میں کوئی مرد ہے تو میرے مقابلے پر آئے اگر وہ مجھ سے لڑے اور مجھے قتل کر دے تو ہم تمہارے خادم ہو جائیں گے اور اگر میں اسے قتل کر دوں تو تم ہمارے خادم ہو جانا۔

سن لیا تم نے! کوئی مرد نکالو اور میرے مقابلے پر بھیجو۔“ اس کے بعد اس کا قہقہہ اس طرح گونجا جیسے ایک ساتھ بہت سے پتھر لڑھکا دیے ہوں۔ پھر سناٹا ہو گیا۔ وہ انسان نما دیو وادی میں کھڑا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ کوئی اس کے مقابلے کو آئے۔

طالوت کے لشکر میں کسی کو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھتا۔ طالوت بھی سر جھکا کر اپنے خیمے کی طرف لوٹ گیا۔ اب وہ خود ہی خود بڑبڑا رہا تھا۔ ”مجھے شموئیل علیہ السلام کی بددعا لگ گئی ہے۔ خدا نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میری بہادری کہاں رخصت ہو گئی۔ اگر خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو میں بھی اسے چھوڑتا ہوں۔ اب جالوت جانے اور بنی اسرائیل۔“

خدا نے طالوت کو چھوڑ دیا تھا لیکن اسرائیلی قوم کو فراموش نہیں کیا تھا۔ طالوت کی جگہ کسی کو بادشاہ بھی تو مقرر کرنا تھا اور اس کا انتخاب ہو چکا تھا۔ یہ تھے حضرت داؤد علیہ السلام۔

(جاری ہے)

ماخذات: قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت

www.Paksociety.com

جھانسا

سلیم انور

سیر کو سوا سیر۔۔۔ یہ تو ہر دور کا حصہ رہا ہے یہ اور بات کہ قصے بدل جاتے ہیں۔۔۔ وہ بھی جب ایک ادھوری کہانی کو پورا کرنے نکلی تو کتنے ہی کرداروں سے ملاقات ہوئی اور پھر اسے وہ کردار بھی مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی۔

شطرنج کی بساط پر ایک کھلاڑی کا حیرت انگیز انجام

وہ ایک پرکشش نوجوان لڑکی تھی جو نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے پرعزم انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ نہ دائیں جانب دیکھ رہی تھی نہ بائیں جانب۔ اس کی نظروں کا رخ سیدھ میں تھا جیسے اپنی منزل کے بارے میں وہ پریقین ہو اور اسے اپنی منزل تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس نے عمدہ لباس پہنا ہوا تھا اور خوش ذوقی و شائستگی اس کی شخصیت

سے عیاں تھی۔ وہ اس قسم کی لڑکی تھی کہ اسے جو بھی دیکھتا، دیکھے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ گویا وہ ذہن پر چھا جانے والی شخصیت کی حامل تھی۔

وہ سڑک پر چلتے ہوئے بالآخر اس عمارت تک پہنچ گئی جس میں کلنگر اینڈ اینگل ہارٹ کے دفاتر تھے۔ عمارت کے سامنے وہ کچھ دیر کے لیے رک گئی اور نیچے قائم ریسٹورنٹ کی کھڑکی کے شیشے میں اپنے عکس کا جائزہ لینے کے بعد وہ دوبارہ چل پڑی۔ اس مرتبہ اس کا رخ عمارت کے داخلی دروازے کی جانب تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر کلنگر اینڈ اینگل ہارٹ کے دفتر میں داخل ہوگئی۔ استقبالیہ پر پہنچ کر اس نے خوشگوار لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا مسٹر کلنگر موجود ہیں؟“

کیرولینا نے اپنی میز پر سے سر اٹھا کر اس لڑکی کا سرتاپا بہ غور جائزہ لیا۔ ”کیا تم نے اپائنٹمنٹ لے رکھا ہے؟“ کیرولینا نے پوچھا۔

”نہیں۔ بس انہیں یہ بتا دو کہ میں یہاں ان سے وہ لینے کے لیے آئی ہوں جو ان پر میرا واجب ہے۔“

اس جواب پر کیرولینا نے تیوریاں چڑھالیں۔ وہ اس فرم میں تیس سال سے زیادہ عرصے سے سیکریٹری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ وہ اب اتنی تجربہ کار ہو چکی تھی کہ بہت کم شپٹاتی تھی اور کوئی بھی اس کی رعب دار شخصیت کو نظر انداز کرکے اس کے مالکان تک براہِ راست پہنچنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ وہ قدرے درشت لہجے میں بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا چاہتی ہو، لیکن......“

”تم نے مجھے نہیں پہچانا، کیرولینا۔ ہے نا؟“

لڑکی کی اس بات نے کیرولینا کو پریشان تو نہیں کیا البتہ وہ شش و پنج میں پڑ گئی اور مشتبہ سی ہوگئی کہ وہ لڑکی اس کی چوکسی سے گریزاں ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔

”کیا میں تمہیں جانتی ہوں؟“ کیرولینا نے پوچھا۔

وہ الجھن میں پڑ گئی تھی کیونکہ روزانہ ہی ان کے دفتر میں بہت سے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان میں سے اکثر بے چارے مسٹر کلنگر کی توجہ کے طالب ہوتے تھے کیونکہ مسٹر اینگل ہارٹ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس کے بعد اب دفتر میں مسٹر کلنگر ہی باقی رہ گئے تھے۔ کیرولینا نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ وہ یقین کر لینا چاہتی تھی کہ کہیں وہ کسی ایسے کا راستہ تو نہیں روک رہی جس کے پاس اس کے پاس سے ملاقات کرنے کا قانونی جواز ہو۔ اس کے علاوہ وہ لڑکی ویسے بھی بے حد معصوم لگ رہی تھی۔

لڑکی یہ سن کر مسکرا دی۔ ”اس سے فرق نہیں پڑتا۔ ایک اچھی سیکریٹری کے مانند مسٹر کلنگر کو میرا پیغام پہنچا دو۔“

لڑکی نے اس اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ کیرولینا فوری طور پر اپنی چوکسی فراموش کر بیٹھی۔ اس نے سوچا کہ اس بات کا فیصلہ مسٹر کلنگر پر چھوڑ دے، آیا وہ اس لڑکی سے ذاتی طور پر ملاقات کرنا پسند کرتے ہیں یا نہیں۔

کیرولینا اس لڑکی کو استقبالیہ پر چھوڑ کر مسٹر کلنگر کے کمرے میں چلی گئی۔

جب کیرولینا نے اپنے باس کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا تو کلنگر نے پوچھا۔ ”کیا اس نے اپنا نام بتایا ہے؟“ خفگی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

کیرولینا اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”نہیں، سر۔“

کلنگر نے اس جواب پر جب اسے گھور کر دیکھا تو وہ بڑبڑائی۔ ”لیکن میرا خیال ہے سر......“

”اوہ نیور مائنڈ!“ کلنگر نے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر میز سے گھومتے ہوئے اس کے پاس آکر ایک لمحے کے لیے توقف کیا، پھر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

ابھی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا کہ کیرولینا کو اپنے باس کے حلق سے ایک ہلکی سی حیرت زدہ چیخ سی سنائی دی۔ ”اوہ مائی گاڈ! کیرولینا۔ 911 پر فون کرو۔“

کیرولینا یہ سن کر ٹیلی فون کی جانب لپکی تو اس کی پنڈلی میز کے کنارے سے ٹکرا گئی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے فون کے پاس پہنچی اور ریسیور جھپٹ کر 911 کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

فون کرنے کے بعد کیرولینا تیزی سے استقبالیہ کی جانب لپکی۔ مسٹر کلنگر کے کمرے سے نکل کر اس نے دیکھا کہ وہ اس کی استقبالیہ کی میز کے سامنے فرش پر جھکے ہوئے ہیں۔ فرش پر وہ لڑکی چاروں خانے چت پڑی ہوئی تھی جو مسٹر کلنگر سے ملاقات کی متمنی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ! کیا ہوا مسٹر کلنگر؟ جب میں آپ کو اس کی آمد کا بتانے کے لیے آپ کے کمرے میں گئی تو یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اسے کیا ہوا؟“

☆☆☆

کیرولینا اس سہ پہر بھی اعصابی ہیجان میں مبتلا تھی جب وہ سراغ رساں ان کے دفتر میں داخل ہوا۔

کیرولینا نے ایک چبھتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔ یہ وہی سراغ رساں تھا جو پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔ اب یہ یہاں کیا لینے کے لیے آیا ہے؟ کیرولینا نے دل ہی دل میں سوچا۔

اس سے پیشتر کہ کیرولینا کو کچھ کہنے کا موقع ملتا، وہ پوچھ بیٹھا۔ ”تمہارے باس موجود ہیں؟“

”موجود تو ہیں لیکن میں نہیں سمجھتی کہ آپ انہیں اس وقت ڈسٹرب کریں۔ یہاں پہلے ہی ایک ٹریجڈی ہو چکی ہے اور......“

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کیرولینا کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ”مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔“

کیرولینا نے خود سے سوال کیا۔ کیا ان لوگوں کے پاس بس یہی ایک سراغ رساں ہے؟ اسے اس شخص سے کچھ چڑ سی ہو رہی تھی۔

پستہ قد، بے ڈھنگا، ہاتھ میں وہ سیاہ شیطانی اطالین سگار اس انداز سے دبا رکھا تھا جیسے وہ پہلی مرتبہ یہاں آیا ہو۔ البتہ اسے کم از کم اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اس نے اس بدبودار سگار کو سلگایا نہیں تھا۔

کیرولینا قدرے تذبذب کے بعد اپنی میز سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسٹر کلنگر کے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ پھر اس نے دروازے پر آہستگی سے دستک دی۔

”یس؟“ اندر سے مسٹر کلنگر کی آواز ابھری

”سراغ رساں اینڈرسن آئے ہیں، سر۔“ کیرولینا نے بلند آواز سے کہا۔

اندر سے مسٹر کلنگر کی غراہٹ نما آواز سنائی دی۔ ”انہیں اندر بھیج دو کیرولینا!“

کیرولینا نے مسٹر کلنگر کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے سراغ رساں کو سر کی جنبش سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جب سراغ رساں کمرے میں داخل ہو گیا تو کیرولینا نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا لیکن فوری طور پر اپنی استقبالیہ کی نشست پر واپس نہیں پلٹی بلکہ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

اس لڑکی نے زہر کھا کر خود کو مار ڈالا تھا۔ اس زہر خورانی سے مسٹر کلنگر کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ کیرولینا اسی اچنبھے میں تھی۔

”آپ کو معلوم ہے کہ وہ لڑکی مر چکی ہے؟“ سراغ رساں اینڈرسن نے بیٹھنے کی پیشکش کے بغیر خود ہی کرسی سنبھال لی اور مسٹر کلنگر سے مخاطب ہوا۔

”اچھا......؟ بے چاری۔“ کلنگر نے میز پر سے ایک پین اٹھا لیا اور اسے اپنی انگلیوں میں گھمانا شروع کر دیا۔ پھر نگاہ اٹھا کر اینڈرسن کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ اسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ تم تو جانتے ہو کہ اس کے باپ نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا اور......“

”وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟“ سراغ رساں اینڈرسن نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے پوچھ لیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ اس نے میری سیکریٹری کو بتایا کہ وہ یہاں کچھ لینے کے لیے آئی ہے۔ مجھے اس بات کا ذرہ برابر بھی آئیڈیا نہیں کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ میں نے تو اس کے باپ کی تدفین کے بعد سے

اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہہ

☆ جنت امید سے نہیں، عمل سے ملتی ہے۔

☆ مجھے بہت افسوس ہوتا ہے جب انسانوں کے جاگنے سے پہلے پرندے جاگ جاتے ہیں۔

☆ جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔

☆ مجھے گرمیوں کے روزے اور سردیوں کی نماز بہت پسند ہے۔

☆ کوئی تمہارا دل دکھائے تو ناراض نہ ہونا کیونکہ یہ قدرت کا قانون ہے کہ جس درخت پر زیادہ میٹھا پھل ہوتا ہے اسے لوگ زیادہ پتھر مارتے ہیں۔

☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ہی ٹھوکر کھاتا ہے۔

☆ باشعور اور باضمیر لوگوں کے درمیان دوستی کا رشتہ خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ قریب تر اور گہرا ہوتا ہے۔

☆ اچھے دوست اور زندگی کے ہمسفر جب بھی ناراض ہوں انہیں منا لینا چاہیے کیونکہ تسبیح جب بھی ٹوٹتی ہے تو اس کے دانے چن لیے جاتے ہیں۔

☆ ہر انسان کی عزت اور اس سے محبت کرو کیونکہ ہر انسان کے اندر خدا کی کوئی نہ کوئی صفت ضرور موجود ہوتی ہے۔

☆ پریشانی خاموش ہونے سے کم، صبر کرنے سے ختم اور شکر کرنے سے خوشی میں بدل جاتی ہے۔

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔"

تدفین؟ کیرولینا یہ سن کر چونک گئی اور تب اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ لڑکی کون تھی۔ وہ جنیفر تھی، مسٹر کلنگر کے پارٹنر مسٹر اینگل ہارٹ کی بیٹی۔ "اوہ بے چاری جنیفر! اور میں نے اسے پہچانا تک نہیں!"

اندر سراغ رساں اینڈرسن نے بھویں اچکاتے ہوئے مسٹر کلنگر سے پوچھا۔ "کیا آپ اس بارے میں پریقین ہیں؟"

"ہاں۔ میں پریقین کیوں نہ ہوں؟"

یہ سن کر سراغ رساں اینڈرسن نے اپنا سگار مسٹر کلنگر کی جانب اس طرح تان لیا جیسے وہ کوئی ہتھیار ہو۔ "ہمیں اس لڑکی کی پاکٹ بک میں ایک تحریر ملی ہے۔ میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ اس نے آپ کے آفس میں زہر کھا لیا تھا۔"

"تحریر؟ کیسی تحریر؟ میں سمجھا نہیں۔"

"اس تحریر میں اس نے آپ پر ایک الزام لگایا ہے۔" سراغ رساں اینڈرسن نے بتایا۔

"کیسا الزام؟"

"اس کا کہنا ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ دست درازی کی ہے۔"

"کیا؟" کلنگر کے ہاتھ سے پین چھوٹ گیا اور وہ اپنی کرسی پر بے ساختہ پیچھے کھسک گیا۔ اس کی کرسی پیچھے دیوار سے جا لگی اور چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

کیرولینا نے جب یہ سنا تو اسے اپنی ٹانگیں بے جان سی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس گھٹی گھٹی چیخ کو بلند ہونے سے روک لیا جو اس کے لبوں تک آ گئی تھی۔

یہ ناقابل یقین بات تھی۔ مسٹر کلنگر ایک باعزت اور نیک نام شخص تھے اور شادی شدہ بھی تھے۔ وہ ایسی حرکت ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔

"کیا تم مجھے گرفتار کرنے کے لیے یہاں آئے ہو؟" کلنگر نے سراغ رساں سے پوچھا۔

"وہ لاش کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔" سراغ رساں اینڈرسن نے کہا۔ "اگر اس الزام کی تائید میں کوئی ثبوت سامنے آیا تو پھر آپ بہت بڑی مشکل میں مبتلا ہو جائیں گے میرے دوست! میرے پاس اس وقت تو آپ کی گرفتاری کا کوئی وارنٹ نہیں ہے۔ میں تو یہاں آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

"کیا مجھے اپنے وکیل کو طلب کرنے کی ضرورت ہے؟" کلنگر نے جاننا چاہا۔

"اگر آپ سے یہ جرم سرزد ہوا ہے جس کا الزام آپ کے پارٹنر کی بیٹی نے آپ پر لگایا ہے تو بہتر یہی ہوگا کہ آپ ابھی اس کا اعتراف کرلیں۔ اس اعتراف کے لیے آپ کو اپنے وکیل کو طلب کرنا ہوگا۔ کیا آپ اس بارے میں خود کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" سراغ رساں اینڈرسن نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

☆☆☆

کلنگر نے ایک اور جام تیار کرلیا۔ عام طور پر وہ زیادہ پینے سے گریز کرتا تھا لیکن یہ کوئی عام حالات نہیں تھے جس کی بنا پر وہ جام پہ جام انڈیل رہا تھا۔

اسے اس حقیقت کا یقین تھا کہ اس نے اپنے پارٹنر اینگل ہارٹ کی بیٹی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ لیکن از روئے واقعات شہادتوں نے ایک سے زیادہ آدمیوں کو جیل بھیج دیا تھا۔ اس ہیجان کی بنا پر اس کے پیٹ میں مروڑ سا ہو رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اسے یہ بھی یاد نہیں آیا تھا کہ دست درازی کا وہ واقعہ کب پیش آیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پوسٹ مارٹم سے کیا نتیجہ اخذ ہوگا اور کیا اس الزام کی تصدیق ہو جائے گی۔ البتہ اسے یہ علم ضرور تھا کہ اسے اس روز جنیفر سے نہیں ملنا چاہیے تھا۔ بادی النظر میں ان کی یہ ملاقات اسے مجرم قرار دینے کا موجب بن سکتی تھی۔

اس نے سراغ رساں اینڈرسن سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کے پارٹنر مسٹر اینگل ہارٹ کی تدفین کے بعد سے اس کی ملاقات جنیفر سے نہیں ہوئی تھی۔ جنیفر نے اسے فون کیا تھا اور اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کلنگر کو اب اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اسے جنیفر سے ملنے کے لیے جانا نہیں چاہیے تھا۔ کم از کم وہاں نہیں جہاں اس نے اسے بلایا تھا۔

اسے خود تو اتنی عقل ہونی چاہیے تھی کہ وہ ملاقات کے لیے اسے اپنے دفتر میں بلا لیتا۔ اس کے بجائے وہ اس ہوٹل میں چلا گیا تھا جہاں جنیفر قیام پذیر تھی۔ لوگوں نے اسے وہاں ہوٹل میں دیکھا تھا۔ لعنت ہو، وہ خود سے بڑبڑایا۔

"یہ تم ہو جس نے غبن کیا ہے۔" وہ اس سہ پہر ہوٹل میں ملاقات کے دوران اس پر برس پڑی تھی۔ "میرے باپ نے خودکشی کرلی جبکہ وہ رقم انہوں نے خرد برد نہیں کی تھی۔ تم نے وہ رقم خرد برد کی ہے۔ تم نے سازش کے طور پر ثبوت وہاں رکھ دیے اور ان پر جھوٹا الزام لگا دیا۔ ان کی موت کے ذمے دار تم ہو۔ تم اور صرف تم!"

یقیناً کلنگر نے یہ الزام رد کر دیا تھا۔ جنیفر کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ کلنگر نے اس بارے میں بے حد چالاکی سے کام لیا تھا۔ غبن کے تمام ثبوت اس کے پارٹنر کو ملوث کرتے تھے۔ وہ اس معاملے میں بے حد کمزور ثابت ہوا تھا۔ اس نے جنیفر اور اس کے الزام پر خوب قہقہے لگائے تھے۔

تب جنیفر کسی شیرنی کے مانند اس پر جھپٹ پڑی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی، اس کے چہرے پر پنجے مار رہی تھی اور دیوانہ وار اس پر ضربیں لگا رہی تھی۔

کلنگر نے ہوٹل کے کمرے سے نکل بھاگنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ وہ ہال سے دوڑتے ہوئے لابی تک چلا گیا تھا اور جنیفر بھی اس کے تعاقب میں لابی تک چلی آئی تھی۔

یہ منظر درجن بھر لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس واقعے کے عینی شاہد موجود تھے۔ سراغ رساں اینڈرسن کو یہ بات پتا چلنا لازمی تھی۔ وہ یہ یقین کرلے گا کہ دست درازی کا واقعہ اسی وقت پیش آیا ہوگا۔ اس وقت یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہوگی کہ بادی النظر میں جھوٹ کو سچ ثابت کرنا پڑ رہا ہے۔

اتنے میں کسی نے کمرے کے بند دروازے پر دستک دی۔ پھر ناب گھمانے کی آواز ابھری۔ کلنگر نے خود کو اپنی اسٹڈی میں بند کر رکھا تھا اور اندر سے تالا لگا دیا تھا تاکہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

"کلنگر کیا تم اندر موجود ہو؟" یہ اس کی بیوی تھی جو آوازیں دے رہی تھی۔

"اوہ، کتنے شرم کی بات ہے۔ وہ کیا سوچے گی۔"

غبن سے زیادہ بدترین جرم آبروریزی تھا جس کا ارتکاب اس نے نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف غبن کا مرتکب ہوا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے لیزا۔ مجھے ایک ضروری کام آج ہی نمٹانا ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

"کیا تم واقعی ٹھیک ہو؟"

"ہاں ڈیئر۔ مجھے قدرے پرائیویسی درکار ہے۔ میرا کام جلد ہی نمٹ جائے گا۔"

کلنگر کی یقین دہانی نے اس کی بیوی کو مطمئن کر دیا اور وہ پلٹ گئی۔ کلنگر کو اپنی بیوی کے قدموں کی چاپ اسٹڈی سے دور ہوتی اور ہال کی جانب جاتی سنائی دی تو اسے قدرے حیرانی ہوئی۔ اس کی بیوی نے خلاف توقع زیادہ احتجاج نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ اپنی اسٹڈی میں خود کو بند کر لینا کلنگر کا معمول نہیں تھا۔

کلنگر نے ایک اور جام بھرا اور غٹاغٹ اسے پی گیا۔

پھر اس نے اپنی میز کی دراز کھولی۔ وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی اسے جھرجھری سی آ گئی۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اس نے سوچا۔

لیکن نہیں۔ اس لڑکی کی بات پر سب یقین کرلیں گے۔

اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے دراز کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ لیکن دراز میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہی وہ رک گیا۔

کیوں نہ ایک اور جام ہو جائے؟

☆☆☆

سراغ رساں اینڈرسن نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلایا۔

اس نے اپنے ہاتھ اپنے کولہوں پر جماتے ہوئے ایک بار پھر کمرے کا بہ غور جائزہ لیا اور دوبارہ سر ہلانے لگا۔

آخر کیا بات کسی شخص کو اس قسم کی حرکت پر اکساتی ہے؟ اسے لوگوں کے احمق پن پر ہمیشہ ہی حیرانی ہوا کرتی تھی۔ اس مرتبہ بھی وہ حیران کن حالات پر غور کر رہا تھا۔

اس سے قبل کہ تحقیق کے نتیجے میں غبن کا کوئی نتیجہ خیز اور حتمی ثبوت سامنے آتا، اینگل ہارٹ نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی تھی۔

اس کی بیٹی نے زہر کھا لیا تھا اور اپنے پیچھے یہ الزام چھوڑ گئی تھی کہ اس کے باپ کے پارٹنر نے اس کی آبروریزی کی تھی۔

اور اب کلنگر نے خود کو ہلاک کرلیا تھا۔

اور یہ سمجھنا سب سے مشکل ترین کام تھا۔ وہ لڑکی بہ ظاہر اپنے باپ کے غم میں اپنے آپے میں نہیں رہی تھی۔ اس نے کلنگر پر الزام کیوں لگایا تھا، یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں بہ آسانی آ سکتی ہے۔ البتہ کلنگر کو کس چیز نے اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنی جان لے لے؟

اس نے تو لڑکی پر مجرمانہ حملہ نہیں کیا تھا بلکہ کسی نے بھی اس کی آبروریزی نہیں کی تھی۔

اس لیے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور لیبارٹری تجزیے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ جنیفر اینگل ہارٹ مرتے دم تک کنواری تھی۔

OOO

www.Paksociety.com

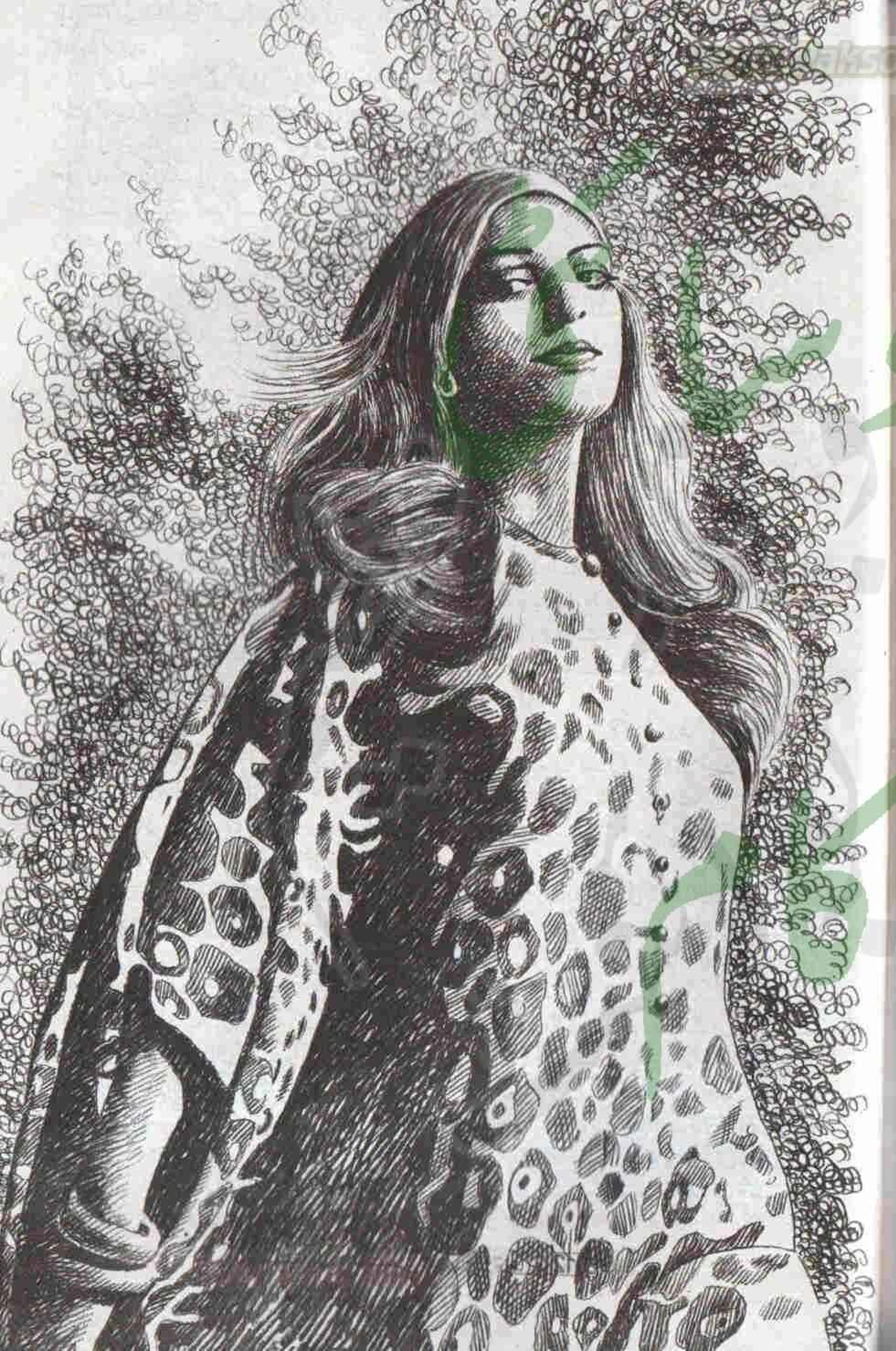

سودے بازی

احمد اقبال

سودا کوئی بھی ہو، قوتِ خرید ہے تو کیا خوشی کیا غم... کیا موت کیا زندگی... کچھ بھی تو مشکل نہیں مگر... ایک دن یہی خوش فہمی انسان کی بھول ثابت ہوتی ہے جب سامنے دریا ہو اور کوئی بوند بھی نہ پاسکے، جب چراغ سر پر ہو اور اندھیرے کا دائرہ انسان کو قید کرلے... جب سامنے منزل ہو اور قدم اٹھنے سے انکاری ہو تو بلندی سے پستی کا سفر کچھ مشکل نہیں رہتا۔ وہ جو پربت پربت اپنی منزلوں کی تلاش میں نکلے تھے جب قدموں تلے خاک بھی نہ رہی تو خدا کی قدرت کا احساس جاگا... روپ بدلتی اس دنیا میں جانے کتنے بہروپیے صبح و شام تماشا کرتے ہیں اور آتی جاتی یہ رُتیں جانے کتنے پیغام چھوڑ جاتی ہیں مگر کون ہے جو انہیں سمجھے... کہیں زرد پتّے وقت گزر جانے کا احساس دلاتے ہیں تو کہیں پھوٹتی کونپل سے موسم کے پلٹنے کی نوید ملتی ہے... کوئی اونچی اڑان بھر کر بھی عاجزی میں رہتا ہے تو کوئی پستی میں بھی تکبر سے فلک کو تکتا ہے... پل پل بدلتی اس دنیا میں وہ بھی سزائے موت کا ایک ایسا ہی قیدی تھا جسے لمحہ بہ لمحہ موت کی جانب بڑھنے والا ہر قدم جانے کیوں زندگی کی طرف پلٹتا محسوس ہورہا تھا... جانے یہ اس کا توکل تھا یا تیقن کہ اسے موت کا کھیل بھی ایک مداری کا تماشا محسوس ہورہا تھا مگر... جب کوئی دو جمع دو کو پانچ کرنے والا اچانک صفر پر کھڑا ہوجائے تو کون ہے جو اس کی تہی دامانی کی انتہا معلوم کرسکے۔ حسن کی ایک ایک ادا خریدنے والا پیار کا ایک سچا احساس تک نہ خرید سکا۔

اپنے انجام سے بے خبر چند معتبر...... نادانوں کا انجام پر فکر

سزائے موت کے منتظر قیدیوں کی آہنی سلاخوں والی کوٹھریاں آمنے سامنے تھیں۔ درمیانی چند فٹ چوڑی راہداری میں گشت کرنے والے مسلح اور باوردی گارڈ کے لیے یہ اپنے اٹھائیس سالہ دورِ ملازمت کا سب سے زیادہ حیران کن مشاہدہ تھا۔ اس نے درجنوں قیدیوں کو تختۂ دار کی جانب جاتے دیکھا تھا، ان میں سے اکثر لے جائے جاتے تھے کیونکہ موت کا خوف وقت مقررہ سے بہت پہلے ان پر جانکنی کے عذاب کی طرح مسلط ہوجاتا تھا اور عملاً وہ مرنے سے پہلے ہی مرجاتے تھے۔

سوائے قیدی نمبر تین سو دو سید اکبر حسین کے۔

ایک بار پھر وہ اس کی کوٹھری کے سامنے سے گزرا تو اکبر نے اسے روک لیا...... ”لو صوفی صاحب...... سگریٹ پیو۔“

صوفی نے رک کر سگریٹ لے لی۔ اکبر نے اپنے طلائی لائٹر سے اس کی سگریٹ جلائی۔ ”ایسا لگتا ہے کہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔“

صوفی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”ہاں، تم اتنے مطمئن اور پُرسکون کیوں ہو...... کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری زندگی کے صرف چند گھنٹے باقی ہیں؟“

اکبر مسکرایا۔ ”یہ تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”یعنی اب بھی تمہیں اُمید ہے کہ کوئی معجزہ رونما ہوگا اور تم پھر زندگی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔“

”ایسے معجزے ناممکن تو نہیں ہیں۔“

صوفی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارے لیے یہ وقت ہے توبہ کا......“

اکبر ہنس پڑا۔ ”یار تمہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ آخری وقت کی توبہ کے بارے میں کیا کہا گیا ہے...... یہ قبول نہیں ہوتی۔“

”بندے کو خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

چاہیے...... یہ جو اللہ کی کتاب آپ کو دی گئی ہے، اس کی تلاوت کریں۔"

قیدی نے ایک طویل کش لیا۔ "یار صوفی! ایسی مقدس الہامی کتاب کس کے گھر میں نہیں ہوتی، میری عمر دس گیارہ برس ہوگی جب میں نے اسے پہلی بار ختم کیا تھا۔ بڑی تقریب ہوئی تھی، مجھے ابھی تک یاد ہے۔ گھر میں ایک نہیں اس کتاب مقدس کے چار نسخے تھے۔ ایک کے سائے میں میری ماں رخصت ہو کے آئی تھی، دوسرا موٹے حروف والا میرے دادا پڑھتے تھے، ان کے انتقال کے بعد اسے بھی ریشمی گوٹے والے جزدان میں لپیٹ کر آٹھ فٹ اونچے طاق پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں تیسرے جزدان میں تیس پارے الگ الگ بھی رکھے رہتے تھے جو کسی کے مرنے پر قرآن خوانی کے لیے نکالے جاتے تھے...... ہاں...... ایک چوتھا نسخہ تھا جو میری ماں مکے مدینے سے لائی تھی، جب وہ حج کر کے آئی تھی، لیکن حاصل کیا ہوا؟؟"

گارڈ چونکا۔ "حاصل کیا ہوا......؟"

"ہاں...... بعض گھروں میں شاید اس سے بھی زیادہ تعداد میں قرآن کے نسخے ہوں گے، بیش قیمت اور نادر...... ساری دنیا میں جیسے مقابلہ ہے، چھوٹے سے چھوٹا، بڑے سے بڑا...... چاندی کے اور سونے کے حروف والا قرآن موجود ہے، مگر فائدہ......؟"

گارڈ نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

قیدی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ بتاؤ صوفی صاحب کہ کوئی میڈیکل کی تمام کتابیں خرید لے، کیا ان کو پڑھے اور سمجھے بغیر وہ ڈاکٹر بن سکتا ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟"

"تو پھر قرآن کو پڑھے اور سمجھے بغیر کوئی مسلمان یا انسان کیسے بن سکتا ہے...... یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی، کسی کی سمجھ میں نہیں آتی...... آجاتی تو کیا میں یہاں آتا۔"

گارڈ نے سر ہلایا۔ "کیا تم واقعی خوفزدہ نہیں ہو؟"

ایک لمحے کے لیے اکبر کو خیال آیا کہ وہ گارڈ کو سچ بتا دے...... اب اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ایک معمولی گارڈ پر افشائے راز سے اس کا پلان تو فیل نہیں ہو سکتا۔ پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ "نہیں صوفی صاحب...... ابھی نہیں...... وہ وقت ابھی بہت دور ہے......"

"کمال ہے تین گھنٹے تمہیں بہت لگتے ہیں؟"

اکبر نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔ "اگر میں کہوں کہ میں نے اپنے لیے مزید زندگی کی مہلت خرید لی ہے۔"

صوفی کا شک یقین میں بدلنے لگا کہ قیدی کا دماغ چل گیا ہے۔ ناممکن مفروضات اس کے لیے یقین بن گئے ہیں، درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا...... "کیسی باتیں کرتے ہو تم......!" اس نے ہمدردانہ افسوس سے کہا۔

قیدی نے اصرار کیا۔ "یار صوفی...... ایسا ہوتا ہے، کچھ لوگ صاف قتل عمد کے مجرم ہوتے ہیں، گواہ ثبوت سب کچھ پیش کیے جانے کے باوجود کوئی سیشن جج انہیں صاف بری کر دیتا ہے اور پراسیکیوشن اس کے خلاف اپیل تک نہیں کرتا، یہ کیا ہے...... غریب آدمی کے پاس رشوت دینے کے پیسے نہیں ہوتے تو پھانسی کا پھندا بے گناہ ہونے کے باوجود اس کے گلے میں فٹ کر دیا جاتا ہے...... ایک کیس کا مجھے معلوم ہے، رحم کی درخواست منظور کرانے کے لیے ایک شخص نے کروڑوں لگا کے سفارش پہنچائی تھی۔"

صوفی نے ڈاڑھی کھجائی۔ "چلو یہ بھی چھوڑو، جن کے پاس دولت کی قوت خرید ہوتی ہے، وہ مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے کر اپنے لیے زندگی خریدتے ہیں یا نہیں...... وہ دیت کی رقم بڑھاتے جاتے ہیں، لالچ غالب آتا جاتا ہے، انتقام کے جذبات کمزور پڑتے جاتے ہیں۔ جو خرید سکتا ہے وہ زندگی بھی خرید لیتا ہے۔"

صوفی نے جاتے جاتے کہا۔ "دولت تو تمہارے پاس بھی کم نہیں تھی۔"

قیدی ہنسا۔ اس نے گارڈ کے طنز کی تلخی کو نظر انداز کر دینا ہی مناسب جانا تھا۔ یہ تو اس گارڈ سمیت سب نے ہی دیکھا تھا کہ گرفتاری کے روزِ اول سے آج تک اس نے دولت سے اپنے لیے آرام و آسائش کی ہر سہولت حاصل کی تھی اور ایک اسی پر کیا منحصر...... ہر وہ شخص جو اپنی جیب میں مال رکھتا ہے صرف دکھاوے کی جیل کاٹتا ہے۔ جیل کے اندر اسے رہائش کے لیے گھر جیسی سہولت حاصل رہتی ہے۔ اس کا کھانا گھر سے آتا ہے، اسے نوکر چاکر، اخبار، ٹی وی اور موبائل فون سے لے کر شراب و شباب تک زندگی میں رنگ بدلنے کے تمام لوازمات فراہم کیے جاتے ہیں۔ کچھ تو ایسے بھی تھے جو ہر چھٹی والے دن یا عید، بقرعید پر اپنے گھر چلے جاتے تھے اور حاضری کے وقت پھر موجود ہوتے تھے۔

جو کسی نے نہیں دیکھا تھا اور نہ جان سکتا تھا وہ اپنی زندگی کا سودا تھا جو اس نے ایک کامیاب بزنس مین کی طرح بہت دیکھ بھال کے...... ٹھوک بجا کے اور اپنے فائدے کو سو فیصد یقینی سمجھ کے کیا تھا۔

جو اس نے بھی نہیں کھیلا تھا۔

مونٹی کارلو کے "تاج" جیسے عالی شان، پرتعیش اور جگمگاتے کیسینوز Casinos میں لاکھوں لٹا کے تفریح میں سنسنی خیزی لانے والوں کی بات الگ ہے۔

ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد جواری وہ غریب ہوتے ہیں جو کچھ کیے بغیر راتوں رات امیر بن جانا چاہتے ہیں۔ لاٹری، پرائز بونڈ، سٹہ، رقم اور سونے کو دوگنا کر دینے والا کراماتی عمل، نذرانہ اور مدفون خزانے کا سراغ دینے والا کوئی نقش سب چٹکی بجاتے میں بدبختی کو خوش بختی میں بدل دینے کی آرزو کے سراب ہیں۔

❖❖❖

زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا یہ سبق اس نے بھی تجربات سے حاصل کیا تھا۔ کچھ اپنے لیکن زیادہ اپنے آس پاس بسنے والوں کے...... ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرنا اس کے غیر جذباتی مشاہدے اور اس کی عقل، ذہانت کا کرشمہ تھا...... اور یقیناً یہ انتہائی غیر معمولی صلاحیت خدا نے اسے بلاوجہ نہیں دی تھی۔

بہت کم عمری میں اس نے عملی زندگی سے وہ سبق حاصل کرنے شروع کر دیے تھے جو اس کی عمر کے بچوں کو اسکولوں اور مدرسوں میں پڑھائی جانے والی کسی کتاب کا حصہ نہیں تھے۔

لاہور کی جس غریب بستی کے ایک چھوٹے سے مکان میں اس نے ہوش سنبھالا وہاں اس کا باپ پہلے ایک چھوٹی سی مسجد میں صرف موذن تھا۔ یہ اعزازی تقرری تھی جو اس نے محض خوش گلو ہونے کی بنیاد پر حاصل کی تھی۔ اس کا سید اصغر حسین کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔

وہ ایسا کوئی پنج وقتہ نمازی بھی نہیں تھا۔ ایک زمانے میں اپنی مالی پریشانی اسے ایک خود ساختہ پیر کے پاس لے گئی جو آدھی رات کے بعد خود رنگ کا ڈبا اور برش لے کر لاہور کی دیواروں پر اپنے اشتہار لکھتا تھا۔ ظاہر ہے ان اشتہاروں میں بھی انسان کی ساری محرومیوں کو دور کرنے کے ایسے دعوے ہوتے تھے جو (نعوذ باللہ) خدائی کے برابر تھے۔ ترقی، کامیابی، دولت مندی، اچھا رشتہ، اولادِ نرینہ...... سب کچھ ماہر علوم افلاک سائیں کامل مراد والا کے اختیار میں تھا۔ اس نے وہ سب رکھوا لیا جو اصغر علی کی جیب میں تھا۔ پانی میں گھول کر پینے کے لیے ایک نقش دیا اور تلقین کر دی کہ ڈاڑھی رکھو اور نماز پڑھو۔

سودیشی ریل کا سفر

"چھ بجے تھے یا سات، صحیح یاد نہیں، لیکن اس روز کومبو اسٹیشن پر پہنچی ہم پہ سے ہوتی۔ ٹکٹ کی کھڑکی ابھی بند تھی کیونکہ بکنگ کلرک غسل خانے گئے ہوتے تھے۔ عجب اجاڑ اجاڑ سا اسٹیشن تھا اور اب سے کوئی تیس برس پہلے کا منظر پیش کرتا تھا لدھیانے کا اسٹیشن یاد آیا۔ لیکن کومبو کا اسٹیشن تباہ نہیں۔ بعض پٹریاں تو زنگ آلود بھی تھیں۔ ہو سکتا ہے اکثر بارش کی وجہ سے یہ کیفیت ہو، لیکن ہمیں یہی گمان ہوا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد سے ان پٹریوں پر کوئی ریل نہیں آئی۔ انجن بھی دھواں دار پرانی وضع کے چھک چھک کرتے جو ہم نے بچپن میں دیکھے تھے۔ اور جن کی پیٹھ پر اونٹ کی طرح کوہان نکلے رہتے تھے۔ ہمارے پاس فقط دو چھوٹے چھوٹے بریف کیس تھے جن کے لیے قلی کی ضرورت بھی۔ کراچی اور لاہور کے قلی ایک بار میں جتنا بار اٹھا لیتے ہیں دو دو بستر، ایک اس بغل میں ایک دوسری بغل میں۔ دو دو تین تین سوٹ کیس، ایک پر ایک ٹکا ہوا، پھل کی ٹوکریاں، صراحیاں، ناشتے دان وغیرہ۔ اس کو دیکھتے ہوئے ہم جیسے دس مسافروں کے لیے ایک قلی بہت تھا۔ لیکن ہمیں دیکھتے ہی چار چھ ننگ دھڑنگ قلی بھاگتے آئے۔ ایک نے ہمارا بریف کیس تھاما جس میں دو قمیصیں اور دو پاجامے تھے۔ ایک نے ڈاکٹر صاحب کا، ہمارے ہاتھ میں ایک اخبار تھا، ایک قلی اسے اٹھانے پر مصر تھا اور ڈاکٹر اختر حسین کے ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبی تھی، ایک اس کے درپے ہوا۔"

ابن بطوطہ کے تعاقب میں ۔ ابن انشا

مالی حالات میں تو کیا انقلاب آتا۔ پیر صاحب کے کہنے پر اس نے باقاعدگی سے نماز پڑھنی شروع کی اور ڈاڑھی بھی رکھ لی۔ تقسیم سے پہلے بھی وہ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور میں خانہ بدوش جیسی زندگی گزارتا تھا اور سارا سال میلوں ٹھیلوں میں یا گاؤں دیہات کے مزاروں پر گا کر روزی کماتا تھا۔ وہ میراثی کہلاتے تھے اور یہ ان کا خاندانی پیشہ تھا لیکن اپنے باپ اور ایک بھائی کے مقابلے میں اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تجربے کا نکھار آتا گیا۔ خود اسے گانے میں سرور کے ساتھ تسکین کا

انوکھا احساس ملتا تھا اور وہ سننے والوں کو والہانہ انداز میں جھوم کر سر ہلاتے یا رقص کرتے دیکھتا تو خود اس پر وجد طاری ہو جاتا اور وہ چمٹا لے کر سننے والوں کے درمیان پہنچ جاتا تھا۔

جب اس نے ایک انجانے محسن کے کہنے پر عارفانہ کلام گانا شروع کیا تو دھوم مچ گئی۔ جس آئٹم سے اس پر سکوں اور نوٹوں کی بارش ہونے لگتی تھی وہ ''جگنی'' تھا۔ وہ سننے والوں کے ساتھ اور سننے والے اس کے ساتھ رقص کرتے تھے۔ اس کا باپ بہت خوش تھا۔ تمام عمر حقارت سے میراثی کہلانے کے باوجود وہ غربت کی لکیر کو پار کر کے خوشحالی کے حصار میں قدم نہ رکھ پایا تھا۔ اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ مزاروں کے مجاور یا میلوں کے منتظم لے جاتے تھے۔ بیٹے نے اچانک کایا پلٹ دی تھی۔ اب منتظم اور مجاور اس کے محتاج ہو گئے تھے اور وہ اپنی شرائط پر جاتا تھا...... بڑھتے بڑھتے اس کا حصہ کل آمدنی کے نصف تک پہنچ چکا تھا......

اسے زمیندار، جاگیردار شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی بلانے لگے تھے مگر لاہور کی فلم نگری جانے کا اس نے ابھی نہیں سوچا تھا۔

اچانک ملک تقسیم ہو گیا...... وہ حالات سے بے خبر نہیں تھا لیکن ایک تو شہروں کی سیاست کا اثر دیہات کے میلوں یا مزارات کے عرسوں پر نہیں پڑتا تھا، دوسرے عام احساس یہ تھا کہ گورداسپور کو پاکستان میں شامل کیا جائے گا۔ ملک اسلامی ہو گا تو ان تقریبات کو فروغ ملے گا جہاں وہ عارفانہ کلام گا کے داد بھی وصول کر سکے اور دام بھی...... اللہ اسی طرح مہربان رہے تو وہ داتا کی نگری میں اپنی آواز کا جادو جگائے یا پاکپتن میں بابا فرید شکر گنج کے عرس پر......

اچانک سب ختم ہو گیا۔ گورداسپور کو بھارت کے حوالے کر دیا گیا اور مسلمان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے...... اس کا سارا خاندان ختم ہو گیا...... باپ پہلے قتل ہوا، ماں نے راہ میں دم توڑا اور اس کی لاش وہیں بے گور و کفن پڑی رہ گئی۔ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ اس کی دو بہنوں کا اغوا سرحد پار کرنے سے پہلے ہوا، جب وہ واہگہ کی سرحد کے پار پہنچا تو اکیلا تھا۔

شہر میں ہاتھ پیر مار کے اسے ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا تو اس نے اردگرد کے دیہات کا رخ کیا۔ حالات ابھی تک خراب تھے۔ میلے اجڑ گئے تھے اور عرس کی تقریبات میں قوال حاوی تھے۔ اپنی اچھی آواز کے باعث اسے موقع ضرور ملا لیکن پیسہ بہت کم ملا...... وہ ہمت ہارنے والا شخص نہیں تھا، اس کی عمر پچیس سال تھی اور وہ سختی برداشت کرنے کا بے پناہ حوصلہ رکھتا تھا۔

دو سال میں اس نے اپنے قدم جمائے...... حالات بہتر ہوئے تو تقریبات کی رونقیں بھی لوٹ آئیں لیکن اسے وہ خاندانی اجارہ داری والا پس منظر نہ ملا جو گورداسپور اور نواح میں اس کی کامیابی کا ضامن بن گیا تھا۔ یہاں حسد کا جذبہ اس کے ہم پیشہ لوگوں کو اس کے خلاف لاتا رہا۔ اس نے پھر بھی مقابلہ جاری رکھا۔ ابھی وہ گھر داری کی ذمے داریوں سے آزاد تھا اور اس کی اکیلی جان کے لیے وہ آمدنی کافی تھی جو گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

یہاں بھی وہ کم ذات میراثی تھا لیکن عزت کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ نوشتۂ تقدیر تھا جسے بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ اچھی کمائی ہوتی رہے، اس کے لیے یہی بڑی کامیابی تھی۔ آمدنی اتنی ہو کہ وہ شادی کر لے اور اپنا گھر بنا لے۔ آگے بچوں کا نصیب کہ وہ زندہ رہنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔

وہ تیس سال کا تھا جب شادو نے اس کی زندگی میں قدم رکھا اور اس کا رخ بدل دیا۔ ساہیوال کے ایک بہت دولت مند زمیندار نے اسے اپنے بیٹے کی شادی کے موقعے پر طلب کیا۔ اس کا نام چودھری بشیر تھا اور زمینوں کے علاوہ اس کے پاس نیلی بار کے علاقے کی مشہور نسل کی سینکڑوں بھینسیں تھیں جن کا دودھ وہ ذاتی تعلقات کی بنا پر اوکاڑہ کے ملٹری ڈیری فارم کو سپلائی کر دیتا تھا۔

وہ چودھری کے ڈیرے پر حاضر ہوا تو شہر کے مضافات کا علاقہ ہونے کے باوجود وہاں بڑی گہما گہمی تھی۔ درجنوں معصوم مزارع اور کمی کمین شادی کے انتظامات میں بھی مصروف تھے۔ اپنی آمد کی اطلاع کرانے کے بعد وہ گھنٹوں انتظار میں کھڑا رہا۔ کسی کو بھی فرصت نہ تھی کہ اس سے پانی کو بھی پوچھتا۔ لوگوں کی مشکوک سوالیہ نظریں اس پر ضرور پڑتی رہیں...... کئی بار اس سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں کھڑا ہے اور جواب دینے پر خوامخواہ ڈانٹا گیا کہ ایک طرف ہو جا۔

جب اس کی پیشی ہوئی تو چودھری نے کہا۔ ''اصغر...... تو نے پہچانا ہمیں......؟''

''نہیں جناب عالی...... گستاخی معاف......''

''ہم گورداسپور آئے تھے۔ اپنا ایک یار تھا ادھر...... اس کے باپ کی برسی پر تو نے گایا تھا، آج رات جشن ہے، شاہی قلعے سے لاہور کی ناچنے والیاں بھی آئیں گی۔ بس آج رونق لگا دے...... انعام ملے گا۔ اوئے اسے کچھ کھانے پینے کو دو...... میراثی ہے تو کیا، بندہ ہے آخر...... مرنے والا ہو رہا ہے، آواز کیسے نکالے گا بھوکا ہو گا تو۔''

چودھری کی بات پر خوشامدی ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اصغر خاموشی سے سلام کر کے نکل آیا۔ اس کے لیے یہ سلوک غیر متوقع نہیں تھا۔ عزت داروں کی محفل میں ہر میراثی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ اس سے بھی بدتر وہ بھانڈ تھے جو ایسی ہر محفل میں جگت بازی کرتے تھے...... وہ رٹے رٹائے جملوں پر سب کا مذاق اڑاتے تھے جس کا کوئی برا نہیں مناتا تھا اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو جوتے بھی مارتے جاتے تھے...... جوتا درحقیقت صرف تلا ہوتا تھا جس کے مارنے کا بھی مخصوص انداز تھا، اس سے آواز بہت پیدا ہوتی تھی مگر جس کی چھترول ہوتی تھی اس کو چوٹ نہیں آتی تھی...... عزت کے کمترین درجے پر کھسرے فائز تھے جن کا شمار انسانوں میں بھی نہیں تھا۔

اصغر کو رات تک میراثیوں، بھانڈوں کے ساتھ ایک گوشے میں سرنگوں بیٹھنا پڑا۔ وہ سب خاندانی رئیسوں، جاگیرداروں کی محفل تھی۔ حضرات ایک طرف صوفوں پر ڈھیر تھے اور خوب پی پلا رہے تھے۔ خواتین کافی فاصلے پر ان کے مقابل برائے نام باریک سے پردے کے پیچھے جمع تھیں اور درمیان کا سارا تماشا ملاحظہ کر سکتی تھیں۔ بیچ کی جگہ تیس فٹ لمبی چوڑی تھی جس پر قالین بچھا ہوا تھا۔

لاہور سے چار ناچنے والیاں آئی ہوئی تھیں۔ وہ سب بھرے جسموں والی جوان اور خوبصورت خواتین تھیں جنہوں نے خوب سرخی پاؤڈر تھوپا ہوا تھا اور لباس ایسا زیب تن کیا تھا کہ جب رقص ہو تو جوانی یوں چھلکے جیسے ڈھکن کھولنے سے سوڈے کی بوتل سے جھاگ چھلکتا ہے۔ پہلے دو نے فلمی گانے تن ڈولے میرا من ڈولے پر ایک ساتھ رقص کیا۔

دوسرے دور کی رقاصائیں اپنا طائفہ لائی تھیں۔ کم لباسی کے باعث ان کا رقص مردوں کے لیے زیادہ ہوشربا اور خواتین کے لیے شرمناک تھا۔ اصغر حیران تھا کہ آخر انہوں نے کپڑے پہنے ہی کیوں ہیں۔ اچانک چودھری نے طائفے کو روک دیا۔ ''اوئے یہ کیا ریں ریں کر رہے ہو؟...... چل اوئے اصغر...... آجا اپنی جگنی کے ساتھ......''

اچانک طلب کیے جانے پر اصغر ہڑبڑا کے اٹھا اور...... چمٹا لے کر وسط میں پہنچ گیا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ رقص کرنے والی لڑکیوں نے نکتۂ اعتراض اٹھا دیا۔ ''ہم جگنی پر ڈانس نہیں کرتے۔''

چودھری بشیر کا پارا چڑھ گیا۔ ''کیوں...... جگنی کاٹتی ہے تمہیں؟''

[illegible] ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ ''مائی باپ...... ہم مولا علی کی شان میں گائی جانے والی جگنی کے ساتھ ایسی بے ادبی نہیں کر سکتے۔''

چودھری کا جوابی ردعمل سامنے آنے سے پہلے زنانہ حصے سے کسی نے بہ آواز بلند کہا۔ ''یہ بات تو ہے۔''

اس کی تائید مردانہ حصے میں موجود ایک بزرگ نے اپنی ریش سفید پر ہاتھ پھیر کے فرمائی۔ ''چل پتر بشیر...... اس کو رہنے دے۔ خوشی کے موقعے پر بندہ جانتے بوجھتے گناہ گار ہو...... کیا فائدہ......''

چودھری نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''او میراثیا...... چھوڑ اپنی جگنی، کوئی اور چیز نکال پھڑکتی ہوئی۔''

اصغر نے مودبانہ کہا۔ ''جنابِ عالی...... سب صوفیانہ کلام ہے میرے پاس......''

''جا پھر کسی عرس میں...... ادھر شادی میں کیا لینے آ گیا؟'' چودھری نے برہمی سے اس کو دفع ہونے کے لیے کہا۔

اصغر کو پہلی بار بے عزتی کا احساس ہوا۔ بے عزتی اس کی نہیں...... اس کے فن کی ہوئی تھی جو اس کا اثاثہ تھا۔ جگنی گا کے ہی اس نے نام کمایا تھا۔ سارا زمانہ اسی کا دیوانہ تھا...... وہ ایک کونے میں سر کھجاتے سوچتا رہا۔ گناہ کی بات وہ کر رہے ہیں جو سر سے پاؤں تک گناہوں کی دلدل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شراب کے نشے میں دھت ہیں...... فاحشہ عورتوں کو نچا رہے ہیں۔ اس کنجری کی بات کو غلط نہیں کہا جا سکتا مگر جگنی تو رقص کے بغیر بھی سنی جا سکتی تھی۔

خواتین کی طرف سے کسی نے فرمائش کی۔ ''اس کے لیے بھی وہی گانا لگاؤ سپیرے والا......''

ڈانسرز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے۔''

مردانہ حصے میں سے چند آوازیں آئیں۔ ''سپیرے کو بھی بلاؤ......''

اب ڈانسرز کو کہنا پڑا۔ ''اللہ معاف کرے چودھری صاحب...... سانپ سے ڈر لگتا ہے جی...... ان کا تو واقف ہے پریکٹس کی وجہ سے...... ہمیں کاٹ لیا تو......''

پریکٹس والی بات درست تھی مگر کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ سپیرے نے کہا۔ ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... نہیں کاٹتا۔''

''کاٹنے والا ہوتا تو ہم سب کے بیچ میں لاتے دیتے...... ان کے زہریلے دانت نکالے ہوتے ہیں۔'' چودھری نے کہا مگر ڈانسرز راضی نہ ہوئیں۔ انہوں نے بھی

www.Paksociety.com

"چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے۔" پر ڈانس کیا لیکن نفسیاتی طور پر ان کی حریف نے میدان مار لیا تھا۔ دوسری پرفارمنس زیادہ اچھی تھی لیکن انہیں نیچا دکھانے کے لیے پہلی دو ڈانسرز نے پھر سامنے آ کے سانپوں کے ساتھ اپنا رقص پیش کیا اور اس بار سانپوں کے ساتھ زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا کیونکہ انہیں نہ صرف داد مل رہی تھی بلکہ ان پر نوٹ بھی برس رہے تھے...... پیچھے ہٹ جانے والی ڈانسرز کو اس وقت پھر موقعہ ملا جب سپیرا ڈانس کرنے والیوں کے پاؤں ناچتے ناچتے اور ہاتھ مال سمیٹتے سمیٹتے تھک گئے۔

اصغر صبح کی اذان تک بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔ اس بزم طرب میں شاید وہ اکیلا ہی دل گرفتہ تھا۔ اسے پھر کسی نے نہیں بلایا۔ وہاں کوئی بھی اس کا صوفیانہ کلام یا جگنی سننے کے موڈ میں نہیں تھا اور درمیان میں جو وقفہ آیا اس میں بھانڈ جگت کرتے رہے اور ڈانسرز کو آرام کرنے کا موقع مل گیا۔

اصغر کو صبح مزید بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا جب وہ انعام حاصل کرنے کی امید میں چودھری کے سامنے چلا گیا۔ وہاں بھانڈ بھی تھے، کھسرے بھی اور میراثی بھی...... چودھری کے ساتھ اس کا بیٹا بھی بیٹھا ہوا تھا جس کی شادی کا جشن تھا۔ چودھری ایک گڈی میں سے سو سو کے نوٹ گنے بغیر الگ کرتا تھا اور انعام لینے والا اسے اور دلہا کو دعائیں دیتا آگے بڑھ جاتا تھا۔

اصغر کو دیکھتے ہی چودھری کا موڈ بگڑ گیا۔ "اوئے...... تو کیا لینے آ گیا، کیا تیر مارا ہے تو نے...... حلق سے آواز بھی نہیں نکالی، انعام کس بات کا...... چل ہٹ ادھر سے......"

اصغر خاموشی سے ہٹ گیا۔ اس کی جگہ خیرات مانگنے والا بھی ہوتا تو خالی ہاتھ نہ جاتا۔ وہ چودھری کے ڈیرے سے نکلا تو غصے اور احساس ذلت سے مغلوب تھا۔ وہ سیدھا سڑک پر گیا اور بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی جیب میں مشکل سے واپسی کا کرایہ تھا۔ اتنی صبح نہ بس تھی اور نہ بس اسٹاپ والا ڈھابا کھلا تھا۔

ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کسی نے پیچھے سے اسے پکارا۔ "اوئے اصغر...... کدھر جا رہا ہے تو......؟"

"کیوں؟...... اتنی بے عزتی کرا کے خالی ہاتھ واپس بھی نہ جاؤں۔"

"اوئے چھوڑ عزت بے عزتی کو......" پیچھے سے آنے والے نے کہا۔ "آ میرے ساتھ...... آج اپنے شاہ صاحب کا عرس ہے، بڑے شاہ صاحب کا...... ابھی جو گدی نشین ہے...... ان کے والد تھے...... تجھے بلایا ہے......"

عرس میں اس گاؤں کے علاوہ ادھر ادھر سے آئے ہوئے معتقدین بھی تھے، عرس کے لیے ایک قوال پارٹی بھی آئی ہوئی تھی لیکن اصغر نے عارفانہ کلام کے بعد جگنی شروع کی تو رنگ محفل بدل گیا۔ آہستہ آہستہ وجد میں آنے والے بھول گئے کہ یہ کوئی رقص طرب نہیں برسی کا اجتماع ہے۔ ابتدا ایک باریش بزرگ نے کی جو شاہ صاحب کا معتمد خاص ہونے کے باعث ان کا خلیفہ کہلاتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اور دونوں ہاتھ اٹھا کے درمیان میں آ گیا اور ناچنے لگا۔ اس کے ساتھ شاہ صاحب کے دیگر مرید آ گئے اور شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان پر "حال" طاری ہے جو ایک روحانی کیفیت کا نام ہے۔ کسی نے ناچنے والوں کو نہیں روکا...... اصغر کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ وہ کتنی دیر سے گا رہا ہے۔

بالآخر شاہ صاحب کے اشارے پر ہی بے خودی اور خود فراموشی کا یہ طوفان تھما۔ اصغر جب شاہ صاحب کی قدم بوسی کے لیے جھکا تو بلا ارادہ گر گیا۔ شاہ صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کسی کو اشارہ کیا۔ اسے سرخ رومال میں لپیٹ کر کچھ دیا گیا۔ اس نے بعد میں کھول کے دیکھا تو اس میں ایک ٹوپی اور تسبیح جو شاہ صاحب حج سے واپسی پر مکے مدینے سے لائے تھے، کے علاوہ دو ہزار روپے نقد تھے اور ایک سونے کی انگوٹھی جو بڑی بیگم صاحبہ کا انعام تھی۔

اس قدردانی نے اصغر کے سارے گلے شکوے دور کر دیے جو اسے چودھری کی حویلی میں قدر ناشناسی کے سبب ہوئے تھے۔ عرس کی تقریب نماز مغرب پر تمام ہو گئی، لنگر کی دیگ سے میٹھے چاول کھانے اور دودھ کا گلاس چڑھانے کے بعد اصغر پر غنودگی کا حملہ ہوا۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ فرش پر ایک دیوار کے ساتھ لیٹا اور سو گیا۔ عقیدت مند اس وقت بھی مزار کے طواف میں مصروف تھے۔ چادریں چڑھا رہے تھے اور منت مان کے دعا مانگ رہے تھے۔

آدھی رات کے بعد اصغر کو یوں لگا جیسے کوئی شانہ ہلا کے اسے جگانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کے سر گھمایا تو ایک سایہ سا دروازے کی طرف لپکتا نظر آیا۔ چوڑیوں کی کھنک نے اصغر کو سمجھا دیا کہ سایہ کسی عورت کا ہے۔ وہ دروازے میں پل بھر کے لیے رکی تھی اور اس نے ہاتھ سے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔

اصغر نے ادھر ادھر بے سدھ پڑے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر بھی تاریکی تھی مگر وہ اصغر کو احاطے کی دیوار کے ساتھ کھڑی نظر آ گئی۔

"کیا بات ہے؟ کون ہے تو؟" اصغر نے قریب جا کر پوچھا۔

وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے کھڑی تھی۔ "شادو ہے میرا نام...... میں تجھے کچھ بتانے آئی ہوں۔"

"ایسی کیا بات تھی جو دن میں نہیں بتائی جا سکتی تھی، کسی نے دیکھ لیا تو...... بدنامی تیری ہوگی، میں بھی مارا جاؤں گا۔"

وہ ہنسی تو اصغر کو یوں لگا جیسے چوڑیاں پھر کھنکی ہیں۔

"اتنا مت ڈر...... کچھ نہیں ہوگا، کیسا مرد ہے تو...... بیٹھ ادھر آرام سے......"

اصغر نے اس کا نرم ہاتھ اپنی کلائی پر محسوس کیا اور اس کی ساری مزاحمت جواب دے گئی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"تیری آواز میں بڑا جادو ہے......" وہ بولی۔

"بس یہی بتانا تھا، اس کے لیے تو آدھی رات کو گھر سے نکلی اور مجھے جگا دیا۔ تو پاگل ہے کیا......" اصغر کی گویائی بحال ہو گئی۔

اس نے اصغر کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ "کل بھی میں چودھری کے ڈیرے پر تھی، انہوں نے بڑی زیادتی کی تیرے ساتھ لیکن انہیں جگنی سے زیادہ کنجریوں کو ننگا نچا کے مزہ آ رہا تھا۔"

اب اصغر کی نظر اندھیرے میں دیکھنے لگی تھی۔ اس کے مقابل اٹھارہ بیس سال کی بھرے بھرے جسم اور گول چہرے والی ایک لڑکی تھی۔ اس کا دوپٹا گلے میں ہار کی طرح پڑا ہوا تھا اور وہ اس کے لمبے گھنے سیاہ بالوں کو بکھرا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گورے یا سانولے رنگ کا اس تاریکی میں اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اصغر کو اس کے روپ سے زیادہ اس کے اعتماد نے مسحور کیا تھا۔ وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے اصغر سے پرانی شناسائی ہے اور ان کے یوں ملنے میں نہ کوئی بات معیوب ہے اور نہ خطرے کی۔

"آج شاہ صاحب نے مجھے دو ہزار روپے نقد انعام دیے ہیں، سونے کی ایک انگوٹھی بڑی بیگم صاحب سے ملی ہے۔"

"چودھری صاحب تک یہ خبر پہنچ گئی ہے۔ اب تیری خیر نہیں۔"

اصغر بھونچکا رہ گیا۔ "کیا، مطلب؟"

"چودھری اور شاہ صاحب کی آپس میں لگتی ہے۔"

"کس بات پر......؟"

"چھوڑ اسے...... مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے کہ بڑے چودھری صاحب نے بڑے شاہ صاحب کا مرید بننے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں

تیرے ساتھ ہوا اس کی اطلاع شاہ صاحب کو مل گئی۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور تجھے برسی پر بلا لیا۔ مقصد چودھری کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسے بندے کی قدر نہیں...... اور یہ جو انعام ملا ہے تجھے...... یہ بھی چودھری کو ذلیل کرنے کے لیے ہے۔ کچھ لوگ یہی کام کرتے ہیں...... انہوں نے یہاں شاہ صاحب کو چڑھایا کہ چودھری کا تو خاندان ہی ایسا ہے، آج بھی وہ جگنی گانے والے پر ایک کنجری کے ننگے ناچ کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں سے جانے والوں نے چودھری کو اکسایا کہ آپ نے جس میراثی کو منہ نہیں لگایا تھا اسے شاہ صاحب نے دو ہزار دے کر آپ کو بے عزت کیا ہے...... جیسے آپ کے مہمان کو بھوکا سونا پڑے تو شاہ صاحب کے گھر سے حلوا آ جائے...... ورنہ ایک میراثی کی اوقات سو پچاس سے زیادہ نہیں۔ مقصد تو آپ کے منہ پر جوتا مارنا تھا۔"

اصغر دم بخود بیٹھا اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

"پھر اب کیا ہوگا شادو......؟"

اس نے خوشخبری دینے کے انداز میں کہا۔ "کل چودھری صاحب بھی تجھے بلا کے انعام دیں گے۔"

"اچھا...... یعنی دو ہزار کے مقابلے میں چار......"

اصغر کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔

وہ اسے حیرانی سے دیکھتی رہی۔ "کیا تو واقعی اتنا بے وقوف ہے، صبح جوتے پڑیں گے تجھے دو ہزار...... ہو سکتا ہے تیرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر بٹھا کے تیرا جلوس نکالا جائے۔"

اصغر کا رنگ اڑ گیا۔ "کیوں؟...... میرا کیا قصور ہے؟"

"تیرا قصور یہ ہے کہ تو میراثی ہے...... کم ذات، غریب اور کمزور...... شاہ صاحب کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ جرم تیرا بنا دیا جائے گا کہ بلایا چودھری صاحب نے اور تو ہو گیا شاہ صاحب کی طرف...... چودھری صاحب کو بے عزت کرانے۔"

"شادو...... چودھری نے مجھے نہ عزت دی تھی نہ اتنی دور بلا کے کوئی انعام، میرے پاس تو واپسی کے پیسے بھی نہیں تھے۔"

"اب کہا جائے گا کہ تو نے بے صبرے پن کا مظاہرہ کیا۔ اگر تو ٹھہرتا تو چودھری صاحب ایسے گئے گزرے بھی نہیں کہ تجھے خالی ہاتھ لوٹا دیتے۔ وہ بھی بیٹے کی شادی کے موقع پر...... وہ دو کے بجائے چار ہزار دیتے۔"

www.Paksociety.com

اصغر گھبرایا۔ ''کیا میں شاہ صاحب کو بتادوں؟''
وہ ہنسی۔ ''پاگل...... وہ کچھ نہیں کرنے والے، سانڈ لڑتے ہیں نا تو کچلے جاتے ہیں مینڈک۔''
''پھر بتانا...... میں کیا کروں؟'' اصغر کو اس لڑکی نے اپنے پرسکون۔ پراعتماد اور بےتکلف اپنایت کے انداز سے مسحور کردیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اسے حالات کی پوری خبر دی تھی۔ اسے اصغر کی آواز اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ تمام خطرات مول لے کر اسے خبردار کرنے چلی آئی تھی اور اس خیال سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھی کہ کسی نے اسے یوں اصغر کے ساتھ بیٹھا دیکھ لیا تو کیا ہوگا...... گاؤں کی کوئی لڑکی اتنی سمجھدار یا نڈر بھی ہوسکتی ہے، اصغر کو یقین نہیں آرہا تھا۔
''اگر ہمت ہے۔'' شادو اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تو آجا میرے ساتھ۔'' وہ کپڑے جھاڑ کے بولی۔ ''میں تجھے بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔''
کسی سحرزدہ شخص کی طرح وہ شادو کے پیچھے چل پڑا۔ وہ سنبھل سنبھل کے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، اونچے نیچے راستوں پر ٹیلوں اور جھاڑیوں سے دامن بچاتی آگے چلتی گئی۔ بڑے شاہ صاحب کا مزار بستی کے باہر ایک نسبتاً اونچی جگہ پر تھا، بستی کے اور مزار کے درمیان مسجد تھی۔ شادو نے آخری بار مڑ کے دیکھا اور اصغر نے اس کے سفید ہموار دانتوں کو مسکراہٹ سے روشن دیکھا۔
''میں یہاں رہتی ہوں۔''
اصغر پھر بھونچکا رہ گیا۔ ''اس مسجد میں......؟''
''ہاں...... آجا آجا...... ڈر مت...... میرا ابا یہاں امامت کرتا ہے، یہ مسجد اسی نے بنائی تھی، گاؤں والوں کی مدد سے۔'' اس نے ایک بند دروازے کی کنڈی کھولی۔
''یہ میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی بات ہے، اب تو میری ماں کو مرے بھی دس سال ہوگئے، اللہ کا شکر ہے کہ پرانی رنجش کے باوجود شاہ صاحب نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بنائی، حالانکہ وہ بنا سکتے تھے، اب بھی جمعہ یہیں ہوتا ہے۔''
اصغر نے اس چھوٹی سی مسجد کو دیکھا جو اس وقت تاریک تھی۔ اس کا صحن خاصا بڑا تھا۔ اس میں دو چار سو نمازی ایک ساتھ کھڑے ہوسکتے تھے۔ مسجد کا ایک مینار تھا اور ایک گنبد...... اس کی عمارت چوڑائی کے رخ پھیلی ہوئی تھی۔
''پیش امام صاحب اس وقت کہاں ہیں؟'' اصغر نے بڑی مشکل سے سوال کیا۔
''وہ سو رہے ہیں۔ اتنا مت ڈر، اگر وہ جاگ گئے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اٹھ کے مجھے تلاش کرنے باہر نہیں نکلیں گے، فجر کی اذان تک...... ابھی تو دو بجے ہیں، بیٹھ جا یہاں۔''
وہ دیوار کا سہارا لے کر اس تاریک گوشے میں پیر پھیلا کے بیٹھ گئی جہاں صحن کی دو دیواریں ملتی تھیں۔
اصغر نے کسی ہپناٹائز کیے ہوئے شخص کی طرح اس حکم کی بھی تعمیل کی اور دوسری دیوار سے ٹیک لگا کے شادو سے چند فٹ دور بیٹھ گیا۔ ان کے درمیان خاموشی کا ایک مختصر وقفہ حائل ہوا۔ پھر شادو نے کہا۔ ''تو سوچ رہا ہے کہ آخر مجھے کسی کا ڈر کیوں نہیں، میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت میرا باپ بھی نہیں آسکتا۔''
اصغر نے گھڑے جیسا سر ہلادیا۔
''اس کی طرف سے مجھے اجازت نہ ہوتی، تو یہ ناممکن تھا۔''
اصغر کے لیے یہ بےخبری میں ہونے والے بم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔ ''اجازت......؟'' آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔
شادو نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔''
''کیا پوچھ لیا تھا؟ یہ کہ میں اصغر میراثی سے ملنے جاؤں؟ یہ کیا معاملہ ہے شادو...... باتوں سے تو مجھے بہت سیدھی سچی لگتی ہے، مجھے کسی مصیبت میں نہ ڈال دینا۔ میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ...... اور نہ بھائی بہن۔''
شادو کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ''رہنے کا کوئی ٹھکانا ہے یا وہ بھی نہیں......؟''
''ابھی تک تو نہیں ہے، اکیلا آدمی ہوں۔ یہی میرا روزگار ہے، گھوم پھر کے لوگوں کا دل بہلاتا...... میرے باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے، میں بھی میراثی ہوں ذات کا...... گا بجا کے روزی روٹی کماتا ہوں۔ گھر کا کیا کروں گا، جہاں رات ہوجائے کوئی ٹھکانا تلاش کرلیتا ہوں، اب ہاتھ میں کچھ پیسے آگئے ہیں تو......'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ اپنا گھر بسانے کی سوچ رہا ہوں مگر اس نے خود کو روک لیا۔ ''پر تو یہ سب کیوں پوچھ رہی ہے؟''
وہ دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے بیٹھی رہی۔ ''میں کیسی لگتی ہوں تجھے......؟''
اصغر کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ہکلانے لگا...... ''کیسی...... کیسی کیا مطلب...... اچھی ہے، بلکہ بہت اچھی ہے۔''

''شادی کرے گا مجھ سے......؟'' شادو نے اسی سپاٹ لہجے میں اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔
اصغر کی زبان گنگ اور جسم مفلوج ہوگیا۔ ایک خیال اسے یہ آیا کہ لڑکی کے روپ میں یہ کوئی بدروح نہ ہو جو پلک جھپکنے میں غائب ہوجائے۔ اسے ہوش آئے تو وہ وہیں مزار کے اندر پڑا ہو۔ اس کی نظر بےخیالی میں شادو کے پیروں کی طرف گئی، اس نے سنا تھا کہ چڑیلوں کے پیر الٹے ہوتے ہیں۔ وہ اسی طرح ویرانوں میں بھٹکتی پھرتی ہیں، حسین عورت کا روپ دھار کے بھولے بھٹکے مسافر پر اپنا جادو چلاتی ہیں اور ان کا کلیجا نکال لیتی ہیں۔
شادو کی آواز اس کے کانوں میں دور سے آئی۔
''میرے ابا نے تجھے چودھری کے ڈیرے پر دیکھا تھا، اس وقت جب چودھری نے تجھے بیٹھک میں بلایا۔ وہ بھی وہاں تھے، کل رات کے لیے انہوں نے چودھری سے معذرت کرلی تھی، ظاہر ہے اس قسم کی تقریب میں ان کا کیا کام...... وہ چودھری کو شادی کے موقعے پر ہونے والی بےہودگی اور بےشرمی سے روک نہیں سکتے تھے۔ وہ سب ابا کے نزدیک غیر شرعی اور گناہ تھا، انہوں نے خود کو روک لیا...... جانتے ہیں کہ جس قسم کی زندگی چودھری جیسے لوگ گزارتے ہیں، اس سے ان کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ اپنی عزت بچاتے ہیں تاکہ مسجد میں امامت کرتے رہیں اور لوگوں کو روزہ نماز کی تلقین بھی...... لیکن چودھری نے بڑی بیگم کے ذریعے کہلوایا کہ پیش امام کی جگہ شادی میں مجھے ضرور آنا ہوگا، ایسا اس نے کیوں چاہا، اس کی وجہ بھی میں بتاؤں گی...... کل چودھری کے بیٹے کا نکاح ابا کو پڑھانا ہے، اس سے پہلے ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔''
''کیسی بات......؟'' اصغر بولا۔
''میری پوری بات سن لے، پھر تجھے خود ہی سمجھ آجائے گی۔ ابا کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں، پچاس سے کچھ اوپر ہے۔ شادی کے بعد ماں چوبیس سال اس کے ساتھ رہی، پہلے اسی حجرے میں تھی، پھر اس کے ساتھ ایک کمرا اور بنوانا پڑا۔ ان کی پہلی اولاد میرا سب سے بڑا بھائی تھا، وہ تین سال کا تھا کہ نالے میں ڈوب کے مرگیا۔ بارشوں کے بعد پانی کا ایک ریلا آیا تو اسے بھی بہا کے لے گیا۔ پھر دو لڑکیاں ہوئیں، دونوں شادی ہوکے گئیں، ایک رات میری ماں کو بخار ہوا۔ دو دن بعد وہ مرگئی۔ میں اس وقت دس سال کی تھی، بڑی بہنوں نے صرف قرآن پڑھا تھا...... ماں کے مرنے سے ابا ڈر گیا کہ وہ بھی نہ رہا تو میرا کیا بنے گا، اس نے مجھے خود پڑھایا۔ وہ کہتا تھا کہ تعلیم عورت کا زیور نہیں، ہتھیار ہوتا ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو اس سے وہ اپنا دفاع کرسکتی ہے۔ اکیلی بھی دنیا سے لڑسکتی ہے۔ کہتے ہیں نیت نیک ہو تو اللہ بھی مدد کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی بہنوں کے مقابلے میں خدا نے مجھے اتنی اچھی صورت نہیں دی جتنا اچھا دماغ دیا ہے۔ تعلیم میں میری دلچسپی نے ابا کو بھی حیران کردیا۔ میں ایک کے بعد دوسری کلاس کی کتابیں ختم کرتی گئی، اگر میں چاہتی تو میٹرک کا امتحان پاس کرلیتی لیکن یہاں نہ اسکول ہے اور نہ کوئی پڑھانے والا...... شہر زیادہ دور نہیں لیکن وہاں ہمارا کوئی نہیں اور میرا گاؤں سے ہر روز اسکول آنا جانا ناممکن تھا۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں چودھری کے گھر میں یا شاہ صاحب کے گھر کی عورتوں سے بات کرتی تو وہ میری شکل دیکھتی رہ جاتی تھیں، میری بہت سی باتیں تو ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی ہوں گی...... بات مردوں تک پہنچی، میری یہ اچھائی ہی میری بدنصیبی بن گئی۔ پہلے ڈھکے چھپے لفظوں میں اور پھر واضح الفاظ میں میرے باپ سے میرا رشتہ مانگ لیا گیا۔ چودھری نے پہل کی۔ ابا نے ٹالا کہ جناب وہ تو ابھی بچی ہے۔ چودھری کی بات سنی تو شاہ صاحب کیسے پیچھے رہتے۔ انہوں نے ابا کو بلا کے میرے لیے پیغام دے دیا۔ دونوں کا موقف ایک ہی تھا کہ اتنی عزت آج تک گاؤں کے کسی اور بندے کو نہیں ملی۔ مطلب سمجھ رہا ہے نا تو...... وہ مسجد کے پیش امام کو بھی رتبے میں اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے، وہ کمی کمین اور کم ذات نہ سہی، ان کے برابر کا بھی نہیں اور اس کی بیٹی حویلی کی بیگم ہوگی تو اس کا سماجی مرتبہ کتنا بلند ہوجائے گا۔ ابا بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بیچ میں چودھری کے بیٹے کی شادی اور شاہ صاحب کے ابا کا عرس شریف آگیا، ابا کو کچھ مہلت مل گئی۔ انکار وہ کس کو کرے۔ دونوں ایک جیسے خطرناک حریف...... دونوں عمر میں مجھ سے دگنے، پہلے سے دو دو بیویاں رکھنے والے، مجھے گھر میں ڈال کے کچھ عرصے بعد شرعی عذر پر چوتھی لے آئیں گے۔''
شادو کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ بات اصغر کی سمجھ میں آچکی تھی مگر بہت سے سوالات اب بھی جواب طلب تھے۔
''چودھری کے گھر میں جو تیرے ساتھ ہوا۔'' شادو، اصغر کے کسی سوال سے پہلے ہی بولنے لگی۔ ''میں نے ابا کو بتایا، ابا کو بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگے کہ چودھری نے بڑی زیادتی کی۔ وہ اچھا بندہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ چودھری سے بات کررہا تھا بڑی تسلی سے...... بڑے مہذب طریقے

www.Paksociety.com

سے...... لگتا ہے پڑھا لکھا بھی ہے۔"

اصغر نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے تو اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

"عرس میں ابا خود بھی تھا۔ اسے قوالیاں سننے کا بڑا شوق ہے لیکن میں نے دیکھا، جب تو گا رہا تھا تو ابا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے بعد میں پوچھا تو بولا کہ عارفانہ کلام کا اثر دل پر ہوتا ہے اور اس نوجوان کی آواز بھی حلق سے نہیں دل سے نکل رہی تھی۔ میں نے بھی تعریف کی۔ میں تعریف میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔ وہ بھی تو باپ ہے میرا...... سمجھ گیا کہ گانے سے زیادہ مجھے گانے والا اچھا لگا ہوگا۔ اس نے سرسری انداز میں اور بھی چند سوال کیے اور باتوں باتوں میں میرے دل کا حال جان لیا...... عشا کی نماز کے بعد اس نے مجھے پاس بٹھا کے پوچھا۔ "پتر شادو...... ایک بات پوچھوں...... سچ بتائے گی؟"

میں نے کہا۔ "پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے آپ سے؟"

انہوں نے کہا۔ "بول بھی نہیں سکتی تو...... بولے گی تو پکڑی جائے گی۔ تجھے جھوٹ بولنا نہیں آتا، یہ اصغر کیسا لگا تجھے......؟"

میں تو گھبرا گئی۔ "کیسا لگا...... کیا مطلب ابا......؟"

"اچھا لگا تو بتا دے...... سوہنا گبرو جوان ہے، اللہ نے آواز میں بڑا سوز دیا ہے، سمجھدار ہے اور مہذب ہے۔ تو اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔"

میری زبان گنگ ہوگئی۔ "مگر ابا...... اس کا کیا پتا......"

"پتا کرلے، جا پوچھ لے اس سے...... اگر تو اسے پسند کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ میری کوہ نور ہیرے جیسی بیٹی کو پسند نہ کرے، اگر وہ ہاں کہے تو اسے لے آنا اپنے ساتھ...... میں تم دونوں کا نکاح پڑھا دوں گا۔ اس سے پہلے کہ دونوں طرف سے حملہ کرنے والے بھیڑیے تیری بوٹیاں نوچیں، عزت آبرو کے ساتھ یہاں سے نکل جا...... میں نے اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کی، وہ خوش رکھے گا تجھے......"

اصغر کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھا تھا۔ "مگر شادو، میں تو میراثی ہوں۔ میری ذات......"

"ابا کسی ذات پات کو نہیں مانتا۔ مسلمان سب ایک ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ یہ سب اللہ کی مخلوق ہیں اور سب کلمہ گو مسلمان ہیں۔ برتری کسی کو ہوگی تو تقویٰ پر نہ کہ نسب پر۔ نہ عربی کو عجمی پر؟ نہ گورے کو کالے پر......"

اصغر نے ایسی باتیں پہلے نہیں سنی تھیں۔ "مگر دنیا میں ایسا نہیں ہے شادو......"

"دنیا میں تو بہت کچھ نہیں ہے۔" شادو نے چمک کے کہا۔ "مگر جو ہمارے نبی پاک ﷺ نے کہا ہے وہ غلط تو نہیں ہوسکتا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "اگر وہ ایسی باتیں کرتا ہے، تو یہ چودھری اور شاہ جی اسے برداشت کیسے کرتے ہیں؟"

شادو نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر جواز بنا لیا۔ "وہ خود بھی ایسی باتیں سب کے سامنے نہیں کہتا۔ جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اب تو بول، تو کیا کہتا ہے؟ جواب دے میری بات کا......"

وہ شادو کو تکتا رہا۔ شادو نے اپنے گھٹنے سمیٹے اور ٹھوڑی ان پر ٹکا دی، اندھیرے میں بھی وہ شادو کی آنکھوں میں ستارے سے چمکتے دیکھ سکتا تھا۔ اصغر کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان بپا تھا، صرف ایک لفظ تھا جو اس کے حلق میں آ کے اٹک گیا تھا۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ یہ لفظ بول سکے۔ بول نہیں سکتا تو گردن ہلا کے اقرار کرلے۔ بتا دے کہ اسے اپنی خوش قسمتی پر ابھی تک اعتبار نہیں آیا ہے۔ آخر زندگی میں اس نے کون سی ایسی نیکی کی تھی جس کا انعام خدا نے شادو کی صورت میں دیا...... اس کی اوقات ہی کیا ہے۔

"تو ڈرتا ہے؟" اس نے شادو کی رندھی ہوئی آواز سنی۔ "سمجھ گئی تیرا جواب کیا ہے...... جا، چلا جا......" وہ اٹھنے لگی۔

اچانک اصغر میں وہ ہمت لوٹ آئی جس کا اندازہ خود اسے بھی نہیں تھا۔ اس نے شادو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میری خاموشی کا غلط مطلب لیا تو نے...... میں جاؤں گا، چلا جاؤں گا یہاں سے مگر تجھے ساتھ لے کر...... سوچ رہا تھا میں تیرے باپ کے بارے میں......"

شادو نے ایک انگلی سے آنسوؤں کے وہ قطرے جھٹک دیے جو اس کی آنکھوں سے رخساروں پر اتر آئے تھے۔ "اس نے مجھ سے کہا تھا۔ میری فکر مت کر شادو، میرے مولا نے بڑی عزت دی مجھے اپنے بندوں کی نظر میں، اب تھوڑی سی رہ گئی ہے...... وہ بے عزت ہو کے بھی گزار لوں گا۔ وہ تو جانتا ہے نا کہ میں نے گناہ کا کوئی کام نہیں کیا۔"

"ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

"وہ نہیں جائے گا، مجھے معلوم ہے۔" شادو پھر پرسکون ہوگئی۔

"کیا بتائے گا وہ لوگوں کو......؟"

"وہی جو سچ ہے، اسے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ میں نے شادو کو رخصت کردیا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ گئی۔ یہ کوئی گناہ کی بات نہیں، سنت رسول ﷺ ہے۔"

"یہ چودھری اور شاہ جی...... یہ اسے معاف کردیں گے؟ اس بے عزتی کو کیسے برداشت کریں گے کہ تیرے باپ نے ان پر ایک غیر کم ذات اور لاوارث میراثی کو ترجیح دی؟"

"اس کے پاس جواب کے لیے بہت دلائل ہیں۔ ایک باپ ہی اپنی بیٹی کا برا بھلا سوچ اور سمجھتا ہے۔ جس کے ساتھ چاہے اسے رخصت کرے...... اور اس کے پاس بڑے مضبوط گواہ ہیں، وہی جو نکاح کے گواہ ہوں گے...... جو کہیں گے کہ اس نکاح میں جبر کو دخل نہیں اور نہ لالچ کو۔ ایک اس کے بچپن کا ساتھی ہے، ریٹائرڈ اسکول ماسٹر...... دوسرا اس کا یار جو شہر میں پوسٹ مین تھا۔ فجر کی نماز میں جو چند لوگ باقاعدگی سے آتے ہیں، ان میں یہ دو بھی شامل ہیں لیکن اصل میں تو میرے باپ کو تحفظ بھی انہی کے گھر سے ملے گا۔ چودھری اور شاہ جی کے گھر سے...... ان کی پہلی خاندانی بیویاں بڑی مضبوط ہیں، وہ نہیں چاہیں گے کہ جس خواہش کا اظہار انہوں نے ابا سے کیا تھا، اس کا علم ان کی بیویوں کو ہو اور جوان اولاد کی نظر میں ان کی کرکری ہو۔"

اصغر نے آہستہ سے شادو کا نرم و نازک سرد ہاتھ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا۔ "کیا واقعی اب بھی تو میرا جواب سننا چاہتی ہے......؟ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ میرے ہاتھ میں تیرا ہاتھ ہے، اسے چھوڑ سکتا ہوں میں، میں جاہل سہی پاگل نہیں ہوں لیکن ایک سوال مجھے بھی کرنا ہے تجھ سے......"

شادو نے نظر اٹھائی۔ "پوچھ لے...... کچھ دیر میں فجر ہوجائے گی۔"

"زندگی میں کبھی تجھے اتنی عجلت میں کیے گئے فیصلے پر افسوس تو نہیں ہوگا؟ ابھی کیا ہے میرے پاس...... لیکن میں وعدہ کرسکتا ہوں کہ دنیا کی ہر خوشی تیرے قدموں میں ڈال دوں گا، آج میں مان گیا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، دیکھ تقدیر مجھے کہاں لے آئی۔ بس یہ نہ ہو کہ بعد میں......"

"بعد میں کیا ہوگا۔ اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا اصغر...... چل اب جا اور اس دروازے پر دستک دے......" شادو نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "دائیں ہاتھ والا میرا کمرا ہے، ابا سے بات کرلے۔"

اصغر گھبرایا...... "بات کرلوں، کیا...... کیا کہوں ان سے......؟"

شادو مسکرائی تو اس کے موتیوں جیسے دانت پھر چمکے۔ "پاگل، میرا ہاتھ نہیں مانگے گا ابا سے......؟" وہ ایک دم پلٹی اور دیوار کے ساتھ چلتی اپنے کمرے میں غائب ہوگئی۔ وہ سحر زدہ سا کھڑا رہا، کسی نے آج تک اس ادا سے پاگل کہہ کے اسے سچ مچ پاگل نہیں کیا تھا۔

وہ تذبذب، خوف، اشتیاق، امید اور ناامیدی کے جذبات سے مغلوب دوسرے دروازے پر کھڑا رہا۔ یہ چند سیکنڈ اس پر بہت بھاری تھے، یہ ناقابلِ تصور فیصلے کا لمحہ تھا جب اسے معلوم ہوجاتا کہ خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا...... یا حقیقت ایسی ہی تھی کہ تقدیر نے اس کے نام لاٹری میں شادو جیسی شریکِ حیات نکال دی تھی۔ کسی سبب اور وجہ کے بغیر خدا اس پر اتنا مہربان ہوگیا تھا۔ اسے تو سوچنے پر بھی اپنی کوئی نیکی یاد نہیں آئی تھی۔

بالآخر اس کے ہاتھ نے آہستہ سے زنجیر والی کنڈی کو ہلایا اور اس کے دل کی دھڑکن جو پہلے تیز تھی جیسے بند ہوگئی۔ پھر دروازہ کھلا اور اس نے اپنے مقابل ایک نحیف و نزار عمر رسیدہ شخص کو دیکھا جس کے سر، جھریوں سے بھرے چہرے کی بھویں اور میلی بنیان سے دکھائی دینے والے مدقوق سینے کے تمام بال بالکل سفید ہوچکے تھے۔

اس نے اپنی دھندلائی نظروں سے اصغر کو دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ "آجا اصغر...... بیٹھ ادھر......"

سلام کر کے اصغر اس کے ساتھ ہی چارپائی کی پٹی پر ٹک گیا۔ کچھ دیر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ عرضِ مدعا کیسے کرے، پھر اس نے چوڑیوں کی جھنکار سنی اور درمیانی دروازے کی طرف دیکھا جو ویسے تو بند تھا مگر اس کی نظر نے شادو کو کسی جھری سے جھانکتے دیکھا۔ چونکہ وہ دروازہ غائب ہوگیا اور شادو اپنی تمام رعنائی اور حسن کے ساتھ اس کے سامنے آگئی۔ گونگے بنے کیوں بیٹھے ہو، بولو...... بولو اصغر...... اس نے شادو کی آواز کو اپنے کانوں میں رس گھولتے سنا۔

یکلخت اس کی ہمت لوٹ آئی، اس نے مولوی صاحب کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔ "مولوی صاحب...... میں...... میں اصغر میراثی...... آپ سے شادو کا رشتہ مانگنے آیا ہوں، کیونکہ اس دنیا میں میرا اور کوئی نہ تھا جو یہ کام کرتا، میں ہرگز اس کے لائق نہیں ہوں...... میں جانتا ہوں، کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس...... مگر میں اسے خوش اور سکھی رکھ سکتا ہوں۔"

مولوی صاحب نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور اس

www.paksociety.com

کے سر پر رکھ دیا۔ ''میں جانتا ہوں، مجھے اس کا اشارہ مل گیا تھا جو سب کا مشکل کشا ہے...... اچھا...... تو بیٹھ، میں وضو کرلوں، اذان کا وقت ہوگیا ہے۔''

اصغر نے سر اٹھایا۔ ''مولوی صاحب، اجازت ہو تو...... میں اذان دے دوں؟''

مولوی صاحب نے سر ہلایا۔ ''جا دے...... پوچھتا کیوں ہے۔''

اصغر نے وضو کیا اور صحن کے وسط میں کھڑا ہوگیا۔ جس گلے سے پہلے لچر فلمی گانے نکلتے تھے۔ اللہ نے توفیق دی تو اسی سے عارفانہ کلام کی صدا نکلی تھی جو دلوں میں اتر گئی تھی...... بابا بلھے شاہؒ کی کافیوں سے جگنی تک اس کی آواز نے روح کے تاروں کو جھنجوڑا تھا...... آج اس سے آواز اذان نکلی تو جیسے ہفت افلاک تک اس کی بازگشت پہنچی۔

جب اذان ختم ہوئی تو اصغر کی آنکھوں میں آنسو تھے، پیش امام صاحب دروازے میں ساکت کھڑے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے دوسرے دروازے میں شادو بت بنی کھڑی تھی، پھر نمازی آنے شروع ہوئے۔ انہوں نے پوچھا، یہ کس کی آواز اذاں تھی؟ اور مولوی صاحب نے بڑے فخر سے اسے ملوایا۔ ''یہ اصغر ہے، میرا ہونے والا داماد......''

نماز کے فوراً بعد گواہوں کی موجودگی میں پیش امام صاحب نے شادو کو اصغر کے نکاح میں دے دیا...... نمازی چلے گئے تو انہوں نے شادو کا ہاتھ اصغر کے ہاتھ میں تھمایا۔

''اب تم جاؤ، تم کو اللہ کی امان میں دیا۔''

اصغر نے کہا۔ ''لیکن آپ......؟''

''میری فکر مت کرو، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ خطرہ تمہیں ہے اور مت بھولو کہ اب تم اکیلے نہیں ہو...... تمہیں شادو کو بھی بچانا ہے، اس خبر کو پھیلنے میں دیر نہیں لگے گی، غضب ناک بھیڑیوں کا غول تمہارے پیچھے آئے گا...... اس لیے جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے نکل جاؤ۔''

شادو اس سے چمٹ کر رونے لگی۔ ''تم بھی چلو ہمارے ساتھ۔''

انہوں نے پیار سے اس کے سر کو تھپکا۔ ''پاگل...... میں کیسے ساتھ جاسکتا ہوں، مجھ میں اب اتنا دم ہی کہاں ہے کہ تمہارا ساتھ دے سکوں۔ تمہارے سامنے پوری زندگی ہے، میرے پیچھے اب کچھ نہیں ہے جس کی مجھے فکر ہو، تم جاؤ...... اجالا پھیلنے سے پہلے نکل جاؤ...... اور دیکھو...... ہوا کی سمت میں مت جانا کہ کتے بو سونگھتے تم تک پہنچ جائیں، شادو جانتی ہے مولا داد تانگے والے کا گھر...... اس سے کہنا تمہیں واپس نہ لے جائے، آگے لے جائے۔ یہاں سے سترہ دور پر جو سڑک ملے گی...... وہ ملتان نہیں مخالف سمت بھی لاہور لے جائے گی۔''

اصغر نے فرار کی اس حکمت عملی کو سمجھ لیا تھا۔ شاہ جی کے کارندے اسے بس اسٹاپ سے واپس لے گئے تھے۔ آج چودھری کے کارندے بھی انہیں وہیں سے اٹھا لیتے۔ اب وہ ملتان جانے والی سڑک کا رخ کریں گے۔ دور تک ان کی تلاش میں جائیں گے۔ مولوی صاحب نے جس گاؤں کا ذکر کیا تھا وہ مولا داد، تانگے والے کی سسرال تھی اور وہ اکثر وہاں چلا جاتا تھا۔ وہ گزشتہ رات ہی آیا تھا۔ اصغر نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا مگر وہ جانتا تھا کہ مولوی صاحب نے اسے کیا ذمے داری سونپی ہے اور ان کے ایک شاگرد کی حیثیت سے وہ اپنا فرض نبھا رہا تھا۔

جب دو گھنٹے بعد وہ گاؤں کے باہر سے گزرنے والی سڑک کے کنارے اترے تو مسلسل آنسو بہاتی شادو نے کہا۔ ''ابا کا خیال رکھنا مولا داد...... اور اپنا بھی......''

کسی بڑے بھائی کی طرح مولا داد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''فکر ہی نہ کر کڑیے، جا تیرا رب راکھا......'' اور تانگے کو موڑ کے واپس لے گیا۔ اس وقت تک سورج بہت اوپر آگیا تھا۔ شادو منہ سر چادر میں لپیٹے کھڑی تھی اور اصغر کو یہاں کوئی نہیں پہچانتا تھا، وہ چار دوسرے مسافروں کے ساتھ بس میں سوار ہوا اور تین گھنٹے میں لاہور پہنچا تو ایک بالکل بدلا ہوا آدمی تھا۔ قدرت نے اچانک اسے ذمے دار بنا دیا تھا۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ بیوی تھی اور اس کے سامنے وہ مستقبل تھا جس میں ان کے بچے تھے اور ان کی پرورش کے مسائل تھے۔ انہیں بڑا کرنے، تعلیم دلوانے اور ان کی شادی کرنے تک۔

لیکن فوری مسئلہ اس کے لیے ایک گھر کا حصول تھا، خواہ وہ ایک کمرا ہی ہو جہاں وہ اپنی بیوی کو رکھ سکے۔ وہ وقت نہیں رہا تھا جب وہ کسی بھی خانقاہ کے چبوترے پر، کسی بھی مسجد میں، کسی بھی پارک کی بنچ پر یا ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں قلیوں کے فرش پر سو جاتا تھا۔

اسے بڑی حیرانی ہوئی جب لاہور پہنچ جانے کے بعد یہ سارے مسائل جن کو وہ بہت بڑا سمجھ رہا تھا خود بخود حل ہوگئے۔ اس کے پاس دو ہزار نقد تھے۔ پہلے سے پس انداز کی ہوئی پونجی کو ملا کے یہ نو ہزار ہوجاتے تھے۔ ہزار کی وہ انگوٹھی جو اسے انعام میں ملی تھی۔ اسے دھرمپورے میں ایک احاطے میں ایک کمرے کا گھر صرف سو روپے ماہوار کرائے

پر مل گیا۔ احاطے میں اس جیسے تیس چالیس خاندان آباد تھے، کم خرچ ہونے کے ساتھ یہ جگہ ان کی موجودہ ضروریات کے لیے کافی تھی اور یہاں وہ محفوظ بھی تھے۔

جان کی حفاظت پہلا مسئلہ تھی۔ اصغر بھی جانتا تھا کہ چودھری یا شاہ صاحب کے جاسوس اسے لاہور میں کہاں تلاش کریں گے۔ وہ مزارات پر جائیں گے اور میلوں کا رخ کریں گے۔ قوالوں سے اور میلوں میں گانے والوں سے پوچھیں گے۔ اصغر میراثی کہاں ملے گا...... لیکن کب تک...... بالآخر انہیں یقین آجائے گا کہ اصغر میراثی ان کی توقع سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ چمٹا لے کر جگنی گانے آیا اصغر گاؤں کی سب سے قیمتی لڑکی نکال لے گیا۔

شادو نے گھر سنبھالتے ہی اصغر کی زندگی کا سارا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پہلے تو اس نے اصغر کو گھر میں قید کردیا۔ وہ گھر کا سودا سلف یا ضرورت کی کوئی چیز لینے دھرمپورے کے بازار سے آگے نہیں جاسکتا تھا اور یہاں بھی وہ برقعہ اوڑھ کے اس کے ساتھ جاتی تھی۔ ''ابھی ہمارے پاس اتنا ہے کہ تجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ کہتی۔

''لیکن شادو...... میں کام نہیں کروں گا تو گزارا کیسے ہوگا؟''

''کام؟...... کون سا کام...... اب میں تجھے وہ مراثیوں والا کام تو کرنے نہیں دوں گی، ادھر ادھر پھر کے گانے کا......''

''مگر مجھے تو وہی ایک کام آتا ہے۔''

''کام بہت ہیں...... یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اب میں بھی تیرے ساتھ ہوں، کیا مجھے بھی ساتھ لیے پھرے گا اور ابھی نہ سہی، ایک نہ ایک دن انہیں معلوم ہوجائے گا جو میری تیری جان کے دشمن ہیں۔ میرا کوئی خیال نہیں تجھے......''

''اچھا بتا میں کیا کروں؟''

''بتاؤں گی جب وقت آئے گا...... پہلی بات یہ کہ خبردار جو آئندہ خود کو اصغر میراثی کہا...... اب تو سید اصغر حسین ہے۔''

وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''سید اصغر حسین......''

وہ ڈانٹ کے بولی۔ ''ہاں...... اور تیرے باپ کا نام بھی سید دلاور حسین تھا...... کوئی بھی پوچھے یہی بتانا ہے۔''

''مگر یہ تو بڑے...... گناہ کی بات ہوگی۔''

''چل رہنے دے گناہ ثواب...... تو بھولا نہیں بے وقوف ہے، جب پاکستان بنا تھا نا...... تو تیرے جیسے بہت تھے جو ادھر کمین شمار ہوتے تھے، نائی، موچی، بھنگی

جن

ایک سردار صاحب نے ایک گاڑی کو روکنے کے لیے اشارہ کیا۔ گاڑی رک گئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد دیکھتے ہیں کہ گاڑی میں ڈرائیور موجود نہیں اور گاڑی خود بخود چل رہی ہے۔ سردار بہت پریشان ہوئے اور ڈر گئے کہ گاڑی کو جن چلا رہا ہے۔

نزدیکی پیٹرول پمپ پر گاڑی رکی اور تھوڑی دیر بعد ایک پسینے سے شرابور شخص گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگا تو سردار بولا۔ ''یہاں نہ بیٹھو یہاں جن بیٹھا گاڑی چلا رہا ہے۔''

وہ صاحب غصے سے بولے۔ ''اوئے اخروٹ کے بچے میں 2 کلومیٹر سے دھکا لگا رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ گاڑی جن چلا رہا ہے۔''

لاعلاج

ڈاکٹر مریض کو چیک کرنے کے بعد اس کی بیوی سے۔

''آپ کے شوہر ٹھیک ہوسکتے ہیں۔ اگر آپ ان کا خیال رکھیں۔ پریشان نہ کریں، لڑائی نہ کریں اور ان کی خدمت کریں۔''

شوہر: ''ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

بیوی: ''تم لاعلاج ہو......''

پریشانی

ٹریفک سارجنٹ نے ایک موٹر سائیکل پر سوار 4 طالب علموں کو دیکھ کر غصے سے کہا۔ ''اوئے ڈبل سواری پر پابندی ہے اور تم چار، چار سوار ہو۔''

ڈرائیونگ کرنے والا لڑکا پریشانی سے پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اوئے پانچواں کہاں گر گیا......؟''

مرسلہ: سدھارتھ، جودھپور، کیروالا

www.Paksociety.com

تھے...... جو سیانے تھے انہوں نے صدیوں کی ذلت کا بوجھ ادھر ہی پھینک دیا۔ سرحد کے پار...... انہوں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور یہاں آ کے معزز ہو گئے۔ انہوں نے اپنی آنے والی نسلوں کو بھی عزت دار کر دیا، کون جانتا تھا یہاں انہیں۔ نام اور پیشے ہی نہیں، ولدیت تک بدل لی انہوں نے...... گناہ گار تو وہ تھے جو اللہ کے بندوں کو اس طرح بے عزتی کا طوق پہنا کے خود عزت دار بن جاتے تھے...... جیسے ہندو ذات پات کو مانتے ہیں، براہمنی مقدس ہیں اور اچھوت ناپاک، محض نسبت پر...... اسلام تو سب کو مساوی درجہ دیتا ہے، بات سمجھ میں آرہی ہے تیری......؟''

اس نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔ ''مگر شادو، میں کروں گا کیا......؟''

''وقت آئے گا تو میں بتاؤں گی۔ سب کچھ کر سکتا ہے تو جو تیرے جیسا دو ہاتھ پاؤں، دو آنکھوں اور ایک سر والا کر رہا ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''سر، میں کچھ ہونا چاہیے مگر بھوسا نہیں۔''

اصغر نے محسوس کیا کہ نام کی بات نہیں، اس کی زندگی میں سب کچھ بدل گیا ہے، کچھ بھی نہیں رہا جو اس کا اپنا تھا۔ یہ جادو کرنے والی شادو تھی۔ اصغر کو وہ ایک خوبصورت عورت سے زیادہ کوئی جادوگرنی لگتی تھی جو سب کچھ کرنے پر قادر تھی، وہ بھی جو اسے ناممکن لگتا تھا اور وہ بھی جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا۔ وہ خوش بھی تھا لیکن ڈرتا بھی تھا اور شادو اس کے اندر کا ڈر نکال کے اس میں اعتماد بھرنے پر کمر بستہ نظر آتی تھی...... اس کی باتیں اصغر کو چکرا دیتی تھیں۔

وہ پوچھتا تھا۔ ''کہاں سے سیکھ لی ہیں تو نے یہ باتیں، کس نے بتائی ہیں، کتابوں میں تو یہ سب نہیں ہوتا۔''

وہ ہنستی۔ ''سب سے بڑی کتاب ہے زندگی اور اسے آدمی پڑھتا ہے عقل سے...... تجربے سے...... دیکھ کر اور سیکھ کر...... کنویں کا مینڈک کنویں میں پیدا ہوتا ہے اور کنویں میں ہی مر جاتا ہے، وہ دیکھ اوپر آسمان کی طرف...... اتنی بلندی پر اڑنے والے پرندے کی نگاہ کہاں تک دیکھ رہی ہے اور کیا دیکھ رہی ہے؟''

پندرہ دن بعد ایک دن اصغر نے دیکھا تو وہ گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی، اصغر کا دل بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا شادو...... ابا یاد آرہا ہے؟''

اس نے آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں اٹھائیں۔ ''انہوں نے ابا کو مار دیا اصغر...... اسی دن مار دیا۔''

اصغر کے دل کو ایک دھچکا لگا۔ ''مار دیا...... کس نے؟''

''قاتلوں نے اور کس نے...... اس نے مجھے تیرے حوالے کر دیا تھا۔ بڑی بے عزتی کی تھی عزت داروں کی...... اسے سزا تو ملنی ہی تھی، کسی کو ترس تک نہ آیا اس بوڑھے آدمی کا سر کلہاڑی سے دو ٹکڑے کرتے ہوئے...... وہ تو ویسے ہی مرنے والا تھا، وہ مجھے ان ہوس پرست بھیڑیوں کے آگے ڈال دیتا تو کچھ نہ ہوتا۔'' وہ پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

اصغر نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ مت رو شادو...... دعا مانگ ان کی مغفرت کے لیے...... مگر تجھے یہ بات بتائی کس نے؟''

''مولاداد نے......''

''وہ آیا تھا یہاں؟'' اصغر چوکنا ہو گیا۔

''وہ یہاں کیسے آسکتا تھا۔ اس کا ایک ماما یہاں رہتا ہے...... اس نے مجھے ایک پرچے پر اس کا نام لکھ کر دیا تھا۔ اس کی پرچون کی دکان ہے۔''

''تو گئی تھی......؟''

''نہیں...... اس کا فون نمبر یاد کر لیا تھا میں نے...... آج پیسے دے کر اسے فون کیا اور پوچھا تو اس نے کہا کہ مولاداد سے اسے تو معلوم ہو گیا مگر وہ مجھے کیسے بتاتا...... وہ پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں...... میں نے جھوٹ بول دیا...... کہا کہ کسی دن آؤں گی۔''

''سچ مجھے بڑا دکھ ہوا، تیرا تو باپ تھا......''

''نہیں اصغر......'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''میرا ابھی باپ نہیں تھا وہ...... اس نے مجھے پالا ضرور تھا۔''

اصغر اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ ''پھر...... تمہارا باپ کون تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم...... میں اس وقت بہت چھوٹی تھی جب مجھے اس گھر میں لایا گیا تھا۔''

''اور مولوی صاحب نے بھی نہیں بتایا کبھی؟''

''وہ ضرور بتاتے...... اگر انہیں معلوم ہوتا، وہ چاہتے تو یہ بات بھی مجھے نہ بتاتے کہ میں کسی اور کی بیٹی ہوں۔ انہیں یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ دوسرے لوگ بتا دیں گے، یا میرا اصل باپ آجائے گا۔ ایسے گول گول دیدے مت گھماؤ...... مولوی صاحب کی بیوی نے کچھ نہیں کیا تھا، میری اصل ماں کو بھی کوئی نہیں جانتا۔''

''یہ کیا بات کو گھما رہی ہو۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''یہ کہو نا کہ مجھے گھما رہی ہو...... جیسے ابا نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو چھپا سکتا تھا، میں بھی تم سے چھپا لیتی...... یہ ابھی زیادہ دن کی بات نہیں تھی کہ اس نے مجبوراً ایسا کہا۔ اس نے مجھے بلایا اور کہا بیٹا شاہدہ پروین۔ ایک کڑوی گولی ہے جو میں مجبوراً تجھے دے رہا ہوں۔ جانتا ہوں یہ زہر ہے لیکن وقت آنے پر تیری جان بچانے کے لیے یہی سچ کام آئے گا۔ دیکھ یہ بدنیت چودھری اور ہوس کا مارا شاہ جی...... یہ اس لیے تیرا ہاتھ مجھ سے مانگ رہے ہیں کہ تجھے وہ میری بیٹی سمجھتے ہیں۔ اگر تجھے بچانے کی اور کوئی صورت نہ رہی تو میں ان کو یہ سچ بتا دوں گا پھر دیکھوں گا وہ کیسے تجھے قبول کرتے ہیں...... ابا نے مجھے بتایا کہ جب اس کی آخری بیٹی کی پیدائش کا وقت آیا تو نہ جانے کیا خرابی پیدا ہو گئی، لڑکی مردہ پیدا ہوئی۔ وقت سے پہلے نہ ان کی بیوی کو اندازہ ہو سکا اور نہ اس دائی کو جو کبھی کبھار آجاتی تھی اور اس رات بھی وہی آتی لیکن ان کی بیوی کو اچانک درد اٹھا...... باہر بارش ہو رہی تھی لیکن وہ دائی کو بلانے گئے مگر وہ کسی دوسرے گھر میں تھی۔ چودھری کے گھر میں اس کی دوسری بیوی کے ساتھ...... اور فوراً نہیں آسکتی تھی لڑکی پیدا ہوئی تو ماں کو اندازہ ہو گیا کہ اس میں زندگی کے کوئی آثار نہیں۔ اس وقت تک صبح ہو چکی تھی اور بارش بھی تھم گئی تھی۔ ابا نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور دفن کرنے کے لیے قریب ہی قبرستان میں لے گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ زمین نرم ہے، خود ہی گڑھا کھود کر مردہ بچی کو گاڑ دے گا...... وہاں میں پڑی تھی۔ میرے رونے کی آواز نے اسے متوجہ کیا اور وہ اس مردہ کو دفنانا بھول کے مجھے بچانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے کلمہ پڑھتے ہوئے مجھے اپنی پگڑی کھول کے اچھی طرح لپیٹا اور گھر لے آیا۔ مجھے اپنی بیوی کے حوالے کر کے وہ پھر گیا اور مردہ بچی دفنا دی۔ جب وہ لوٹ کے گھر آیا تو یہ بات اس کی بیوی نے کہی۔ اگر ہم کسی کو بھی نہ بتائیں تو سب اسے ہماری بیٹی سمجھیں گے...... میرا باپ بھونچکا رہ گیا۔ اس نے کہا۔ تمہیں معلوم ہے، تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم کسی اور کے گناہ کی پرورش کی ذمے داری لے رہی ہو۔ بیوی نے کہا۔ گناہ ثواب کا معاملہ اللہ جانے...... میں تو اسے بچا کے باعزت زندگی گزارنے کا موقع دے رہی ہوں۔ ابا نے کہا کہ معلوم نہیں یہ کس کا گناہ تھا جو اسے مرنے کے لیے قبرستان میں پھینک گیا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ موت اور زندگی کسی بندے کے ہاتھ میں نہیں۔ جسے ہم زندہ دیکھنا چاہتے تھے اسے ایک سانس کی زندگی نہ ملی...... اور جس کو وہ سنگ دل ماں یا باپ مارنا چاہتا تھا اسے بچانے کے لیے خدا نے تمہیں بھیج دیا۔ اس میں بچی کا کیا قصور ہے اگر گناہ گار ماں باپ تھے...... بچے تو معصوم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ابا قائل ہو گیا اور اپنی بیوی کی قدر و منزلت اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح پالا اور ہو سکتا ہے مجبوری نہ ہوتی تو مجھ پر بھی اس راز کا انکشاف بھی نہ کرتے...... جس کے ماں باپ کا پتا نہ ہو اسے دنیا کیا سمجھتی ہے...... حرامی...... یہ بات مجبوری میں شاہ جی کو اور چودھری صاحب کو بتانا پڑتی تو وہ مجھ سے ایسے دور بھاگتے جیسے میں گندگی کی پوٹ ہوں، اپنی عالی نسبی پر انہیں بڑا غرور ہے۔ اپنے عزت دار خون میں وہ گندے خون کی آمیزش کرتے...... کیا معلوم میں کسی چمار کی اولاد تھی یا بھنگی کی...... کیا بات ہے، تم خاموش کیوں ہو؟''

اصغر چونکا۔ ''میں سوچ رہا ہوں، یہ بات تم نے مجھے کیوں بتائی؟''

''اس لیے کہ مجھے تم پر اعتماد تھا...... کہ تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

اصغر نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ''تم میرے لیے شادو ہو اور بس...... مجھے اس سے کیا کہ تمہاری ماں کون تھی اور باپ کون تھا...... تم سے اچھی اور کوئی شادو کیسے ہو سکتی ہے خواہ وہ کسی محل کی شہزادی ہو......''

شادو نے شرارت سے کہا۔ ''اور اگر کسی دن آگئے میرے اصل ماں باپ...... پھر؟''

''پھر کیا...... میں انہیں ساس سسر مان لوں گا۔''

شادو نے کہا۔ ''میرے اور تمہارے سوا اب یہ کوئی نہیں جانتا کہ شادو کون ہے اور کس کی بیٹی ہے۔ میرے اصل ماں باپ نے تو فرض کر لیا ہوگا کہ جس کو وہ اپنے گناہ کا ثمر جانتے ہوئے بارش میں باہر پھینک آئے تھے، ایک قبرستان میں...... وہ لوٹ کے زندہ انسانوں کی دنیا میں پہنچ گئی تھی......''

اصغر کی نظر میں اس دن کے بعد سے اپنی بیوی کی عزت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ یہ بات بھی پرانی ہو گئی۔ اصغر مسلسل بیکاری سے تنگ آچکا تھا اور اسے مستقبل کی فکر بھی ہو رہی تھی۔ ان کا سرمایہ اب نصف رہ گیا تھا۔ باقی انہوں نے گھرداری کی ضروریات اور اپنے لیے کپڑے وغیرہ خریدنے پر خرچ کر دیا تھا۔ شاہدہ اسے محنت مزدوری کے لیے بھی گھر سے نہیں نکلنے دیتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میں چھولوں کی ریڑھی لگا سکتا ہوں۔ باغ جناح میں پاپڑ بیچ سکتا ہوں، اسٹیشن پر قلی بن سکتا ہوں مگر شادو کو ڈر تھا کہ وہ باہر نکلا تو پکڑا جائے گا۔ اپنی شناخت چھپانے کے لیے اس نے ڈاڑھی بھی

www.Paksociety.com

رکھ لی تھی جو تین مہینے میں ایک مشت سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔
ایک دن وہ نہ جانے کہاں سے آئی تو برقعہ اتار کے بستر پر لیٹ گئی۔ ''میں اسپتال گئی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ تم ماں بننے والی ہو......'' اس نے یوں کہا جیسے کسی گناہ کا اعتراف کررہی ہو۔
اصغر نے خوشی سے چیخ ماری۔ ''سچ...... یعنی میں باپ......''
''نہیں اصغر تم نہیں...... باپ اس کا وہ ہے۔'' وہ مجرم لہجے میں منہ چھپا کے بولی۔
آواز اصغر کے حلق میں پھنس گئی۔ ''وہ کون......؟''
وہ قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھی۔ ''صدر پاکستان۔ ذرا اپنی شکل دیکھو...... پاگل...... رونے والی ہورہی ہے۔'' شادو کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔
اصغر سخت خفیف ہوا۔ ''پاگل تو میں ہوں...... مگر کیا تم نے......؟''
وہ اٹھ بیٹھی۔ ''سنو ہم اپنے بچے کے سامنے اپنے ماضی کا کوئی حوالہ نہیں دیں گے۔ اب تم کام کروگے مگر اپنے بچے کو بڑا آدمی بنانے کے لیے۔ ہم جارہے ہیں یہاں سے۔''
''کہاں جارہے ہیں...... اور کیوں......؟''
''سب پتا چل جائے گا تمہیں آہستہ آہستہ...... گھر بھی دیکھ آئی ہوں، اس سے بہت اچھا ہے۔ کھلی جگہ ہے اور صاف ستھری بھی...... جیسے ہمارا گاؤں تھا۔ کمرے دو ہیں لیکن کرایہ اتنا ہی ہے۔ پانی سامنے مسجد سے لانا ہوگا، بجلی ابھی نہیں ہے مگر لگ جائے گی...... بات کرلی ہے میں نے مالک مکان سے...... تم اب سید اصغر حسین شاہ ہو...... یاد رکھنا......''
اصغر نے سر ہلایا۔ ''کون ہے مالک مکان...... تم کیسے جانتی ہو اسے......؟''
''میں تو تمہیں بھی نہیں جانتی تھی، آم کھاؤ پیڑ مت گنو...... پاگل، وہ ہے پیش امام ایک مسجد میں...... اور اکیلا ہے، مکان بھی اسی کا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا باپ بھی امامت کرتا تھا، بس وہ ایک دم موم ہوگیا...... ہاتھ رکھ دیا میرے سر پر کہ پھر تم میری بیٹی بھی ہو، اب تم دیکھنا میں کیسے جذباتی استحصال کرتی ہوں اس کا...... میری باتوں سے متاثر تو وہ ہو ہی گیا تھا۔ سچ مچ کا ابا بنالوں گی تو کرایہ خاک لے گا ہم سے...... مکان بالآخر ہمیں ہی مل جائے گا، خدمت کروں گی اس کی...... دونوں وقت پکا کے کھلاؤں گی، بیوی اس کی بھی نہیں ہے...... بچے ہیں۔''
اصغر بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ ''تم تو بڑے خطرناک عزائم رکھتی ہو، اسے بھی پھانس لیا۔''
شادو ہنسی۔ ''تم جیسے سانڈ کو قابو کرلیا تو وہ بے چارا کیا ہے، بیمار بڈھا۔ تم وہ کرتے جاؤ جو میں کہتی ہوں...... پھر دیکھنا۔''
شادو کو ایسا کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اصغر اس کا بندۂ بے دام تھا۔ اس کے اشاروں پر چلنے والی کٹھ پتلی...... وہ اس کے لیے اچھا سوچ رہی تھی تو یہ اس کی محبت کا ثبوت تھا۔
انہوں نے اپنا تمام اسباب ایک ریڑھے پر لادا اور دریا پار شاہدرہ سے بھی آگے ایک نواحی بستی میں پہنچ گئے جہاں گھر بن رہے تھے۔ شروع کے حصے میں آبادی پوری تھی۔ گلیوں میں بجلی پانی سب کچھ تھا، آگے کہیں کہیں ابھی کھیت بھی تھے مگر لگتا تھا کہ ان کی جگہ بھی مکان لے لیں گے۔ زیر تکمیل مکان بہت تھے اور یہ نچلے درجے کی آبادی تھی، مکان تین سے پانچ مرلے کے تھے۔ مسجد اسی آبادی کی ضرورت کے لیے وجود میں آئی تھی اور ابھی چھوٹی تھی۔ شادو کو یہاں آکے یوں لگا جیسے وہ لوٹ کے اسی گاؤں میں پہنچ گئی ہے جہاں اس کی ساری زندگی گزری تھی۔
شادو کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ عزت دار زندگی کے۔ عیش و آرام کی زندگی کے...... ویسی ہی جیسی چودھری یا شاہ جی گزارتے تھے اور وہ جانتی تھی کہ یہ زندگی کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اپنی زندگی سے اس نے جو سبق حاصل کیے تھے وہ بڑے تلخ تھے...... یہ دوہرے معیاروں کی دنیا تھی، جو شریف اور باضمیر، حق حلال کی روزی پر یقین رکھنے والے اور صراط مستقیم پر چلنے والے تھے وہ عزت دار نہیں تھے اور عیش و آرام تو دور کی بات ہے، زندگی کی بنیادی آسائشوں سے بھی محروم تھے۔ عزت دار وہ تھے جو منافقت کی دہری زندگی گزارتے تھے۔ خود حلال و حرام، جائز ناجائز میں تفریق کے قائل نہ تھے مگر دنیا کو اس کی تلقین کرتے تھے۔ وہ غریبوں کا خون چوستے تھے مگر سب کے سامنے مزدور کی اُجرت اس کا پسینا خشک ہونے سے پہلے ادا کرنے کی بات ضرور دہراتے تھے۔
بدنام شہر نے جہاں نیچے سے اوپر تک سب فریب کار تھے اور منشیات کے زہر سے نسوانیت کی آبرو تک دولت کمانے کے تمام ذرائع کسی احساس گناہ یا کسی یوم جزا و سزا کے خوف کی پروا کیے بغیر اختیار کرتے تھے...... لیکن شادو نے دیکھ لیا تھا کہ ہوس کی تابکاری نے کس طرح گاؤں، دیہات کی فضا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ منافقت اور فریب کے عیار بیوپاری ہی وہاں بھی کامیاب تھے۔

شادو کے ذہن کا منفی ردعمل حالات کا نتیجہ تھا۔ اس کا وجود ہی گناہ کا ثمر تھا اور کوئی اخلاقی جواز نہیں رکھتا تھا......
اصغر کے ساتھ زندگی کا سفر دو منفی قوتوں کا ملاپ تھا جن سے شادو نے مثبت نتائج حاصل کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔
نئے گھر میں منتقل ہوتے ہی شادو نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع کردیا۔ پرانے وقتوں کی وہ روایت باقی نہ رہی تھی جب ہر گھر سے مسجد میں کھانا جاتا تھا۔ یہ کھانا مسجد میں ضرورت کے تحت قیام کرنے والے مسافروں کا پیٹ بھرتا تھا۔ وہ رات کو مسجد میں سوتے اور صبح نہادھو کر اپنے کام کرنے نکل جاتے تھے۔ اب مسجدوں میں رات کے وقت قفل پڑ جاتے تھے کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں چور نہ صف چھوڑتے تھے اور نہ کلاک......
پیش امام صاحب کے لیے ایک دو گھروں سے کھانا بھیجا جاتا تھا لیکن کبھی وہ بھول جاتے تھے تو مولوی صاحب پانی پی کر بھی خدا کا شکر بجالاتے اور سوجاتے تھے۔ وجہ گھر میں کوئی تقریب ہوتی تھی یا کوئی ایسی ہی مصروفیت...... مگر ان کی حمیت اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ کھانا مانگنے جائیں حالانکہ اپنے بچپن میں وہ محلے کی مسجد کے نابینا موذن کے ساتھ گھر گھر سے آٹا مانگنے بھی جاتے رہے تھے۔
پہلے ان سے ہی شادو نے مولوی صاحب کو پیغام بھجوا دیا کہ اب وہ تینوں وقت کا کھانا اپنی بیٹی کے گھر کھائیں گے۔ ان کا پرتکلف انکار رائگاں گیا۔ شادو کے خلوص سے مجبور ہوکے صبح کا ناشتا کرنے کے لیے نماز فجر کے بعد، دوپہر کے لیے ظہر کے بعد اور رات کا کھانا کھانے کے لیے عشا کے بعد آتے۔
شادو نے دن میں اصغر کو زبردستی نماز باجماعت کے لیے مسجد بھیجا تھا اور مولوی صاحب کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے اس نو وارد سے تعارف حاصل کیا جو خود آگے بڑھ کر سب سے ملتا تھا۔ اپنا نام سید اصغر حسین شاہ بتا کے کہتا تھا کہ وہ محلے میں نیا آیا تھا۔
رات کے کھانے کے بعد مولوی صاحب رک گئے۔ ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی اور صحت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ شادو کی خدمت گزاری نے انہیں اداس کردیا تھا۔ کھانے کے بعد شادو نے ان کے سامنے چائے رکھی تو انہوں نے خود ہی پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کے والد کہاں امامت کرتے تھے؟
شادو کی کہانی تیار تھی۔ اس نے سب کچھ درست بتایا سوائے اصل جائے رہائش کے...... اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ پیش امام صاحب کی اصل اولاد نہیں تھی اور نہ یہ کہ اس کی شادی کن حالات میں اصغر سے ہوئی تھی۔ ماں بچپن میں ہی مرگئی تھی۔ بھائی تھا نہیں، ابا بعد میں گزر گئے۔ اب مسجد پر ان کی ایک مخالف سیاسی شخصیت نے قبضہ کرلیا ہے اور وہاں اپنا پیش امام رکھ لیا ہے جس کا عقیدہ بھی مختلف ہے۔
شادو نے ایک متاثر کرنے والا پس منظر اپنے شوہر سید اصغر حسین شاہ کو بھی دے ڈالا۔ اس کا تعلق گورداسپور کے ایک اعلیٰ گھرانے سے تھا مگر وہ سب پاکستان آتے ہوئے قتل ہوگئے۔ اصغر نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی مگر ان کے ظلم اور غیر اخلاقی رویے سے بددل ہوکے بھاگ آیا۔ شادو کے ابا نے اسے پناہ دی اور وہ اسی مسجد میں موذن رہا۔ اس کا لحن بہت اچھا تھا، عارفانہ کلام اور حمد و نعت بہت اچھی پڑھتا تھا۔ مولوی صاحب نے موزوں پاکے اپنی بیٹی کی شادی کردی تو اصغر نے اپنی ذمے داری خود اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اپنی بیوی کے ساتھ لاہور آگیا۔
مولوی صاحب بہت متاثر ہوئے۔ اپنے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ جب وہ بڑے ہوئے تو ان پر باہر جانے کی دھن سوار ہوگئی۔ وہ خود اس وقت ایک پرائمری اسکول میں دینیات پڑھاتے تھے اور ان کی گزر بسر بہت تنگی ترشی میں ہوتی تھی۔ لڑکوں نے بڑی مشکل سے میٹرک کیا۔ ان کی ماں بھی خوش نہیں رہتی تھی۔ اس نے خود اپنے بچوں کو بگاڑا، انہیں کہا کہ یہ باپ تو تمہیں قناعت کے سبق کے سوا کچھ دینے سے رہا۔ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے تمہیں خود ہی دنیا میں کچھ کرنا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غلط صحبت میں پڑ گئے۔ پھر چھوٹے موٹے جرائم میں پولیس کے ہاتھ لگے۔ وہ کبھی گھر آتے تو ماں کو یکمشت خاصی رقم دے جاتے تھے۔ میں پوچھتا تو کہتی کہ تم آم کھاؤ، پیڑ مت گنو۔ تمہارے ہی بچوں کی کمائی ہے۔ میں اس کمائی سے ہمیشہ دور رہا۔ بالآخر باہر نکلنے میں کامیاب رہے اور امریکا پہنچ گئے۔ چار سال بعد انہوں نے ہمیں بھی بلایا لیکن میں نے انکار کردیا...... میری بیوی چلی گئی۔ اس بات کو بھی بیس سال ہوگئے۔ اب کچھ پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ نہ انہیں معلوم ہے کہ میں زندہ ہوں یا نہیں۔ بیوی کو میں نے طلاق نہیں دی تھی۔ شرعاً وہ آج بھی میری بیوی ہے۔''
اصغر کو دلی افسوس ہوا لیکن شادو نے اپنی حکمت عملی طے کرلی تھی۔ ''بدبختی ہے ان کی اور کیا......'' وہ آہ بھر کے بولی۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ کی صورت میں مجھے پھر اپنا باپ مل گیا ہے۔''

www.Paksociety.com

ان کے جانے کے بعد اصغر نے پوچھا۔ ”آخر تم اس اکیلے بوڑھے کے جذبات سے کیوں کھیل رہی ہو؟“

وہ بگڑ گئی۔ ”بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو مجھ سے...... کیا تھی میں اور کیا تھی میری زندگی...... میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ میں کس کی ناجائز اولاد ہوں، پیدائش کے وقت ہی میرے قاتل خود میرے ماں باپ بن گئے تھے۔ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنے کے بعد مجھے پھینک کر وہ پھر پارسا بن گئے۔ وہ عورت کنواری رہی اور یوم حشر سے پہلے کسی کو اس کی تقدیس پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں ہوگی۔“

”شادو میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“

”اور تم خود کو دیکھو...... تمہاری اگلی پچھلی نسلوں کو ذلت کے سوا کیا ملا۔ اب میں اپنی اولاد کے لیے اس دنیا سے سب کچھ چھین لوں گی، عزت بھی...... عیش آرام بھی...... اور تم کو میرا ساتھ دینا ہے، ورنہ میں قتل کردوں گی تمہیں...... آئی سمجھ میں میری بات......“

اصغر نے ہمیشہ کی طرح گھڑے جیسا سر ہلایا۔ رات کو شادو اس سے چمٹ کر روتی رہی...... اصغر اسے چمکارتا رہا۔

”رومت شادو...... میں تیرے ساتھ ہوں۔“

اگلے دن اتفاق ایسا ہوا کہ اذان دینے والا نوجوان بیمار پڑ گیا۔ اصغر نے اجازت طلب کی اور اذان دی تو اس کی آواز کا لحن دور دور تک جس کے کانوں میں پڑا اس کے لبوں سے بے اختیار ”سبحان اللہ“ نکلا۔ کسی مطالبے یا حجت کے بغیر اذان دینے کی پنج وقتہ ذمے داری اصغر کو سونپ دی گئی۔ خود اس موذن نے برا نہیں مانا جس سے یہ اعزاز چھن گیا تھا۔

آہستہ آہستہ شادو کی ہدایات پر اصغر نے مسجد کے انتظامی امور میں ”بہتری“ کے لیے اقدامات پر توجہ دی۔ مسجد کی کچھ بنیادی ضروریات کے طور پر نئی صفیں بچھانے کا کام شروع ہوا جو قالین کی طرح تھیں، لائٹس بدل گئیں...... نیا اسپیکر سسٹم آیا، وضو خانے میں ٹائل اور نئی چوکیاں، ٹونٹیاں نظر آئیں۔

ظاہر ہے اس سے مسجد کے حسن اور شان و شوکت میں اضافہ ہوا۔ اس کے لیے چندے کی اپیل پوسٹرز اور بینرز کی صورت میں کی گئی اور مسجد کے دروازے پر چندے کا مقفل صندوق بھی رکھ دیا گیا۔ خود پیش امام صاحب کے لیے ان امور کی نگرانی ممکن نہ تھی۔ اصل انتظام اصغر کے ہاتھ میں آیا۔ اس نے تمام عطیات ایک ہاتھ سے لے کر امام صاحب کو دیے تو دوسرے ہاتھ سے اخراجات وصول کرلیے......

چندے والی تجوری کے تالے کی ایک ہی چابی تھی جس سے مولوی صاحب خود ہی ہر جمعے کو رقم نکالتے تھے اور اصغر اسے شمار کر کے اس کا اندراج کرتا تھا۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ تجوری کی دوسری چابی اصغر کے پاس ہے۔ وہ رات کے وقت اتنی رقم نکال لیتا تھا کہ جمعے کا اوسط خراب نہ ہو، اس میں نامعلوم مخیر حضرات پانچ ہزار بھی ڈال گئے۔ کئی مرتبہ اصغر کو بیرر چیک ملے جو اس نے مختلف بینکوں سے کیش کرائے۔

شادو نے اصغر سے پیسا پیسا رکھوالیا اور ساری رقم بہت دور شہر کے ایک بینک اکاؤنٹ میں جمع ہوتی چلی گئی۔ اکبر کی پیدائش تک مسجد عملاً اصغر کے انتظام میں آچکی تھی اور اس کی ظاہری خوبصورتی سے زیادہ اندرونی آرائش نے لوگوں پر بڑا اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ علاقے میں پانی اور بجلی کے بعد گیس کی لائن پڑی تو آبادی بھی تیزی سے بڑھی۔ مکانات بننے کی رفتار میں اضافہ ہوگیا اور خالی پلاٹ کم ہونے لگے۔ اس موقعے پر شادو نے اصغر کو توسیع کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اتفاق سے مسجد کے ایک طرف پلاٹ ابھی خالی تھا اور دوسری طرف صرف چار دیواری بنا کے چھوڑ دی گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک کے مالک کی وفات ہوچکی ہے اور اس کی دو بیویوں کے اور ان کی اولادوں کے درمیان وراثت کی جنگ چل رہی ہے لیکن انہیں اس مضافاتی بستی کے پانچ مرلہ والے پلاٹ کا علم ہی نہیں تھا۔ وہ لاہور میں سمن آباد کی ایک کوٹھی اور والٹن کی طرف ایک پولٹری فارم کی تقسیم پر مقدمے بازی میں مصروف تھے۔ شادو نے بہت سوچ سمجھ کے دوسری بیوی کا انتخاب کیا جو زیادہ لالچی تھی اور جس کی ابھی صرف ایک اولاد تھی۔ ایک ایجنٹ کی معرفت فروخت کے معاملات طے پائے اور وہ پلاٹ کو مسجد کے نام پر وقف کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس نے نصف قیمت کو بھی لالچ میں بہت سمجھا۔ ڈراسے یہ تھا کہ پہلی بیوی کو پتا نہ چل جائے۔

دوسرے پلاٹ کے مالک پر مسجد کمیٹی نے جس کا سربراہ اصغر تھا، اخلاقی دباؤ ڈالا کہ وہ پلاٹ مسجد کے لیے وقف کردے اور ثواب دارین حاصل کرے۔ دلائل سے شاید وہ قائل نہ ہوتا لیکن اس کی عمر رسیدہ ماں نے کہا کہ مسجد کا نام اس کے مرحوم شوہر فاروق کے نام پر مسجد فاروق رکھا جائے تو وہ پلاٹ وقف کیا جاسکتا ہے۔ یہ شرط منظور کرلی گئی اور چند مہینوں میں مسجد کے رقبے میں تین گنا اضافہ ہوگیا۔

اگلے چار سال میں مسجد کی توسیع ہوئی۔ تعمیر کے لیے سریے سیمنٹ کا عطیہ حاصل کرنے کے لیے بھی مہم چلائی گئی۔

ہر جمعے کے خطبے کے علاوہ دونوں عیدوں پر نمازیوں سے جذباتی اپیل نے بہت کام کیا۔ بجلی کے سامان سے ٹائلوں اور کھڑکی دروازوں کی فراہمی تک کارِ خیر اور ثواب دارین کے جذبات کو خوب ابھارا گیا۔ سارے معاملات کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی ضرور تھی مگر اس میں عمداً وہ لوگ شامل کیے گئے تھے جو صرف نماز جمعہ میں باقاعدگی سے آتے تھے لیکن عشا میں بھی پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ سب مصروف لوگ تھے جو ہر جگہ ہر وقت موجود نہیں رہ سکتے تھے اور انہیں مولانا اصغر حسین کی انتظامی صلاحیت پر بھی اتنا ہی اعتماد تھا جتنا ان کی ایمانداری پر......

اصغر نے زبان خلق سے بچنے کے لیے حساب کتاب ضرور رکھا لیکن اس طرح جیسے انکم ٹیکس سے بچنے والے رکھتے ہیں۔ مسجد کے پیش امام بھی بہت خوش تھے کہ شاہدہ جیسی بیٹی اور اصغر جیسے داماد نے انہیں اتنی شاندار مسجد بنا دی جو اب جامع مسجد کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ عید بقر عید پر اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہتی تھی اور نمازیوں کے لیے چھت پر صفوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

اللہ کے گھر کے حساب کتاب میں غبن پر اصغر کے ضمیر نے ابتدا میں کچھ احتجاج کیا تھا۔ پھر وہی ہوا جو دولت مندی کے دنیاوی احساس غرور میں ہوتا ہے...... اسے نہ احساس گناہ کی پشیمانی رہی اور نہ احساس جرم کی پریشانی...... شادو کا پڑھایا ہوا سبق پرانا ہوچکا تھا، یہ سبق پڑھنے والا اب خود استادوں کا استاد تھا۔

تجربے سے اصغر کو اندازہ ہوگیا کہ صرف وہی نہیں، مسجد کو ذاتی جاگیر بنانے والے ہر جگہ مصروف عمل ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے فرقے کے عقائد کو فروغ دینے کے لیے قلعہ بندی کررہے تھے تو کچھ دوسروں کے سیاسی مفادات کے لیے مسجد کو استعمال کرتے تھے۔ طریقۂ کار ہر جگہ ایک ہی تھا۔ غاصبانہ قبضہ شرعاً ناجائز سہی۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ قانون کی مدد سے کسی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کو شہید کراسکے یا اس کے خلاف مہم بھی چلا سکے۔

اب کسی کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عام یقین یہی تھا کہ شادو اس مسجد کے پیش امام کی بیٹی ہے اور مولانا اصغر ان کے داماد ہیں جو انہی کے گھر میں رہتے ہیں۔ شادو نے جذباتی کمزوری کے ایک لمحے میں پیش امام صاحب سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ گھر کو اس کے نام کر جائیں گے اور پھر ایک روز قانونی دستاویزات ان کے سامنے رکھ دیں تو انہوں نے دستخط کرتے ہوئے ذرا بھی برا نہیں منایا۔ ان کی اپنی

اولاد اور بیوی کا فر ملک امریکا کی شہری بن چکی تھی اور اس تعلق کی دنیاوی حیثیت ختم ہوچکی تھی۔ شاہدہ نے تو پرائی ہونے کے باوجود اپنایت کا حق ادا کردیا تھا۔

شادو کے لیے اس بستی میں شان و شوکت کی زندگی گزارنا مشکل تھا۔ وہ بڑے صبر کے ساتھ پیش امام صاحب کی رحلت کا انتظار کررہی تھی۔ یہ کار خیر وہ خود بھی کرا سکتی تھی مگر اس نے رسک لینے سے گریز کیا اور انتظار کرتی رہی کہ عزرائیل خود ہی وقتِ مقررہ پر انہیں لے جائے تو اصغر اس منافع بخش کاروبار کو سنبھال لے جس میں وہ دہرا فائدہ تھا جو شاید دنیا کے کسی اور بزنس میں نہیں تھا یعنی دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی...... ہم خرما و ہم ثواب...... فکر اسے اکبر کی تھی جو اب اسکول میں داخلے کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ یہاں کوئی ٹاپ کلاس انگلش میڈیم اسکول نہیں تھا جس میں اپر کلاس کے او لیول کو ٹارگٹ بنا کے آتے ہیں۔ اب وہ اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی جس میں اس کے لیے کوئی چارم نہیں رہ گیا تھا۔ اب وہ اس قابل ہوچکی تھی کہ زندگی کی جن خوشیوں سے اب تک محروم رہی تھی وہ حاصل کرسکے اور اپنے بیٹے کو وہ زندگی دے سکے جس کے خواب تو سب دیکھتے ہیں مگر تعبیر ہر ایک کو نہیں ملتی۔

اس سے پہلے کہ ایسا وقت آتا حالات کے دھارے کا رخ پلٹ گیا۔ وہ عید میلادالنبیؐ کے مبارک موقعے پر ہونے والا جلسہ تھا جس میں ہمیشہ کی طرح اصغر نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ وہ جگنی کو بھول چکا تھا۔ وہ اور قسم کا مجمع ہوتا تھا جو اس پر رقص کرتا تھا، یہاں ایک مختلف اجتماع تھا جس میں روحانیت میں ڈوبے ہوئے لوگ وجد میں آتے تھے۔ اس نے اپنی حمد و نعت سے سماں باندھ دیا اور نصف شب کے بعد تعریف و توصیف سے نوازنے والے رخصت ہوگئے تو ایک شخص جو پہلی صف میں موجود تھا اٹھ کے اصغر کے سامنے آگیا۔

اصغر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”جی فرمائیے۔ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

اس نے سر ہلایا اور پلک جھپکائے بغیر اصغر کو گھورتا رہا۔ ”تم اصغر میراثی ہونا......؟“

اگر وہ پیچھے سے اس کے کان کے قریب فائر کردیتا تب بھی اصغر کا دماغ صدمے سے یوں سن نہ ہوتا۔ وہ یوں منجمد ہوگیا جیسے اسے ہزاروں وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

اس کا مخاطب معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”اب مجھے تمہاری زبان سے کسی اعتراف جرم کی ضرورت نہیں...... تمہاری حالت بتاتی ہے کہ میں نے تمہیں پہچاننے میں کوئی

www.Paksociety.com

غلطی نہیں کی۔''

اصغر نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ ''کون ہو تم......؟''

''رازداں...... واقف حال...... نقاب کشا...... میرے نام سے کیا فرق پڑتا ہے، مولانا اصغر حسین شاہ...... تم ہمارے گاؤں کے پیش امام کی لڑکی کو بھگا لائے تھے۔ چودھری صاحب اور شاہ جی دونوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے......''

''دیکھیے یہ بہتان ہے۔ پیش امام صاحب نے شرع کے مطابق میرا نکاح کیا تھا۔'' اصغر کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ ''میں حلف بھی اٹھا سکتا ہوں لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ آیئے میرے گھر میں میری بیوی سے خود تصدیق کرلیجیے۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اگر واپس جا کے میں چودھری صاحب کو یا شاہ جی کو بتا دوں کہ میں نے ان کے مجرم کو تلاش کرلیا ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ...... آپ مجھے بلیک میل کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ کون سا جرم کیا ہے میں نے آخر......؟''

اب یہ کون طے کرسکتا ہے کہ اس کے بعد جو کچھ ہوا ایک حادثہ تھا۔ وہ انتہا تھی جہاں ظالم کی دراز ہونے والی رسی ختم ہوجاتی ہے اور بعض اوقات پھانسی کا پھندا بن کے اسی کے گلے میں فٹ ہوجاتی ہے یا محض اتفاقات کا سلسلہ......

اس شخص نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ ''پتا لگ جائے گا میراثی دے پتر......''

اصغر اپنے اوپر نازل ہونے والی آفت ناگہانی سے شدید خوف اور دہشت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ ایک وحشی درندہ بن گیا تھا جو محصور ہوجائے تو فرار یا دفاع کی کوشش کو لاحاصل جان کے حملہ کرکے مرنے مارنے کی حکمت عملی اپناتا ہے۔ پھر اچانک لائٹ چلی گئی۔ صحن میں جہاں سیکڑوں بلب روشن تھے یکلخت ایسا گھپ اندھیرا مسلط ہوگیا جس کا موازنہ قبر کے اندر کی تاریکی سے کیا جاسکتا تھا...... مگر قبر ایک تھی۔

یہ کس کی قبر ہوگی؟ اس کی اپنی یا دشمن کی...... اس سوال کا جواب اصغر بھی اپنے خلاف کیسے دیتا۔ پلک جھپکنے میں اس نے دشمن کو دبوچ لیا جو اس ردعمل کے لیے تیار ہرگز نہ تھا۔ اپنی دانست میں اس نے تو صرف پتھر اٹھایا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جواب میں دست اجل اس پر قضا کا تیر چلا دے گا۔ وہ بے خبری یا بے وقوفی میں مارا گیا۔

داؤ پیچ سے واقفیت اور جسمانی طاقت میں برتری کے علاوہ اس کے اندر اچانک انگڑائی لینے والی حیوانی قوت اصغر کے کام آئی۔ اس نے اپنے حریف کو یوں دبوچا کہ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ اسے کھینچ کر اندر لے گیا جہاں منبر کی سنگ مرمر سے بنی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ اس نے بالوں سے پکڑ کے اس کا سر اس پر مارا تو ایک کونے کی سخت دھار نے ہڈی کو پاش پاش کردیا۔ سفید سنگ مرمر پر خون کی لالی سے گلکاری ہوگئی اور اس کے نوکیلے کونے سے مرنے والے کا مغز ٹپکنے لگا مگر یہ سب اصغر نے اسے چھوڑنے کے بعد بھی نہیں دیکھا تھا۔

بجلی جیسے اچانک گئی تھی ایسے ہی بروقت لوٹ آئی۔ تاریکی کا یہ وقفہ کتنا لمبا تھا۔ اصغر کو اس کا اندازہ نہ ہوا...... ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے تو یہ بھی پتا نہ چلا کہ مرنے والے نے اپنے حلق سے موت کے کرب میں جو فریاد بلند کی تھی وہ کہاں تک سنی گئی تھی۔ اچانک بجلی آنے پر اس نے دیکھا تو ایک لاش اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ مسجد کا منبر اس کے خون کی گواہی دے رہا تھا۔ لہو اصغر کے ہاتھوں پر ہی نہیں لباس پر بھی اعتراف جرم کی تحریر بنا ہوا تھا اور نہ جانے کیسے وہاں نمودار ہوجانے والے پیش امام صاحب مجسم سوال بنے اصغر کو اپنی وحشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پیش امام صاحب جلسے کے بعد صفوں کو لپیٹ کر رکھنے والوں کی نگرانی کر رہے تھے جو ادھر ادھر پھیلا ہوا دوسرا سامان بھی سمیٹ رہے تھے۔ یہ سب محلے کے نوجوان لڑکے تھے جو ہر تقریب میں اپنی توانائی کو اس جذبے کے ساتھ بروئے کار لاتے تھے۔ پیش امام صاحب قریب ہی ایک ستون کی اوٹ میں کرسی ڈالے بیٹھے تھے اور مرنے والے کی آخری چیخ سن کر لپکے تھے۔

اصغر کی عقل اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس پر دیوانگی کا غلبہ تھا۔ ایک چشم دید گواہ کو ختم کرنے میں اسے کوئی دیر نہیں لگی۔ پھر اس نے دونوں لاشوں کو منبر کے پیچھے کیا اور وہ دروازہ کھولنا چاہا جس کے پیچھے مختصر سے قطعہ زمین پر جنازے رکھے جاتے تھے۔ محراب کا دروازہ کھول دیا جاتا تھا تو مسجد کے اندر صف بستہ لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوجاتے تھے مگر اس وقت دروازہ مقفل تھا۔ قفل صرف ضرورت کے وقت کھولا جاتا تھا۔

اصغر پلٹا اور باہر نکلنے کی کوشش کی مگر پیش امام صاحب کو غیر موجود پا کے دو لڑکے ہدایات لینے کے لیے نمودار

ہوگئے...... انہیں صورت حال کی سنگینی کو سمجھنے میں دیر ضرور لگی مگر اتنی بھی نہیں کہ قاتل کو مسجد کا صحن عبور کرکے فرار ہونے کا موقع مل جاتا...... انہوں نے ''پکڑو...... پکڑو'' کا شور مچایا تو آگے والوں نے اصغر کو روک لیا۔

ایک قنات لگا کے صحن کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا تاکہ عید میلادالنبیؐ کے جلسے میں پردہ دار خواتین بھی شریک ہوجاتیں۔ شادو اس قنات کے پیچھے اکبر کے ساتھ تھی...... مگر خواتین کو اس نے مبارکباد وصول کرتے ہوئے رخصت کیا ہی تھا کہ چیخ پکار کی آوازوں نے اسے متوجہ کرلیا۔ اس نے اصغر کے پکڑے جانے کا پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یہ جاننے میں اسے کوئی دیر نہیں لگی کہ اصغر کیا جرم کرکے فرار ہو رہا تھا۔

بقا کی جبلت نے ایک منٹ میں شادو کے حواس اور اس کی عقل کا ایکسی لریٹر دبا دیا۔ وہ اکبر کو لے کر بھاگی اور تیر کی طرح اپنے کوارٹر میں پہنچی۔ اس نے بڑی عجلت میں اپنا اور اکبر کا ضروری سامان اور تمام اہم دستاویزات سمیٹ کر ایک سوٹ کیس پیک کیا۔ اس کے لیے نہ سوٹ کیس کو اٹھا کے لے جانا ممکن تھا اور نہ سڑک تک جا کے کوئی رکشا یا تانگا لانا...... لیکن اس کا شاطر ذہن کام کر رہا تھا۔ اس نے اندازہ کیا کہ پولیس کس سمت سے آئے گی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اکبر کو تھاما اور دوسرے سے سوٹ کیس کو گھسیٹ کر مخالف سمت میں لے گئی۔ یہ ٹرالی بیگ تھا جس کا ہینڈل باہر نکل آتا تھا اور اس کے نیچے پہیے تھے۔

سو گز دور جا کے اس نے ایک دروازے پر نصب گھنٹی بجائی۔ وہاں مشتبہ کردار کا ایک شخص رہتا تھا جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کرتا کیا ہے۔ اس کی کوئی فیملی نہیں تھی لیکن اس کی گاڑی میں سے اتر کے اندر جانے والی خواتین کو کئی لوگوں نے دیکھا تھا جن کو وہ اپنی رشتے دار بتاتا تھا۔ شادو کو بھی...... ہر عورت کی طرح اندازہ تھا کہ غلام محمد کی نظر اس پر کیسے پڑتی ہے اور کیا کہتی ہے۔ اسے بھی کسی نے مسجد میں قدم رکھتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ جب مسجد میں حضور علیہ السلام کی ولادت باسعادت کی مبارک تقریب جاری تھی تو وہ خواب غفلت میں تھا۔

اچانک شادو کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ شادو نے روتے ہوئے سخت پریشانی کے ساتھ کہا کہ اس کے شوہر کے بارے میں اسے ابھی اطلاع ملی ہے کہ وہ حادثے میں شدید زخمی ہوئے ہیں اور انہیں گنگا رام اسپتال لے جایا گیا ہے۔ اس وقت تانگا، رکشا دستیاب نہیں...... کیا وہ اسے اسپتال پہنچا سکتا ہے۔

غلام محمد نے ایک خوبصورت عورت کی مدد کے جذبے کا مظاہرہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اللہ نیکی کا اجر دیتا ہے۔ کیا پتا آج کی نیکی کل اس کے التفات کا صلہ بن جائے...... اور اس سے بھی بڑھ کر...... کیا پتا وہ دڑھیل صوفی جو کسی طرح بھی ایسی حسینہ کا مجازی خدا ہونے کا ذرا بھی مستحق نہ تھا، اللہ کو پیارا ہوجائے تو......

سوچے سمجھے بغیر غلام محمد نے کار نکالی اور گنگا رام اسپتال کے سفر پر روانہ ہوگیا...... سوٹ کیس کو اس نے فرض کرلیا کہ اسباب ضرورت ہوگا جو اسپتال میں درکار ہوگا۔ وہ ہمدردی کے جذبات کا مزید مظاہرہ کرنے کے لیے کار پارک کرنے گیا تو شادو کو گیٹ پر اتار گیا کہ میں ابھی آتا ہوں، گھبرانا مت...... پیچھے ایک ٹیکسی آ کے رکی جس میں کسی مریض کو لایا گیا تھا، شادو نے اپنا سوٹ کیس اس میں رکھا اور ڈرائیور کو ایک پتا دیا۔

صبح تین بجے وہ مولا داد کے ماما کو رو رو کے اپنی بپتا سنا رہی تھی۔ ''مجھے بس دو چار دن کا آسرا چاہیے، پھر میں بندوبست کرلوں گی، تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور نہ ذمے داری...... اصغر کو سزائے موت سے میں خود بچالوں گی۔''

سانحہ رات کو دیر سے اس وقت پیش آیا تھا جب صبح شائع ہونے والے اخبارات کی آخری کاپی پریس میں چلی گئی تھی مگر سہ پہر تک اس دہرے سنسنی خیز قتل کی خبر خصوصی ضمیموں کے ذریعے سارے لاہور میں پھیل چکی تھی۔ ہر اخبار نے اس جنونی قاتل کی زنجیر بکف تصویر بھی چھاپی تھی جس میں وہ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے نظر آ رہا تھا، ایسی مبارک رات میں مسجد کے اندر ایسی گھناؤنی واردات کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف عوام کا اور مذہبی تنظیموں کا شدید ردعمل سامنے آیا تھا۔ ہر شخص مطالبہ کر رہا تھا کہ اصغر کو چوک میں پھانسی دی جائے۔

شادو بروقت فرار ہوگئی تھی، چند گھنٹے بعد ہی اشتعال کے جنون میں مبتلا ایک گروہ نے اس کے گھر کو تہس نہس کردیا تھا۔ خود مولا داد کا ماما بہت ڈرا ہوا تھا کہ کہیں شادو کی اس کے گھر میں موجودگی کا راز افشا نہ ہوجائے۔ اس نے گاؤں سے مولا داد کو بلا بھیجا۔ وہ شادو کے حق میں فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔

اس نے بڑے بھائی کی طرح شادو کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دی۔ ''تو فکر ہی نہ کر...... تیرا بھائی تیرے ساتھ ہے...... اللہ نے چاہا تو ہم اصغر کو بھی بچالیں گے، تیری طرف

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

تو کوئی آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا۔“

”بھائی مولا داد...... پیسے کی فکر نہ کرنا، سب سے پہلے میرے رہنے کا ٹھکانا کرو...... پھر ہم کوئی بہت اچھا وکیل کریں گے، اصغر کی ضمانت کے لیے۔ پولیس سے پہلے معاملہ طے کرو، وہ جتنی رشوت مانگتے ہیں میں دوں گی، پھر وکیل کی فیس بھی...... میں ہر فیصلے کے خلاف اپیل کروں گی۔ ہائی کورٹ میں...... سپریم کورٹ میں......“

مولا داد ان معاملات میں شاطر ذہن نہیں رکھتا تھا مگر اس نے ایک بندہ تلاش کرلیا، جو پولیس کے تمام معاملات طے کرا سکتا تھا۔ پہلا سودا آسان تھا۔ ملزم کے اعتراف جرم اور متعدد چشم دید گواہوں کی موجودگی میں تفتیش بے معنی تھی۔ اصغر کو بلاوجہ کے تشدد سے بچا کے آرام اور سہولیات فراہم کرنے کا بھاری معاوضہ بھی پولیس نے اس لیے وصول کیا کہ ان کے مطابق معاملہ ”حساس“ نوعیت کا تھا اور ان کی نوکری کے ساتھ جان بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

شادو کا اکاؤنٹ تین مختلف بینکوں میں تھا۔ پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اصغر سے کراس چیک سائن کرائے اور تمام رقم اپنے ایک ہی اکاؤنٹ میں منتقل کردی جو سمن آباد میں تھا۔ پھر اس نے گھر تلاش کیا اور سمن آباد میں اوپر کی منزل کے دو کمرے کرائے پر لے لیے۔ مالک مکان سعودی عرب میں مقیم تھا چنانچہ شادو کو آتے جاتے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔

ایک ہفتے بعد وہ اپنے گوشۂ گمنامی میں سیٹل ہو چکی تھی کہ مولا داد اسے ایک ایجنٹ سے ملوانے لے گیا جو بہت کچھ کرنے کا دعویدار تھا اور...... انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں دور تک تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے صاف بتایا کہ قانون کا راستہ خطرناک ہے۔ اس پر بھروسا کیا تو اصغر ایک دن تختہ دار پر کھڑا نظر آئے گا۔

”لاقانونیت کا راستہ مہنگا مگر محفوظ ہے۔“ اس نے کہا۔

”کتنا مہنگا اور کتنا محفوظ......؟“ شادو نے پوچھا۔

”لو بہن جی...... ابھی کیس عدالت میں نہیں گیا، چالان پیش ہوگا سیشن کورٹ میں، ضمانت کا تو سوال ہی نہیں۔“

”ہم اپیل میں جائیں گے......“

وہ ہنسنے لگا۔ ”جہاں مرضی جاؤ، بڑے سے بڑا وکیل کر لو، ہوگا کچھ نہیں۔“

”پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟“ شادو نے بے بسی سے کہا۔

”دیکھو...... پولیس سب کچھ کرسکتی ہے۔ پہلے تو چالان کو لمبا کرے، ریمانڈ لیتی جائے۔ ریمانڈ لینے کی قیمت الگ ہے، وہ جج لے گا...... اس عرصے میں معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، پبلک کے سامنے نئے معاملات آجائیں گے۔ اس درمیان میں گواہوں کو توڑو۔“

”یہ تو بہت مشکل ہے۔“

وہ پھر اپنی مکروہ ہنسی ہنسنے لگا۔ ”آسان تو کچھ نہیں ہوتا بی بی...... اور مفت بھی کچھ نہیں ہوتا۔ پولیس سب کر دے گی، جو ہونا تھا ہوگیا۔ کون پڑتا ہے گواہوں کے جنجال میں، ان کو منہ بند کرنے کی قیمت دیں گے تو وہ خوشی خوشی لیں گے۔ جن کو ضمیر ایمان نے روکا، ان سے پولیس دوسری طرح نمٹنا جانتی ہے۔ ان کے گھر والوں کو دلدل میں کھینچ لیتی ہے۔ کسی کے بیوی بچے، کسی کے ماں باپ یا بھائی بہن، ان کے پرچے کاٹ دیے جائیں تو وہ سچے گواہ کو خود ہی روک لیتے ہیں کہ تیری وجہ سے ہم پھنسے ہیں۔ اپنی زبان بند رکھو...... یہ پہلا مرحلہ شاید دس لاکھ کا ہوگا، گواہ ختم...... گواہ ختم تو کیس ختم، لیکن......“

”لیکن کیا......؟“

”یہ قتل کا عام مقدمہ نہیں ہے...... دہرے قتل کا کیس ہے اور یہ ہوسکتا ہے کہ پیش امام کا کوئی طالب علم...... ان کے پیچھے نماز پڑھنے والا یا کوئی بندہ جس کو ایمان عزیز ہو اور ضمیر تنگ کرے، اسے یہ آزمائش لگے اور وہ استقامت کو امتحان سمجھ کے اڑ جائے۔ ویسے تو ہر بندے کی ایک قیمت ہوتی ہے، کم یا زیادہ...... مگر کیا پتا، کچھ لوگ اس پر سیاست کریں...... پوسٹر لگائیں، جلوس نکالیں...... بیان دیں...... کیا تمہیں معلوم ہے بعد میں وہاں کیا ہوا...... مسجد میں......“

”ہاں...... سنا ہے اور کوئی آگیا ہے۔“

”آیا نہیں...... لایا گیا ہے، مخالف سیاسی گروہ کے ملا جو عقیدے کا اختلاف بھی رکھتا ہے۔ یہ طاقتور لوگ ہیں اور کبھی نہیں چاہیں گے کہ اصغر باعزت رہا ہو کے واپس آئے اور اپنی پرانی پوزیشن پر بحال ہو جائے۔ دس ان کے بھی رکھ لو۔“

”یہ تو اب مشکل ہے...... کہ اصغر واپس جاسکے۔“

”ہاں ہے تو مشکل...... لیکن ان کی کوشش تو ہوگی کہ اس کے حامی کچھ بول ہی نہ سکیں، مولانا اصغر حسین سیدھے سیدھے لٹک جائیں تو آئندہ بھی خطرہ کوئی نہ ہو۔“

شادو پریشان ہوگئی۔ ”پھر کیا ہوگا؟“

www.Paksociety.com

انڈر ورلڈ کا ایجنٹ مسکرایا۔ ''اپن کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک کارڈ ہے۔ ایک بہت مہنگا والا ہے مگر پکا......''

''کتنا مہنگا......؟''

''کوئی تیس لاکھ والا...... سیدھا جج کی جیب میں...... یہ نیا آیا ہے، اوپر سے بہت سخت بنتا ہے مگر ہم اندر کی بات جانتا ہے۔ وہ بری نہیں کرے گا تو عمر قید......''

''عمر قید......'' شادو نے گھبرا کے کہا۔

''گھبراتا کیوں ہے، چودہ سال کا مطلب پانچ سال...... زندگی تو بچ گیا نا...... اندر جیل میں رعایت ملے گا کیونکہ عالم لوگ ہے۔'' ایجنٹ نے اپنا لب ولہجہ بدل لیا۔ ''سیشن کے خلاف پراسیکیوشن اپیل میں نہیں جائے گا، ہمارا گارنٹی...... ہائی کورٹ کو نہیں بولے گا کہ اس کو ضرور پھانسی دو...... پراسیکیوشن کو راضی کرنے کے رکھو دس......''

شادو پریشان ہوگئی۔ ''یہ تو پچاس سے بھی زیادہ ہوگئے۔''

ایجنٹ بہت کائیاں آدمی تھا۔ ''زیادہ ہے تو بابا جانے دو۔ پیسا بچاؤ...... کام آئے گا دوسرا شادی بنا لینا...... ابھی تم جوان ہے، خوبصورت ہے، اس مولوی کے مقابلے میں ایک سے بڑھ کر ایک ملے گا۔''

شادو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''خدا کے لیے ایسا مت کہو، اس بچے کا باپ ہے وہ......''

ایجنٹ کچھ دیر شادو کو دیکھتا اور سوچتا رہا۔ ''ایک ترکیب اور ہے، کورٹ کچہری سب چھوڑو...... مولانا صاحب کو لے کر غائب ہوجاؤ۔''

''وہ کیسے...... کوئی جادو ہے؟''

''جادو سب پیسے کا ہے بابا...... پیسا دو اور دنیا کی مارکیٹ سے جو چاہو لو۔ خوبصورت عورت...... بڈھی گھوڑی کے واسطے لال لگام، ایک دم سچا پیار...... ایم اے، پی ایچ ڈی کا ڈگری...... زندگی یا موت، کسی کو مروانا ہو یا بچانا ہو...... سب پیسے کا کھیل ہے۔''

''میں اصغر کو کیسے بچا سکتی ہوں...... یہ بتاؤ۔''

''سنو...... تھانے سے اس کو پیشی کے لیے کورٹ کون لے جائے گا؟ یہی گارڈ...... یہ ملاقات کراتے ہیں پیشی سے پہلے اور بعد میں بھی...... ویسے تو چار بندے جاتے ہیں، ایک بیمار بھی ہوسکتا ہے، ایک کسی وجہ سے لیٹ ہوجائے...... پانچ پانچ لاکھ میں وہ ایسا ہی کریں گے۔ رہ جائیں گے دو، ان کو مل جائیں دس دس تو وہ پیشی سے پہلے باتھ روم جانے کا موقع دیں گے۔ ہتھکڑی ایسے کھولیں گے کہ بند نظر آئے۔ ادھر ہو گاڑی اپنی جو اصغر کو نکال لے جائے...... گارڈ معطل بھی ہوں گے اور گرفتار بھی...... ہوسکتا ہے نوکری سے جائیں، دس دس ان کا حق بنتا ہے...... مگر خرچہ دیکھو تو آدھا، صرف پچیس میں صوفی صاحب فورا فری...... آگے تمہارا کام، ایسے غائب ہوجاؤ کہ کسی کو کبھی نظر نہ آؤ۔ اتنا بڑا ملک ہے، کراچی بھاگ جاؤ۔ ادھر پانی والا سمندر سے بڑا انسانوں کو سمندر ہے...... اس میں گم ہوجاؤ...... نام، ولدیت، شناختی کارڈ، حلیہ...... سب بدل لو...... بہت آسان ہے اور مال ہے تو ملک سے ہی نکل جاؤ...... عیش کرو......''

شادو نے امکانات پر غور کیا۔ ''یہ تو بہت مشکل ہے۔''

''دیکھو بی بی...... ہم جھوٹ بول کے جھوٹا دلاسا دینا نہیں جانتا۔ یہ واقعی مشکل ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ پھر پکڑا جائے...... کسی کی مخبری پر یا اپنی غلطی سے، اشتہاری تو وہ ہوجائے گا۔ ہر تھانے میں اس کا فوٹو جائے گا۔''

شادو کے لیے کچھ بھی طے کرنا مشکل تھا۔ اس کا اپنا دماغ جس کی شاطری پر اسے بڑا ناز تھا، اب ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس کا واحد مشیر مولا داد تھا۔ اس نے تھانہ کچہری کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے سب ہی کو دیکھا تھا مگر خود کبھی ایوان انصاف کی غلام گردشوں میں خوار نہیں ہوا تھا۔ باقی سب نظام عدل کے ٹاؤٹ تھے۔ وہ گدھ جو ہر شکار پر منڈلانے آجاتے تھے۔ وہ تاڑ گئے تھے کہ شکار ایک عام گھریلو قسم کی عورت ہے جس کی پہلی بدقسمتی یہ ہے کہ دولت مند ہے۔ دوسری یہ کہ خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہے اور تیسری یہ کہ شوہر سے وفاداری کو اپنا ایمان سمجھتی ہے ورنہ اسے بچانے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے سے تو بہتر تھا کہ اس کے لٹکائے جانے کا انتظار کرتی۔ صبر سے چار ماہ دس دن عدت کے گزارتے ہی اپنی پسند کا شوہر خرید لیتی۔ اتنے پیسے کے ساتھ تو اسے خط غلامی لکھ کر دینے والے فلمی ہیرو بھی مل جاتے۔

ایسے سب لٹیرے اپنے چہروں پر خلوص اور ہمدردی کے نقاب ڈال کر شادو کا گھیراؤ کرنے آگئے۔ مولا داد کہاں تک اس کا ساتھ دیتا۔ وہ پہلے ہی اپنے علاقے میں مجرم کا مددگار ثابت ہوچکا تھا اور خطرے میں تھا۔ دوسری طرف اس کی اپنی بیوی کو یقین آچکا تھا کہ بھائی بن کے وہ شادو کے دل میں جگہ بنا رہا ہے ورنہ درحقیقت وہ پہلے سے اس پر فریفتہ ہے اور شاید کیا یقینا ایک دن وہ بیوہ سے شادی کو سنت قرار دے کر شادو کو گھر لے آئے گا۔

مولا داد بھی شادو کا ساتھ چھوڑ گیا تو شادو بڑی آسانی

سے لٹ گئی۔ پولیس کے اور عدالتی اہلکار جھوٹے حیلوں، بہانوں اور وعدوں کی قیمت وصول کرتے رہے۔ انہوں نے کسی گواہ کو منحرف نہیں کیا۔ کچھ خود ہی گواہی کے چکر سے دور رہے مگر چشم دید گواہوں نے جو دیکھا تھا عدالت کو بتا دیا۔

جب یہ بات یقینی ہوگئی کہ جج کا فیصلہ سزائے موت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تو مایوس اور دل شکستہ شادو نے آخری داؤ پر پیسے لگا دیے۔ اس نے پیشی کے موقعے پر اصغر کو فرار کرانے کی قیمت ادا کردی اور باقی زندگی کے لیے شناخت بدل کے گمنام رہنے کا طے کرلیا۔ سب کچھ ہارنے سے جیتنے کی امید میں بازی کھیلنا بہرحال بہتر تھا۔

ایک خوف تھا جو دن رات آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتا تھا اور خوابوں میں بھی اسے وہ دہشت ناک مناظر دکھاتا تھا جو اس کے اعمال کی سزا تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے گناہ کیا تھے اور جرائم کیا۔ دولت کمانے کے غلط راستوں پر اس نے اصغر کو ڈالا تھا اور وہ دنیا کے نہیں دین کے نام پر چوری کا مرتکب ہوا تھا، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ سزا سے صاف بچ جائے۔ خدا رحمٰن ورحیم ہے تو جبار وقہار بھی ہے۔

جھوٹے آسروں پر شادو نے آخری وار کھیلا اور وہ بھی ہار گئی۔ اصغر کو فرار کا موقع فراہم کرنے کا وعدہ بھی جھوٹا ثابت ہوا۔ اس کام کا معاوضہ وصول کرنے والوں نے اسے موقع ضرور فراہم کیا مگر پھر خود ہی اصغر کو گولی ماردی، جوان کا فرض تھا۔ کہا یہ گیا کہ اصغر کو پولیس کی تحویل سے چھڑا کر لے جانے کے لیے مسلح افراد نے حملہ کیا تھا مگر ملزم کی حفاظت پر مامور نفری نے اسے ناکام بنا دیا۔

اصغر بڑی رسوائی کے ساتھ دفن ہوا۔ جنازے میں شرکت کے لیے کون آتا۔ پرانے گاؤں والے ابھی اس کے دشمن تھے جو اسے اصغر میراثی کے طور پر جانتے تھے اور اس محلے کے رہنے والے بھی جن کے لیے وہ مولانا اصغر حسین شاہ تھا۔ مولا داد کچھ لوگوں کو انسانی ہمدردی کے نام پر لے آیا اور پولیس کی نگرانی میں ایک خیراتی ادارے نے اسے کفن دے کر دفن کرا دیا۔

شادو اس رات اکیلی بیٹھی خون کے آنسو روتی رہی۔ پاس پڑوس میں کسی کو علم ہی نہیں تھا کہ وہ کسی اصغر میراثی یا مولانا اصغر حسین شاہ کی بیوہ ہے۔ اپنی شناخت کو اس نے سب سے چھپائے رکھا تھا۔ مالک مکان سعودی عرب میں مقیم نہ ہوتے تو شاید وہ اکیلی اس گھر میں رہ بھی نہ پاتی۔

اکبر ماں کو چپ کراتے اور خود بھی روتے روتے بالآخر سو گیا تھا۔ اس وقت اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے یہ فون نمبر کسی کو نہیں بتایا تھا۔ مالک مکان نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ چاہے تو اسے استعمال کرسکتی ہے لیکن بل ادا کرتی رہے۔

اس کے ہیلو کہنے پر کسی نے اپنا تعارف کرائے بغیر بولنا شروع کردیا۔ ''دیکھو شاہدہ بی بی...... ہم تو تمہاری مدد کرنا چاہتے تھے لیکن تم نے ہمارے ساتھ ہی چالاکی دکھائی۔''

شادو نے بدحواسی میں کہا۔ ''کون ہو تم......؟''

وہ بولتا رہا۔ ''ہم نے اصغر کو فرار کرانے کے لیے بڑا خطرہ مول لیا تھا، جو ذمے دار تھے وہ برطرف ہوتے اور جیل بھی جاتے۔''

''مگر انہوں نے اس کی قیمت لی تھی۔''

''اور تم نے ساتھ ہی دوسرے بندے پکڑ لیے کہ حملہ کرکے اصغر کو چھڑا لے جائیں، ان کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی۔''

شادو چلائی۔ ''یہ جھوٹ ہے، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''چھوڑو بی بی...... اب تفتیش ہوگی تو سب سامنے آجائے گا...... اور کون کرسکتا تھا یہ کام تمہارے سوا۔ جب تھانے میں تم کو ننگا کرکے پولیس اپنے طریقے سے پوچھے گی تو تم سب کے نام بتا دو گی، تم جیسی عورت کے لیے ایک رات بھی قیامت کی رات ہوتی ہے۔''

فون بند ہوگیا مگر شادو لرزتی رہی۔ اس کے جسم پر ایسی کپکپی طاری تھی جیسے اسے جاڑا بخار ہونے والا ہے۔ اسے اور کچھ نہیں سوجھا۔ ایک بار پھر اس نے اکبر کے ساتھ فرار کا راستہ اختیار کیا۔ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر نکل گئی۔ اس کے اکاؤنٹ میں اب صرف پانچ لاکھ رہ گئے تھے جو اسے تنکے کا سہارا لگتے تھے۔ اسے وہ بات یاد تھی، کراچی میں ایک پانی کا سمندر ہے، دوسرا انسانوں کا...... اس نے خود کو انسانوں کے سمندر کے سپرد کردیا۔

شادو نے قدرت کی سزا کو اپنا مقدر سمجھ کے قبول کرلیا تھا۔ اپنی عقل اور ہوشیاری کا خمیازہ بھگت لینے کے بعد اس نے خود کو قدرت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ احساس گناہ نے اس کی شخصیت کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ اب اس کا تمام وقت نماز اور تلاوت کے بعد اللہ سے اپنے تمام گناہوں کی معافی مانگتے صرف ہوتا تھا۔ ابھی وقت تھا، توبہ قبول ہوسکتی تھی۔

ایک سیاسی حکومت کا سات سالہ دور ختم ہوا تھا اور ایک اور فوجی حکومت برسر اقتدار تھی۔ تین لاکھ میں شاہدہ کو دو کمروں کا ایک فلیٹ یوسف پلازا میں مل گیا جو اندر سے بھی

www.Paksociety.com

بہت خوبصورت تھا، اس کے لیے اسے نیا شناختی کارڈ بھی بنوانا پڑا۔ اس نے اپنا نام زاہدہ کرلیا مگر شوہر کا نام بدلنے کی اسے ہمت نہ پڑی۔ فلیٹ کی رجسٹری اس کے نام پر ہوگئی۔

اس کے سامنے اب ایک پورا مستقبل تھا، رقم جو کبھی ایک کروڑ کی حد کو چھونے والی تھی، اب ایک لاکھ پر آگئی تھی، ایک لاکھ میں پوری زندگی نہیں گزاری جاسکتی تھی، جب دس برس کے ہوش سنبھالتے بچے کا ساتھ بھی ہو...... شاہدہ کے پاس تعلیم تھی مگر کوئی سند نہیں تھی جو اسے کہیں ٹیچر کی ملازمت دلوا سکتی، اس نے گھر پر ہی بچوں کو قرآن پڑھانا شروع کیا۔ پھر گھر گھر جانے لگی۔ اکبر کو اس نے قریب ہی ایک اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ اردگرد کے لوگوں کو اس نے مجبوراً ایک جھوٹی کہانی سنادی تھی جس سے وہ سب کی ہمدردیاں سمیٹنے کے قابل ہوگئی تھی۔

تاہم ایک تنہائی کا عذاب تھا جو اس کو کھوکھلا کررہا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ قدرت نے اسے زندگی کے لمبے سفر کے لیے جو ساتھی دیا تھا وہ اس کے اپنے گناہوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ وہ ایک سیدھا سادا مخلص انسان تھا جو اس کی محبت میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے سوا کسی کو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے وہ صراط مستقیم پر رکھنا چاہتی تو وہ چلتا مگر وہ خود اپنی ناآسودہ خواہشوں کی اسیر تھی۔ اس نے اصغر کو ان کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ وہ خود جرم و گناہ کی اس زندگی کے آزار سے چھوٹ گیا تھا اور اپنی سزا بھگت چکا تھا۔ ایک وہ تھی کہ گمنامی کے ساتھ تنہائی کی قید کاٹ رہی تھی اور اس جہاں کے بعد دوسری دنیا میں اس کے لیے سخت تر عذاب تھا۔

ایک مسئلہ اکبر تھا، وہ اب اتنا بڑا اور سمجھدار ہوچکا تھا کہ ماں کو سمجھنے لگا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو شاید اسے باقی زندگی کے لیے بھی کوئی ساتھی مل جاتا مگر جب وہ ایسا سوچتی تو اکبر اس کی راہ میں حائل ہوجاتا تھا۔ شروع شروع میں اس کے معصوم ذہن میں اٹھنے والا ہر سوال اس کے لبوں پر آجاتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ خاموش ہوگیا۔ سوال اس کی آنکھیں کرنے لگیں، ہر وقت اور ہر جگہ...... یہ تم کیا کررہی ہو، کیوں کررہی ہو؟...... کس کے لیے کررہی ہو...... وہ وقت پیچھے رہ گیا تھا جب وہ پوچھ سکتا تھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

☆☆☆

اکبر کے لیے اس کی زندگی اپنے ماضی کا ایکشن ری پلے تھی، صرف اس کا انجام مختلف ہونے والا تھا۔ ماں اس کے باپ کے لیے زندگی خرید نہیں سکی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ عورت تھی جو ویسے ہی ناقص العقل اور کمزور ہوتی ہے۔

پھر وہ ایک گاؤں سے آئی تھی اور دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ اسے دیا تھا وہ لوٹانے کے لیے اس نے جس مرد کی رفاقت پر انحصار کیا تھا وہ کسی طرح بھی اس کا ہمسر نہیں تھا۔

مرتے وقت اس کی ماں نے اسے سب کچھ بتادیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ یہ بوجھ قبر میں لے جانا نہیں چاہتی تھی، اکبر نے بہت کچھ دیکھا تھا مگر بہت کچھ اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہوچکا تھا۔ اس عورت کے ساتھ زندگی نے دو بار دغا کی۔ اسے کچھ لوگ یوں بھی سمجھ سکتے تھے کہ اس نے ایک جرم کی سزا دو بار کاٹی۔ یہ انصاف کے اصولوں کے خلاف تھا مگر وہ کہتی تھی کہ میں نے ایک اپنی انتقامی سوچ سے مغلوب ہوکے جرم و گناہ کا راستہ اختیار کیا۔ دوسرے میں نے اصغر میراثی کو مولانا سید اصغر حسین شاہ بناکے اسے بھی اس راستے پر چلایا۔

اس کی دوسری سزا کا زمانہ اس وقت شروع ہوا جب اس کی ناآسودہ خواہشات اور پرتعیش زندگی کے خوابوں کو تعبیر ملنے کا وقت قریب تھا، جو شوہر نہ کرپایا تھا وہ بیٹا کررہا تھا۔ سب کچھ اچانک ہی ہوگیا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ یوں جیسے اچانک لائٹ چلی گئی ہو، چند سیکنڈ بعد روشنی لوٹ آئی اور اس نے یہ بات بھلادی۔ چند دن بعد پھر ایسا ہوا اور ایسا اکثر ہونے لگا تو اس نے اکبر سے ذکر کیا۔

یکلخت اپنے آس پاس تاریکی محسوس کرنے کے ساتھ اسے چکر سے بھی محسوس ہوتے تھے، آخری بار تو یہ ہوا کہ وہ خود کو سنبھال نہ سکی۔ اسے یوں لگا جیسے زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکل گئی ہے۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں گر پڑی۔ ہوش آنے پر بیٹا اسے آنکھوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس کے خیال میں دنیا کا اندھیر ہوجانا بصارت کی خرابی ہی ہوسکتا تھا۔

ڈاکٹر نے قدرے تشویش کے ساتھ اسے دوسرے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا جس نے معائنہ کیے بغیر ہی اکبر کو بتادیا کہ علامات واضح طور پر برین ٹیومر کی ہیں، اس کی ماں کے دماغ میں سرطان کی رسولی بن گئی ہے جسے آپریشن سے نکالا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ وہ تمام زندگی کے لیے اندھی بھی ہوسکتی ہے اور مفلوج بھی...... اگر زندہ رہی۔

سی ٹی اسکین سے صورت حال واضح ہوگئی، رسولی ایسی جگہ تھی کہ آپریشن ناگزیر تھا اور اس کے بچ جانے کے

امکانات بہت کم تھے۔ مرنا اسے آپریشن نہ کرانے کی صورت میں بھی تھا اور زیادہ سے زیادہ تین ماہ بعد...... اکبر نے ایک دن سوچا اور پھر آپریشن کے اخراجات ادا کردیے اور کاغذات پر سائن کردیے، کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر تھا۔

ڈاکٹر نے صرف اپنی فیس کھری کرنے کے لیے آپریشن شروع کیا اور ٹیومر کو چھیڑے بغیر کوشش ترک کردی۔ اس نے اکبر کو صاف بتادیا کہ رسولی بہت پھیل چکی ہے اور اس اسٹیج پر نکالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی جڑیں جسم کے دوسرے حصوں میں نمودار ہوجائیں گی، اس کی ماں کی زندگی مزید مختصر ہوگئی ہے۔ اکبر نے دوسرے بڑے اسپتال سے رجوع کیا۔ یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ ماں کو باہر لے جائے گا لیکن اسپیشلسٹ نے واضح الفاظ میں بتادیا کہ اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوگا، آگے اس کی مرضی......

اکبر نے اور خود ڈاکٹروں نے پوری کوشش کی تھی کہ شادو پر اس کے مرض کی سنگینی ظاہر نہ ہو مگر اس نے اپنی کسی چھٹی حس کی مدد سے بھانپ لیا تھا یا خود عزرائیل نے اس کے کان میں سرگوشی کرکے اپنی جلد آمد کی اطلاع دے دی تھی کہ رازداری کی کوشش رائگاں گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کی پرورش کرنے والوں نے آخری وقت آنے سے پہلے اسے سچ بتادیا تھا کہ وہ اس کے حقیقی ماں باپ نہیں ہیں اسی طرح شادو نے اپنے بیٹے کو وہ سب بتانے کا فیصلہ کیا جو اسے معلوم نہ تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ اکبر کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ہوش سنبھالنے کی کوئی ایک عمر نہیں ہوتی۔ اکبر نے سنگین حقائق کو بہت چھوٹی عمر سے سمجھنا شروع کردیا تھا جب اس کے بارے میں خود شادو یہ سمجھتی تھی کہ وہ بے شعور اور معصوم بچہ ہے اور اس کی عمر کے دوسرے بچے بستر گیلے کرتے تھے۔ ٹافی، ببل گم کے لیے مچلتے تھے اور تتلا کے بولتے تھے۔ جب ماں اسے ایک رات سوتے سے جگا کر کرا اپنے گھر سے فرار ہوئی تھی تو رو رہی تھی اور خاموشی سے اس کی صورت دیکھنے کے باوجود وہ اس کی باتوں سے سمجھ گیا تھا کہ پولیس نے اس کے باپ کو پکڑ لیا ہے، پھر یہ بھی اس کی سمجھ میں آگیا کہ اس کے باپ نے مسجد میں دو آدمی مار دیے تھے۔ جو کچھ اس کے بعد ہوتا رہا وہ اپنے ذہن کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی بار ماں اسے ساتھ لے جانے پر مجبور ہوئی تھی اور وہ دوسروں سے اس کی گفتگو سنتا تھا۔ ایک بار بھی شادو نے اسے تھانے میں یا کچہری میں اصغر سے نہیں ملوایا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے۔

پھر جس دن وہ دوسری بار اکبر کو اپنے ساتھ لے کر اس شہر سے فرار ہوئی تھی تو اکبر نے سمجھ لیا تھا کہ اب اس کا باپ نہیں رہا۔ اسے تمام حقائق کا علم تو نہیں تھا مگر ایک رات اس کی آنکھ کھلی تو ماں رو رہی تھی اور اس نے پوچھ لیا۔ ”ماں...... کیا ابا کو پھانسی ہوگئی۔“ اور شادو کو یہ بات اس کے منہ سے سن کر ایسا شاک لگا تھا کہ وہ رونا بھول گئی تھی۔ ”یہ تم سے کس نے کہا؟“ وہ چلائی مگر دوسرے لمحے اس نے اکبر کو اپنے ساتھ چمٹالیا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

”پھر تم کیوں رو رہی ہو...... مجھے سب معلوم ہے ماں۔“ وہ بولا اور شادو نے محسوس کیا کہ نہ وہ سچ کو جھوٹ بنا سکتی ہے اور نہ اس کا بیٹا جھوٹ کو سچ تسلیم کرسکتا ہے۔ وہ بڑی سختی کے دن تھے، اکبر کو وہ زمانہ یاد آتا تھا جب اسے لاہور کے بہت اچھے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرایا گیا تھا جہاں صاف ستھرے بچے چمکتی دمکتی کاروں سے اتر کے آیا کرتے تھے...... اس نے بھی ماں سے ضد کی تھی کہ وہ رکشا میں نہیں کار میں جائے گا تو اس کی ماں نے پیار سے مسکرا کے کہا تھا۔ ”کیوں نہیں میرے چاند...... بس تھوڑے دن کی بات ہے، ہم بھی ویسی ہی کار لے لیں گے۔“

”اور ہماری بھی بہت بڑی کوٹھی ہوگی، جس میں آپ لان پر میرے ساتھ فٹ بال کھیلیں گی؟“ اس نے پوچھا تھا۔

شادو نے چمکتی آنکھوں سے سر ہلایا تھا۔ ”فٹ بال بھی اور کرکٹ بھی......“

جب کراچی میں اسے علامہ اقبال گورنمنٹ اسکول میں داخل کرایا گیا تو وہاں ہر کلاس میں ساٹھ ستر بچے ٹھونس دیے گئے تھے جو چھوٹی چھوٹی خستہ حال ڈیسکوں پر تین تین بیٹھتے تھے اور کلاس روم کی کھڑکیوں کے ٹوٹے شیشوں سے باہر سڑک کی ٹریفک کے شور کے ساتھ دھواں اور گرد و غبار آتا تھا اور فٹ پاتھ پر فقیر ہیروئن کے نشے میں بے سدھ پڑے رہتے تھے۔

اس وقت اکبر کو گردش حالات کا بخوبی اندازہ ہوچکا تھا۔ اس نے ماں سے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ چمکتی دمکتی کار کہاں گئی اور وہ کوٹھی کہاں گئی جس کے لان پر وہ فٹ بال اور کرکٹ کھیلنے کا وعدہ کرچکی تھی۔ ماں بہت دکھی تھی۔ وہ اکثر روتی تھی اور اس کی صحت بھی خراب ہوگئی تھی۔ اسے خود سے زیادہ ماں کی فکر تھی کہ آخر وہ کیا کرے کہ ماں کے ہونٹوں کی ہنسی لوٹ آئے اور وہ پھر پہلے جیسی ہوجائے۔

www.Paksociety.com

پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا مگر ماں ہر وقت ایک ہی بات دہراتی رہتی تھی۔ ”تجھے پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بننا ہے اکبر......“ پہلے وہ حیران ہوتا تھا کہ بڑا آدمی بننے کے لیے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بڑے تو سب ہی ہو جاتے ہیں۔ ہر بچہ بڑا آدمی بنتا ہے، رفتہ رفتہ ماں کی بات کا دوسرا مطلب اس کی سمجھ میں آنے لگا۔ پھر تیسرا مطلب اس پر وقت اور زندگی کے تجربے نے واضح کیا جو پہلے مطلب سے یکسر مختلف تھا۔ پڑھ لکھ کے یہاں نہ کوئی بڑا آدمی بنا ہے اور نہ بنے گا۔ بڑا وہ ہے جو طاقتور ہے اور طاقت وہ نہیں ہوتی جس سے ایک پہلوان دوسرے کو چت کرتا ہے یا روڈ رولر کو کھینچ لیتا ہے، طاقت پیسا ہے......

یہ سبق اس نے پہلی بار صرف دس سال کی عمر میں سیکھ لیا تھا۔ اس دن پہلے اسے ماسٹر صاحب نے مارا کہ اس کے جوتے اتنے گندے اور پھٹے ہوئے کیوں ہیں۔ کلاس کے بعد ایک لڑکے نے کہا۔ ”جوتے کیا اس کی تو قمیص بھی پھٹی ہوئی ہے۔“ اور ایک سوراخ میں انگلی ڈال کے قمیص کو پیچھے سے نیچے تک پھاڑ دیا۔ سب ہنسنے لگے تو اکبر احساس ذلت اور غصے میں قمیص پھاڑنے والے سے لڑ گیا، وہ زیادہ عمر کا لڑکا تھا۔ اس نے اکبر کو ڈیسک پر دے مارا اور پھر اٹھایا تو ڈیسک سے نکلی ہوئی کیل میں پھنس کر اس کی پتلون بھی پیچھے سے پھٹ گئی۔ لڑکے ہنس ہنس کے دہرے ہوگئے۔ ”ابے اس کی تو ہر چیز پھٹی ہوئی ہے۔“ کسی نے کہا۔

اسے مارنے والے نے کہا۔ ”جو نہیں پھٹی، میں پھاڑ دوں گا۔“

اکبر روتا ہوا بھاگا تو بستہ وہیں رہ گیا۔ وہ گھر گیا تو ماں نے اسے اور مارا۔ تو پڑھنے جاتا ہے یا غنڈا گردی سیکھنے، ایک جوتا نہیں تھا۔ اب قمیص پتلون سب پھاڑ لایا۔ بستہ چھوڑ آیا، میں کہاں سے لاؤں یہ سب؟“

اکبر نے چیخ کر کہا۔ ”مت لاؤ...... میں خود لے آؤں گا۔“ اور گھر سے باہر بھاگ گیا۔ سارا دن وہ یوسف پلازا کے پیچھے والے گراؤنڈ کی ایک بنچ پر بھوکا پیاسا بیٹھا رہا۔ شاید وہ اسے کہاں کہاں تلاش کر رہی ہوگی۔ کتنا رو رہی ہوگی، یہ خیال اسے تسکین پہنچا رہا تھا وہ رات تک اسی جگہ بیٹھا رہا اور باغیانہ خیالات اس کے وجود میں طوفان اٹھاتے رہے۔

اچانک ایک شخص اس کے پاس آبیٹھا۔ وہ دبلا پتلا اور لمبا تھا۔ اس کے بڑے بڑے بال تھے۔ اس نے گلے میں زرد رنگ کا رومال ڈال رکھا تھا اور وہ پان کھا رہا تھا۔ اس کی ریشمی ٹی شرٹ پر ایک سانپ کا پھن تھا۔ ”کون ہے بے تو......؟ اس وقت یہاں کیوں بیٹھا ہے، گھر نہیں ہے تیرا......؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

”گھر ہے...... مگر میں جاؤں گا نہیں۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”ابا نے مارا ہے، کپڑے پھاڑ دیے۔“

”ابا تو خود مر چکا ہے...... کپڑے کسی اور نے پھاڑے تھے...... میں اس سالے کی...... پھاڑ دوں گا کسی دن...... ماں نے مجھے مارا کہ اب اور یونیفارم کہاں سے لاؤں، میں نے کہا نہیں چاہیے مجھے تمہاری خیرات...... میں خود لے آؤں گا۔“

اس نے اکبر کو غور سے دیکھا۔ ”اچھا...... یہ کہا تو نے...... بات تو سولہ آنے سو پیسے ٹھیک کہی مگر یہاں کیا تیرے لیے فرشتے یونیفارم لے کر آئیں گے......؟ یہ لے......“ اس نے جیب میں سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکالا اور اکبر کی طرف بڑھایا۔ ”کل لے لینا دوسری یونیفارم...... چل اب گھر جا...... پکڑ پیسے......“

اکبر نے نوٹ پکڑ لیا۔ ”ماں پوچھے گی......“

”ابے کہہ دینا راستے میں پڑے ملے ہیں، اٹھ میں گھر چھوڑ آؤں تجھے...... تو علامہ اقبال اسکول میں پڑھتا ہے نا......“

اکبر نے سر ہلایا۔ ”پانچویں میں...... بی سیکشن ہے میرا۔“

”ماں کو یقین دلانے کے لیے اکبر کو قسم کھانا پڑی۔ بڑی آسانی سے اس نے ہر قسم اٹھالی۔ ماں چپ ہوگئی مگر اس کی آنکھوں میں شک باقی رہا۔ وہ ایک دن اسکول نہیں گیا مگر اگلے دن گیا تو اس کے یونیفارم میں ہر چیز نئی تھی، وہ چھٹی کے بعد نکلا تو باہر وہی شخص اس کا منتظر تھا۔

اس نے اکبر کو توصیفی نظر سے دیکھا۔ ”خرید لی نا اپنی یونیفارم تو نے۔“

”ماں نے کہا میں جھوٹ بول رہا ہوں...... میرے قسمیں کھانے کے باوجود۔“

”چار بجے وہیں آجانا...... کل والی جگہ...... اب تو ہم دوست ہیں۔“

”ماں نہیں آنے دے گی۔“

”کہہ دینا...... ابے کچھ بھی کہہ دینا کہ پیچھے تک جا رہا ہوں، وہ کون سا رسیوں سے باندھ کے رکھتی ہے تجھے، نہ آیا تو میں گھر جا کے تیری ماں کو سب بتا دوں گا کہ نوٹ مجھ سے مانگا تھا تو نے، کہا تھا کہ ماں اسپتال میں پڑی ہے۔ جھوٹی قسمیں کھائی تھیں تو نے......“

اکبر ڈر گیا۔ وہ چار بجے وہیں پہنچا تو اس شخص کے ساتھ دو اسی جیسے اور بیٹھے تھے۔ وہ سب سگریٹیں پھونک رہے تھے اور زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ”جانی یہ ہے تیرا دوست......“ ایک نے کہا۔

اکبر کو پانچ سو دینے والے نے کہا۔ ”ہاں...... کل میں نے اسے پانچ سو روپے ادھار دیے تھے۔“

”ادھار یہ کیسے واپس کرے گا یار۔“ دوسرا بولا۔

جانی نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”واپس نہیں کرے گا تو ہم اس کی ماں کو اٹھا لیں گے، وہ اچھی عورت ہے۔“

”نہیں یار یہ تو ابھی پانچویں میں پڑھتا ہے، اس کی کون سی کمائی ہے کہ یہ تیرا ادھار چکا سکے۔“

”یہ ہمارا ایک چھوٹا سا کام کرے گا۔ اس کا ادھار ختم ہو جائے گا اور پیسے مل جائیں گے اسے...... جو ہم اس کی ماں کو خود پہنچا دیں گے کہ تیرے بیٹے کی کمائی ہے...... چل بیٹے......“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اکبر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا مگر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پانچ سو لے کر اس نے خود کو ہی نہیں اپنی ماں کو بھی کسی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ماں پہلے ہی بڑی مشکل زندگی گزار رہی تھی۔ مگر وہ ان کی بات ماننے پر مجبور تھا۔

انہوں نے اکبر کو ایک کرکٹ کا بیٹ دیا۔ پھر ایک بال اور کہا۔ ”یہ اس کھڑکی پر مارو...... اور ادھر جا کے گھنٹی بجاؤ، اپنی بال مانگو۔ آنٹی دروازہ کھولیں گی اور تمہیں بال دے دیں گی، بس تمہارا کام ختم......“

”آنٹی ماریں گی مجھے کہ شیشہ توڑ دیا۔“

ان میں سے ایک بولا۔ ”چلو شیشہ ہم توڑ دیتے ہیں، تم کہنا کہ میں نے تو شاٹ مارا تھا لیکن ادھر نہیں...... ایک لڑکے نے تھرو کی، بال کھڑکی میں لگ گئی...... چلو اب زیادہ باتیں نہیں، جاؤ بیل بجاؤ۔“

اکبر کے بیل بجانے سے پہلے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، اندر سے کسی نے کہا۔ ”کون ہے؟“

”آنٹی...... میری بال......“ اکبر مشکل سے بولا۔

کسی نے ڈور آئی سے ہاتھ میں بیٹ پکڑے بچے کو دیکھا جو خاصا نروس نظر آ رہا تھا پہلے اندر کے دروازے کی کنڈی کھولی گئی، پھر باہر والے لوہے کی گرل کا تالا کھلا اور اکبر نے اپنے مقابل ایک موٹی تازہ سرخ سفید عورت کو دیکھا جو غصے سے لال ہو رہی تھی۔ ”یہ کرکٹ گراؤنڈ ہے تمہارا؟ آس پاس سب گھر ہیں......“

اس سے زیادہ بولنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا۔ اچانک اکبر کے پیچھے سے وہ تینوں دندناتے آگے بڑھے اور عورت کو دھکیل کر لے گئے۔ ایک کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے عورت نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دوسرے نے اس کو دبوچ لیا۔ اس دھکم پیل میں اکبر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ایک دم پلٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ دروازہ اس سے پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ شاید انہیں بعد میں احساس ہوا ہوگا کہ جو سب سے آگے تھا وہ تو اب کہیں بھی نہیں ہے۔

اکبر بیٹ اٹھائے بھاگتا چلا گیا۔ اپنے فلیٹ کے احاطے میں داخل ہو کے اس نے دیکھا۔ اس کی عمر کے اور اس سے بڑے بہت سے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکے نے گھما کے شاٹ مارا گیند اوپر اٹھی اور سیکنڈ فلور کے ایک فلیٹ کی کھڑکی کا شیشہ توڑتی غائب ہوگئی۔ اکبر رک گیا، سب لڑکے اپنی جگہ ساکت ہوگئے تھے اور منہ اٹھا کے دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ چند منٹ بعد ایک عورت بال کے ساتھ گیلری میں نمودار ہوئی، اس نے نیچے دیکھا تو چھ سات ٹیموں کے پچاس ساٹھ لڑکے کھیلنے میں مصروف تھے۔ فرد جرم کسی ایک پر عائد کرنے کی ناکام کوشش کے بعد عورت نے بال نیچے پھینکی اور واپس اندر چلی گئی۔

اکبر نے سکون کا سانس لیا۔ یہ لڑکے اسے جانتے تھے، وہ فوراً گھر جاتا تو ماں اس کے چہرے کو دیکھ کر بہت سے سوال کرتی، وہ کھیل میں شامل ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ گھر پہنچا تو ماں نے پوچھا۔ ”کہاں چلا گیا تھا بغیر بتائے، یہ بیٹ کس کا ہے؟“

”نیچے ہی تو کھیل رہا تھا ماں...... بیٹ ٹیم کا ہے۔“ وہ جوتے اتار کے ہاتھ دھونے چلا گیا۔ اس کی نظر میں اب پھر ریوالور دیکھ کر چیخ مارنے والی عورت کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنی دہشت تھی، وہ تینوں ڈاکو تھے اور یقیناً انہوں نے اکبر کو دروازہ کھلوانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ پھر اب کیا ہوگا، کیا انہوں نے اس عورت کو مار دیا ہوگا؟ کیا وہ پکڑے جائیں گے؟ کیا ان کے ساتھ وہ بھی پکڑا جائے گا......؟ عورت اسے پہچان لے گی، کیا وہ ماں کو بتائے......؟

لیکن ماں کو بتانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ وہ کھانا بھی پورا نہیں کھا سکا اور بہانہ کر کے اٹھ گیا کہ پیٹ میں درد ہے۔ خوف سے واقعی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ بہت رات تک وہ دروازے پر کسی دستک کا منتظر

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ وہ طے کر چکا تھا کہ اب پولیس آئی ان تینوں کے ساتھ یا اس عورت کے ساتھ تو وہ صاف انکار کر دے گا کہ وہ کسی کو نہیں جانتا۔ نیچے کھیلنے والے سب لڑکے گواہ ہیں کہ وہ یہاں کرکٹ کھیل رہا تھا۔ وہ گھر تو یہاں سے بہت دور ہے۔

معلوم نہیں کب اسے نیند آگئی، صبح ماں نے اسے اسکول جانے کے لیے بیدار کیا تو اس نے پھر پیٹ کے درد کا بہانہ کیا۔ ماں کی صورت پر اسے کچھ فکرمندی نظر آئی۔ اس کے پوچھنے پر ماں نے تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ نکالا۔ ''معلوم نہیں یہ کس نے دروازے کے نیچے سے اندر ڈالا اور کس وقت......''

''کیا ہے اس میں......؟''

ماں نے فکرمندی سے اس کو دیکھا۔ ''پچیس ہزار روپے...... کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کروں، شاید کوئی غلطی سے یہاں ڈال گیا مگر غلطی کیسی...... وہ دروازہ بجا کے بھی دے سکتا تھا، ہوسکتا ہے وہ لفافہ واپس لینے آئے، کسی کو بتاؤں یا نہیں؟ پولیس تو رکھ لے گی اور کھا جائے گی، کسی اور سے کہوں تو سو باتیں مشہور ہوں گی...... میرا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔''

''تم کچھ مت کرو ماں...... خاموش ہی رہو۔'' اکبر نے سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود اپنے لہجے پر قابو رکھا۔ ماں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنی بڑی رقم کو وہ کسی کی غلطی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ لیکن جو سوال اس کے سامنے جواب کے لیے صدائے فقیر کی طرح ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا وہ ''کیوں'' تھا...... کسی نے یہ غلطی کیوں کی آخر!...... وہ کیا چاہتا تھا، اس عنایت کا مقصد صرف مدد ہے تو کیوں اور یہ قیمت ہے کسی قسم کی تو خریدار کو کیا چاہیے؟...... اس کے پاس ہے کیا، سوائے اس کے اپنے...... مگر کیا اس نے کبھی ظاہر ہونے دیا کہ وہ برائے فروخت ہے؟

اگر اس واقعے کا وہ کسی سے ذکر بھی کرتی تو ہر ذہن میں یہ آخری جواب ہی ہوتا۔ اس کا حسن و شباب کسی کے نزدیک اتنی قیمت ضرور رکھتا ہے، خریدار جو بھی ہوگا سامنے ضرور آئے گا اور کیوں نہ آئے جب وہ خود ضرورت ہے کا اشتہار بنی پھرتی ہے۔

اکبر دم سادھ گیا۔ ایک ہفتے تک وہ اسکول کی کھڑکی کے ٹوٹے شیشوں سے باہر دیکھتا رہا کہ مالِ غنیمت میں سے اس کا حصہ پہنچانے والا وہ دوست پھر دکھائی دے تو اس سے پوچھے کہ سب ٹھیک تو ہے نا...... وہ عورت...... وہ خود...... اس کے ساتھی...... دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا اور اکبر مایوس ہونے لگا، شاید اس روز اس کی حالت پر رحم کھا کے خدا نے اس کے لیے غیبی امداد فراہم کر دی تھی۔ وہ یتیموں اور بیواؤں کو اس بے رحم اور خود غرض دنیا کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے شرم آئی، وہ ڈاکا ڈالنے کی ایک واردات کو جو اس نے مجبوری میں کی تھی تائیدِ ایزدی سمجھ رہا ہے۔

ایک مہینے بعد جانی اسے پھر دکھائی دے گیا۔ اس نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ''جانی بھائی...... آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں تو شکریہ ادا کرنے کے لیے آپ کی تلاش میں تھا۔''

وہ اکبر کو ایک طرف لے گیا۔ ''کس بات کا شکریہ بے۔''

''آپ نے پچیس ہزار میرے گھر پہنچا دیے...... میرا حصہ......''

اس نے اکبر کے ایک ہلکا سا تھپڑ مارا۔ ''سالا حصے کی اولاد...... تو نے کسی سے ذکر تو نہیں کیا تھا اس بات کا......؟''

''نہیں جانی...... میں کوئی بے وقوف ہوں، اسی لیے تو تم کھلے پھر رہے ہو کہ میں نے اپنی ماں سے بھی ذکر نہیں کیا تھا، وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے کوئی ڈز ڈاڈز......''

جانی کچھ نرم پڑا۔ ''ابے نہیں...... وہ تو ہو گئی تھی بے ہوش۔''

''مال کتنا ہاتھ لگا......؟''

جانی نے پھر اس کے جھانپڑ مارا۔ ''تو حساب مانگ رہا ہے، سالے؟ چل پھٹ ادھر سے۔ ہم نے ترس کھا کے اتنا دے دیا۔''

اکبر کو مایوسی ہوئی۔ اسے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ پھر میری خدمات کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ اس کی ماں نے بالآخر وہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی۔ اس عزم کے ساتھ کہ جب بھی کوئی طلب گار آیا، اس کے جسم کا یا رقم کا...... اس کے منہ پر مار دے گی، وہ سخت تعجب میں تھی کہ دو ہفتے گزر گئے پھر پورا مہینا، کیا سچ مچ یہ تائیدِ ایزدی تھی؟ کون تھا وہ نادیدہ مددگار......؟

ایک مہینے بعد جانی پھر نظر آیا، اس نے کلاس کے باہر فٹ پاتھ پر سے اکبر کو اشارہ کیا اور وہ سر کو دو انگلیاں دکھائے باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ کلاس روم سے بستہ اٹھا کے جانے لگا تو ماسٹر نے پوچھا کہ اب کہاں...... اکبر نے معصومیت سے کہا۔ ''میری پتلون خراب ہو گئی ہے سر......'' اور سب کو

ہنستا چھوڑ کے نکل آیا۔

دوسری واردات شہر کے مخالف حصے میں مگر ایک پوش علاقے میں بالکل اسی طرح ہوئی...... لیکن اس بار اکبر بدحواس ہو کے فرار نہیں ہوا۔ وہ بیٹ ہاتھ میں پکڑے کچھ دور کھڑا رہا اور جب جانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آیا تو اکبر نے انہیں جا لیا...... وہ پریشان ہو گئے۔

''دوست...... میرا حصہ مجھے یہیں دے دو۔'' اس نے کہا۔

''کیسا حصہ بے...... کون ہے تو......؟'' جانی کے ایک ساتھی نے کہا۔

جانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہم تجھ پر بھروسا کرتے ہیں، تو ہم پر بھروسا رکھ...... اتنا نقد نہیں ہے ابھی......''

''چلو جو بھی ہو، مگر میرے گھر مت جانا۔ ماں پریشان ہوتی ہے، پہلے بھی پولیس کو بتانا چاہتی تھی...... میں نے روک دیا۔''

جانی نے سر ہلایا اور وہ چلے گئے۔ ان کو یقیناً بڑی کامیابی ہوئی تھی۔ ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اکبر نے اگلے دن تین اخبار خریدے۔ اس واردات کی خبر سب میں تھی۔ ڈاکو ایک عورت کو باندھ کر اس کا سارا زیور اتروا لے گئے تھے۔ عورت کے بیان کے مطابق ڈاکوؤں کا مددگار ایک بارہ تیرہ سال کا بچہ تھا جس نے بال لینے کے بہانے اس سے دروازہ کھلوالیا تھا۔ ڈاکو دو لاکھ کے بانڈز بھی لے گئے تھے۔

جانی ایک ہفتے بعد نمودار ہوا۔ اس کا موڈ پھر پچیس دینے کا تھا مگر اکبر نے اسے اخبارات دکھائے۔ ''صرف بانڈز ہی دو لاکھ کے تھے، مجھے پچاس دو...... زیورات اپنے پاس رکھو۔''

جانی نے اسے گھورا۔ ''سالے حصے دار...... اگر میں انکار کر دوں پھر......؟''

''مجھے پتا ہے، تم انکار نہیں کرو گے جانی بھائی۔'' اکبر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے یوں کہا کہ جانی کا ہاتھ اپنی جیب میں گیا۔ ایک لمحے کے لیے اکبر کو شک ہوا کہ وہ ریوالور نہ نکال لے مگر اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں نوٹ تھے۔ ''لے پارٹنر...... قسمت اچھی ہے تیری، اس بار میں پچاس ہی لایا تھا ورنہ جانی کو دھمکی دی تھی تو نے...... سوچ سمجھ کے بات کیا کر...... یہ رقم ماں کو دے گا تو تو......؟''

اکبر نے لفافہ بستے میں رکھ کے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب مجھے طریقہ آ گیا ہے، میں یہ رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

کرادوں گا۔‘‘

شاہدہ کو اس کا علم چھ مہینے بعد ہوا۔ اس کے حساب بینک میں اب ایک لاکھ بھی نہیں تھے مگر اسے بتایا گیا کہ کل رقم پونے دو لاکھ تھی، شاید مجھ سے بھی حساب کتاب میں غلطی ہوئی۔ وہ سوچتی ہوئی لوٹ آئی۔ اس کے اندازے پہلے بھی غلط ہوجاتے تھے جب وہ پانچ پانچ دس دس لاکھ جمع کراتی تھی یا نکلواتی تھی، نہ بینک اسٹیٹمنٹ اس نے کبھی مانگی تھی نہ اسے ملی تھی۔

اس سے اگلی واردات مہینے بھر بعد بالکل مخالف سمت میں ہوئی۔ جانی کا گروہ جس کا اب اکبر چوتھا رکن بن چکا تھا بہت محتاط ہوگیا تھا۔ ایک جیسی دو وارداتوں کی خبر نے زیادہ ہلچل نہیں مچائی تھی مگر ایسے واقعات روز ہونے لگتے تو پولیس کے ساتھ پبلک بھی ہوشیار ہوجاتی۔ مہینے بھر بعد بات پرانی ہوگئی، شہر میں اسٹریٹ کرائم کی وارداتیں بڑھ رہی تھیں اور میڈیا والے موبائل فونز یا موٹر سائیکل اور گاڑیاں چھینے جانے کی بات زیادہ کرتے تھے۔ ڈکیتی میں بینک لوٹے جانے پر زیادہ شور ہوتا تھا۔ گھر میں ڈاکو آجائیں تو پولیس خود اسے چوری کا مقدمہ بناتی تھی اور خبر دبانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ زیادہ تر لوگ گھر میں ہونے والی چوریوں کو ماسیوں کی مخبری سے منسوب کرتے تھے اور خود حفاظتی اقدام لیتے تھے جن میں کسی اجنبی کے لیے دروازہ نہ کھولنا شامل تھا، تاہم دروازے کھلوانے والے ابھی کم ہوشیار نہ تھے۔

عملاً کچھ نہ کرنے کے باوجود اکبر ایک گروہ کے لیے انتہائی کارآمد خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اندر کی معلومات وہ اپنے ذرائع سے حاصل کرلیتے تھے مگر اندر جانے کے لیے دروازہ اکبر کھلواتا تھا۔ چار مختلف سمتوں کی وارداتوں میں اکبر کو ڈیڑھ لاکھ مل گئے تھے۔ مالِ غنیمت کی منصفانہ تقسیم کے معاملے میں چوروں سے زیادہ ایماندار تو بعض اوقات ایمان کی تبلیغ کرنے والے بھی نہیں ہوتے۔

اکبر کے لیے رقم کو رکھنا مسئلہ بنا تھا۔ وہ اپنی ساری آمدنی ماں کے اکاؤنٹ میں نہیں ڈال سکتا تھا، اس کا ایک حل تو یہ تھا کہ وہ کسی بینک میں اکاؤنٹ کھولے۔ اس میں مشکل یہ تھی کہ اکاؤنٹ کو صرف والدین یا گارجین ہی چلا سکتے تھے۔ اس نے دوسرا طریقہ آزمایا اور پرائز بونڈ خرید کے رکھتا گیا۔ قسمت اس کی کس طرح یاوری کررہی ہے، اس کا اندازہ اکبر کو تین ماہ بعد ایک لاکھ کا انعام نکلنے پر ہوا۔

اسے اندازہ تھا کہ علم، عقل اور ذہانت سے بڑھ کر انسان کا مددگار کوئی نہیں ہوتا خواہ وہ ترقی کے روایتی راستے پر چلے اور محنت سے رزق حلال کمائے یا دولت مندی کا شارٹ کٹ لے۔ اس کی ماں اور باپ کے ساتھ یہی ٹریجڈی تھی کہ وہ گاؤں سے تعلق رکھتے تھے اور تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ ان پڑھ اور بے وقوف مجرم پکڑے جاتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم اور ذہانت رکھنے والے بڑے بڑے بزنس کرتے تھے یا سیاست اور کبھی پکڑے نہیں جاتے تھے۔

اس کی ماں کو کبھی شک نہ ہوسکا کہ اکبر کی مجرمانہ سرگرمیاں کیا ہیں۔ تعلیم میں وہ ہمیشہ آگے رہا اور اس کا شریفانہ رویہ اور سعادت مندی والے اطوار سب کو متاثر کرتے رہے۔ پس منظر میں رہنے کی وجہ سے اکبر ہمیشہ محفوظ رہا۔ جانی کے دو ساتھی ایک گھر کے اندر مارے گئے جب انتہائی غیر متوقع انداز میں عورت نے ریوالور نکال کے دونوں کو شوٹ کردیا۔ اکبر ہمیشہ سب سے پہلے نکل جاتا تھا۔ جانی بھی کھڑکی سے کود کر فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ لاشوں سے پولیس کیا پوچھتی...... مگر عورت نے بہت کچھ بتادیا۔

جانی دو مہینے غائب رہا۔ اکبر بھی میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوگیا تھا۔ اس نے قائل کرکے ماں کو اپنے کالج کے نزدیک دوسرے فلیٹ میں شفٹ کردیا۔ کرایہ ادا کرنے کی ذمے داری بھی خود اس نے لے لی اور ماں سے کہا کہ وہ ٹیوشن پڑھاتا ہے حالانکہ فلیٹ اس نے نقد خریدا تھا اور اس کے نام پر تھا مگر یہ بہادرآباد کا علاقہ تھا جہاں نسبتاً خوشحال اور تعلیم یافتہ لوگ رہتے تھے۔ یہاں کرائے بھی زیادہ تھے اور فلیٹ بھی مہنگے تھے۔ شادو کو وہاں جانے کے بعد تشویش ہوئی مگر اکبر نے اسے مطمئن ہونے پر مجبور کردیا۔

کئی مہینے بعد جانی اسے اچانک نظر آگیا۔ وہ ایک ٹیکسی سے سامان اتار کے طارق روڈ کی کسی دکان میں لے جارہا تھا۔ اکبر سے مل کے وہ بہت خوش ہوا اور اس نے بتایا کہ اب وہ ’’کھیپی‘‘ بن گیا ہے اور ایک گروہ میں شامل ہے جو اس جیسے نوجوانوں کو ہانگ کانگ، سنگاپور، بینکاک اور ملائیشیا بھیجتا ہے۔ ان شہروں کا ویزا آسانی سے ملتا ہے۔ کرایہ کم ہے اور وہاں دنیا بھر کا مال ملتا ہے۔ وہ ایسی چیزیں خرید لاتا ہے جن کی پاکستان میں زیادہ ڈیمانڈ ہو۔ امپورٹڈ کے لیبل پر وہ چیز بہت مہنگی ہوجاتی ہے جو درحقیقت بھارت، پاکستان یا بنگلا دیش سے ہی بن کر جاتی ہے۔ جانی کاسمیٹک، پرفیوم اور خاص طور پر زنانہ مردانہ استعمال کی جنسی دوائیں لاتا تھا۔

اکبر کی عمر ابھی اٹھارہ سال نہیں ہوئی تھی۔ جانی نے

اسے یوں اپنا پارٹنر بنالیا کہ لوکل مارکیٹ میں مال کی تقسیم اور مزید آرڈر لینے کا کام اس کے سپرد کردیا۔ یوں اکبر نے عملاً مارکیٹنگ اور سیلز کی تربیت حاصل کی۔ انٹر پاس کیا تو جانی نے اس کو شناختی کارڈ بنوادیا۔ اس سے پاسپورٹ کا حصول ممکن ہوا اور اکبر نے ملک سے باہر قدم رکھا تو دیکھا کہ علامہ مرحومؒ صحیح فرما گئے تھے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، پہلے عشق کے بعد باقی بات بھی اس نے خود ہی سمجھ لی کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

ماں کو مطمئن رکھنا اب اکبر کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ مطمئن نہ ہوتی تو کیا کرتی، بیٹا جوان تھا، اسے نہ مارا جاسکتا تھا اور نہ زبردستی گھر میں بند کیا جاسکتا تھا۔ اس نے خود ہی بتادیا کہ وہ ایک کلاس فیلو کے ساتھ بزنس پارٹنر بن گیا ہے —— وہ دونوں ہر جمعے کی رات کو جہاز سے جاتے ہیں اور مال خریدنے میں دو دن گزار کے اتوار کی رات کو لوٹ آتے ہیں۔ پیر کی صبح وہ کالج میں حاضر ہوجاتا ہے۔

صرف ایک بار شادو نے پوچھا تھا کہ کہیں وہ اسمگلر تو نہیں بن گیا اور اکبر ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا تھا۔ ’’ایسی میری قسمت کہاں ماں......‘‘

’’کیا مطلب......تو اسمگلر بننا چاہتا ہے؟‘‘

’’ارے ماں وہ لکھ پتی نہیں کروڑ پتی ہوتے ہیں۔ بہت بڑے بزنس کو چلاتے ہیں اور اب اسمگلر نہیں...... امپورٹر ایکسپورٹر کہلاتے ہیں......تو فکر مت کر...... تیرا بیٹا کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی کام کرہی نہیں سکتا کیونکہ وہ ایک پیش امام کی بیٹی اور مولانا اصغر حسین شاہ کی اولاد ہے۔‘‘

لیکن اکبر بڑی تیزی سے دنیا کو سمجھ رہا تھا اور آگے بڑھتا جارہا تھا۔ دو سال میں جب وہ بی اے کرچکا تھا اس نے بڑے دوستانہ ماحول میں جانی سے اپنا بزنس الگ کرلیا۔ خود جانی اب لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ اکبر کو معلوم تھا کہ وہ اسے برابر کا حصے دار نہیں سمجھتا اور اپنی استادی کے زعم میں اکبر کو شاگرد کا درجہ دیتا ہے۔ تاہم اکبر میں ایک خاص ذہانت لوگوں سے مراسم بڑھانے اور استوار رکھنے کی تھی۔ اس نے اپنی قوت برداشت کو مفادات کا تابع بنالیا تھا۔ ہر شخص اس سے متاثر ہوتا تھا۔ بڑا اس کی شائستگی اور عزت آمیز رویے سے، چھوٹا اس کے دوستانہ انداز سے اور برابر کا اس لیے کہ وہ برابری کا دعوے دار نہیں، خود کو کمتر سمجھتا ہے۔

وہ اچھے کپڑے پہنتا تھا۔ انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شادو پر گیا تھا تو خوش شکل بھی تھا اور ذہین بھی...... اس نے باڈی بلڈنگ کی اور اپنے جسم کو اتنا پرکشش بنالیا کہ اس کی مردانہ وجاہت پر جنس مخالف کی نظر خود ٹھہر جاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بڑی کامیابی کے لیے حسین سہارا کتنا ضروری ہے اور اوپر جانے کے لیے ہر سیڑھی میں اس کے ساتھ ایک نئی عورت ہونی چاہیے جو ہمہ صفت ہو۔ تنہائی کی شریک، افسر رابطہ، سیکریٹری، مشکل کشا، معاملہ فہم اور تعلق کو صرف کاروباری ضرورت سمجھ کے قبول کرنے والی...... جو بیوی کی طرح گلے کا ہار بننے کی نہ سوچے بلکہ خود بھی ترقی کے لیے یہ ضروری سمجھتی ہو کہ خوب سے خوب تر تلاش کیا جائے مگر جب تک ساتھ رہے ایمانداری، رازداری اور وفاداری کے بلند سنہرے اصول نبھائے۔

ایسی لڑکیاں بہت کم تھیں، مگر اکبر کی نگاہِ انتخاب انہیں تلاش کرلیتی تھی کیونکہ وہ خود بھی کسی کا سہارا یا آلۂ کار بننے کی جستجو میں ہوتی تھیں۔ جب وہ کھیپی تھا تو ایک شہر سے دوسرے شہر آتے جاتے۔ مال لاتے اور ٹھکانے لگاتے اس نے یہ سبق سیکھا کہ کیا قانون اور کیا انسان...... سب خریدے جاسکتے ہیں، کم یا زیادہ قیمت کا انحصار باہمی فائدے کی کمی بیشی پر رہتا ہے۔

ابھی وہ کھیپی سے امپورٹر ایکسپورٹر بننے کے عمل سے گزر رہا تھا کہ اس پر ماں کی بیماری کا اور موت کا صدمہ یوں آیا جیسے ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرا تھا، اس کا نام تھا لٹل بوائے...... ننھا بچہ...... وہ خود ایک چھوٹا سا بچہ تھا جب ایک گھر میں بال لینے داخل ہوا تھا۔ اب وہ بین الاقوامی سرحدیں پار کرکے دوسرے ملکوں میں آجارہا تھا مگر ماں کے سامنے ہنوز وہ لٹل بوائے تھا۔ جب اپنی تمام جمع پونجی داؤ پر لگانے کے عزم کو بھی شکست ہوگئی تو اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ سب کچھ اس کی قوتِ خرید میں نہیں ہے۔

پھر مرنے سے پہلے ماں نے اس کے سامنے اعتراف کرلیا کہ وہ کون تھی۔ اس کا باپ کون تھا، اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوگیا...... وہ اپنے لیے حسب نسب کی عزت خریدنے پر بس کرتی تو شاید کچھ نہ ہوتا مگر اس کے بعد اس کے احساس محرومی نے اسے لالچ کی راہ پر دھکیل دیا۔ اس نے چوری بھی کی تو اللہ کے گھر میں...... اللہ اس کی سزا کیوں نہ دیتا۔ اس نے بتایا کہ اس کا پیسا بے مصرف ہے۔ اس سے نہ وہ اپنا سہاگ بچاسکی۔ نہ اصغر کی زندگی خرید سکی اور نہ باعزت زندگی...... اور خود اپنی نظر میں گرگئی۔

اکبر نے بعد میں بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ آج وہ خود بھی اسی راہ پر گامزن تھا جس پر اس کے ماں باپ نے چلنا چاہا تھا۔ مگر وہ ناکام رہے تھے۔ اکبر نے ان کی ناکامی کے

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

اسباب کا تجزیہ کیا اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ گاؤں سے شہر آئے تھے، ان پڑھ تھے...... کمتری کے احساس میں مبتلا تھے اور انہوں نے مال کمانے کے لیے غلط وقت، غلط جگہ اور غلط افراد کا انتخاب کیا۔

ایک سماجیات، نفسیات، معاشیات اور کاروباری امور کے تجربہ کار تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ ماہر کی طرح اس نے اپنے والدین کی ہر غلطی کو لکھا اور سمجھا اور بہت سے عملی نتائج اخذ کیے جو اس کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتے تھے۔

ماں کا کسی کی ناجائز اولاد ہونا کوئی غلطی نہیں تھی جیسے اصغر کا میراثی ہونا۔ ان کا نظریہ ضرورت کے تحت محبت کرنا اور شادی کر لینا مثبت قدم تھا۔ ماں کا اصغر میراثی کو سید اصغر حسین شاہ بنا دینا نفرت پر مبنی سماجی رویے کے خلاف بغاوت تھی اور جائز تھی۔ اس کی ماں کا مسجد کا پیسا خرد برد کرانا بھی جائز تھا۔ جو آدمی خالی پیٹ ہو وہ حرام حلال کو دیکھے یا اپنی بھوک کو۔ جائز طریقے سے کمانے کی ہر کوشش میں ناکامی اور ذلت اٹھانے کے بعد اس کے باپ نے وہی راستہ اختیار کیا جو اس کی ماں کے بیان کے مطابق چودھری صاحب اور شاہ جی جیسے سب عزت داروں نے اختیار کیا تھا۔

لیکن اس کے بعد ان سے بہت سی غلطیاں ہوئیں جن کا سلسلہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ ہاتھ میں دس بیس لاکھ آتے ہی اس جگہ کو نہ چھوڑنا غلطی تھی۔ اتنی رقم کو دوگنا یا دس گنا کرنے کے لیے راستے کھلے تھے جو محفوظ تھے، وہ کراچی آ کے بزنس کر سکتے تھے۔ اس کے باپ نے مشتعل ہو کے غلطی کی۔ ماضی کے حوالے سے بلیک میل کرنے والے کو خریدا جا سکتا تھا۔ اس کا منہ بند کرنے کے لیے ایک لاکھ بھی بہت ہوتے۔

پیش امام صاحب کو بلاوجہ قتل کرنا اس کی سب سے بڑی غلطی بن گیا۔ فرار کی کوششیں نہ کر کے بھی اس نے غلطی کی تھی۔ تمام مالی معاملات میں ماں کو خود مختار بنانا بھی غلط تھا۔ وہ خود پولیس سے بات کرتا اور قانونی معاملات کو خراب کرنے سے گواہوں کو خریدنے تک ہر کام کرتا۔ ایک عورت کو ان معاملات کا کیا پتا۔ لٹیرے سب لوٹ کے کھا گئے اور شوہر کو بھگا لے جانے کے بجائے خود کو جان بچا کے بھاگنا پڑا۔

خیر...... عزت دار تو ماں باپ اسے بنا ہی گئے تھے ورنہ آج وہ بھی اکبر میراثی ہوتا۔ رزق حلال اور محنت کی کمائی کے چکر میں وہ خود نہیں پڑا ورنہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد درخواست برائے کلرکی لیے دفتروں میں خوار پھرتا۔ زندگی نے خود اسے کامیابی کے راستے پر کھینچ لیا تھا اور وہ عملی سبق دیے تھے جو اس کے آگے بڑھنے میں معاون تھے۔

دنیا کہتی ہے کہ فرسٹ ملین ہی مشکل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پیسے کو پیسا کھینچتا ہے۔ یہ پہلا ملین کوئی ذہین ترین قوم کا شاہین بچہ پہاڑوں کی چٹانوں پر بیٹھ کے نہیں کما سکتا۔ تمام ڈگریاں لے کر اعلیٰ ترین مقابلے کے امتحان کی کسی پوسٹ سے محض تنخواہ سے نہیں بچا سکتا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ خود جوان ہو، اس کا عزم جوان ہو اور جذبات جوان ہوں۔ اس کے لیے واحد راستہ ناجائز ذرائع کے خارزار سے گزرتا ہے۔ آسان پسند اس پر نہ چل پاتے تو پھر کلرکی کر کے ریٹائر ہو جاتے۔

اکبر کا استاد جانی تھا جس نے اس کو خوابوں کی تعبیر بیچنے والی دنیا دکھائی۔ جو چاہو لے لو، پیسا اور ہوتا کس لیے ہے۔ محض دیکھ کر خوش ہونے کے لیے کہ لاکھ کے کروڑ بن گئے اور کروڑ کے ارب۔ ایک مختصر اور محدود زندگی میں قوت خرید دیتا ہے۔ آرام اور عیش و عشرت کے لوازمات فراہم کرتا ہے۔ سوسائٹی میں اعلیٰ مقام...... اثر رسوخ اور طاقت...... اقتدار سب کچھ خریدا جا سکتا ہے اگر خزانے بھرے ہوئے ہوں۔

صرف پچیس سال کی عمر میں اکبر ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ جس کی گڈول بہت اچھی تھی۔ دبئی میں اس کی ملاقات ایک پاکستانی تاجر سے ہوئی جو پہلے لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزارتا رہا اور ملک میں حالات بہتر ہوئے تو دبئی آ کے سیٹل ہو گیا۔ یہ امریکا سے بہتر تھا کہ دو گھنٹے میں پاکستان جانا ممکن تھا اور واپس آنے کے لیے ویزا کا حصول کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا۔ یہاں یورپ و امریکا سے زیادہ آسانیاں تھیں، صرف پیسے والوں کے لیے......

ممتاز رشید فی الحال سیاست سے دور تھا اور حالات کے مزید سازگار ہونے کا انتظار کر رہا تھا جب وہ پاکستان جائے تو کم سے کم وزیر بن سکے۔ مرکزی نہ سہی صوبائی سہی۔ ایک ہی سرخاب کا پر لگنا باقی تھا، باقی تو ھذا من فضل ربی......

وہ دنیا بھر سے پرانے کمپیوٹرز اور ری کنڈیشنڈ گاڑیاں منگوا کے پاکستان بھیج رہا تھا۔

وہ اکبر سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ ان کی ملاقات ایک مسلم ملک کے سفارت خانے کی تقریب میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ اکبر نے انہیں ایک سیون اسٹار ہوٹل میں ڈنر کے لیے مدعو کیا جہاں وہ مقیم تھا۔ یہ ایک بزنس ڈنر تھا جس میں شرکا صرف تین تھے۔ رشید، اس کی حسین و جمیل بیوی مہناز فاطمہ عرف مونا اور اکبر۔

''آپ اکیلے دبئی آتے ہیں۔ اپنی مسز کو ساتھ نہیں لاتے۔'' مونا نے اپنے ناز و ادا اور حسن و شباب کی بے ضرر سادگی و رعنائی کے ساتھ کہا۔

''اگر وہ ہوتی تب بھی شاید نہ لاتا۔'' اکبر مسکرایا۔

''ہوتی کیا مطلب......'' وہ معصومیت سے بولی۔ ''شادی نہیں کی آپ نے......؟''

''کر چکا ہوتا اگر آپ رشید صاحب سے پہلے مجھے مل گئی ہوتیں۔'' اکبر نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ رشید کے غرور ملکیت کو بانس پر چڑھا دیا اور مونا کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کر دیا۔

رشید نے کہا۔ ''تمہیں اس سے اچھی بھی مل سکتی ہے۔ دیکھو، تلاش کرو۔ ونڈو شاپنگ کرو، لندن، پیرس اور بالی وڈ سے ہالی وڈ تک...... ایک سے ایک مال سجا ہے۔''

''میرا خیال ہے کچھ کام کی بات ہو جائے۔ مسز رشید اتنی دیر میں مینو کا مطالعہ کر کے آرڈر دینے کا مشکل کام کر سکتی ہیں۔''

مونا نے اٹھلا کے کہا۔ ''بھئی خود دیکھو کیا کھانا ہے، مجھے آپ کی پسند کا کیا پتا۔''

''پتا تو یقیناً چل گیا ہوگا۔'' اکبر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''مگر ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔ اس میں زہر ہو تو آپ کے آرڈر پر ہم کھائیں گے۔''

رشید نے کہا۔ ''دیکھو...... تمہارے لیے ایک بزنس پروپوزل ہے میرے پاس، جو میں بہت لوگوں کو دے چکا ہوں، لیکن کسی نے سیریس ہو کے کام نہیں کیا۔ میں جو پرانے کمپیوٹرز کے مانیٹر جہاز بھر بھر کے منگواتا ہوں۔ پرانے پکچر ٹیوب والے، ان سے ٹی وی بناؤ۔''

''ٹی وی بناؤں...... وہ کیسے......؟''

''وہ میں بتاتا ہوں۔'' رشید بڑے انہماک سے اس کو بتانے لگا۔ ''باڈی ادھر سے بنواؤ۔ سرکٹ چائنا سے لو، اسپیکر وغیرہ لوکل...... بہترین کلر پکچر والا پندرہ اور سترہ انچ کا ٹی وی آدھی قیمت پر مارکیٹ کرو، پاکستان میں کون پوچھتا ہے...... جو نام چاہو رکھو۔''

اس وقت پہلی بار مونا نے میز کے نیچے اکبر کے پیر کو آہستہ سے ٹھوکر ماری اور ''سوری'' کہہ کر پھر مینو دیکھنے لگی۔ آرڈر کی تعمیل ہونے تک اور کھانے کے دوران میں جب رشید اپنی پروڈکٹ کی تکنیکی سائڈ سے مارکیٹنگ تک ڈسکس کر رہا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ ایسے ٹی وی غریب لوگ مفت سمجھ کر لوٹیں گے اور منافع کی شرح کیا ہوگی...... تو اکبر کی توجہ مونا کی طرف تھی۔ اس وقت مونا نے تیسری بار سگنل دیا اور اکبر نے ایک لمحے کے لیے رشید کی طرف سے نظریں ہٹائے بغیر پہلا جوابی سگنل دیا...... اگلا ڈنر دو دن بعد رشید کی طرف سے تھا مگر اس سے پہلے ہی فون آ گیا۔ ''آپ آ رہے ہیں نا...... میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔''

''میرا تو دل چاہتا ہے ابھی آ جاؤں...... اجازت ہے؟'' اکبر نے کہا۔

''یہ اجازت کی نہیں، ہمت کی بات ہے جناب۔'' وہ ہنسی مگر اکبر نے جلد بازی سے گریز کیا۔ ہمت تو اس میں اتنی تھی کہ ابھی جا کے مونا کو اٹھا لاتا...... لیکن وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈنر پر گیا۔ اس نے مونا کی شکایت بھری مایوس اور حوصلہ بڑھانے والی نگاہوں کو بھی نظرانداز کیا، وہ صرف رشید سے کاروباری معاملات میں الجھا رہا۔ ان کے درمیان مکمل تعاون کا ایگریمنٹ ہو گیا تھا۔ بس اسے کاروباری معاہدے کی شکل دینا باقی تھا جو ان کے قانونی مشیروں کا مسئلہ تھا۔

رشید پچاس پچپن سال کا ادھیڑ عمر شخص تھا جو شاید کاروبار کو حد سے زیادہ توجہ دینے یا اعتدال سے بڑھ کر شراب و شباب کے مزے لوٹنے کے باعث تھکن اور بڑھاپے کے احساس کا شکار تھا۔ مونا کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ رشید کے مقابلے میں بیس سال کم ہے یا تیس سال...... اس نے اپنی فگر کو ایسے طریقوں سے سنبھال کے رکھا تھا کہ لباس اور میک اپ بدل کے وہ کبھی بیس کی لگتی تھی تو کبھی تیس کی...... صاف ظاہر تھا کہ اس ازدواجی تعلق کو استوار کرنے والی قوت صرف دولت کی ہے...... محبت کی نہیں......

دو ہفتے میں کنٹریکٹ فائنل ہو گیا۔ رشید اور اکبر بزنس پارٹنر بن گئے۔ پرانے کمپیوٹرز کی پکچر ٹیوبس سے ہر برانڈ کے ٹی وی بنانے کا بزنس اکبر کو پاکستان میں شروع کرنا اور چلانا تھا۔ ٹیوبس کی اور کچھ دوسرے پرزوں کی فراہمی رشید کی ذمے داری تھی۔ ٹی وی سیٹ بنا کے پاکستان کی مارکیٹ میں ڈالنا اور وہیل پروموشن وغیرہ اکبر کے ذمے تھا۔ رشید نے ان سیٹس کو دبئی کے راستے مختلف برانڈ نیم سے انڈیا پہنچانے کا وعدہ بھی کیا تھا کیونکہ دبئی میں کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نقلی مال رکھنا سنگین جرم تھا۔

اکبر کا رشید کے ری کنڈیشنڈ کاروں والے بزنس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ٹی وی سیٹس بنانے کے بزنس میں دونوں کی سرمایہ کاری برابر تھی اور قانونی طور پر نفع نقصان میں وہ برابر

www.Paksociety.com

کے شریک تھے۔ ان معاملات کے طے ہونے تک اکبر بھی دبئی میں مقیم رہا اور اس نے رشید کا اعتماد حاصل کرنے پر زیادہ توجہ دی۔ اس کی عاجزی و انکساری محض دکھاوا تھی۔ وہ رشید کو بڑا بھائی کہتا رہا اور سیاسی داؤ پیچ اور کاروباری رموز کا ماہر رشید اس کی نفسیاتی چال کو نہ سمجھ سکا۔ وہ اکبر کی نیکی شرافت اور خلوص کا قائل ہو گیا اور اسے واقعی چھوٹا بھائی سمجھنے لگا۔

رشید کے سامنے اکبر نے مونا کو محترمہ بھابی صاحبہ کہا تو خود رشید بولا کہ بھئی یہ کیا غربت والا اندازِ تخاطب ہے صرف بھابی کہنا کافی ہے۔ چھوٹے بڑے ہر بھائی کی بیوی کو بھابی ہی کہا جاتا ہے۔ اکبر نے تھوڑے سے تکلف کے بعد یہ بات مان لی مگر اس رشتے میں ایک ظاہری فاصلہ رکھا۔ قربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کبھی رشید کے بلائے بغیر اس کے گھر میں قدم نہیں رکھا۔

یہ الگ بات ہے کہ خود مونا نے اس کے ہوٹل کے لاؤنج سے کمرے تک کا فاصلہ چند روز میں طے کر لیا۔ ایک رات اس کا فون آیا۔ ”کل تم مجھے لنچ پر بلا رہے ہو۔“

اکبر نے کہا۔ ”نہیں تو......“

مونا کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس کی نظر نے بہت پہلے تاڑ لیا تھا اور اس کے ذہن نے سمجھ لیا تھا کہ اکبر کی نظر میں اس کے لیے ایک CODED پیغام کیا ہے جسے اس کے شوہر کی نظر پڑھ ہی نہیں سکتی۔

اکبر نے چند سیکنڈ بعد کہا۔ ”میں نے ڈنر پر مدعو کیا تھا مونا تاکہ ہمیں کچھ فرصت اور خلوت میسر آئے۔“

مونا کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”ابھی لنچ کے لیے بھی فرصت کو غنیمت جانو...... خلوت کی بعد میں سوچیں گے۔“

اس شوخ بیانی میں نہ اقرار تھا نہ انکار...... لیکن اکبر بساطِ عشق کا پرانا شاطر تھا اور عورت کی ہر چال کو سمجھتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ ان کی اگلی چال کیا ہو گی۔ اکبر نے دانستہ لنچ کے لیے اب ہوٹل کے بجائے ایک انڈین ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا۔ پہلے ایک گھنٹے میں موڈ بنانے کے لیے ”سپ“ کرتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے سے محض جھوٹ بولا۔ لیکن ایک ہی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے جس کا اظہار صرف آنکھوں سے ہوا، ہونٹوں سے نہیں...... پھر انہوں نے فون کر کے رشید کو بلا لیا۔ ”بھئی میں یہاں ایک بزنس لنچ پر آیا تھا کہ میں نے دیکھا کہ بھابی اکیلی بیٹھی ہیں...... جس سے میری میٹنگ تھی اس نے معذرت کر لی...... اس کی جگہ تم آ جاؤ۔“

رشید کچھ دیر میں پہنچ گیا تو مونا اور اکبر واپس اپنے اپنے حفظِ مراتب کے خول میں سمٹ گئے۔ ”آپ جناب...... بھابی...... اکبر بھائی......“ لنچ کے دوران کچھ ذاتی معلومات کا تبادلہ ہوا۔ اکبر نے مزید جھوٹ بولا۔ رشید نے مونا سے اپنی بے پناہ محبت کا حوالہ بھی دیا اور مونا خالص مشرقی لڑکی بن کے شرمائی بھی۔ بڈھا واقعی دیوانہ ہے لڑکی کے عشق میں...... اس عمر میں عشق اور محبت بھی نام ہو جاتا ہے جسمانی ہوس کا...... یہ بھی دوطرفہ طلب کا رشتہ تھا، جو کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر چل رہا تھا۔ شاید مونا سب کچھ دے رہی تھی، رشید سب کچھ دے ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن دونوں کے لیے وہ بہت تھا جو وہ ایک دوسرے کو دے رہے تھے۔

لنچ کے دوران ہی مونا نے کہا۔ ”ڈارلنگ...... تمہیں تو ٹائم مل نہیں رہا...... کرن مجھے کب سے بلا رہی ہے۔“

”دیکھو...... ابھی ہم یہاں ایک بزنس ڈیل فائنل کر رہے ہیں۔ تم چاہو تو دو چار دن کے لیے چلی جاؤ...... اس سے زیادہ تم مجھ سے دور رہ سکتی ہو، میں نہیں رہ سکتا۔“

مونا نے کسی کی پروا کیے بغیر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ”یو آر رِچ اے ڈارلنگ...... میں کل کوئی فلائٹ دیکھ لوں؟“

رشید نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”دن میں کئی بار فون کرنا ہے۔ یہ مت بھولنا......“

”اور تم بھی مجھے ائرپورٹ پر سی آف کرنا مت بھولنا۔“ وہ اٹھلا کے بولی۔

اگلے دن ایک ٹریول بیگ کے ساتھ وہ سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد اکبر کے ہوٹل پہنچی۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو اکبر نے کہا۔ ”یس!“ مگر وہ اس سے پہلے ہی اندر پہنچ چکی تھی۔ اکبر واقعی حیران ہوا جب مونا نے اپنا برقعہ اتار کے پھینکا اور اس سے لپٹ گئی۔

”تم بس حیران ہوتے رہنا اور کچھ مت کرنا دیور جی......“ وہ اسے چومتے ہوئے بولی۔

رات کو مونا نے کچھ سچ بولا۔ ”میرا اصل نام مہناز فاطمہ نہیں...... مونا سنگھ ہے، میرا تعلق انڈیا سے ہے۔“

”رشید سے شادی کے لیے تم مسلمان ہو گئیں؟“

”ہونا پڑا...... وہ شادی کے معاملے میں پکا مسلمان ہے۔ اس کی پہلی خاندانی بیوی پاکستان کے ایک گاؤں میں ہے، خاندان کے ساتھ...... دو وہ چھوڑ چکا تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ چکی تھیں، چوتھی میں ہوں۔“

”تم اسے کب چھوڑو گی......؟“ اکبر نے اسے آہستہ سے چوما۔

”کیوں چھوڑوں میں اسے......“

”ہاں...... کاٹھ کا الو ہے...... سونے کا بنا ہوا۔“

مونا نے اسے دھکیلا۔ ”بکواس فرماتے ہیں آپ۔ مجھے تو سچی محبت ہے اس سے......“ مونا نے کہا اور پھر خود ہی ہنس پڑی۔

”مجھے اس کا ثبوت مانگنے کی ضرورت نہیں، وہ بھی اتنی ہی اور ایسی ہی محبت کرتا ہو گا تم سے......“

مونا نے سر ہلایا۔ ”مجھے ائرپورٹ چھوڑنے آیا تھا تو بڑا اداس چہرہ بنا رکھا تھا...... ڈرامے باز...... اگر ابھی میں چھاپا ماروں اس کے بیڈروم پر تو مجھے معلوم ہے وہاں کون ملے گی۔“

”اور اس نے فون کیا تمہاری بہن کو پیرس...... پھر......؟“

”کرن اور میں ایک دوسرے کے رازدار ہیں۔ اس کی صورت تو مجھ سے نہیں ملتی مگر آواز ملتی ہے، وہ اسے پیرس سے روز فون کرے گی اور میرے ڈائیلاگ بولے گی۔“

”ایسا تم نے بھی کیا ہو گا اس کے لیے...... اکثر......“

مونا نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اس کا شوہر ایک فارمر ہے، وہ پیرس کے مضافات میں رہتے ہیں۔ کرن نے اپنا نام یا مذہب نہیں بدلا بلکہ شادی کا رسمی تکلف بھی نہیں برتا...... شی از لکی...... وہ بہ دستور کرن سنگھ ہے اور ایک معاہدے کے تحت بڈھے کے ساتھ رہتی ہے، بڈھے کے سب بیٹے اور بیٹیاں ادھر ادھر نکل گئے۔ وہ کبھی کبھار آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ڈیڈ اچھا کیا آپ نے ایک عورت رکھ لی، شاید ماں کے پاس جا کے کہتے ہوں گے کہ ممی آپ نے اچھا کیا کہ ایک مرد رکھ لیا۔“

ڈرامائی انداز میں اکبر نے ایک دم کہا۔ ”مونا...... رشید کو چھوڑ دو...... مجھ سے شادی کر لو......“

مونا اس کی سنجیدگی پر چونکی۔ ”شادی...... ہم شادی کر چکے......“

”نہیں...... تم قانونی اور شرعی طور پر میری بیوی بن جاؤ، مجھے خوبصورت عورت نہیں، تم جیسی شریکِ حیات چاہیے۔ صرف ایک، تمام عمر کے لیے جو مجھے آج تک ملی نہیں تھی حالانکہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا...... خود مجھے یاد نہیں کہ میری زندگی میں کتنی عورتیں آئیں...... کچھ چند دن کے لیے، کچھ چند ہفتوں کے لیے...... ایک تھی جو سال بھر رہی لیکن وہ شادی کی قائل نہ تھی۔“

”وہ تو میں بھی نہیں......“ مونا چھت کو دیکھتی رہی۔

”کیوں......؟ بس بہت بھٹک چکے ہم دونوں...... چلو اب اپنا گھر بسائیں...... جہاں اپنے بچے ہوں جن کو ہم بڑا کریں...... میرے ساتھ پاکستان چلو...... میرا گھر دیکھو جو بہت بڑا ہے مگر وہاں میں اکیلا رہتا ہوں، اسے آباد کرو...... وہ پسند نہ آئے تو لاہور، کراچی، اسلام آباد میں کوئی گھر پسند کرو...... پھر اسی گھر میں ہم بوڑھے ہونے تک رہیں...... اور مر جائیں......“

مونا جو خاموش تھی اچانک رونے لگی۔ ”بکواس بند کرو، تم مرد اپنی باتوں سے بے وقوف بناتے ہو لیکن تمہیں یہ سب ڈرامے بازی کرنے کی کیا ضرورت ہے جب میں تمہارے پاس ہوں۔ تم جب کہو گے، جب بلاؤ گے میں آ جاؤں گی، مگر شادی کے لیے نہیں...... تم اسے نہیں جانتے سید اکبر حسین...... وہ کتنا POSSESIVE ہے...... وہ مجھے قتل کر دے گا۔“

”قتل کرنا میرے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں۔“ اکبر نے بڑے عزم سے کہا۔ ”تمہیں حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں میں...... اور تم بھی یہ بات سمجھ لو تو اچھا ہے۔ جب میں نے زندگی بھر کے لیے کہا ہے تو اس کا مطلب کچھ اور نہیں ہے، اگر کبھی تم نے مجھے چھوڑنے کا سوچا بھی...... تو انجام اچھا نہیں ہو گا، میں تمہیں بھی مار دوں گا اور خود بھی مر جاؤں گا۔“ یہ بات کرتے ہوئے اکبر پر جیسے وحشت سوار تھی۔

مونا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”اچھا...... اچھا...... جیسا تم چاہتے ہو ایسا ہی ہو گا مگر ایسے نہیں...... ذرا اپنی حالت دیکھو، بالکل پاگل لگ رہے ہو...... ہم مل کے کچھ کر لیں گے۔“

اکبر نے ایک کامیاب ڈراما کیا تھا، اسے اندازہ تھا کہ مونا جیسی لڑکیوں کو اپنے خلوصِ نیت کا یقین دلانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اتنی بار کھلونا بن چکی ہوتی ہیں کہ ہر مرد انہیں کھلاڑی لگتا ہے۔ اس کے باوجود ایک گھر...... ایک محبت کرنے والے، وفادار شوہر اور اپنے بچوں کا اور پھر ان کے بچوں کی شوخی اور شرارت سے بھرا بڑھاپا ان کا وہ خواب رہتا ہے جس کی تعبیر وہ تمام عمر تلاش کرتی رہتی ہیں۔

اکبر بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ مونا جیسی لڑکیاں کبھی اچھی بیوی نہیں ہوتیں۔ انہیں اپنے گھر کے خواب کی تعبیر سچ مچ مل جائے تو بہت جلد ذمے داریاں اور پابندیاں انہیں بیزار کرنے لگتی ہیں۔ پھر انہیں اپنی آزادی کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب وہ کسی ایک مرد کی غلام نہیں تھیں۔ تمام مرد ان کے ایک اشارۂ ابرو کے غلام تھے۔

وہ بے وقوف نہیں تھا کہ مونا سے شادی کرتا۔ شادی

www.Paksociety.com

کے لیے اس نے بہت پہلے سے ایک لڑکی کا انتخاب کر رکھا تھا جو درحقیقت اس کی ماں کا انتخاب تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب مذہبی گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے والد یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور لڑکی خود بی اے کے بعد ایم اے کرنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر ملازمت کے لیے نہیں...... وہ پردہ دار تھی اور بلاشبہ خوبصورت بھی، اکبر کی ماں زندہ ہوتی تو شادی بھی ہوجاتی۔ اب وہ انتظار کررہے تھے کہ خود اکبر کی طرف سے سلسلۂ جنبانی کب ہوتا ہے۔ وہ ایسی لڑکی تھی جو صرف ایک گھر اور شوہر کی خدمت کے لیے ساری زندگی وقف کرنے کو اپنا ایمان سمجھتی ہیں، خواہ شوہر کاروبار کے نام پر دنیا بھر میں عیاشی کرتا پھرے۔

وہ لوٹ کے پاکستان گیا تو اپنے ٹی وی بنانے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں اس کے کئی مہینے لگ گئے۔ وہ درمیان میں صرف مونا سے ملنے دوبار دبئی بھی گیا اور اس کے لیے اپنے جال کا پھندا مزید سخت کر آیا۔ مونا اب جذباتی طور پر اس کے دام میں گرفتار بھی اور اس وقت کی منتظر تھی جب وہ اس کی بیوی بنے گی، بہ ظاہر یہ کام آسان نظر نہیں آتا تھا۔

ٹی وی بنا کے بازار میں فروخت کے لیے جانے تک اکبر کو بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی لیکن اسے رشید کے اندازے سے زیادہ کامیابی ملی۔ پاکستان میں دوائیں تک دو نمبر اور نقلی فروخت ہورہی تھیں...... اور سادہ لوح انہیں سستا اور اصلی سمجھ کے خرید بھی رہے تھے۔

اس دوران میں اکبر کو پروفیسر صاحب کی بیماری کی خبر ملی۔ وہ اسپتال میں تھے اور انہوں نے پیغام دے کر اکبر کو بلوایا تھا۔ اکبر کو معلوم ہوا کہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ آئی سی یو میں تھے لیکن اب وارڈ میں منتقل کردیے گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ریٹائر ہوچکے ہیں اب اچانک یہ بیماری آگئی ہے...... شاید بائی پاس ہوگا۔

اکبر نے کہا۔ ''بائی پاس معمولی بات ہے، آپ علاج کی یا اخراجات کی بالکل فکر نہ کریں۔''

انہوں نے کہا۔ ''اکبر میاں...... فکروں سے زندگی میں ایک دن کا اضافہ نہیں ہوسکتا۔ اس عمر میں یہ بیماریاں تو آئیں گی اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے محتاجی بھی کوئی نہیں، فکر البتہ کلثوم کی ہے۔''

اکبر چونکا۔ ''اب اس کی فکر کیوں ہے آپ کو......؟''

''اس لیے کہ میں باپ ہوں اس کا...... اور تمہاری طرف سے خاموشی ہے، میں اس کا کیا مطلب لوں۔ جو بات تمہاری ماں نے کی تھی وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔'' وہ جذبات میں اونچا بولنے لگے۔

''پلیز سر...... ایسا مت کہیں...... میری ماں کا دیا ہوا قول میرا قول ہے، میں اس پر قائم ہوں اور قائم رہوں گا۔''

''یعنی میں انتظار کرتا رہوں...... عزرائیل سے بھی کہوں کہ انتظار کرے۔ اکبر صاحب کو ابھی فرصت نہیں......'' ان کا سانس پھولنے لگا۔

''جی نہیں...... میں ہر وقت تیار ہوں...... جب آپ کہیں......''

پروفیسر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اکبر میاں...... کلثوم کو میری زندگی میں لے جاؤ...... وہ میری اکلوتی بیٹی ہے، میں اسے باپ ہی نہیں، ماں بن کے بھی پال رہا ہوں۔''

''یہ کیوں...... اس کی والدہ......''

''تمہیں تو کچھ پتا نہیں...... چھ مہینے ہوگئے اس کے انتقال کو۔'' پروفیسر نے کہا۔

اکبر کی کلثوم سے شادی انتہائی سادگی سے ہوئی۔ حالات ایسے تھے کہ دھوم دھام کی گنجائش بھی نہ تھی۔ پروفیسر جیسے کلثوم کی رخصتی کے انتظار میں زندگی کی ہر سانس شمار کررہا تھا۔ صرف تین دن بعد اس کی موت آپریشن ٹیبل پر ہوگئی حالانکہ بائی پاس میں ناکامی کا تناسب نہ ہونے کے برابر سمجھا جاتا ہے اور جدید سہولیات نے اسے بہت آسان کردیا ہے مگر ہونے والی بات ہوگئی۔

اکبر کو مہینے بھر فرصت نہ ملی۔ وہ ایک طرف کلثوم کی دلجوئی کرتا تو دوسری طرف کاروباری مصروفیات کے لیے وقت نکالتا لیکن اسے ایک عجیب سی طمانیت اور مسرت کے احساس نے مغلوب رکھا۔ اس نے بروقت فیصلہ کیا تھا۔ ایک طرف اپنی مرحوم ماں کی دی ہوئی زبان کا پاس رکھا تھا تو دوسری طرف پروفیسر کے لیے ایک پُرسکون موت کو آسان بنا دیا تھا۔ مرتے وقت اس کے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا کہ بعد میں بیٹی کا کیا ہوگا۔

کلثوم ایک آئیڈیل بیوی ثابت ہوئی۔ جیسا کہ اسے یقین تھا۔ شوہر کی خدمت کو اپنا فرض اور وفاداری کو جزو ایمان سمجھنے والی...... مشرقی روایات اور وضع داری کا نمونہ...... حسن صورت اور حسن سیرت کا مکمل پیکر...... صرف ایک مہینے میں اکبر پر واضح ہوگیا کہ مثالی عورت کیا ہوتی ہے۔ وہ عام عورت پر کیا برتری رکھتی ہے۔ مونا جیسی عورتوں کو سرے سے عورت سمجھنا ہی عورت کی تذلیل سے کم نہ تھا۔

اس ایک مہینے میں مونا نے اسے کئی فون کیے اور اس

www.Paksociety.com

سے بار بار بولتی رہی کہ وہ دبئی کب آرہا ہے۔ دوبار اس نے پاکستان آنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا مگر اکبر نے اسے ٹال دیا۔ نہ اس نے مونا کو اپنی شادی کا پتا چلنے دیا اور نہ وہ چاہتا تھا کہ اسے پتا چلے۔ اس کے عزائم کچھ اور تھے جن کی تکمیل صرف مونا کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ چنانچہ موقع ملنے پر وہ مونا کو اپنی دیوانگی آمیز محبت سے دیوانہ بھی بناتا رہا۔

کلثوم تعلیم یافتہ، ذہین اور نیک لڑکی تھی جو کسی کے بارے میں نہ برا سوچتی تھی اور نہ چاہتی تھی، شوہر پر شک کرنا تو اس کے نزدیک گناہِ عظیم تھا۔ وہ مجسم وفا تھی اور وفاداری ثابت کرنے کے لیے جان بھی دینی پڑتی تو دے سکتی تھی۔ اپنے حسن انتظام سے اس نے اکبر کے لیے گھر کو واقعی جنت بنا دیا تھا۔

گھر کی طرف سے بے فکری کے بعد اکبر نے پھر کاروبار کو زیادہ وقت دینا شروع کیا اور اس کے دبئی کے چکر بھی بڑھ گئے۔ کلثوم نے ایک بار بھی نہ شکایت کی کہ وہ اسے کم وقت دیتا ہے، نہ اس کے ساتھ دبئی جانے کی خواہش ظاہر کی اور نہ اس کی مصروفیات کی نوعیت کے بارے میں کوئی سوال کیا۔

وقت آگیا تھا کہ وہ مونا سے مطالبہ کرتا کہ رشید کو چھوڑ دے۔ اس نے ایک دن ڈرامائی انداز میں اعلان کر دیا۔

”میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا...... تم اس سے طلاق مانگو۔“

”اکبر...... اسے پہلے ہی شک ہے، تم پر نہیں...... مجھ پر...... تمہیں تو وہ اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتا ہے۔ خوب کھیل رچایا ہے یہ بھی تم نے...... اگر میں نے طلاق مانگی تو اس کا شک خود بخود یقین میں بدل جائے گا۔ تم جانتے نہیں اکبر...... وہ جتنا بے ضرر نظر آتا ہے، اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ مجھے قتل کروا دے گا لیکن اس سے پہلے وہ جاسوس چھوڑ دے گا میرے پیچھے...... میری نقل و حرکت کی نگرانی کرے گا، اس سے تم بھی مارے جاؤ گے۔“

”پھر...... کیا اس سے پہلے کہ سانپ ڈسے مجھے اس کا پھن کچل دینا چاہیے...... دشمن کے وار کرنے سے پہلے دشمن کا خاتمہ......“

”بالکل...... یہی کرنا ہوگا تمہیں...... تمہاری مدد میں کروں گی۔“

اکبر بولا۔ ”تم کیا کر سکتی ہو۔“

”سنو...... وہ خواب آور گولیاں کھاتا ہے، کل میں اسے رات کے وقت دودھ کا گلاس دوں گی، اس میں دس بیس گولیاں پہلے سے حل کر دوں گی، اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔ رات بارہ بجے کے بعد تم آجانا۔ دروازہ کھلا ہوگا، وہ بے ہوش پڑا ہوگا...... اس کے منہ پر تکیہ رکھ کے اس کا خاتمہ کر دینا...... اور نکل جانا۔“

”اور تم......؟“

”میری بہن کرن کی بھابی یہاں اسپتال میں داخل ہے۔ وہ میری گواہ بنے گی کہ میں رات بھر اس کے ساتھ تھی...... رشید کی موت خودکشی سمجھی جائے گی یا سلیپنگ پلز کے زیادہ استعمال کا نتیجہ......“

اکبر کو یہ پروگرام عین اپنے پروگرام کے مطابق لگا۔ وہ خود پولیس کو بتا دے گا کہ مونا اس رات گھر میں ہی تھی، اس کی بھابی جھوٹ بول رہی ہے۔ اور جھوٹ کا پتا بھی چل جائے گا۔ رشید کا پتا صاف ہوتے ہی وہ پورے بزنس کا مالک بن جائے گا۔ مونا ڈارلنگ...... تمہارا خوابوں کا گھر اب بڑا گھر ہوگا، سرکاری مہمان خانہ......

اگلی رات وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق رات بارہ بجے رشید کے گھر میں داخل ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ بیڈروم کس طرف ہے۔ وہ مین گیٹ کے بجائے عقبی دیوار پھاند کے اندر پہنچا۔ اسے اندازہ تھا کہ رشید کے گھر میں گیٹ پر موجود سیکیورٹی گارڈ کے علاوہ کہاں کہاں کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے نصب ہیں۔ اپنی دانست میں اس نے سب کیمروں کو دھوکا دیا اور کچن کی طرف سے گھر کے اندر پہنچا تو سب کی نظر سے محفوظ رہا۔ اندر کی راہداری میں بھی کیمرے دونوں طرف سے تمام نقل و حرکت ریکارڈ کرتے تھے چنانچہ اس نے ایک کھڑکی کا شیشہ توڑا اور کچن میں اترا۔ وہاں سے ملحقہ اسٹور میں گیا۔ سرونٹ کوارٹر کی طرف سے بیڈروم کی ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ کے اندر گیا۔

اکبر کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آج کیمروں کی پوزیشن اس طرح بدل دی گئی ہے کہ اس کی ایک ایک حرکت مسلسل فلم کی صورت میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔ اس نے تو محتاط رہتے ہوئے وہی راستہ اختیار کیا تھا جو مونا نے محفوظ قرار دیا تھا۔ کمرے میں اترتے ہی اس نے نائٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں رشید کو بستر پر ساکت پڑا دیکھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر جھکا اور یہ دیکھنا چاہا کہ خواب آور گولیوں کے زیرِ اثر وہ ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے یا ابھی زندہ ہے۔

رشید اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ایک دم اس نے اکبر کو خود پر جھکے دیکھا اور خطرے کو محسوس کرتے ہی چیخ کر گارڈ کو طلب کرنا چاہا۔ اب اکبر کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ رشید کو آواز نکالنے سے قبل ہی دبوچ کر بے بس کر دے۔ اپنی عمر کی طاقت کے اعتبار سے رشید نے مزاحمت کی اور خود کو بچانے کے لیے آواز بھی نکالی مگر اب اکبر پر خون سوار تھا، اس نے رشید کا گلا دبوچا اور اسے اپنے نیچے دبا لیا۔ رشید کی وحشت زدہ آنکھوں نے پوچھا بھی کہ چھوٹے بھائی، تم ایسا کیوں کر رہے ہو مگر اکبر کے ہاتھوں کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔

چند منٹ میں رشید کی مزاحمت ختم ہوگئی۔ اکبر کو بالکل اندازہ نہ ہو سکا کہ اس نے وہ کارڈلیس سوئچ دبا دیا تھا جس کی گھنٹی کچن میں بجتی تھی۔ یہ عام حالات میں ملازم کو بلانے کے لیے تھی مگر آج ملازم چھٹی پر تھا تو بیل گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ کے پاس رکھوا دی گئی تھی۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک دم لائٹس آن ہوگئیں۔ اکبر نے سیکیورٹی گارڈ کی گن کا رخ اپنی طرف دیکھا، اس کی نظر نے مونا کو ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ واقعی اسپتال میں کرن کی بھابی کے ساتھ تھی۔

اکبر کا سارے کاروبار پر قبضے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ وہ آدھے سے بھی گیا اور اپنی زندگی سے بھی۔ پولیس نے عدالت کے سامنے اس کے اندر آنے کی اور رشید کو قتل کرنے کی پوری فلم پیش کر دی۔ اس کو جائے واردات سے گرفتار کرنے والے سیکیورٹی گارڈ کے علاوہ دوسرا گواہ نوکر بن گیا۔ اس نے کہا کہ وہ سرونٹ کوارٹر میں سو رہا تھا جب رشید صاحب نے گھنٹی بجا کے اسے طلب کیا۔ اس نے جا کے دیکھا تو ملزم ان پر سوار تھا۔ وہ گارڈ کی طرف بھاگا۔ اسے ڈر تھا کہ اندر جا کے اس نے رشید صاحب کو بچانے کی کوشش کی یا شور مچایا تو وہ خود بھی مارا جائے گا اور ملزم اسے گولی مار کے بھاگ جائے گا۔ گارڈ کے پاس اسلحہ تھا۔ ہم نے ملزم کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

انکار کی کہیں گنجائش نہ تھی۔ اسے گرفتار کر کے پاکستان بھیج دیا گیا جہاں اس پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ تین سو دو کے تحت مقدمہ چلا۔ سیشن کورٹ میں حاضر ہو کے مونا نے رو رو کے اکبر کے خلاف گواہی میں کہا کہ ایک بار اس نے مونا کو بھی ورغلایا تھا مگر وہ اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی تھی۔ اس نے سختی سے ملزم کو منع کیا کہ وہ پھر ایسی بات نہ کرے۔ رشید صاحب تو اسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں۔ اس نے قتل کی رات گھر سے اپنی غیر موجودگی کا جو سبب بتایا وہ حقیقی تھا۔ اپنے دفاع میں اکبر نے جو کہا وہ جھوٹ ثابت ہوتا چلا گیا۔ مونا کبھی سکھ نہیں تھی۔ اس کا نام والدین نے مہناز فاطمہ رکھا تھا۔ وہ انڈین نہیں پاکستانی اور فیصل آباد کی رہنے والی تھی۔ اس کی کوئی بہن کرن نام کی پیرس میں نہیں تھی۔ اسپتال میں وہ کرن کی نہیں اپنی بھابی کے ساتھ تھی۔

عدالت نے اسے قتل عمد کے جرم میں سزائے موت دی۔ اکبر کی مقدمے پر اثر انداز ہونے کی ہر کوشش ناکام رہی۔ اس نے فوجداری کے سب سے بڑے وکیل کو پیروی کی فیس ایک کروڑ دی تھی تاکہ وہ ہائی کورٹ میں بھی اس کا دفاع کرے اور سپریم کورٹ میں بھی...... اپیل کی سماعت کے دوران ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کا وکیل بک گیا ہے۔

کلثوم نے اس تمام عرصے میں اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے تھے۔ اس نے تصدیق کر دی کہ مونا اب اس کے وکیل کے ساتھ رہتی ہے اور شاید اسی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب ہائی کورٹ نے اس کی اپیل مسترد کر دی۔ ابھی تک وہ رشید کی بیوہ تھی اور پارٹنر شپ کے معاہدے کی ایک شق کی رو سے اگر ایک پارٹنر نہ رہتا تو دوسرا خود بخود کل کا مالک بن جاتا۔ دونوں کے نہ رہنے کی صورت میں حقوق ملکیت مہناز فاطمہ کو منتقل ہو جاتے جو رشید کی بیوہ تھی۔ اگر اکبر کی بیوی ہوتی تو شاید معاہدے میں اس کا نام بھی آتا اور نصف کی حقدار وہ بھی ہوتی مگر اکبر نے تو شادی بھی بہت بعد میں کی تھی...... اور اب مونا اس کی موت کو یقینی بنانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے شادی کر کے اپنا کیس کیوں خراب کرتی، اس نے وکیل صفائی کو حسن و شباب کی قوت خرید سے اپنا بنا لیا تھا اور یہ اکبر کے ایک کروڑ کے مقابلے میں بڑی قیمت تھی۔

کلثوم نے وہی کیا جو اس کے شوہر نے کیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ گھریلو پردہ دار عورت جب اپنے سہاگ کو بچانے کے لیے نکلی تو اس نے جھجک کو بالائے طاق رکھ دیا اور اتنے اعتماد کا مظاہرہ کیا کہ اکبر کو حیران کر دیا۔ اس نے نہ صرف مقدمہ لڑا اور باہر سے اپنے شوہر کی مکمل قانونی مدد کی بلکہ جہاں ضرورت پڑی اس نے غیر قانونی مدد حاصل کرنے کی کوشش میں بھی تعاون کیا۔

اکبر نے جیل میں رہ کے بھی پاور آف اٹارنی کلثوم کو دے دی تھی چنانچہ اس کے کاروباری اور مالی امور کو بھی اس کی گھریلو بیوی نے حیرت انگیز مہارت کے ساتھ چلایا۔ اکبر پہلے سے قائل تھا کہ دنیا میں ہر چیز خریدی جا سکتی تھی۔ کیا انصاف اور کیا قانون...... کلثوم نے اس کے اعتماد اور یقین کو زندہ رکھا اور ذرا نا امید نہیں ہوئی۔

یہ کلثوم کی کوشش کا نتیجہ ہی تھا کہ موت سے چند قدم

www.Paksociety.com

کے فاصلے پر بھی اکبر زندگی سے مایوس نہ تھا۔ اکبر جیسا اسے بتاتا گیا کلثوم ویسا ہی کرتی گئی۔ اس نے اکبر کے لیے نئے نام اور ولدیت کے ساتھ نیا شناختی کارڈ حاصل کرلیا۔ پھر نیا پاسپورٹ بنوالیا۔ یہ طے تھا کہ اکبر اور وہ پاکستان سے نکل جائیں گے۔ اکبر کی ہدایت کے مطابق اس نے تمام کاروبار کا بھی سودا کرلیا تھا۔ پھر اس نے اکبر کو مطلع کیا کہ نئے خریدار نے رقم ادا کردی ہے اور اب وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں جاکے رہنے کے لیے آزاد ہیں۔ ان کے پاس اتنا پیسا ہے کہ وہ کینیڈا یا ملائیشیا کہیں کی نیشنلٹی بھی انویسٹمنٹ کرکے فوراً حاصل کرسکتے ہیں۔

آخری بات اکبر نے اسے یہ بتائی تھی کہ اس کی رحم کی اپیل بھی مسترد ہوچکی ہے۔ اب اس کو پھانسی دیے جانے کی تاریخ کا انتظار ہے۔ بلیک وارنٹ موصول ہونے کے بعد کلثوم نے آخری داؤ کھیلا...... پھانسی دیے جانے کے وقت جو لوگ موجود ہوتے تھے اور ملزم کی موت کی تصدیق کرتے تھے ان میں جیلر کے علاوہ مجسٹریٹ، ایک ڈاکٹر، جلاد اور مولوی شامل تھے۔

پانچ کروڑ میں کلثوم نے ان سے سودا کرلیا تھا۔

+++

سب دیکھنے والوں نے اسے بڑی بہادری کے ساتھ مسکراتے ہوئے تختۂ دار کی جانب یوں جاتا دیکھا جیسے رہا ہونے والے مجرم جیل کے دروازے کا رخ کرتے ہیں۔ وہ اس شخص کی ہمت پر حیران تھے جو موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ گارڈ بھی جس نے کچھ دیر پہلے اس کے منہ سے یہ الفاظ سنے تھے کہ زندگی خریدی جاسکتی ہے۔

صرف ایک گھنٹے بعد وہ ایک اسٹریچر پر لیٹا ہوا تھا، اس کا جسم مردے کی طرح ساکت تھا مگر سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی چادر کے نیچے اکبر مسکرا رہا تھا۔ شاید ایسا پہلے بھی ہوا ہو مگر اس نے جو دولت کمائی تھی، بے مصرف نہیں تھی۔ وہ اپنے لیے دوسری زندگی خریدنے میں کامیاب رہا تھا۔ پھانسی کے وقت موجود تمام سرکاری اہلکار اس کی موت کے گواہ تھے۔ ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کی تھی، کلثوم نے زبردست شوہر پرستی کا مظاہرہ کیا تھا اور ہر ایک کو منہ مانگی قیمت پر خرید لیا تھا۔

اس کے بعد ملنے والی دوسری زندگی کی ساری ذمے داری کلثوم نے قبول کی تھی۔ مجرم کی یہاں تدفین بھی ہوگی اور وہ بھی دوبارہ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ دستاویزات کی رو سے اکبر کو پھانسی دے دی گئی تھی اور وہ مرچکا تھا۔

اسٹریچر دھکیلنے والے آہستہ آہستہ اسے باہر کی جانب لے آئے جہاں اس کی لاش ورثا کے حوالے کی جاتی تھی۔ کلثوم اس کی واحد وارث تھی۔ وہ خون کے آنسو رو رہی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر دیکھنے والوں کا بھی کلیجا پھٹتا تھا۔ اس کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ وہ دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔

لاش کو اسٹریچر سے ایک ایمبولینس میں منتقل کیا گیا جو اسی مقصد کے لیے خود کلثوم لائی تھی۔ ایمبولینس جیسے ہی جیل کے دروازے سے نکلی اکبر نے چادر ہٹائی اور ایک قہقہہ مار کے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ ایمبولینس ڈرائیور کی پروا کیے بغیر کلثوم کو چوم چوم کے اس کا برا حال کردیتا۔ تم نے تو کمال کردیا میری جان...... پھر وہ کسی وفا شعار بیوی کی طرح کہتی۔ یہ سب آپ کی محبت کا اعجاز تھا میرے سرتاج۔

لیکن ابھی وہ اٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ ایمبولینس میں کلثوم کے مقابل بیٹھے ہوئے ایک ہینڈسم ہیرو ٹائپ نوجوان نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری...... ضرب اتنی شدید تھی کہ اکبر کی آنکھوں کے سامنے موت سے زیادہ گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ اٹھنے سے پہلے وہ گر گیا۔

اس نے اپنی وفا شعار بیوی کی آواز سنی۔ ”سر نہیں، اس کی گردن توڑ دو...... تم تو جوڈو کراٹے کے ماہر ہو۔“

اکبر چلایا۔ ”کلثوم...... یہ سب...... یہ کیا ہے، یہ کون ہے؟“

”یہ وہ ہے جو چار ماہ دس دن بعد میرا دوسرا شوہر ہوگا۔ جو میری پہلی محبت تھا۔ یہ میرا ہی نہیں تمہارے سارے کاروبار کا بھی مالک ہوگا کیونکہ تم تو مرچکے ہو۔ تمہیں پھانسی ہوئی تھی نا...... میت گھر پہنچے گی تو بہت سے سوگوار منتظر ہوں گے۔ وہ سب آج تمہاری تدفین میں شریک ہوں گے۔“ کلثوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اکبر کی خریدی ہوئی زندگی کا سفر تمام ہوا، جس کی اس نے بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی مگر اپنی اس زرخرید زندگی میں وہ صرف چالیس منٹ جیا...... اس کی عالی شان کوٹھی کے دروازے پر وہ سب سوگوار سرنگوں کھڑے تھے جن کا وہ ان داتا تھا...... نوکر چاکر...... فیکٹری کے ملازم...... دوست احباب...... شناسا!

جیل سے پھانسی پا کے آنے والی میت کو اتارتے وقت ان میں سے کسی کو اندازہ نہ تھا کہ وہ چالیس منٹ کی خریدی ہوئی زندگی پانے والے کی میت ہے۔

www.Paksociety.com